اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ

خود نوشت سوانح

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ العالی

جلد اوّل

جس میں حضرت موصوف مدظلہ العالی کی خاندان۔ ابتدائی زندگی۔ تعلیم۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کی خدمت میں حاضری۔ دار العلوم دیوبند میں داخلہ اور اُن حالات پر شرح و بسط اور پوری تفصیل سے بحث کی گئی ہے جن سے متاثر ہو کر مسلمانانِ ہند بالخصوص شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز اور اکابر علماء ہند نے انگریزوں کے خلاف جدوجہد آزادی میں حصہ لیا۔

ناشر ــــ سید محمد اسعد ــــ
(خلف حضرت مصنف مدظلہ العالی)

قیمت غیر مجلد ۵ر
مجلد ۶ر

إِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ

نقشِ حیات

(یعنی)

خود نوشت سوانح

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ العالی

جلد اوّل

جس میں حضرت موصوف مدظلہ العالی کا خاندان۔ ابتدائی زندگی۔ تعلیم۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کی خدمت میں حاضری۔ دار العلوم دیوبند میں داخلہ اور اُن حالات پر شرح و بسط اور پوری تفصیل سے بحث کی گئی ہے جن سے متاثر ہو کر مسلمانانِ ہند بالخصوص شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز اور اکابر علماء ہند نے انگریزوں کے خلاف جد و جہدِ آزادی میں حصہ لیا۔

ناشر ــــ سید محمد اسعد ــــ قیمت

(خلف حضرت مصنف مدظلہ العالی)

کتبہ خلیق

غیر مجلد ۵ر
مجلد ۶ر

(دلی پرنٹنگ ورکس دہلی)

ملنے کے پتے

(۱)

مکتبہ برہان۔ اردو بازار۔ جامع مسجد۔ دہلی ۶

(۲)

الجمعیۃ بک ڈپو۔ دفتر جمعیۃ علماء ہند۔ قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی

(۳)

کتب خانہ فخریہ۔ امروہہ گیٹ۔ مراد آباد (یو۔پی)

(۴)

قومی کتاب گھر۔ دیوبند۔ ضلع سہارن پور

(۵)

محمد اسعد۔ خلف حضرت مصنف مدظلہ العالی

آستانہ حضرت مدظلہ العالی۔ دیوبند ضلع سہارنپور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

تعارف اور وجہ تالیف

از

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند و ممبر ہند پارلیمنٹ دام ظلہ العالی

---

(۱) جس قدسی صفات بزرگ کے رشحات قلم آپ کے سامنے پیش کئے جا رہے ہیں اس کی شہرت و عظمت کی سطح میرے تعارفی الفاظ سے بہت بلند ہے۔

کون نہیں جانتا کہ وہ بزرگِ باخدا۔ عالم باعمل جس کو مولانا حسین احمد مدنی کہا جاتا ہے۔ اور علماء ہند کا بہت بڑا طبقہ اُس سے یہاں تک ارادت اور عقیدت رکھتا ہے کہ " شیخ الاسلام " کا صحیح خطاب ہی ان کے جذبات احترام کی کسی قدر تسکین کر سکتا ہے ــــ وہ علم و عمل اور شریعت و طریقت کا وہ مجمع البحرین ہے کہ اگر ایک طرف اتباع سنت، اخلاق نبوت، سیرت صحابہ اور اسوہ مشائخ کا سرچشمہ ہے تو دوسری جانب وہ ایسا بحرِ بے پایاں ہے جس سے جذباتِ حریت۔ ترقی ملت۔ حب وطن۔ ہمدردی خلق خدا۔ غمخواری نوع انسانیت۔ اور اُن کے لئے ایثار اور بے پناہ قربانی کے چشمے اُبلتے رہتے ہیں۔ اُس کا قلب حامل شریعت ہے اور عمل تفسیر شریعت۔

دینی اور ملی جذبات نے جس طرح خوف و خشیہ الٰہی کی کھٹک اس مقدس ہستی کے دل میں پیدا کی۔ اسی طرح خدمت خلق کے پاک احساسات اُس کے قلب حق آگاہ پر کچھ کم اثر انداز نہیں ہوئے اور آخر درد و کرب کی یہی ملی جلی کیفیت سعی پیہم کی صورت میں نمودار ہوئی۔ جس نے اُس کو چین و آرام۔ راحت و سکون سے قطعاً ناآشنا

بنا دیا - اور آج جبکہ ستر سال سے تجاوز کر کے جسمانی طاقت ضعف پیری کے حوالہ ہو چکی ہے اُس کی پاک زندگی شباب جد و جہد سے ہم آغوش اور سعی پیہم کی حامل ہے -

(۲) عہد شباب کی بات ہے - وہ سید المرسلین - رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم اطہر میں درس و تدریس کے ذریعہ قال اللہ و قال الرسول کی خدمت انجام دیا کرتا تھا - اور مشرق وسطیٰ - افریقہ - چین اور جزائر شرق الہند کے تشنگان علوم اور رہ نوردان سلوک و طریقت اُس کے ظاہری و باطنی کمالات و ملکات سے فیضیاب ہوا کرتے تھے مگر اُس کی نگاہ حقیقت آگاہ نے جب یہ دیکھا کہ حیات ملی کس طرح مظلومیت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھائی جا رہی ہے - اور انسانیت کس طرح درد و کرب میں مبتلا ہے - تب وہ خدمت ملی کے تنہا اس گوشہ پر قانع نہ رہ سکا - اُس نے نہ صرف دُنیاء اسلام - بلکہ عالم انسانیت پر گہری نظر ڈالی - وہ نظر جو رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے جوارِ رحمت کے طفیل میں - رحمت و شفقت، محبت و رافت اور ہمدردی و غمخواری کے جذبات میں ڈوبی ہوئی تھی جس کی وسعت، فرقہ واریت کی تنگنائیوں سے آزاد - اور تحزّب اور گروہ بندی کے گرد و غبار سے پاک تھی - اُس نے دیکھا کہ مغرب کے فولادی پنجے - مشرق کے گوشت و پوست کو کھرچتے ہوئے ہڈیوں تک پہونچ گئے ہیں مشرق اس اذیت سے تڑپ رہا ہے - وہ درد بھری آواز سے انسانیت کے نام پر اپیل کر رہا ہے لیکن سفید فام یورپین وحشیوں کے دل رحم اور مہربانی کے مفہوم سے قطعاً نا آشنا ہو چکے ہیں -

یورپ کے نقشہ میں انگریز کی تصویر سب سے زیادہ بھیانک تھی - وہ ظلم و ستم کے لشکر بے پناہ کا علم بردار تھا جس کی دراز دستیاں جبرالٹر سے لیکر سنگاپور تک اور آئرلینڈ سے لیکر ہانگ کانگ تک ہر ایک آزاد قوم کی عزت و عظمت پامال کر چکی تھیں - وہ اپنے وطن عزیز کی تباہ حالی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا - دولت آل عثمان (ترکی) پر یورشِ یورپ کی خونیں تاریخ اُس کی نگاہوں کے سامنے تھی - افریقہ اور ایشیا کی مظلوم قوموں کی چہار طرف آہ و بکا - گریہ و زاری کی دردناک صداؤں نے اس کو بے چین و مضطرب بنا دیا تھا - چنانچہ وہ عزم بالجزم کا فولادی پیکر - استقلال و استقامت کا کوہ گراں بن کر اُٹھا - سب سے پہلے وطن عزیز کی آزادی اور برطانوی اقتدار کی پامالی کو اُس نے اپنا لائحہ عمل بنا لیا کہ یہی طریق کار - مظلوم قوموں کی گلوخلاصی - وطن کی آزادی اور دنیاء اسلام کی رفعت اور ترقی کا کفیل ہو سکتا تھا -

یہی وہ فراست مومن تھی جس نے چالیس سالہ جنگ آزادی کا ہیرو بناکر اس بلند شخصیت کو سیاست کے اس انقلابی مقام پر لاکھڑا کیا جس کو ظاہر بین نگاہیں حیرت و تعجب سے دیکھتی تھیں۔ اور سطحی انداز بیان سے اس مقدس ہستی کے اس بے لوث جوش و خروش اور سرگرمی عمل کو محض پولیٹیکل حیثیت دیتی نظر آتی تھیں اور اس کے اخلاص و صداقت۔ اعلاء حق اور جہاد حریت کے مقدس جذبات کی وہ قدر نہ کرسکتی تھیں جس کی وہ مستحق تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ بیسویں صدی میں انگریز۔ انگریزیت۔ اور نہ صرف انگریزی سامراج بلکہ ہر ایک سامراج کی سب سے بڑی دشمن حسین احمد مدنی کی شخصیت ہے تو یہ دعویٰ ایسا ہی صحیح ہوگا جیسا کہ آج انگریزی اقتدار کا زوال آفتاب نیم روز کی طرح ایک حقیقت بنکر سامنے آچکا ہے۔

غرض یہی وہ پاک جذبات و حسیات تھے جن کی عملی شکل و صورت نے اس بوریانشین مقدس درویش اور جانشین رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قید و بند کے مصائب کے سامنے سینہ سپر کردیا اور درس و تدریس اور ارشاد و سلوک کے مبارک سلسلوں کے ساتھ مسند یوسفی کی رونق و آرائش کے لئے بھی اسی کو چن لیا۔

ذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم۔

(۲) وجہ تالیف

۱۹۴۴ء میں جب آپ نینی جیل میں قید و بند کی زندگی بسر کر رہے تھے تو بعض مخلص خدام[1] اور بے تکلف احباب نے آپ سے سوانح حیات قلم بند کرنے کی درخواست کی۔ تاکہ اس طرح اکابر امت مرحومہ کے اس اسوۂ حسنہ کا بھی اتباع ہو جائے جس کو امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ۔ امام الحدیث احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے مقدس اساطین امت نے اپنے اخلاف کے لئے یادگار چھوڑا ہے۔

اول اول آپ نے انکار کیا۔ لیکن آخرکار جب عرض و گذارش نے اصرار پیہم کی شکل اختیار کرلی تب مجبور ہو کر قلم اٹھایا اور اپنی زندگی سے متعلق چند صفحات لکھ دیئے مگر جب جنبش قلم اس موڑ پر پہونچی جہاں سے

---

[1] اس سلسلہ میں مولانا ابوالحسن صاحب کا اسم گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

وہ اپنے مقدس استاذ۔ شیخ الطریقت حضرت مولانا محمود حسن، قدس اللہ سرہ العزیز کی رفاقت میں میدانِ سیاست میں گامزن ہوا۔ تو اُس کے سامنے سب سے اہم اور سب سے زیادہ وقیع یہ مسئلہ آیا کہ آخر شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز اور اُن کے رفقاء کار نے یوریبن اقوام خصوصاً انگریزی اقتدار کی مخالفت میں سیاست کی پرشور اور ہنگامہ آرا زندگی کیوں اختیار کی۔

یوں تو یہ سوال سیاسی رہنما اور پولیٹیکل لیڈروں کے نقطۂ نظر سے کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا لیکن وہ گوشہ نشین۔ خدا پرست۔ صوفی و عالم جو رضاء الٰہی میں غرق۔ پبلک کی ہنگامی زندگی سے الگ تھلگ رہتے ہوں جن کی تقدیس کا شہرہ خواہ تمام دنیا میں کیوں نہ ہو۔ لیکن خود اُن کی اپنی جدوجہد کا دائرہ خانقاہوں اور مدرسوں سے وابستہ اور جن کی تلقین و تبلیغ حق کا طریق کار خاموش علم و عمل اور ساکن کردار سے متعلق رہا ہو۔ ایسے قدسی صفات بزرگوں کا راحت و آرام۔ اور راحت و آرام سے بڑھکر درس و تدریس۔ تعلیم و تربیت۔ تزکیہ نفس۔ تالیف و تصنیف۔ تفسیر و اذکار وغیرہ کے مقدس مشاغل سے دست کش ہو کر یک بیک سیاست کے میدان میں کود پڑنا اور حکومت متسلطہ کے بالمقابل صف آرا ہو جانا معمولی بات نہیں بلکہ بہت ہی اہم سوال ہے۔

جس شخص کا قلب احترام شریعت سے زیادہ لبریز ہو اور جو شخص اپنے افعال کے محاسبہ کا زیادہ عادی اور خداوندی بازپرس اور باداش عمل کے اصول پر جس کو جس قدر زیادہ یقین و اعتماد ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ اس سوال کی اہمیت محسوس کرے گا۔

چنانچہ حضرت مصنف مدظلہ العالی کے سامنے یہ سوال سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ آیا — یہ پوری جلد جو آپ کے سامنے ہے۔ اس کا بیشتر حصہ اسی سوال کا مدلل و مفصل جواب ہے۔

دوسری جلد میں قطب العالم۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی سیاسی تحریک کے وہ گوشے جو اب تک پردہ خفا میں تھے اور رولٹ کمیٹی کی تحقیقاتی رپورٹ بھی اُن کو بے نقاب نہیں کر سکی تھی، اُن کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔

تحریک کے رجالِ کار۔ حکومت موقتہ کے قیام افغانستان و حجاز کے انقلابات۔ ناکامی تحریک کے

وجوہات - پھر اسارت مالٹا وغیرہ کے حالات وکوائف قلمبند کرنے کے بعد اپنے حالات قلمبند فرمائے ہیں

اس طرح یہ کتاب صرف حضرت مصنف مدظلہ العالی کی سوانح حیات ہی نہیں رہی بلکہ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد سے لیکر اُن کے اقتدار کے خاتمہ تک تمام نمایاں واقعات کا مجموعہ - برطانوی حکومت کی تباہ کن ڈپلومیسیوں اور سیاسی مکروفریب کا انسائیکلوپیڈیا - حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک حُریت اور اس عرصہ کے سیاسی رجحانات اور انقلابی تحریکات کا وہ مستند اور جامع تذکرہ ہے جس کا مطالعہ ہر اُس شخص کے لئے ضروری ہے جو ماضی سے سبق لیکر مستقبل کی فکر کرنا چاہتا ہے اور ہندیونین میں ملت اسلامیہ کی عزت وعظمت کا آرزومند ہے -

محمد حفظ الرحمٰن کان اللہ لہ

۵ ذیقعدہ ۱۳۷۲ھ - ۲۷ جولائی ۱۹۵۳ء

دھلی

معذرت

کتاب کا نصف حصہ ۱۹۵۰ء میں طبع ہوچکا تھا پھر کچھ ایسے مواقع پیش آئے کہ باقی نصف حصہ ۱۹۵۳ء میں طبع ہوسکا - جو کاغذ پہلے حصہ میں لگایا گیا تھا - دوسرے نصف حصہ کی طباعت کے وقت وہ بازار میں نایاب تھا - اس لئے افسوس ہے کہ نصف اوّل اور نصف ثانی کے کاغذ میں بدنما تفاوت پیدا ہوگیا جس کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں -

ناشر

قطعۂ تاریخ طباعت

سوانح خود نوشت حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدظلہ

عقیدت کا خضرِ طریقِ نجات — شریعت کا سرمایۂ کائنات

طریقت کا مجموعۂ حال و قال — حقیقت کا آئینہ دار صفات

یہ گنجینۂ رازِ حبِّ وطن — چھپا جب بصد حسن و شان ثبات

مصنف ہیں جس کے بفضلِ خدا — حسین احمدِ پاک دل پاک ذات

جو انورؔ ہوئے سال تاریخ طبع — تصور رہا مائلِ التفات

پکارا یہ ہاتف — بجا خود نوشت

۱۳۷۲ھ

ہے اک شیخ کا نقشِ عزمِ حیات

۱۹۵۳ء

دہلی

۵ جولائی ۱۹۵۳ء

کفش بردار شیخ

انور صابری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۱

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلی الہ وصحبہ و بارک وسلم

اما بعد عرصہ دراز سے احباب مجھ سے میری سوانحعمری کی مختلف باتیں دریافت فرماتے رہتے تھے۔ حسب وقت وسوال میں جواب دیتا رہتا تھا۔ بعض بعض احباب نے مختلف اخباروں اور رسائل میں ان کو شائع بھی کر دیا۔ مگر افراط وتفریط اور زیادتی کمی سے وہ مضامین خالی نہیں رہے اور بعض چیزیں غلط بھی شائع ہوئیں جن کے تذکرہ پر اصرار کیا گیا کہ صحیح واقعات قلمبند کر دیئے جائیں۔ کثرتِ مشاغل اس کی فرصت ہی نہ دیتے تھے کہ مختصر سے مختصر طریقہ پر بھی تحریر کروں بالآخر ۱۹۴۲ء میں نظربندی کی نوبت آئی اور جبکہ میں نینی جیل الہ آباد میں تھا تو اس کی پُرزور تحریک ہوئی۔ اور کہا گیا کہ اس وقت تو مجھ کو بہت سی مصروفیتوں سے نجات حاصل ہے اسکو غنیمت جانکر اس مہم کو پورا کر دینا چاہئے کیونکہ اس میں علاوہ تاریخی واقعات کے تذکرہ کے آنیوالے لوگوں کے لئے ہدایت اور مشعلیت راہ بھی ہے اور نعمائے الٰہیہ کے تحدیث کی بھی عمدہ صورت ہے میں نے اس میں غور کیا تو سمجھ میں آیا کہ واقع میں جس قدر انعام اور فضل خداوندی میرے اوپر شل

بارش موجب حیوٰۃ روحانی وجسمانی ہوا ہے، نہ میں اس کا مستحق تھا اور نہ اتنے افضال وانعام کی عام مثالیں پائی جاتی ہیں۔ جس انتہائی تنزل میں انقلابات زمانہ نے ہمارے خاندان کو پہنچایا تھا اس کے بعد اس طرح ابھارنا وہ انتہائی کرم خداوندی ہے جس کا شکریہ ادا نہیں ہو سکتا۔ خاندانی روایات تھیں کہ ہر زمانہ میں کم از کم ایک یا دو صحیح مجذوب اور بکثرت اہل سلوک موجود رہتے تھے مگر ۱۸۵۷ء سے کچھ پہلے اہل عرفان وسلوک سے خاندان خالی ہو گیا اور سب پکے دنیا دار ہو گئے علم ومعرفت کی جگہ جہالت اور نفس پروری نے لیلی تھی، پھر ۱۸۵۷ء کے واقعات نے رہی سہی حالت بھی بالکل برباد کر دی۔ اندوختہ خزانے اور اموال سب لٹ گئے۔ جائدادیں تقریباً سب کی سب نکل گئیں اور انتہائی افلاس نے چاروں طرف سے احاطہ کر کے بالکل بے دست وپا کر دیا۔ خاندان کے مربی حضرات دار الفنا کو راہی ہو گئے اور ابھرنے کے سامان بالکل نیست ونابود ہو گئے۔

عالمگیر پے در پے قحطوں نے جو کہ انگریزی چیرہ دستیوں اور ان کی نحوستوں سے انیسویں صدی عیسوی کے اخیر میں ظہور پذیر ہوئے تمام ہندوستان بالخصوص یوپی اور اودھ کے مشرقی اضلاع میں لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا، خاندانوں کے خاندان بے نام ونشان ہو گئے تھے۔ بقول سر ولیم ڈگبی ۱۸۷۵ء سے ۱۹۰۰ء تک ہندوستان میں اٹھارہ قحط واقع ہوئے۔ اور تقریباً تین کروڑ آدمی ہلاک ہو گئے۔ ایسے زمانہ میں ایسے گرے ہوئے خاندانوں اور پھر ایسے گرے ہوئے خاندان کے یتیم بچوں کو باعزت زندہ رکھنا اور ان کو ان غیر متناہی عظیم الشان نعمتوں سے ڈھک لینا کیا وہ بے نظیر انعام الوہیت نہیں ہے کہ جس کے شکریہ سے کبھی بھی عہدہ برائی نہیں ہو سکتی ؎

اگر بر روید از ہر موز بانم ؂ ادائے شکر لطفش کے توانم

بہر حال حسب ارشاد قرآنی وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ضروری معلوم ہوا کہ بطور تحدیث نعمت خداوندی اللہ تعالیٰ کے اس فضل وکرم کا جو کہ مجھ پر اور میرے والدین اور خاندان پر سایہ گستر رہا ہے اور اب بھی سایہ افگن ہے تذکرہ کروں اور اس کے شکریہ کے گیت گا کر قلب اور دماغ ناظرین کو معطر کروں ؎

من آن خاکم کہ ابر نو بہاری ✧ کند از لطف برمن قطرہ باری

چونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ زمانہائے سابقہ میں اسلاف کرام نے اپنی سوانح عمریاں خود لکھی ہیں جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ سے منقول ہے اور زمانہ حال میں بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں میں اس کی بکثرت مثالیں پائی جاتی ہیں اور چونکہ اپنی بیتی اور سرگذشت سے انسان جسقدر واقف ہوتا ہے دوسرا نہیں ہو سکتا اس لئے کوئی وجہ معتمد علیہ اس سے باز رہنے اور اس کے تذکرہ کو ترک کرنے کی معلوم نہیں ہوتی خصوصاً اس بنار پر کہ امید ہے کہ شاید لوگوں کو صحیح حالات معلوم ہونے کی بنار پر کچھ نفع پہونچے یا کم ازکم وہ ان بدظنیوں اور بدگوئیوں سے پرہیز کریں جو کہ دشمنان دین و مذہب نے اپنی خود غرضیوں کے ماتحت یوروپین پروپگنڈوں سے پھیلائی ہیں اگرچہ ان بدگوئیوں اور سوءظنوں سے میرے لئے کفارۂ سئیات اور دوسروں کے حسنات حاصل کرنے کا فائدہ بھی متصور بلکہ یقینی ہے۔ بہرحال ان مقاصد حسنہ کے ماتحت میں ان سطور کو پیش کش ناظرین کرتا ہوا افضالِ خداوندی سے دست بدعا ہوں کہ وہ مجھکو مالا یُرضِیہ سے محفوظ رکھے اور اپنی مرضیات کی ہر قول و عمل میں توفیق عطا فرمائے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت و الیہ انیب۔ رب اوزعنی ان اشکر نعمتک التی انعمت علی وعلی والدی وان اعمل صالحا ترضاہ و اصلح لی فی ذریتی انی تبت الیک وانی من المسلمین۔

سنہ و تاریخ ولادت

سنہ ۱۲۹۶ ھ ہجری ماہ شوال کی انیسویں تاریخ کی شب میں گیارہ بجے دوشنبہ کے دن گذر جانے کے بعد یعنی شب سہ شنبہ میں بمقام بانگرمئو ضلع اوناؤ میں پیدا ہوا۔ تاریخی نام چراغ محمد ہے۔ حضرت والد صاحب مرحوم نے اپنی بیاض میں صرف یہی تحریر فرمایا ہے۔ تاریخ و سنہ عیسوی نہیں لکھا ہے، حساب سے ۱۸۷۹ء پڑتا ہے۔

اُس زمانہ میں والد صاحب مرحوم قصبہ بانگرمئو میں اردو مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور کئی سال سے مع متعلقین وہاں ہی مقیم تھے۔ سنہ ۱۲۹۳ ھ میں اس سے پہلے میرے منجھلے بھائی مولانا سید احمد صاحب مرحوم بھی وہاں ہی پیدا ہوئے تھے۔ جس زمانہ میں میری پیدائش ہوئی اس زمانہ میں

موسمی تپ ولرزہ کا بہت زور تھا، اموات زیادہ ہوتی تھیں۔ والدہ مرحومہ فرماتی تھیں کہ عموماً بچے اور ان کی مائیں جو کہ اس زمانہ میں زچہ ہوئیں تھیں ضائع ہو گئے۔ تمام قصبہ میں صرف میں اور ایک دوسری عورت معہ بچے کے سالم بچی تھی۔

ابتدائی پرورش بانگرمؤ ہی میں ہوئی۔ میں بہت ہی چھوٹا تھا جبکہ والد مرحوم بانگرمؤ چھوڑ کر وطن آبائی قصبہ ٹانڈہ میں قیام گزیں ہوئے چونکہ اس پردیسی اقامت کی وجہ سے زمینداری کا انتظام نہیں ہو سکتا تھا اس لئے اُنھوں نے کوشش کی کہ تبدیلی ٹانڈہ کو ہو جائے۔ حکام بالا نے اس وجہ سے اس میں لیت ولعل کی کہ ٹانڈہ کے ہیڈ ماسٹر کی تنخواہ عنہ ماہوار ہے اور تمکو یہاں منہ ماہوار ملتے ہیں یہ مقدار تمکو وہاں نہیں دی جا سکتی مگر ضروریات وقت نے مجبور کیا کہ اس قلت تنخواہ پر بھی تبدیلی کرالی جائے۔ بالآخر وہ وہاں سے تبدیل ہو کر ٹانڈہ چلے آئے۔ مجھکو وہاں سے آنا بالکل یاد نہیں۔ غالباً تین برس کی عمر ہو گی۔ اُس کے بعد بارہ برس کی عمر تک ٹانڈہ ہی میں رہنا اور ابتدائی تعلیم حاصل کرنا نصیب ہوا۔

سلسلۂ نسب | سلسلۂ نسب حسب ذیل ہے۔

حسین احمد بن سید حبیب اللہ بن سید پیر علی بن سید جہانگیر بخش بن شاہ نور اشرف بن شاہ مدن ابن شاہ محمد ماہ شاہی بن شاہ خیر اللہ بن شاہ صفت اللہ بن شاہ محب اللہ بن شاہ محمود بن شاہ لدھن بن شاہ قلندر بن شاہ منور بن شاہ راجو بن شاہ عبدالواحد بن شاہ محمد زاہدی بن شاہ نور الحق رحمہم اللہ تعالیٰ۔

شاہ نور الحق رحمۃ اللہ علیہ وہ مورث اعلیٰ ہیں جو کہ اس سرزمین میں الہداد پور قصبہ ٹانڈہ میں پہلے پہل تشریف لاکر اقامت گزیں ہوئے۔ اُس زمانہ میں قوم رجبھر کا ٹانڈہ کے گرد و نواح میں تمام دیہات وغیرہ پر قبضہ اور تصرف تھا، اور وہ مسلمانوں کو ستاتے رہتے تھے۔ حضرت شاہ نور الحق صاحب مرحوم نے بھوبکران کو دعوت اسلام دی مگر وہ لوگ اور راجہ مقابلہ پر آئے آپ نے بزور کرامت ان کو زک دیا۔ انکا راجہ قلعہ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ آپ نے وہیں اقامت

فرمائی اور اس موضع کا نام الہداد پور رکھا. جس کی وجہ تسمیہ ظاہر ہے. قلعہ کے آثار ابتک موجود ہیں شمالی دیوار اور مغربی اور مشرقی. برجوں کے باقیماندہ پتھر وغیرہ باقی ہیں. اسی قلعہ میں آپ کا اور آپکے تمام اولاد کا مزار ابتک بنتا چلا آتا ہے۔

آج ہمارے خاندان میں کوئی ایسا کاغذ یا تحریر موجود نہیں ہے جس سے ظاہر ہو کہ موصوف کہاں سے آئے تھے اور سلسلہ نسب فوقانی کیا ہے اور کس زمانہ میں آئے تھے. مگر شجرۂ طریقت میں جو کہ محفوظ ہے دکھلایا گیا ہے کہ آپ شاہ داؤد چشتی کے اور وہ شاہ عتاب الدین چشتی کے اور وہ شاہ نجم الدین چشتی کے اور وہ شاہ رومی چشتی کے اور وہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمہم اللہ تعالیٰ کے خلیفہ ہیں۔

یہ شجرہ طریقت بہت پرانے کاغذات میں پایا گیا تھا اس کا تصنیف کرنے والا والد ماجد مرحوم کے پڑداداشاہ نور اشرف قدس اللہ سرہٗ العزیز کا کوئی مرید یا بیٹا ہے. الفاظ حسب ذیل ہیں۔

خداوندا کریا کارسازا — کہ ہستی بندہ پرور بے نیازا
بحق راز شاہ نور اشرف — کہ در روشن دلی از نور اشرف
بحق راز حضرت پیر بدن — کہ دلق فقر از وگشتہ مزین
بحق آں محمد ماہ شاہی — کہ در برج فقیری بود ماہی
بحق شاہ خیر اللہ نیکو — نبودش ہیچ مطلوبے بجز تو
خدایا ہم بحق آں شہ دیں — پناہ معرفت توحید آئین
کہ صفت اللہ نام نامیش بود — مسمے درج اسم سامیش بود
خدایا ہم بعز و رفعت شاہ — محب اللہ سمار فقر را ماہ
کہ چوں نام خود آں راسخ محبت — ہمیں بود از رسوخ دل محبت
خدایا ہم بحق شاہ محمود — چہ گویم وصف او جز این کہ محمود
خدایا ہم بحق شاہ لدہن — گر دگشتہ چراغ فقر روشن

شریعت را از و شد خانه آباد — طریقت را از و معمور بنیاد

خدایا هم بحق شه قلندر — که چون دلق فقیری کرده در بر

عمل بر فقر فخری داشته او — فقیری فخر خود انگاشته او

بکار فقر عمر خود بسر برد — بجز راه طریقت کام نسپرد

خدایا از برائے شه منور — که جانش بود از نورت منور

شده روشن ز ذات آن یگانه — چراغ معرفت خانه بخانه

خدایا هم بحق شاه راجو — که در فقر و فنا بر داز همه گو

خدایا هم بآن شاه ستوده — که عبد الواحد او را نام بوده

چو در عبدیت واحد سر آمد — ازان این نام نامیش بر آمد

خدایا هم بحق شاه زهاد — محمد زاهدی کو بود زهاد

ازان وقتیکه از تمیز دم زد — براه زهد بس ثابت قدم زد

بزهد اندر چنان او محو خود ساخت — که یکدم با خودی خود نه پرداخت

بحق شاه نور الحق لاریب — که نور حق نمایان داشت از غیب

ازان وقتیکه حق تمیز دادش — نبوده غیر ذات حق مرادش

خدارا از برائے شاه داؤد — که اهل چشت را پیر هدی بود

چنان بود او براه شرع و دین چست — که جز تبعیت امرت نمی جست

بحق شه عتاب الدین چشتی — که اندر آتش عشقش برشتی

الهی بحر نجم الدین چشتی — که ذاتش پاک ز آلائش سرشتی

الهی بهر شه ردی چشتی — که آمد فرد در ظاهر سرشتی

بحق خواجه قطب الدین کاکی — که از قطبیتش خلقے امرت خاکی

بآن خواجه معین الدین چشتی — که ذاتش دین و دنیا را بهشتی

بحق خواجہ عثمان ہارون | کہ باشد واقف اسرار بیچون
بحق قدوۂ پیران اعظم | شریف زندنی خواجہ معظم
بحق قطب دین مودود چشتی | کہ سازی پیرو او را بہشتی
بحق خواجہ یوسف ناصر الدین | کہ ہست از عارفان اہل تمکین
خداوندا بحضرت بو محمد | دل او مقتبس از نور احمد
بحق خواجہ بو احمد خدایا | بحال زار ما رحمے بفرما
بحق خواجہ بو اسحق شامی | کہ دارد عالمے را در غلامی
بحق خواجۂ دیں خواجہ ممشاد | علو دینوری از خویش آزاد
ہبیرۂ بصری آن پیر پیران | کہ باشد دستگیر دستگیران
بحق آنکہ فخر عارفان ست | حذیفہ مرعشی قطب جہان ست
بحق خواجہ ابراہیم ادھم | شہنشاہ دو عالم شاہ اعظم
پے خواجہ فضیل اکرم الخلق | شہنشاہ کریمان اعظم الخلق
بعبد الواحد اے واحد حقیقی | کہ یکتا بود در واحد طریقی
بحق اسوۂ اہل کمالان | امام و قدوۂ ارباب حالان
حسن بصری کہ مخدوم جہان است | رئیس خواجگان انس و جان است
بحق آن شہ ملک ولایت | معظم نیر برج ھدایت
علی مرتضی دروازۂ علم | در دریائے خلق و معدن علم
بحق کار فرما شاہ لولاک | کہ از تحت الثریٰ تا عالم پاک
برائش از عدم آمد بہستی | کہ بر دے کس ندارد پیش دستی
طراز اول کہ کلک حق رقم زد | شفیع امتان یعنی محمد
بحق آل و اصحاب کبارش | بحق راز جملہ دوستانش

مرادہ پنج چیز از در گہ خویش — یکے علم و ادب زاید زحد بیش

دویم رزقے کہ میدارم تمنا — عطا فرما مرا در دار دنیا

سویم زیں وقت خود تا آخریں دم — بمانم در جہاں خوشنود و خرم

چہارم دہ فروغ علم ما را — کہ چوں خورشید باشد آشکارا

بہ پنجم چونکہ در گورم رسانند — دو داعم کردہ از من باز مانند

سپس با من نکیر و منکر آیند — ز من از دین من پرسش نمایند

محمد مصطفیٰ یادم دہ آں دم
دگر زہرہ و حسنین معظم

اس سے پتہ چلتا ہے کہ موصوف حضرت خواجہ جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ حضرت خواجہ شیخ عبدالحق ردولوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہمعصر تھے اور ۸۰۰ ہجری سے پہلے یا قریبی زمانہ میں یہاں تشریف لائے تھے اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غالباً موصوف ہندوستان ہی کے کسی حصے سے تشریف لائے تھے۔ اگرچہ ممکن ہے کہ خراسان وغیرہ سے آئے ہوں کیونکہ شاہ داؤد چشتی جو کہ انکے پیر و مرشد ہیں ان کی نسبت مشہور ہے کہ وہ ساتویں پشت کے باشندہ تھے۔ خاندان کے بڑوں سے سننے میں آیا ہے کہ موصوف کا سلسلہ نسب حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے (واللہ اعلم) کہا جاتا ہے کہ نسب نامہ شاہ خیر اللہ صاحب مرحوم کے ساتھ کاغذات میں چلا گیا۔ موصوف خانگی منازعات کی وجہ سے ناراض ہو کر وطن سے چلے گئے تھے اور بقیہ عمر پوربی اضلاع ہند میں گذاری جس کا کچھ پتہ معلوم نہیں ہوا۔ بعض بزرگوں کا کہنا یہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں جبکہ راجہ بہیٹھی نے نانا اکبر علی صاحب مرحوم کے گھرانے کو لوٹا تھا تو اس نے تمام کاغذات قدیمہ بھی لوٹ لئے یا ان کو تلف کر دیا۔ بہر حال آج خاندان میں کسی کے پاس اوپر کا نسب نامہ موجود نہیں ہے۔

والد صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ میں جبکہ صفی پور اور بانگر مئو میں ہیڈ ماسٹر تھا اور لوگوں سے تذکرہ آتا تھا کہ میں سادات سے ہوں اور میرا خاندان پیرزادوں کا خاندان ہے تو لوگ تصدیق نہیں کرتے تھے کیونکہ اودھ کے شہروں میں ٹانڈہ کپڑوں کے بننے والوں (نوربافوں) کی بستی مشہور تھا اور یہاں کے کپڑے واقع میں بہت امتیازی شان رکھتے تھے۔ ٹانڈہ کی آبادی کا بڑا حصہ اسی برادری کا ہے۔ اس لئے لوگ یہی سمجھتے تھے کہ یہ بھی اسی قوم میں سے ہونگے مگر حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے ایک روز بھرے مجمع میں فرمایا کہ "مدرس تو سید اور پیرزادے ہیں ان کے مورث اعلیٰ شاہ نورالحق رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے اولیاء اللہ میں سے ہیں رات میرے پاس وہ آئے تھے اور مجھ سے کہتے تھے کہ میرے بیٹے حبیب اللہ کا خیال رکھو۔ بھئی یہ تو بڑے پیرزادے ہیں"۔ (حضرت مولانا قدس اللہ سرہٗ العزیز والد صاحب مرحوم کو مدرس کہکر پکارتے تھے) اُسکے بعد سے اون کی نظر التفات مجھ پر بہت زیادہ ہوگئی۔ اور لوگوں کے خیالات میرے نسب کے متعلق بدل گئے اور یہ مقالہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور ہوگیا۔

والد صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ میں نے اوائل عمر میں خواب دیکھا تھا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ایک بڑے تالاب کے کنارے ایک درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی چرخا کات رہی ہیں اور میں اپنے آپ کو بچہ پاتا ہوں اور تالاب کے دوسرے کنارے پر ہوں۔ میں نے دیکھا کہ میں تالاب میں تیرتا ہوا ان کی طرف اس طرح جا رہا ہوں جیسے بچہ اپنی ماں کے پاس جاتا ہے۔ میں خواب ہی میں ان کو ماں سمجھ رہا ہوں۔ اور وہاں پہنچ گیا ہوں۔

ہجرت کرنے کے بعد اُنھوں نے مدینہ منورہ میں اس کو ذکر کیا اور فرمایا کہ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا مطلب تھا۔ میں نے عرض کیا کہ تعبیر تو ظاہر ہے آپ سمندر کے دوسرے کنارے پر تھے ہجرت کرکے مدینہ منورہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس پہونچ گئے۔ نسبی سلسلہ میں وہ ماں ہیں ہی۔

نیز ایک مرتبہ فرمایا کہ مجھکو نسب نامہ کی تلاش تھی تو میں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت امام

(۲)

حسین رضی اللہ عنہ گھوڑے پر سوار جہاد کو جارہے ہیں اور میں ان کے پاس کھڑا ہوا ہوں تو مجھ کو فرمایا کہ تو میری اولاد میں سے ہے۔

بہر حال یہ امور اگرچہ قطعی حیثیت سے تعیین نسب پر روشنی نہیں ڈالتے مگر کچھ نہ کچھ روشنی ضرور ڈالتے ہیں۔

ہماری قدیمی رشتہ داریاں ان اطراف میں محفوظ و مشہور سادات خاندانوں میں یا شیوخ کے ان خاندانوں میں چلی آتی ہیں جو کہ نسبی حیثیت سے بہت اوپر کی چوٹی کے شمار کئے جاتے ہیں۔ رشتہ ایسے خاندانوں میں کبھی نہیں کیا جاتا تھا جنکے سلسلہ نسب میں نجیب الطرفین ہونے میں کبھی کوئی داغ لگا ہو۔ حسب عادت قدیمۂ ہند خاندانوں کی پشتہا پشت کی تحقیقات کی جاتی تھی۔ اگر سلسلہ نسب میں کسی پشت میں کسی عورت یا مرد میں کوئی کمی نسبی معلوم ہو جاتی تھی تو رشتہ نہیں کیا جاتا تھا (حالانکہ یہ بالکل غلط طریقہ ہے۔ سلسلہ نسب آباد اور ذکور سے ہوتا ہے اناث کو اس میں دخل نہیں حضرت امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ ماجدہ حضرت شہر بانو رحمۃ اللہ علیہا شاہان فارس کی اولاد میں سے تھیں اور اسیر ہو کر آئی تھیں، سادات حسینیہ سب انھیں کی اولاد میں اسی طرح اور ائمہ سادات میں بھی یہ بات پائی جاتی ہے۔ شیوخ صدیقیہ اور فاروقیہ وغیرہ میں بھی یہ بات ملتی ہے۔ خود حضرت اسماعیل علیہ السلام جن سے تمام سلاسل عربیہ کا انتساب ہے حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے ہیں جن کے متعلق مشہور یہی ہے کہ وہ باندی تھیں۔ شرفاء اور سادات حجاز جن کو اپنے نسب پر بڑا غرور اور گھمنڈ ہمیشہ رہا ہے اور شاہان ترک ان کا بے حد احترام کرتے رہے ہیں ان میں بہت سے نفوس باندیوں کے بطن سے ہیں۔ یہ چیز ہندوستانی شرفاء کی غلط ہے اور غالباً ہندوؤں کے پڑوس سے پیدا ہوئی ہے۔ ہندوستان میں جو مسلمان باہر سے آئے ہیں عموماً باہر سے عورتیں اپنے ساتھ نہیں لائے۔ یہاں ہی نکاح یا ملک یمین کے ذریعہ سے سلسلہ تناسل جاری کیا۔ پھر بعد میں ایسے تقیدات کہاں تک صحیح کہے جا سکتے ہیں)

قدیمی زمانہ سے ہماری ان سادات یا شیوخ میں بھی رشتہ داری چلی آتی ہے جو کہ شیعہ مذہب رکھتے ہیں اور یہ مرض اودھ کی شیعی حکومت کی وجہ سے تمام یوپی اور بالخصوص اودھ میں بہت زیادہ پھیلا

اور اگر اس زمانہ میں چند اکابر اولیاء اللہ خاندان میں نہ ہوتے تو غالباً ہمارا خاندان بھی اس لعنت سے محفوظ نہ رہ سکتا۔ تاہم آخر میں بغیر اس کے چارہ نہ ہو سکا کہ نانا حسن علی شاہ صاحب مرحوم نے (جو کہ اپنے زمانہ میں تمام خاندانی جایداد کے متولی اور متصرف تھے) ایک امام باڑہ بنایا اور چھ محرم کی شب کو مہندی نکالنا اور بڑے تزک اور احتشام سے تمام شہر میں روشنی اور باجوں کے ساتھ گشت کرانا جاری کر دیا جس کا بقیہ ابتک چلا جا رہا ہے۔ نیز خاندان کے ہر گھرانے میں تعزیہ رکھنا جاری ہوا جو کہ ہمارے بچپن تک چلتا رہا۔ الحمد للہ کہ آہستہ آہستہ اس کی لعنت تمام خاندان سے اُٹھ گئی۔ مگر مہندی کی لعنت ابتک مرتفع نہ ہوئی۔ نیز شیعوں سے رشتہ داری بھی تقریباً بند ہو گئی۔ اگرچہ قدرے قلیل اب بھی باقی ہے۔

نسبی تفاخر اور غرور یقیناً نہایت قبیح مرض ہے جس کے ازالہ کے لئے اسلام نے انتہائی جد وجہد کی ہے۔ بارگاہ خداوندی میں عملی جد وجہد کی ہی پوچھ ہے۔ نسب بغیر عمل صالح اور بغیر اخلاق کاملہ اور عقاید صادقہ کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ اسلام کے نصب العین میں حضرت بلال اور حضرت سلمان اور حضرت صہیب رضی اللہ عنہم کو جو بلندی اور رفعت حاصل ہوئی۔ ابولہب اور ابوجہل امیہ اور ولید کے انساب عالیہ نے اس کا کروڑواں حصہ بھی حاصل نہ ہونے دیا۔ ان سرداران قریش کے غرور نے ان کو دوزخ کا کُندہ بنا کر چھوڑا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ باوجود بُعد نسبی اپنے اخلاص اور سچی قربانیوں کی بنا پر خلیفۂ اول اور صدیق اکبر بنکر حضرت خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پہلو میں مدفون ہوئے۔ مگر حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کو باوجود قرب نسبی کے یہ شرافت حاصل نہ ہوئی۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ افسوس کہ مسلمانان ہند میں ابتک یہ جھوٹا غرور اور غلط گھمنڈ چلا جاتا ہے۔ جس کو اذہان وقلوب سے بالکل ہی چلا جانا چاہئے تھا حضرت قطب العارفین سید احمد صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ صراط مستقیم میں فرماتے ہیں۔

از جملہ بقایائے رسوم جاہلیت کہ دریں امت مرحومہ کمال انتشار وغایت شہرت یافتہ وارباب خاندان عالی مثل سادات وپیرزادہ ہا دران گرفتار اند افتخار بمکارم آبا ومناقب

اجداد است و اعتماد بر شفاعت ایشان حتی کہ بسبب ہمیں افتخار و اعتماد تواضع و انکسار
راکہ شعار اہل اسلام ست و تقوی و صلاح راکہ افضل مناقب اہل ایمان است نسیاً منسیا ساختہ
و بجائے آں تکبر و تجبر و جرات بر اظہار بدعات و ارتکاب منکرات حاصل نمودہ کلام اللہ و کلام
رسول را پس پشت خود انداختہ اند گویا کہ آیۃ لا تنفع الشفاعۃ الا من اذن لہ الرحمن
ورضی لہ قولا: لا تجزی نفس عن نفس شیئا الآیۃ۔ فاذا نفخ فی الصور
فلا انساب بینھم۔ الایۃ یاایھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثی وجعلنا
کم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم الآیۃ تلک امۃ قد
خلت لھا ماکسبت ولکم ماکسبتم الآیۃ

حدیث ان اللہ قد اذھب عنکم عُبیۃ الجاھلیۃ وفخرھا بالآباء انماھو
مومن تقی او فاجر شقی الناس کلھم بنو آدم وآدم من تراب الحدیث وامثال
ازاں گوش ہوش خود گاہے نشنیدہ دبجر اوہام وظنون خود بہ مسلمات و مشہورات باطلہ و امثال
خود تمسک نمودہ در ورطۂ ہلاکت جان خود را انداختہ۔ سبحان اللہ زہے سفاہت و چہے
حماقت کہ اسباب نجات راکہ بالیقین بالقطع موجب نجات و باعث رفع درجات اند
ترک کردہ باسباب وہمیہ وظنیہ متمسک شدند۔ حال سفاہت مآل ایں جہال بداں می ماند کہ
شخصے اموال خطیرہ خود راکہ در قبضہ خود میداشت وانتفاع بآں قطعی و یقینی می انگاشت در
تحصیل حیل اکسیریہ و اعمال دست غیب کہ حصول آں محض موہوم است برباد دہد۔

القصہ اگر ایں علاقہ نسبیہ باکابر از امور نافعہ معاد است پس بر ظاہر است کہ غفلت
ازاں وعدم اعتنا بآں ہیچ وجہ خلال در نفع آں نمیکند۔ چہ علائق نسبیہ از جنس افعال
اختیاریہ نیست تا بسبب غفلت وعدم اعتنا برہم شود پس وقتیکہ شخصے غافل را از
علائق نسبیہ خود در معاد نفعے حاصل خواہد شد البتہ او را بسبب حصول آں نعمت غیر
مترقبہ سرور و ابتہاج دوبالا بدست خواہد آمد مثل حصول فرحت بسبب بدست آمدن

مالے از میراث آبائی خود با وجودیکہ ایں وارث ازاں غافل بود۔ و اگر ایں امر در معاد کار آمدنی نیست و ایں شخص تمام عمر خود را در امید حصول منفعتے ازاں امر گزرانیدہ باشد پس البتہ ندامتے و خجالتے بسبب جہل مرکب خواہد کشید و بانواع آلام نفسانیہ و تعذیبات روحانیہ گرفتار خواہد گردید پس عدم اعتنا بایں علائق نسبیہ و عدم اعتماد بر امثال ایں امور وہمیہ بہر تقدیر احسن و اصوب است والسلام

حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ باوجودیکہ سادات میں سے ہیں دربہت بڑے پیرزادہ ہیں اور تکیہ رائے بریلی کے چوٹی کے مشہور و معروف خاندان سے وابستہ ہیں۔ ان کے اسلاف میں بہت بڑے بڑے اولیاء اللہ گذرے ہیں مگر مذکورہ بالا الفاظ میں کس مؤثر پیرایہ پر اس نسبی افتخار کی شناعت بیان فرماتے ہیں۔ سخت ضرورت ہے کہ اس خیال خام کو دماغ سے نکالدیا جائے اور اپنے اعمال و اخلاق و عقائد کو درست کیا جائے تاکہ کمالات اور قرب خداوندی کی وہ بے بہا نعمتیں حاصل ہوں جن سے نہ صرف نجات حاصل ہوسکے بلکہ تمام خاندان کے لئے دینی اور دنیوی عزت اور افتخار کی شرافت ملے اور پروردگار عالم اپنی رضا اور خوشنودی سے نوازے۔ نسبوں پر فخر کرنے والے نہ صرف عملی میدان میں کسلمند اور لنگڑے ہوتے ہیں بلکہ ان کے اخلاق اور عقائد بھی بگڑ جاتے ہیں۔ جہالت اور بے کمالی کا بھوت، دنیا پرستی اور نفس پروری کا شیطان ان پر سوار ہوجاتا ہے۔ بیہودہ اور غلط اوہام کے اس قدر متوالے ہوجاتے ہیں کہ تمام مسلمانوں حتیٰ کہ اہل علم و تقویٰ کو بھی حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں، ناشائستہ کلمات اور رنجدہ افعال و معاملات سے دوسروں کا سامنا کرتے ہیں۔ جو لوگ نسبی حیثیت سے کچھ کم یا گرے ہوئے ہوتے ہیں خواہ کتنے ہی متقی یا عالم اور پرہیزگار ہوں ان کی توہین و تذلیل میں انتہائی دلیری عمل میں لاتے رہتے ہیں حالانکہ یہ امر اسلامی تعلیمات اور اسلاف کرام کے طریقوں کے بالکل خلاف ہے۔ احادیث میں مسلمان کو دوسرے مسلمان کی تحقیر کرنے سے سختی سے روکا گیا ہے اور اس کی عظمت اور ہمدردی کا زوردار حکم وارد ہوا ہے۔ اہل تصوف تو اس بارہ میں بہت پیش پیش ہیں۔ حضرت سید صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ صراط مستقیم میں فرماتے ہیں۔

حالات ومقامات وفضائل کہ مندرج این رسالہ است ہر کہ متصف بآں شود یا صرف بدریافت
نمی آں بہرہ مند شود اورا لازم است کہ در تعظیم وتکریم عاطلین وغافلین این امور کوتاہی
نکند حسب حال ہر یک حق تعظیم او انماید چہ ہر مسلم از گفتن نام پاک حق جل شانہ
مقصر نیست پس او لائق تعظیمش بجہت تعظیم این نام پاک می باید این نام پاک اسم
جلیل القدر است کہ بمقابلہ آن ہیچ چیز نمی سنجد و ادراک بکنہ کمال آں نمی رسد و اجر و ثوابش
را پایان نیست۔ وثانیاً حال آغاز وانجام خود را ملاحظہ کردہ از رذیلہ تکبر متبری شدہ خفض جناح
نماید چہ ہر کس در بدو خلقت لایعقل محض ونا کارہ محت بود وانجام خود ہیچ کس را معلوم نیست
کہ چہ خواہد شد۔ وثالثاً بلحاظ عموم رحمت وقدرت حضرت حق جل شانہ از رحمت وقدرت
او ہیچ بعید نیست کہ در یک لمحہ انسان را بر تبہ قطب الاقطاب رساند اگر مومن باشد یا کافر را در
یک لمحہ فایز بہ نعمت ایمان فرماید وہمان وقت او را بہ نعمت قطبیت بنوازد۔ رحمت وانعام
او موقوف بر محنت واستعداد نیست بلکہ محنت واستعداد ہم از انعام عام اوست اگر احدے
را مرد و ہو یعنی مومن شدیدہ نعمتے عطا شدہ نہ پندارد کہ عطائے الٰہی بدون این قسم محن ممکن نیست
جائز است کہ بہ ہزار درجہ بہتر ازان در یک لمحہ عطا فرماید۔

حضرت شہید رح کا یہ ارشاد ان لوگوں کے لئے ہے جو کہ مقامات سلوک طے کر کے تصوف اور روحانیت
میں درجہ کمال کو پہونچ چکے ہیں یا علمی کمالات میں بڑا درجہ حاصل کر چکے ہیں ایسے باکمال اشخاص کیلئے
بھی جبکہ یہ حکم ہے کہ عام مسلمانوں کی تعظیم اور تکریم میں کوتاہی روا نہ رکھیں اور حسب مرتبہ ودرجہ ہر ایک کے
ساتھ ادب کا معاملہ جاری کریں۔ کیونکہ

(الف) کوئی مسلمان کم از کم لفظ اللہ اپنی زبان سے نکالنے میں کوتاہی نہیں کرتا خواہ ایک ہی دو مرتبہ ہو اور
یہ لفظ نہایت ہی بڑا مرتبہ رکھتا ہے اور اس کا اجر وثواب بے حد وبے پایاں ہے اس لفظ پاک کی
وجہ سے کہنے والے میں بھی بڑائی اور عظمت آجاتی ہے۔ (ب) ابتدا میں ہر شخص خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو
نطفہ (منی کا قطرہ) پھر علقہ (خون کا جما ہوا قطرہ) پھر مضغہ (گوشت کا ٹکڑہ) پھر بے جان انسانی ڈھانچہ پھر

جان دار ایسا ڈھانچہ تھا کہ اس میں کچھ سمجھ نہ تھی اور چلنے پھرنے بولنے وغیرہ تمام ضروریات زندگی اور اسباب شرف وعزت سے عاجز اور بیکار تھا۔ اور ان تمام باتوں میں تمام انسان برابر ہیں۔ ہر انسان کو اپنی تمام ابتدائی حالتوں کو سوچنا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ ان حالتوں کے ہوتے ہوئے ہمارے لئے فخر و تکبر اور دوسروں کی حقارت کی کوئی گنجائش ہے یا نہیں (ج) انسان کو اپنا انجام سوچنا چاہئے روحانی حیثیت سے خاتمہ ایک عظیم الشان امر ہے جس پر تمام زندگانی اور اس کے اعمال و اخلاق اور عزت و شرافت وغیرہ کا مدار ہے اگر خاتمہ بہتر ہوا تو دنیا کی تمام عمر شرافت اور عزت والی ہے تمام اعمال سوارت ہیں اور اگر خدانخواستہ خاتمہ خراب ہوا تو تمام اعمال اکارت ہوگئے اور شرافت نسبی تو درکنار شرافت انسانی بھی مٹ گئی اور اسفل السافلین میں داخل ہو کر کتے اور سور وغیرہ ذلیل تر حیوانات سے بھی گر گیا اور دوزخ کا کندہ بن گیا۔ مگر اس خاتمہ کا حال کسی کو معلوم نہیں کہ کیسا ہوگا۔ کہیں خدانخواستہ اس مغرور اور گھمنڈی انسان شریف النسب کا خاتمہ برا نہ ہو جائے اور وہ چوپایوں سے بھی بدتر ہو جائے اور کہیں اس شخص کا خاتمہ جس کو یہ رذیل اور ذلیل کہتا تھا بفضلہ تعالیٰ اعلیٰ اور احسن ہو جائے اور وہ اللہ تعالیٰ کے مقربین اور اصحاب نجات میں سے ہو جائے۔ اور جسمانی حیثیت سے بھی مرنے کے قریب جبکہ ہوش و حواس اور عقل و قوت میں فرق آگیا تو کوئی شرف باقی نہ رہا۔ ومنکم من یُرَدُّ الی ارذل العمر لکیلا یعلم من بعد علم شیئا اور روح نکلنے کے بعد تو جسم انسانی خواہ شریف کا ہو یا رذیل کا، بادشاہ کا ہو یا فقیر کا قوی کا ہو یا ضعیف کا جس حالت پر پہونچ جاتا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ جماد محض ہو کر پھولت پھٹتا ہے۔ سڑتا گلتا ہے۔ کیڑے پڑتے ہیں بدبو سخت پیدا ہوتی ہے پیپ اور لہو بہتا ہے اور زمین میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے۔ یہاں نہ شرافت نسبی کچھ فرق کرتی ہے نہ دولت و ثروت نہ حکومت و قوت۔

(د) رحمت اور انعام خداوندی کی بے نیازی اور وسعت اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ دم کی دم میں ذرہ کو پہاڑ اور قطرہ کو سمندر بنا دے تو کچھ تعجب کی بات نہیں۔ عامی مسلمان کو قطب الاقطاب بنا دے جاہل کو عالم اور دیوانہ کو افلاطون کر دے تو کچھ مستبعد نہیں۔ ایک چرواہا جاہل امسیت کردیا واَصْبَحتُ عربیا عالِما کا نعرہ لگانے لگے تو کیا بعید ہے ایک اسی برس کے آتش پرست اور

بتوں کے پجاری کو نعمت ایمان عطا کر کے قطب زمان اور غوث دوران بنا دے تو کچھ دور نہیں ناقابل کو قابل بنانا اور نااہل کو اہل کر دینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ؎

داد حق را قابلیت شرط نیست ٭ بلکہ شرط قابلیت داد ہست

خلاصہ یہ کہ فخر بالانساب جو کہ مسلمانوں میں ہر جگہ اور بالخصوص ہندوستان میں اور بالاخص سادات اور پیرزادوں اور شیوخ میں پایا جاتا ہے نہایت جھوٹا تکبر اور بہت سی خرابیوں کا باعث ہے باوجودیکہ اسلام نے اس کی جڑ کھود ڈالنے میں کوئی کمی نہیں کی مگر بدقسمتی سے اس کا قلع قمع نہیں ہوا بلکہ ہندوستان میں آکر برادران وطن کی دیکھا دیکھی اور بڑھ گیا۔ حقیقی کمال علم و عمل اور عمدہ اخلاق اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں ہی ہے جس کی بناء پر اسلاف کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کو شرف اور امتیاز اپنے ہمعصروں اور اخلاف پر حاصل ہوا تھا ان کی اولاد اور احفاد کو بھی اگر اسلاف کا اتباع اور ویسے اعمال و اخلاق وغیرہ حاصل ہوں تو وہ اسکے مستحق ہیں کہ ان کو خلف صدق اور سپوت کہا جا سکے ورنہ بمثل پسر حضرت نوح علیہ السلام ناخلف اور کپوت ہی شمار ہوں گے۔ ایسے ناخلفوں اور بدکرداروں کو چاہئے تھا کہ ہمیشہ خائف رہیں کہ کہیں ان اسلاف کرام سے بداعمالیوں کی وجہ سے غضب الٰہی سلسلہ نسب اور اس کی شرافت منقطع کرتا ہوا پسر حضرت نوح (علیہ السلام) کی طرح انہ لیس من اھلک انہ عمل غیر صالح کا اعلان نہ کر دے اور اسلاف کرام کی برکتوں سے محرومیت کا عذاب الیم نہ چکھا دے۔ اُلٹے یہ لوگ کبر اور غرور بلکہ دوسروں کی تحقیر و تذلیل و توہین و تحمیق میں منہمک ہو گئے ہیں۔ ان لوگوں کی ایسی حرکات ناشائستہ کی وجہ سے صرف یہی نہیں ہوتا کہ غریب مسلمانوں اور پیشہ ور مسلم برادیوں اور نومسلم خاندانوں کے دل اور دماغ پر سنگین اور دلخراش ٹھیس لگتی ہے بلکہ اشاعت اسلام اور اس کی ہمہ گیری میں بھی فرق پڑتا ہے۔ اسلامی اصول اور اس کا تفوق چکنا چور ہوتا ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے حجاب بنتو ہیں۔ امت مرحومہ کی زیادتی میں روڑے اٹکتے ہیں جس کی اسلامی تعلیمات میں انتہائی ممانعتیں وارد ہیں۔ والعیاذ باللہ۔

انہیں وجوہ سے مجھکو بہت ڈر لگتا ہے اور شرم معلوم ہوتی ہے کہ موجودہ اعمال و اخلاق اور اس

کم مائگی پر سید یا پیرزادہ اپنے کو کہوں یا لکھوں اور اپنے اس نسب پر فخر کروں ۔ مگر اس میں بھی چونکہ شک نہیں ہے کہ غیر اختیاری نعماء الہیہ میں سے یہ بھی ایک بہت بڑی نعمت ہے یعنی جیسے کہ انسان کا پیدا ہونا ، تمام اعضاء کا صحیح وسالم ہونا ، خوبصورتی اور اعضاء کا تناسب ، ذکاوت اور حافظ وغیرہ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں میں سے ہیں جنمیں بندہ کے اختیار اور ارادہ کو کوئی دخل نہیں ہے اور ان پر بندہ کو ہمیشہ شکر گذار رہنا چاہئے اور تحدث بالنعمۃ کرنا اور دل میں سوچنا اور اللہ تعالیٰ کو شکر گذاری سے خوش کرنا چاہئے ۔ اسی طرح یہ شرافت نسبی بھی ایک غیر اختیاری نعمت اور عطیہ خداوندی ہے اس پر شکر گذاری کرنا اور حسب ارشاد واما بنعمۃ ربك فحدث تحدیث کرنا ضروری ہے اس لئے اس مقام پر رسالہ ہذا میں یہ ذکر کیا گیا ۔

حضرت شہید رحمۃ اللہ علیہ صراط مستقیم میں فرماتے ہیں ۔

فائدہ ! باید دانست کہ در جوہر اولاد کرما استعدادے مکنون بطریق میراث از آبائے کرام ایشاں ودیعت می نہند لیکن آں محض استعداد در ہیچ یکے از امور معاشیہ ومعادیہ کار آمدنی نیست ۔ آرے اگر ہماں استعداد بر روئے کار آید وبسبب تعلیم وتعلم وتشریع وتدین جلوہ گر شود البتہ مظہر امور عظیمہ ومصدر منافع جلیلہ خواہد شد وایں استعدادات مکنونہ را مشابہ استعدادات ازلیہ کہ نصیبہ ہر شخص در ازل الآزال استعدادے از استعدادات صالحہ یا فاسدہ گردیدہ باید فہمید اما بنائے مجازات بر محض آن استعدادات نیست لہذا مادامیکہ آثار آن استعداد بر منصہ ظہور نہ رسد در کارخانہ مجازات ہیچ اعتداد بآں استعداد نہ ۔ آرے ایں قدر یقینی است کہ بسبب مصادفت اسباب ہدایت وضلالت آثار صلاح وفساد فراخور استعداد ظہور می نماید پس ترتب ثمرات بالفعل بر آثار است اگرچہ ارتباطے اخفی باستعدادات ہم میدارد ولیکن ارتباط ثمرات باستعدادات بس خفی وکثیر التخلف است وبآثار بر ظاہر وقلیل التخلف مثلاً منافع حرب بآلات آں ارتباط ظاہر میدارد وبجوہر حدید ارتباطی خفی ۔ لہذا شمشیر پولادی زنگ خوردہ آں کار نمی کند کہ شمشیر مصقل از آہن خام ۔

خلاصہ یہ ہے کہ اہل کمال کی اولاد میں ایسے جوہر قدرۃً رکھتی ہے کہ اگر ان جواہر اور قابلیتوں کو کام میں لایا جائے تو بڑی سے بڑی کامیابیوں اور جلد سے جلد منزل مقصود پر پہونچنے کی نوبت آئے اور اگر اُن استعدادوں اور قابلیتوں کو کام میں نہ لایا جائے تو جس طرح وہ ہاتھ اور وہ پیر بالکل بیکار ہو کر رہ جاتا ہے جسکو پکڑنے اور چلنے سے معطل کر دیا گیا ہو اور جس طرح سے فولادی تلوار زنگ کی وجہ سے آہستہ آہستہ فنا ہو جاتی ہے اسی طرح ان ارباب کمال کی اولاد بھی بے علمی اور بدعملی کی وجہ سے نہ صرف کمال سے محروم رہ جاتی ہے بلکہ بسا اوقات شرف انسانیت سے بھی محروم ہو جاتی ہے اس لئے شریف خاندانوں کا فرض اکمل یہ تھا کہ وہ میدان علم و عمل میں بہت زیادہ جد وجہد کریں تاکہ ان کا ذاتی جوہر زنگ کھا کر فنا نہ ہو جائے اور ان کو حسب وعدۂ یقینی "والذین امنوا واتبعتھم ذریتھم بایمان (الآیۃ) اپنے اسلاف کرام کی ہمرکابی اور ہم مکانی نصیب ہو اور یا اتباع اسلاف باوجود قلتِ عمل اسلاف کے درجات عالیہ تک پہونچانے کا ذریعہ بن سکے۔ واللہ ولی التوفیق۔

ذریعہ معاش خاندان

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے وقت میں خاندان کے پاس تیرہ یا چودہ گانوں تھے جن کی وجہ سے مشترکہ خاندان نہایت ثروت اور رفاہیت سے گذران کرتا تھا۔ مشہور ہے کہ تخت دہلی سے کسی زمانہ میں بہتّر دیہات کی جاگیر ان اطراف میں تین خاندانوں پر تقسیم ہوئی تھی جن میں سے ایک الہداد پور کا ہمارا خاندان بھی تھا جس کو چوبیس گانوں دئے گئے تھے۔ چونکہ کاغذات ضائع ہو گئے اس لئے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ عطیہ کس پادشاہ کے وقت میں ہوا تھا اور کس وجہ سے ہوا تھا۔ والد صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ بادشاہ دہلی کے یہاں پرچہ گذرنے پر مصارف خانقاہ کے لئے یہ دیہات دئے گئے تھے (واللہ اعلم)

۱۸۵۷ء میں خانقاہ وغیرہ کے کوئی آثار باقی نہ تھے۔ اور ان میں مالکانہ تصرفات اہل خاندان کے جاری تھے۔ اور اس سے پہلے گیارہ گانوں غیر معلوم انقلابات اور اسباب کی بنا پر قبضہ و اقتدار سے نکل چکے تھے۔ انگریزی حکومت کے زمانہ میں جو قدر و منزلت زمینوں اور جائیدادوں کی

بڑھ گئی ہے وہ بلکہ اس کا عشرِ عشیر بھی زمانہ سابق میں نہ تھا، معمولی ضرورتوں میں زمینوں کو فروخت کر دینا رہن رکھ دینا بلکہ دوسروں کو بخشدینا معمولی خدمتوں کے صلہ میں گانوں کا گانوں ہبہ کر دینا وغیرہ وغیرہ مسلمانوں اور بالخصوص مسلم رؤسا کا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ غرضیکہ انہیں وجوہ کی بناء پر صرف تیرہ گانوں باقی رہ گئے تھے۔ الہداد پور، جڑادن پور، چاند پور، گوبھردن پور، مہری پور، فرید پور، رسول پور، بھکنا پور وغیرہ

اس زمانہ میں انتظام زمینداری اکبر علی صاحب مرحوم میرے حقیقی نانا کے ہاتھ میں تھا، ۱۸۵۶ء کے آخری ایام میں جبکہ وہ ضلع بستی کے بعض دیہات سے واپس ہوتے ہوئے دریائے گھاگھرا کو کشتی میں عبور کر رہے تھے اور متعلقین کو دوسری کشتی میں اس سے پہلے بھیج چکے تھے آندھی چلی اور کشتی منجدھار میں اُلٹ گئی تو وہ اس حالت کو دیکھ کر تلوار لیکر دریا میں کود پڑے۔ تیر کر دریا کو پار کرنا چاہا مگر پانی زور پر تھا اس لئے ڈوب گئے۔ اس کے بعد ہر قسم کی کوشش بچانے کی کی گئی مگر ڈوبنے سے بچنا تو درکنار لاش تک کا پتہ نہ چلا۔ مرحوم سے بھیٹی کے راجہ سے عداوت اور سخت دشمنی تھی اس نے موقع پاکر مکان پر حملہ کر دیا اور چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اس کا مطالبہ یہ تھا کہ اکبر علی صاحب مرحوم کے لڑکوں کا سر لوں گا۔ مرحوم کے تین لڑکے تصدق حسین، تفضل حسین عبد الغفور اور لڑکی (والدہ ماجدہ مرحومہ) تھے۔ یہ بچے نو عمر تھے۔ چونکہ اس وقت امن کامل طور پر نہ ہوا تھا اور گانوں میں اتفاقات وقت سے کوئی بااثر قوی ہستی جو کہ راجہ اور اس کے سپاہیوں کا مقابلہ کرتی موجود نہ تھی عورتوں نے یہ احساس کر کے کہ مبادا یہ دشمن بچوں کو قتل نہ کر دے، رات میں خادمات کا بھیس بدل کر بچوں کو لیکر شہر ٹانڈہ محلہ قصبہ میں جو کہ گانوں سے بہت قریب تھا چلی گئیں۔ وہاں قرابت داری پہلے سے تھی۔ شہر میں راجہ کا حملہ کرنا ممکن نہ تھا۔ جب راجہ کو گھر خالی معلوم ہوا تو تمام اسباب اور سامان کو لوٹ لیا۔ ایک مہینہ تک گاڑیوں میں لوٹ کا مال نقل کرتا رہا۔ اور ان دیہات پر قبضہ کر لیا جو کہ زیر تصرف تھے۔ صرف دو گانوں جڑادن پور اور الہداد پور اس کے قبضہ سے محفوظ رہ گئے۔ انہیں دو میں مختلف ورثا خاندان کے حصے ہوئے۔ بڑے ہو کر ہمارے ماموؤں نے

ان دیہاتوں کے لئے دیوانی میں دعوے دائر کئے مگر قلت سرمایہ اور دیوانی کے مصارف کی کثرت کی وجہ سے ایک مالدار زمیندار راجہ بھیٹی کا مقابلہ نہ کر سکے۔ بلکہ بقیہ زمینداری سے بھی ہاتھ دھونا پڑا کیونکہ مصارف مقدمہ کے لئے اپنے حصوں کو مہاجنوں کے یہاں رہن کر چکے تھے اور امید رکھتے تھے کہ کامیاب ہو کر رہن شدہ زمینوں کو چھڑا لیں گے۔ قرضہ سودی تھا اس سے خلاصی ناممکن تھی۔ نہایت تنگی اور افلاس سے سب کی بسر اوقات ہوتی تھی۔ مدار آمدنی پیری مریدی اور نذرانہ کی آمدنیوں پر رہ گیا۔ ہر دو مذکورہ بالا گانوں میں دادا مرحوم کا حصہ دو آنے آٹھ پائی تھا والد مرحوم جبکہ بانگرمؤ سے تبدیل ہو کر ٹانڈہ پہونچے ہیں تو یہ حصہ بھی مہاجنوں کے یہاں مرہون تھا فقط سیر کی زمین باقی تھی جس میں ہمارے تایا اشرف علی صاحب مرحوم زراعت کرتے تھے۔

والد صاحب مرحوم کی پیدائش اور تربیت

والد صاحب مرحوم الہدادپور ہی میں ۵۷ء سے چار پانچ برس پہلے پیدا ہوئے ۵۷ء میں ان کو ہوش و حواس تھا اور اس سے پہلے کی رفاہیت اور یہ کہ انکے لئے مٹکے لڈوؤں وغیرہ سے بھرے رہتے تھے یاد تھے۔ دادا صاحب مرحوم تین بھائی تھے پیر علی، نوازش علی، تیغ علی (رحمہم اللہ تعالیٰ)

نوازش علی اور تیغ علی مرحومین لاولد تھے۔ صرف پیر علی مرحوم صاحب اولاد ہوئے۔ چونکہ منجھلے دادا تیغ علی مرحوم اور انکی اہلیہ مرحومہ کو اولاد کا بہت شوق تھا، اس لئے جبکہ دادا مرحوم کے منجھلے بیٹے نجیب اللہ پیدا ہوئے تو انھوں نے اُن کو متبنیٰ بنایا اور گود لے لیا مگر قضا ر الٰہی سے اُن کی عمر نے وفا نہ کیا اور بچپن ہی میں انتقال کر گئے۔ اس کا اثر سب پر بہت ہوا۔ اُس کے بعد جب والد صاحب مرحوم پیدا ہوئے تو دادا صاحب مرحوم نے زور دیا کہ اب اس بچہ کو لیلو وہ تامل کرتے تھے مگر اُن کو مجبور کیا گیا بالآخر اُنھوں نے والد صاحب مرحوم کو لیلیا اور دونوں میاں بیوی (مرحومین) نے نہایت محبت اور شفقت سے والد صاحب مرحوم کو پالا۔ تقدیر الٰہی نے ایسی پلٹی کھائی کہ [illegible] تک تینوں بھائی (دادا مرحومین) انتقال کر گئے۔ گھر میں سوائے عورتوں

اور بچوں کے کوئی مربی صاحب اثر باقی نہ رہا۔ زمینداری اور ثروت چھن گئی۔ افلاس اور ادبار نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ منجھلی دادی مرحومہ نے نہایت تنگدستی کی حالت میں پرورش کیا۔ میں نے ان کو بچپن میں دیکھا ہے فرمایا کرتی تھیں کہ میں نے چرخے کات کات کر حبیب اللہ کو پالا ہے۔

والد صاحب مرحوم نے فضل و کرم خداوندی سے ذہن اور حافظہ بہت عمدہ پایا تھا۔ طبیعت نہایت تیز اور مستقیم تھی اس یتیمی اور افلاس کی حالت میں ٹانڈہ میں مواقع علم میں پہنچتے رہے۔ اور قرآن شریف فارسی اور اسکول اردو میں مڈل کلاس پاس کر لیا۔ اور عنفوان شباب ہی میں ٹانڈہ کے قریب ہی پرائمری اسکول التفات گنج میں ۸؎ روپیہ ماہوار پر مدرس ہو گئے۔ اس ملازمت کی بنا پر کسی قدر بسر اوقات کی سہولتیں پیدا ہو گئیں۔ کاش اگر اس زمانہ میں کوئی مربی تکفل کرنے والا ہوتا تو وہ اپنی تعلیم میں بہت بڑی ترقی کر سکتے۔ التفات گنج ہی میں ان کو بطور خود ترقی کا خیال پیدا ہوا۔ تنخواہ اور ملازمت میں ترقی بغیر نارمل اسکول پاس کئے نہیں ہو سکتی تھی اس لئے ان کو لکھنؤ جانا پڑا۔ اس زمانہ میں تمام صوبہ میں نارمل اسکول صرف لکھنؤ میں تھا۔ وہاں پہنچکر طبعی ذکاوت کی بنا پر بہت جلد عمدہ طریقہ پر کامیاب ہوئے۔ اور پاس ہوتے ہی قصبہ صفی پور ضلع اناؤں میں ہیڈ ماسٹر ہو گئے اور پھر بانگرمؤ میں تبدیل کر دئے گئے اور وہاں متواتر کئی برس تک مقیم رہے۔ اسی تنگی اور افلاس اور فکر معاش کی وجہ سے علوم عربیہ حاصل نہیں کر سکے۔ اگرچہ لوگ اُن کو مولوی کہتے تھے مگر وہ علوم عربیہ سے بالکل ناواقف تھے۔ صرف فارسی، اردو، ہندی، بھاشا سے واقف تھے اور اسکول میں تدریسی مشغلہ کرتے تھے۔ اس زمانہ میں ایسے لوگ مولوی کہے جاتے تھے۔

نارمل پاس کرنے کے بعد انگریزی بعض احباب کی ترغیب سے شروع کی مگر شروع کرنے کے بعد پہلی ہی شب میں خواب میں دیکھا کہ دونوں ہاتھ پاخانہ سے ملوث ہیں۔ اس کی وجہ سے ان کو انگریزی سے نفرت ہو گئی۔ اور ملازمت کی کوشش کر کے کامیاب ہو گئے۔

والد صاحب مرحوم کی شادی

جبکہ والد صاحب مرحوم اٹھارویں سال کی عمر میں تھے اور التفات گنج میں پرائمری اسکول میں ملازم تھے بھلی دادی صاحبہ مرحومہ نے ضروری سمجھا کہ شادی کر دی جائے۔ پہلے گذر چکا ہے کہ نانا اکبر علی صاحب مرحوم جائداد کے متولی و متصرف تھے۔ اور ۱۸۷۵ء میں دریائے گھاگھرا میں ڈوب گئے تھے۔ تین لڑکے نوعمر اور ایک لڑکی (والدہ صاحبہ مرحومہ) چھوڑ گئے تھے والدہ صاحبہ مرحومہ ان کی وفات کے وقت چھ مہینہ کی تھیں ان سب بچوں کی پرورش یتیمانہ طریقہ پر نہایت تنگدستی سے ہوئی۔ کیونکہ باقیماندہ زمینداری کی آمدنی بہت کم تھی اور کوئی بڑی عمر والا نہیں تھا۔ نانی صاحبہ مرحومہ بہت منتظم اور تعلیمیافتہ تھیں۔ انھوں نے فارسی اردو وغیرہ بچوں کو حسب رواج وقت پڑھائی۔ دادی صاحبہ مرحومہ نے کوشش بلیغ کی کہ رشتہ خاندان ہی میں ہو جائے چنانچہ وہ کامیاب ہوگئیں اور جبکہ والدہ مرحومہ کی عمر چودہ برس کی تھی شادی ہوگئی۔ سب سے بڑے بھائی محمد صدیق صاحب مرحوم الہداد پور ہی میں ۱۳۰۳ھ میں پیدا ہوئے۔

نانی صاحبہ مرحومہ موضع نندرولی علاقہ بیکاپور ضلع فیض آباد کے سادات خاندان میں سی تھیں اُن کے ماموں بہت بڑے کامل ولی اللہ اور صاحب علم تھے، انھوں نے نانی صاحبہ کی تربیت فرمائی تھی، علاوہ ہندی اردو لکھنے پڑھنے کے نانی صاحبہ طریقت اور تصوف میں باکمال تھیں۔ کشف قبور وغیرہ میں انکو مہارت تامہ تھی، ریاضات شاقہ اور ذکر و اذکار وغیرہ میں بہت زیادہ جد و جہد فرماتی تھیں انھوں نے والدہ مرحومہ کو بھی اردو، ہندی، پڑھایا اور ہندی لکھنا بھی سکھایا۔ اور ہندی بھاشا میں ہنس جواہر، پدماوت وغیرہ کتابیں بھی پڑھائی۔ تصوف کا چسکہ بھی پیدا کرادیا جو کہ حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب گنج مراد آبادی قدس اللہ سرہ العزیز سے بیعت ہو جانے کے بعد اور بھی زیادہ ہوگیا۔ چنانچہ باوجود کثیر الاولاد ہونے کے وہ ہمیشہ شب خیز اور تہجد گذار رہیں۔ اخیر شب میں اٹھکر صبح تک ذکر و شغل مناجات وغیرہ میں مشغول رہتی تھیں، ان کا اخیر تک معمول رہا کہ روزانہ دو سو مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھ کر جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ہدیہ کرتی تھیں۔ امور خانہ داری میں

اخیر تک نہایت جفاکش تھیں۔ مدینہ منورہ میں پہونچنے کے بعد عسرت اور تنگدستی کی بناء پر اپنے گھر کا آٹا خود پیسنا پڑتا تھا۔ حالانکہ کبھی ہندوستان میں اس کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ مگر اس پیرانہ سالی میں روزانہ ایک طرف خود اور دوسری طرف تینوں بہوؤں میں سے ایک کو باری باری بٹھلا کر آٹا پیسا کرتی تھیں۔ ان کی محبت بھی اولاد سے عاقلانہ تھی، اولاد کو تعلیم کے لئے جدا کرنے میں انھوں نے کبھی پس و پیش نہیں کیا۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کا اُن کو بہت خیال تھا اور بچپن ہی سے مذہبی جذبات اور اخلاقی اصلاح کی تعلیم و تربیت کہانیوں اور چٹکلوں وغیرہ میں خیال کرتی تھیں۔ مرحومہ کا سلسلہ نسب حسب ذیل ہے۔

بنت اکبر علی بن مخدوم بخش بن تراب علی شاہ مدن (مرحومین) شاہ مدن مرحوم کے تین لڑکے تھے تراب علی، ہدایت اللہ، نور اشرف، نور اشرف مرحوم کی اولاد میں والد صاحب مرحوم تھے اور تراب علی مرحوم کی اولاد میں والدہ صاحبہ مرحومہ اور ان کے تین بھائی تصدق حسین، تفضل حسین عبدالغفور، جن میں سے عبدالغفور مرحوم لاولد فوت ہوئے اور اول الذکر ہر دو صاحبوں کی اولاد موجود ہے۔ شاہ مدن صاحب مرحوم کے تیسرے صاحبزادہ ہدایت اللہ لاولد فوت ہوئے۔

والدہ صاحبہ مرحومہ ۱۳۲۲ھ میں مدینہ منورہ میں فوت ہو کر بقیع شریف میں مدفون ہوئیں۔ اُن کے بعد والد صاحب مرحوم نے ضروریات خدمت کی وجہ سے متعدد نکاح کئے مگر وہ راحت حاصل نہ کر سکی جس کی ضرورت اور خواہش تھی۔ والدہ مرحومہ بہت زیادہ صاحب نصیب تھیں جب سے شادی ہوئی مال اور اولاد کی ترقی گھر میں ہوتی رہی۔ اگرچہ بعض چھوٹی اولاد نے ان کے سامنے انتقال کیا مگر جوان اولاد کی جدائی کا صدمہ اور کثرت سے اولاد کے مرنیکا صدمہ اُن کو نہیں پیش آیا۔

والد صاحب مرحوم نے بانگرمؤ سے قصداً کم تنخواہ پر تبدیلی کرائی کیونکہ جو کچھ حصہ جائداد کا تھا وہ بھی ضائع ہو رہا تھا۔ تائے صاحب مرحوم اس کو رہن سے نہ واگذاشت کرا سکتے تھے اور نہ متغلب شرکاء کے جور و ستم سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ والد صاحب مرحوم نے ٹانڈہ پہونچکر ٹوڈہن پر قرض لیا اور جائداد مرہونہ کو واگذاشت کیا اور چھ سات برس میں قرض بھی جائداد کی آمدنی سے

ادا کر دیا۔ پھر تقسیم حصص کی درخواست دیکر تقسیم کرایا۔ اس طرح تائے صاحب مرحوم اور ان کی اولاد کے لئے بھی بہت آسانیاں ہوگئیں اور خود والد صاحب مرحوم کو بھی زمینداری سے منافع حاصل کرنے کا موقعہ ملا۔ اور بغیر قرض دام کے اولاد کی تقریبیں وغیرہ انجام دے سکے۔

والد صاحب مرحوم کی اولاد

اُن کے پانچ لڑکے اور تین لڑکیاں پیدا ہوئے۔ مولانا[1] محمد صدیق صاحب مرحوم سب سے بڑے لڑکے تھے۔

۱۲۸۸ھ میں بمقام الہداد پور پیدا ہوئے اور ۱۳۱۳ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پاکر بقیع شریف میں مدفون ہوئے۔ اُن سے اولاد ذکور واناث متعدد ہوئیں، نکاح بھی متعدد ہوئے مگر اُن کے بعد صرف ایک لڑکا مولوی وحید احمد مرحوم زندہ رہا جو کہ صاحب اولاد ہوکر ٹانڈہ الہداد پور میں متوفی ہوا۔ تین لڑکے اور دو لڑکیاں چھوڑیں بفضلہ تعالیٰ سب زندہ ہیں۔ فرید احمد، رشید احمد، سعید احمد سلمہم اللہ تعالیٰ۔ صفیہ عرف (نیترہ) اور رضیہ سلمہا اللہ تعالیٰ۔ مولانا[2] سید احمد صاحب مرحوم ۱۲۹۳ھ میں بمقام بانگر مئو پیدا ہوئے اور غالباً ۱۳۵۸ھ ماہ شوال میں یا ۱۳۵۹ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی اور بقیع میں مدفون ہوئے باوجود متعدد نکاحوں اور متعدد اولاد ذکور واناث کے سوائے ایک لڑکی کے کوئی اولاد نہیں چھوڑی، مرحوم نے مدینہ منورہ میں مدرسہ شرعیہ کی بنیاد ڈالی جس کا نام مدرسۃ العلوم الشرعیہ لیتامی المدینۃ النبویہ رکھا۔ چونکہ حکومت وقت نے علوم جدیدہ کے لئے بالخصوص جنگ عظیم کے بعد متعدد مدارس قائم کردیئے تھے اور علوم شرعیہ کی طرف سے بہت بے توجہی کردی تھی۔ ترکی حکومت کے زمانہ میں جس قدر بھی توجہ علوم شرعیہ کی طرف باقی تھی وہ بھی باقی نہیں رکھی گئی تھی اس لئے اہل مدینہ منورہ کے بچے نہایت ضایع اور علوم دینیہ سے بالکل بیگانہ ہو رہے تھے۔ اس ضرورت کو محسوس کر کے یہ مدرسہ قائم کیا اور باہمت اہل خیر ہندوستانیوں نے امداد واعانت کی۔ اس لئے اس مدرسہ سے فیض بہت ہوا۔

ہر دو بھائی مرحومین دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے۔ دیوبند جانے سے پہلے اردو مڈل اسکول میں بہت اعلیٰ درجہ میں پاس ہوچکے تھے اور قرآن شریف اور فارسی کی تعلیم والدین

مرحومین سے حاصل کر چکے تھے۔ بڑے بھائی صاحب مرحوم کو بارگاہ رشیدی رقدس اللہ سرہٗ العزیز سے خلافت اور اجازت عطا کی گئی تھی اور بھائی سید احمد صاحب مرحوم کئی برس خانقاہ میں مقیم اور شرف خدمتگذاری حاصل کرتے ہوئے ذاکر و شاغل رہے مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے شرف اجازت حاصل نہ ہوا بعد میں حضرت شیخ الہند اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب (رحمۃ اللہ علیہما) نے اجازت عطا فرمائی۔ مدینہ منورہ میں ہر دو صاحب علوم دینیہ کی تدریس بھی کرتے رہے۔

جمیل احمد مرحوم ذیقعدہ ۱۳۰۲ھ ہجری میں الہداد پور میں پیدا ہوئے عربی درسیات کی متوسطانی کتابیں پڑھتے تھے کہ والد صاحب مرحوم نے ہجرت کی مدینہ منورہ میں پہنچکر ترکی مدرسہ رُشدیہ میں داخل کر دیا۔ چونکہ طبیعت نہایت ذکی تھی اور فنون عربیہ میں اچھی استعداد حاصل کر چکے تھے بہت تھوڑی مدت میں عمدہ ترقی کی اور ہر درجہ میں سب لڑکوں سے اول نمبر رہنے لگے۔ باش صنف کا تمغہ ان کو دیا گیا اور اساتذہ کی خصوصی توجہ منعطف ہوئی، اور جب مدرسہ رُشدیہ کے سب درجوں کو ختم کر چکے تو حکومت ترکیہ کے مصارف سے تمام جماعت فارغہ کو استنبول بھیجا گیا جن میں باش صنف مرحوم ہی تھے۔ اُس وقت گورنر مدینہ عثمان پاشا تھا اور زمانہ سلطان عبدالحمید خاں کا تھا۔ اس جماعت کے بھیجنے کے وقت میں عثمان پاشا مرحوم نے خصوصی تزک اور احتشام کیا اور باب عالی میں بذریعہ تار اطلاع دی۔ سلطان عبدالحمید خاں مرحوم کے حکم سے مدینہ منورہ کے لڑکے ہونے کی بنا پر استنبول میں ان کا خصوصی استقبال ہوا اور تزک و احتشام سے جہاز سے اُتارے گئے۔ اور پھر خصوصی توجہات کے ساتھ مدرسہ اعدادیہ میں داخل کر دئے گئے پہلے ہی سال کے امتحان میں مرحوم وہاں بھی تقریباً ڈیڑھ سو طلبہ سے اول نمبر ثابت ہوئے جس کی وجہ سے وہاں کے حکام اور اساتذہ کی بہت زیادہ توجہ ان کی طرف مبذول ہوئی۔ مگر تقدیرات الٰہیہ نے مساعدت نہیں کی، دوسرے سال میں مرض دق میں مبتلا ہو گئے۔ کئی مہینہ بیمار رہے ہر قسم کا علاج کیا گیا مگر افاقہ نہ ہوا بالآخر مدینہ منورہ واپس آ کر کچھ دنوں بیمار رہ کر نوجوانی کی عمر میں وفات پائی اور مدینہ منورہ میں بقیع شریف میں مدفون ہوئے والد صاحب مرحوم کو اس کا زیادہ صدمہ ہونا طبعی امر تھا۔

محمود احمد سلمہ اللہ تعالیٰ ۱۳۰۳ھ شوال میں الہداد پور میں پیدا ہوئے۔ ہجرت کے وقت آٹھ برس کی عمر تھی معمولی اردو وغیرہ پڑھتے تھے۔ مدینہ منورہ میں ان کو بھی ترکی مدرسہ میں داخل کر دیا گیا۔ جملہ درجات میں کامیابی کے بعد عثمان پاشا مرحوم نے ان لڑکوں کو جو کہ درجہ علیا میں پاس کر چکے تھے استنبول نہیں بھیجا بلکہ مختلف اداروں میں بطور امیدوار داخل کر دیا۔ چنانچہ عزیزم محمود احمد سلمہ کو محکمہ قضاء میں داخل کیا جس میں انھوں نے بہت جلد ترقی کی اور تھوڑے ہی دنوں میں باضابطہ تنخواہ دار صنف اہل تحریر میں ملازم ہو گئے۔ جنگ عظیم کے بعد زمانہ حکومت شریف حسین میں باش کاتب یعنی میر منشی ہو گئے۔ اور زمانہ حکومت سعودیہ میں جدہ کے قاضی بنا دئے گئے مگر چونکہ جدہ میں باوجود کئی سال رہنے کے وہاں کی ہوا موافق نہیں آتی تھی، حکومت سے مدینہ منورہ کی تبدیلی کی درخواست کی مگر کامیاب نہ ہونے کی وجہ سے استعفا دیکر مدینہ منورہ میں مشاغل تجارت اختیار کر لئے جس کی ابتدا انھوں نے ملازمت قضاء کے وقت سے شروع کر دی تھی۔ جرمنی سے آبپاشی کی مشینیں منگا کر مدینہ منورہ میں باغوں والوں کو پہونچاتے تھے اور ایک کارخانہ اُن کی درستی اور اوزاروں وغیرہ کا بھی کھولا جس میں ان کو اچھی آمدنی ہوئی۔ چونکہ ایام ملازمت میں حکومت وقت کو ان کی استعداد و قابلیت بہت زیادہ اطمینان بخش ثابت ہوئی تھی اور پبلک کو کسی قسم کی ان کی شکایتیں بھی نہیں ہوئیں۔ اس لئے حکومت مدینہ منورہ متعدد مہم محکموں میں ان کا وجود ضروری سمجھتی رہتی ہے۔ اور ان کو بلامعاوضہ اور بعض میں بالمعاوضہ ممبر بنا رکھا ہے۔ بحمد للہ کامیابی سے بسر اوقات کر رہے ہیں۔ ایک لڑکا حبیب اللہ جوان اور چند لڑکیاں ہیں۔ حبیب اللہ موصوف ہی اس وقت مدرسہ شرعیہ کا مہتمم اور نگراں ہے۔

والد صاحب مرحوم کے تین لڑکیاں ہوئیں، ایک لڑکی زینب ۱۲۹۹ھ ہجری میں الہداد پور میں پیدا ہوئی اور تین چار برس زندہ رہکر وفات پاگئی۔ دوسری لڑکی نسیم زہرا ۱۳۰۱ھ ہجری میں پیدا ہوئی اور وہ بھی سال ڈیڑھ سال کی ہو کر وفات پاگئی۔ تیسری لڑکی ریاض فاطمہ مرحومہ ۱۳۰۵ھ یا ۱۳۰۶ھ میں پیدا ہوئی اور ۱۳۳۱ھ میں ایک بچی چھوڑ کر مدینہ منورہ میں متوفی ہوئی اس کی بچی بھی کچھ دنوں کے بعد وہاں ہی وفات پاگئی دونوں بقیع شریف میں مدفون ہوئے۔

-والد صاحب مرحوم کی موجودگی میں مدینہ منورہ میں ان کے خاندان سے تقریباً تینتیس یا پینتیس نفوس مرے اور وہیں مدفون ہوئے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

والد صاحب مرحوم کی تعمیر آستانہ ہندوستان

جدی مکان میں تائے صاحب کی کثرت اولاد اور پھر والد صاحب کی کثرت اولاد وغیرہ کی وجہ سے نیز دوسرے رشتہ داروں کی شراکت کی وجہ سے بھی ضروری معلوم ہوا تھا کہ مستقل مکان بنائیں۔ چنانچہ بزمانہ قیام بانگرمئو مکان کی بنیاد رکھی اور تنخواہ کا بڑا حصہ اس میں صرف کرتے رہے اور اپنے آپ نہایت تنگی سے بسر کرتے رہے۔ حتی کہ مہینوں صرف چنوں کے چبالینے پر وقت گذارا الحمد للہ مستقل مکان وسیع اور راحت پہونچانے والا بنوالیا۔ اگرچہ خام اور کھپریل ہی کا تھا مگر وسیع اور بہت کارآمد تھا۔ ٹانڈہ پہونچنے کے بعد اس میں اور بھی وسعت کر لی گئی۔

والد صاحب مرحوم کی ہجرت مدینہ منورہ

ٹانڈہ کے قیام میں حسن انتظام کی بنا پر زمین بھی رہن سے خلاص کر لی گئی تھی اور تقسیم بھی مشترک حصہ داروں سے کرالی گئی تھی اور اطمینان سے آمدنی بھی جائداد کی جاری ہوگئی تھی اور بغیر مقروض ہوئے اولاد کی تقریبیں عقیقے، ختنے، شادیاں انجام پاتی رہیں۔ واقعہ یہی ہے کہ والدین مرحومین کا حسن انتظام ہی تھا کہ اس تھوڑی تنخواہ میں اور معمولی زمین میں وہ سپید پوشی کے ساتھ کثیر الاولاد گھرانہ کا روزمرہ کا خرچ، تعلیمی اخراجات، تقریبیں پوری کرتے رہے حالانکہ کسی قسم کی بیرونی آمدنی نہ تھی۔ اول تو اسکول کے ہیڈ ماسٹر کو بیرونی آمدنی کا موقعہ ہی نہیں ہوتا دوسرے یہ کہ والد صاحب مرحوم نہایت زیادہ متشرع تھے کسی ناجائز آمدنی کو کسی طرح روا ہی نہیں رکھتے تھے۔ اگر غور کیا جائے تو بجز کرامت کے اور کوئی صورت نہیں معلوم ہوتی۔ وہ ہمیشہ آمدنی میں سے پس انداز کر کے ایسی بڑی بڑی تقریبات کا استقبال فرماتے رہتے تھے۔ بڑے بھائی صاحب اور منجھلے بھائی صاحب کا سنہ ۱۳۰۰ھ شوال میں نکاح کیا اول الذکر کی بارات شہزاد پور میں چھ کوس کی دوری پر گئی اور ثانی الذکر کی شادی ماموں تفضل حسین صاحب مرحوم کے یہاں گانوں ہی میں ہوئی، زیورات، جوڑوں، مہمانوں، ولیمہ وغیرہ میں خاصی مقدار خرچ ہوئی جو کہ پس انداز مقدار سے

پوری ہوئی پھر ۱۳۱۲ھ میں میری شادی قتال پور پرگنہ اترولیہ ضلع اعظم گڈھ میں ہوئی اور مصارف کثیرہ برداشت کرنے پڑے۔ مگر ایک پیسہ قرض نہیں لیا۔ اگرچہ آج ہماری آمدنیوں وغیرہ کی مقایست پر یہ حالت بہت گرتی ہوئی نظر آتی ہے مگر والدین مرحومین پر جو حالت ان کے ابتدائی زمانہ طفولیت اور عنفوان شباب میں گذری تھی اس پر نظر کرتے ہوئے بہت اعلیٰ درجہ کی شمار ہوتی تھی۔ اور وہ بہت مطمئن اور خوش وخرم نظر آتے تھے۔ بڑے بھائی صاحب مرحوم سہوارہ اور بلند شہر میں بصیغہ تدریس ملازم ہوگئے تھے۔ اگرچہ میرے اور بھائی سید احمد صاحب مرحوم کے مصارف دارالعلوم دیوبند تحمل کرتا تھا مگر ماہوار والد صاحب مرحوم اخراجات زائدہ کے لئے ایک ایک روپیہ ماہوار ضرور بھیجا کرتے تھے کبھی کبھی ہم لوگ قرضدار بھی ہوجاتے تھے جس میں ہماری بیوقوفیوں کا بہت زیادہ دخل ہوتا تھا اور اس پر بہت زیادہ ملامت بھی کی جاتی تھی مگر اس کو ادا بھی وہی فرماتے تھے۔ اسی طرح ایام تعطیل سالانہ میں دیوبند سے وطن تک آمد و رفت کا خرچ بھی تحمل کرنا پڑتا تھا اور اسی وجہ سے دوسرے سال مکان جانا ہوتا تھا۔ اس وقت میں ان کی دور بین نظر اس طرف متوجہ تھی کہ اولاد کے لئے باغات لگائیں اور مکان میں وسعت دیں کہ ۱۳۱۳ھ میں بروز جمعہ ۲۲ ربیع الاول والدین ماجدین کے پیر و مرشد حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب گنج مرادآبادی قدس اللہ سرہٗ العزیز کا بعمر ایک سو پانچ برس انتقال ہوگیا۔ یوں تو ہر مرید کو اپنے مرشد سے تعلق خاطر اور عشق کم و بیش ہوتا ہی ہے۔ مگر والدین مرحومین کو اور بالخصوص والد صاحب کو بہت ہی زیادہ شغف تھا۔ مدتوں خدمت میں رہنا ہوا تھا ذکر و شغل استفادہ باطنی اور قطع منازل سلوک کی نعمت حاصل ہوئی تھی، مولانا مرحوم کی خصوصی عنایت اور توجہ بھی انپر زیادہ رہتی تھی۔ اس لئے عرصہ تک بہت زیادہ مغموم رہا کئے۔ فراق مرشد میں متعدد قصائد بھی لکھے جن میں سے اکثر قصائد بھاکھا زبان میں بہت زوردار ہیں۔ جبکہ یہ احوال گذر رہے تھے بھائی سید احمد صاحب نے ایک خط میں والد صاحب مرحوم کو لکھدیا کہ میاں (ہم سب اولاد ان کو میاں کہا کرتے تھے) اب ہندوستان رہنے کی جگہ نہیں رہی، اب تو مدینہ منورہ چل بسئے باغ وغیرہ لگانے کی ذکر فضول ہے۔ یہ کلمات ایسے مؤثر واقع ہوئے جیسے کہ اسپریٹ میں دیا سلائی لگتی ہے

اس خط کو دیکھنا تھا کہ عشق محمدی (صلے اللہ علیہ وسلم) کی آگ بھڑک اُٹھی اور ہر دم یہی پیچ وتاب رہنے لگا اور یہ دُھن پیدا ہوگئی کہ تمام گھرانہ کو لیکر وہیں چلنا چاہیئے۔ تدبیریں سوچنے لگے۔ اس گیارہ بارہ نفوس والے خاندان کے سفر مدینہ منورہ کا بوجھ معمولی بوجھ نہ تھا۔ لوگوں نے سمجھایا کہ آپ خود جائیے اور حج وزیارت کر آیئے، مگر نہ مانا۔ بیٹوں کی سُسرال والوں نے زور دیا تو جواب دیا کہ اپنی اپنی لڑکیوں کا طلاق لیلو۔ میں تو اپنے لڑکوں کو ساتھ لیجاؤں گا۔ بہوؤں کو خود کہا کہ جس کو چلنا منظور نہ ہو وہ اپنے خاوند سے طلاق لیلے مگر ہندوستانی رسم ورواج اور طرزِ معاشرت میں جسقدر یہ امر مبغوض ہے ہر ایک جانتا ہے۔ میری کتابیں ادب اور ہیئۃ وغیرہ کی کچھ باقی تھیں میں نے عرض کیا کہ آپ تشریف لیجائیں میں ایک دو سال کے بعد آجاؤں گا فرمایا کہ مدینہ منورہ میں پوری کرلینا۔ میرے خسر حقیقی تو بہت عرصہ پہلے فوت ہو چکے تھے میری اہلیہ کو اس کے حقیقی ماموں شیخ کفایت اللہ صاحب مرحوم قنال پوری نے پالا تھا اور وہی شادی وغیرہ کے متکفل تھے۔ ریاست بلرام پور میں ملازم تھے۔ اُن دنوں میں بعہدہ معتمد ریاست لکھنؤ میں مقیم تھے اُنھوں نے مجھکو روکنا چاہا اور والد صاحب سے کہا کہ میں خود لکھنؤ میں موجود ہوں میں حسین احمد کو اپنے پاس یہاں رکھکر حکیم عبد العزیز صاحب (مرحوم) کے یہاں طب پڑھانا چاہتا ہوں اس کو یہاں چھوڑ دیجئے، والد صاحب نے جواب دیا کہ کیا حسین احمد کو گھوڑے پر سوار کرانے کے بعد میں گدھے پر سوار کروں گا۔ اس کو علوم دینیہ کی تعلیم دلائی گئی ہے اس سے بڑھکر کونسی تعلیم ہے۔ الغرض دوستوں، رشتہ داروں اغیار سبھوں نے سمجھایا مگر حسب قول شاعر ؎

مریضِ عشق پر رحمت خدا کی

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

یہاں تک ان کا جوش اور عشق بڑھا ہوا تھا کہ زمانہ سفر حجاز میں جبکہ گورنمنٹ کی طرف سے سختیاں بہت زیادہ کی جارہی تھیں (جنکا ذکر آگے آئے گا) الہ آباد کے قرنطینہ کی سختیاں دکھلا کر ایک صاحب نے کہا کہ اس سال ارادہ نہ کیجئے تو فرمانے لگے کہ اگر مجھکو یہ کہا جائے کہ تجھکو توپ کے منہ پر باندھ کر گولا

چلاجائیں گے اور تو مدینہ منورہ پہونچ جائیگا تو میں اس کے لئے بھی تیار ہوں۔ گھر میں سوائے بھائی سید احمد صاحب مرحوم کے پوری طرح ہم خیال حضرت والد صاحب کا کوئی نہ تھا۔ بڑے بھائی صاحب نے جب اس قدر عزم مصمم والد صاحب کا دیکھا تو حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز سے بطور شکایت عرض کیا آپ نے فرمایا کہ کچھ حرج نہیں چلے جاؤ اُنھوں نے عرض کیا کہ حضرت ابھی تک میری تعلیم باطنی پوری نہیں ہوئی میں اس کو انجام دینا چاہتا تھا تو فرمایا کہ اب ساتھ چلے جاؤ پھر سب کو چھوڑ چھاڑ کر چلے آنا۔ خلاصہ یہ کہ یہ شوق و اضطراب والد صاحب کا بڑھتا رہا اور اُنھوں نے فکر کی کہ کسی طرح جائداد کا حصہ فروخت ہو جائے تو روانہ ہو جائیں۔ اس جد و جہد میں عرصہ لگ گیا۔ بڑی کوششوں کے بعد ایک رئیس ٹانڈہ کے راجہ علی حسین تیار ہو گئے۔ اور غالباً تین ہزار روپیہ پر دونوں گانوں الہداد پور اور جڑاون پور کا زرعی حصہ فروخت کر دیا سکنائی حصّہ بھی فروخت کرنا چاہا مگر کوئی آدھی تہائی قیمت دینے والا بھی نہ ملا اس لئے وہ فروخت نہ کیا گیا۔ اور بالآخر اواخر شعبان ۱۳۱۶ھ ہجری میں روانگی ہوئی جس کا تفصیلی تذکرہ آگے آئیگا۔

والد صاحب مرحوم کے مختصر حالات

حضرت والد صاحب مرحوم جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے قدرۃ کی فیاضیوں سے بہت کچھ فیضیاب تھے۔ دل اور دماغ بے نظیر پائے ہوئے تھے اگر ماحول مساعدت کرتا تو بے نظیر متبحر اور محقق عالم ہوتے اور علم معرفت اور تصوف میں بھی اعلیٰ درجہ حاصل کرتے یا اگر دنیوی علوم حاصل کرتے تو اپنی اعلیٰ قابلیت کی بنا پر اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے مناصب ضرور حاصل کرتے۔ تاہم باوجود ہر قسم کی عسرت اور تنگدستی کے جس نے ان کو بچپن کی زمانہ سے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا اُنھوں نے حیران کُن ترقی کی، اور نہ صرف عسرت اور تنگدستی کو دور کیا بلکہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی بارگاہ میں حاضر ہو کر ذکر و فکر و مراقبہ میں جد و جہد کی اور بڑے درجہ تک اس میں کامیاب ہوئے۔ کشف اونکا بہت قوی اور زیادہ تھا۔ متعدد مکاشفات ان کے صحیح ثابت ہوئے، اُنھیں میں سے یہ بھی ہے کہ اُنھوں نے مدینہ منورہ میں ایک مرتبہ فرمایا تم میں سے ایک شخص کو ہندوستان جانا ہوگا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ

یہ قرعۂ فال مجھ دیوانہ پر پڑے گا۔ دنیا اور اہل دنیا سے ان کو نفرت تھی۔ حضرت مولانا گنج مراد آبادی سے ان کو خلافت اور اجازت زندگی میں ظاہراً نہیں ملی تھی مگر بعد از وفات حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو والد صاحب نے خواب میں دیکھا کہ میں تم کو اجازت بیعت دیتا ہوں اس بنا پر دو شخصوں کو ٹانڈہ میں بیعت کیا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنی اولاد کو (حالانکہ وہ علوم دنیاوی میں اعلیٰ قابلیت کا اظہار کر چکے تھے اور بڑے بھائی صاحب مرحوم اور بھائی سید احمد صاحب مرحوم مڈل کلاس کے امتحان میں تمام صوبہ اودھ کے تمام طلباء سے نمبر اول نکلے تھے) انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ نہیں کیا اور علوم دینیہ ہی کی طرف لگایا۔ ہمیشہ یہی فکر رہی کہ میری اولاد انہیں علوم عربیہ میں اعلیٰ قابلیت حاصل کرے انھوں نے جبکہ ہم سب بڑے ہو گئے تھے جمع کیا اور فرمایا کہ میں نے تم سبھوں کو اس لئے پرورش کیا ہے کہ تم اللہ کے راستہ میں جہاد کرو اور کچھ کر کے شہادت حاصل کرو۔ اُن کی ہی رغبت اور خواہش کی وجہ سے ہم سبھوں کو طریقت کا شوق ہوا اور حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز کے دربار کی خاکروبی کا شرف حاصل ہوا۔ انھیں کی حسن توجہ کا نتیجہ تھا کہ نہ صرف ہندوستان میں اس بارگاہ کی حاضری اور اس کا توسل نصیب ہوا بلکہ مدینہ منورہ پہونچنے کے بعد بھی باوجود مشکلات اپنی اولاد کو اس دربار دُربار میں بھیجا اور جبکہ اخیر میں بھائی سید احمد صاحب مرحوم کو کئی برس گنگوہ شریف کے قیام میں لگ گئے تو حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا کہ سید احمد اگر کسی قابل ہو گیا ہو تو اس کو اجازت دے کر یہاں بھیج دیجئے مجھکو اس کی ضرورت ہے اور اگر کسی قابل نہیں ہوا تو بہتر ہے کہ آپ کے چوکھٹ پر سر مار مار کر وہیں مر جائے۔ اس کلام پر حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ مولوی سید احمد کے والد چونکہ سلوک اور طریقت سے واقف ہیں اسلئے اس کی قدر اور منزلت جانتے ہیں اور پھر بھائی سید احمد صاحب کو مزید تاکید ذکر وغیرہ کی فرمائی اور حسن توجہ زیادہ کر دی۔ مدینہ منورہ کے قیام کے زمانہ میں اتباع سنت اور التزام جماعات خمسہ وغیرہ میں باوجود ضعف اور پیرانہ سالی انتہائی کوشاں رہتے تھے۔ سخت سردیوں اور سخت گرمیوں میں بھی اس طرح اوقات کی پابندی فرماتے تھے کہ ہم نوجوان اُس سے عاجز رہتے تھے۔ اپنے اوراد و وظائف

مراقبہ وغیرہ کے اخیر تک نہایت پابند رہتے تھے۔ امور خانہ داری اور ضروریات تعمیر وغیرہ کے انجام دینے میں بھی انتہائی جفاکشی کرتے رہتے تھے۔ بسا اوقات تعمیری اوقات میں گارا بنانا۔ پتھروں اور گارے کا معمار تک پہونچانا، روڑوں وغیرہ کو جمع کرنا اور غیر تعمیری اوقات میں اینٹ پاتھنا۔ بازار میں ہر روز جاکر مناسب تعمیرات اشیاء کا خریدنا۔ کھونٹیوں اور چارپائی کے پایوں کا بنانا وغیرہ وغیرہ۔ (حالانکہ کبھی ہندوستان میں ان چیزوں کے کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی) اور جب ہم میں سے کوئی کہتا تھا کہ اب آپ پیرانہ سالی کے اس درجہ پر پہونچ گئے ہیں کہ آپ کو صرف آرام کرنا چاہئے آپ دن و رات ان مشقتوں میں کیوں بسر کرتے ہیں تو فرمایا کرتے کہ مجھ سے پڑے پڑے اور بیکار نہیں رہا جاتا۔ سلب مرض وغیرہ اعمال نقشبندیہ میں ان کو عمدہ ملکہ تھا۔ بلکہ ایک مرتبہ سخت خطرہ میں اسی وجہ سے پھنس گئے تھے جبکہ ایک سخت مریض کا ٹانڈہ میں انھوں نے سلب مرض کیا تو وہ مریض تو اچھا ہو گیا مگر خود مرض میں اسقدر مبتلا ہو گئے کہ لوگ ان کی زندگی سے مایوس ہو گئے۔ کیونکہ سلب مرض میں اُنکا طریقہ تھا کہ اولاً مرض کو اپنے اوپر کھینچتے تھے اور پھر اپنے اوپر سے دفع کر دیتے تھے اس مرتبہ چونکہ مرض شدید تھا اس لئے طبیعت سنبھال نہ سکی اور نہ دفع کر سکی بالآخر خود مبتلا ہو گئے۔

تعویذ اور عملیات میں بھی ان کو اچھا خاصا ملکہ اور کامل مہارت تھی۔ فرمایا کرتے تھے کہ ایک زمانہ میں مجھکو اس کی اسقدر مہارت ہو گئی تھی کہ امراض کے لئے نقوش خود تصنیف کیا کرتا تھا اور ان سے فوائد ہوتے تھے۔ مجھکو زبانی اجازت اعمال و نقوش دیتے وقت فرمایا کہ اس بیاض میں (ان کی اپنی قلمی بیاض) جسقدر اعمال ہیں میرے زکوٰۃ دیئے ہوئے ہیں۔ تجھکو زکوٰۃ کی ضرورت نہیں ہے میں تجھکو اجازت دیتا ہوں مگر بہتر یہ ہے کہ یہ تمام اعمال میرے سامنے ایک مرتبہ کر لے مگر میں نے بیوقوفی اور تکاسل سے اس سے اعراض کیا اور مشاغل علمی کو اہمیت دیتا ہوا اس مشغلہ کو قابل اعتنا نہ سمجھا جس کی وجہ سے بعد میں پچھتانا پڑا۔

علاوہ خاندانی اعمال کے والد صاحب مرحوم نے لکھنؤ اور صفی پور وغیرہ کے قیام کے زمانہ میں بہت سے اعمال مشاہیر سے حاصل کئے تھے۔ پھر اس پر مزید یہ ہوا کہ حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب

گنج مرادآبادی قدس اللہ سرہ العزیز نے جبکہ ان کے پاس رسالہ معدن الاعمال والمسائل مولوی محمد رمضان صاحب مرحوم بوڑیوی نے چھپوا کر بھیجا تو والد صاحب کو بلا کر یہ رسالہ دیا اور فرمایا کہ میں ان تمام اعمال کی جو اس میں مذکور ہیں تم کو اجازت دیتا ہوں۔

۱۳۲۶ھ میں جبکہ میں ہندوستان میں تھا والد صاحب مرحوم نے اسی رسالہ معدن الاعمال کی پیشانی پر خود مندرجہ ذیل عبارت تحریر فرمائی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین۔

امابعد۔ میں عبد ضعیف حبیب اللہ اس کتاب کے سارے عملیات و تعویذات کے کرنے و لکھنے و کسی کو (دگر اہل کو) بخش دینے کی اجازت فرزندم حسین احمد کو اسی طرح دیتا ہوں جس طرح سے مجھکو حضرت مرشدنا مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بلا عمل و ادائے زکوٰۃ کے بخشا و عطا فرمایا ہے۔ پس اس کو بھی عمل کرنے و زکوٰۃ دینے کی چنداں ضرورت نہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ وہ قادر مطلق یوں ہی خلق اللہ کو نفع دیوے گا۔ اسی طرح سے دوسری قلمی کتاب کی بھی میں نے اس کو اجازت دی۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کو اس سے فائدہ پہونچاوے آمین۔ اگر فرزند سید احمد بھی طلب و خواہش رکھتے ہوں تو ان کو بھی اجازت نامہ بس ہے۔ فقط

حبیب اللہ بقلم خود

۲۰ جمادی الثانی ۱۳۲۶ھ

انھوں نے مدینہ منورہ میں پہونچکر مصارف سفر میں سے جو سرمایہ بچا تھا حسب قواعد فرائض وراثت تقسیم کر دیا تھا اور فرمایا تھا کہ میں نے ہجرت کی نیت کی ہے میں تو یہاں ہی مرنے کے لئے آیا ہوں، میں تو یہاں سے بہر حال نہیں جاؤں گا۔ تم سبھوں کو میری طرف سے اجازت ہے خواہ یہاں رہو یا ہندوستان چلے جاؤ۔ چونکہ ایسے شفیق مربی ضعیف العمر کا تنہا چھوڑنا انتہائی بے مروتی تھا اس لئے نہ کوئی اولاد میں سے اور نہ والدہ ماجدہ ان کے فراق پر راضی ہوئے۔ اگرچہ سوائے والد ماجد مرحوم کسی نے بھی ہجرت کی نیت نہیں کی تھی اور سب نے قصد کیا تھا کہ جبتک وہ زندہ

ہیں یہاں ہی رہیں گے۔ اور سرمایہ مذکورہ سے تجارت وغیرہ کا ارادہ کیا گیا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

والدصاحب مرحوم کو طبعی طور پر شاعری سے بھی دلچسپی تھی اور بالخصوص ہندی بھاشا میں ان کے قصاید بہت زوردار اور مؤثر اور مضامین تصوف سے بھرے ہوئے ہیں۔ فارسی اور اردو میں نعتیہ اشعار ان کے بہت ہیں۔ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کے فراق میں (بعد از وصال) بہت پر درد اشعار انھوں نے لکھے ہیں جنمیں سے چند قصائد برفغان دل ہاشمی وغیرہ میں شائع بھی ہوئے ہیں۔ اگر ان کے لکھنے میں طول نہ ہوتا تو میں مکمل یہاں ان کو درج کرتا۔ مگر بطور نمونہ یہ چند اشعار لکھتا ہوں جن سے والدصاحب مرحوم کی قابلیت اور افتاد طبیعت کا پتہ چلتا ہے۔

قطعات

نعت در فارسی

ایں جمال و حسن عالم سوز تو — ویں رُخ پر نور دل افروز تو

کرد بسمل صد ہزاراں جبرئیل — ناوک مژگان سینہ دوز تو

دیگر

جان و دل را میبر دیک آں تو — ایں چہ حسن است اے عجائب شان تو

سوخت از درد ست حبیب ار چہ عجب — اے بسا جبرئیل شد قربان تو

دیگر

اے بہار باغ رضوان کوئے تو — بلبل سدرہ اسیر موئے تو

سجدہ ریزان آمدہ سویت حبیب — اے ہزاراں کعبہ در ابروئے تو

قطعہ نعت اردو

چارو ناچار جو محفل سے ترے جاتے ہیں
حسرت ورنج وقلق ساتھ وہ لیجاتے ہیں

جان سے جاناہے ترے پاس سے جانان جانا
جیتے جاتے ہیں مگر مردہ بنے جاتے ہیں

ایک ہم ہی رہے اس بزم میں باقی ساقی
لوگ میخانہ سے پی پی کے چلے جاتے ہیں

اے رسول عربی آپ کی فرقت کے قتیل
پل محشر سے سُبک پار اُتر جاتے ہیں

سر رہے یا نہ رہے پر رہے سودا سر میں
عشق احمد کا خدایا یہی ہم چاہتے ہیں

اس حبیبِ دلِ خستہ پر نظر ہو جائے
دردمندوں کی دوا آپ کئے جاتے ہیں

نعت در مخلوط بھاکا و اردو

یہ کیسا روگ ہے مجھکو کہاں مرا دل لُبھانا ہے
وہ موہن روپ ہے کیسا جو آنکھوں میں سمانا ہے

کہاں ڈھونڈھوں کدھر جاؤں جتن کوئے نہیں بنتے
پھرا کرتا ہوں من ہی میں یہی آنا اور جانا ہے

کبھی صحرا میں گرد باد بنکر خاک اُڑاتا ہوں
کبھی دریا میں جون غواص غوطہ کا لگانا ہے

میں سارے باغ و پھلواری پھری پیو پیو پیارٹتی
پتہ دے اے صبا تو ہی کہاں وہ گل پھولانا ہے

کہوں میں کیا چلی کیدھر برہ کی آگ دل بھیتر
میں بالم کھوج میں نکلی مجھے پردیس جانا ہے

بہت دن بیتے اے سکھیو نپایوں درس پیتم کا
ہوئی کوئی خطا ایسی کہ من موہن کو ہانا ہے

مدینہ ہے زمیں پر یاکہ ہے عرش بریں اوپر
وہیں وہ شیام بستاہے مجھے وہ دیس جانا ہے

نہ اگر روپ ہے میرے نہ کوئی ڈھنگ آتا ہے
نہ چوندر رنگ میں بورے جیا مورا ڈرانا ہے

میں عاجز بے نوا بندی کنیزک زادے کمتر
اور اس پر یہ دماغ اپنا کہ تجھ پر دل دِوانا ہے

زن و فرزند میں خود بھی دل و جان بھی سبھی تجھ پر
تصدق یا نبی اللہ تو محبوب یگانہ ہے

بصارت تیز کرتی ہے جبیب اُس کوچہ کی مٹی
دل و جان خانماں سب بیچ وہ سرمہ لگانا ہے

فراق مرشد حضرت مولانا فضل الرحمن قدس اللہ سرہٗ العزیز گنج مرادآبادی میں

بھاکھا زبان میں فرمایا جس کو ہندی اصطلاح میں برہ کہتے ہیں

کون بتہا مورا جیا بورانا	کہ برہا ہیا سائے بانا
کون اُگن دیکھے یہ ماہین	جو تین جرون برون جگ ناہین
گوسوانی موری بانہ گہیتا	کہاں گیو مورے کنور کنہیا
رکھ مدہ بن تم ڈھونڈہن جاؤں	کہاں پاؤں سرچرنن ناؤں
کون سہاگ بھاگ اب مورین	جو مین سنگ نہ لاگیوں تورین
تم بن کو مورا دہیر بندھیا	تم بن کو مورے پیم ہریا

کون کاج مورا جوبن بارا | جو چھٹ گیو کنتھہ رتنا را
پیو کھوجت سب کھوئے کے پاوَن پیا پران | سو موا کنتھہ ہران ہے تنے کھوجو سیلی آن
ہوں جوگن توری بھیکھہ بھکاری | کہاں ڈھونڈہوں تم جوگی موراری
کون دیس موئے جوگی چھائے | کہہ کارن موہنہ سنگ نہ لائے
نلج ہوں گھر بار تجاؤں | پی توری کھوج کہیں سُن پاؤں
ہے پنڈت گن گیان گوسائیں | تم تیئیں اگر کنو جگ ناہیں
ہے پنڈت پریمی بیراگی | الکھہ پیم بیراگ سُبھاگی
کون کون گن گیرت بکھانون | جس تم ہتیو نہ دوجا جانون
تہیں تین میں بھیوں سریکھا | اندہ ہتیون سو نینن دیکھا
تم بن میں کھیا بھیوں کہاں ڈھونڈہوں کت جائے | جو درشن میں پاؤں پڑوں اگن میں دہائے۔ الخ

بھجن (مناجات) بھاکا زبان میں !

روز کی بدریا ہے جیا گھبرائے گیو۔۔۔۔ رے (وظیفہ باطنی ہے) | رات کی اندھریا ہے من ڈرکھائے گیو۔۔۔ رے
نہیں آئے ساجن نہیں آئے سامی | چتر گجریا ہے کہیں بلھائے گیو۔۔۔۔۔۔
سپنے مانہہ درس جو دیتھون ۔۔ | پریم کی چندریا ہیں پھرآئے گیو۔۔۔۔۔
پڑگیو آئیکے بھول بھلیاں | ساتھ کی گٹھریا جولائے گنوائیگیو۔۔۔۔
کہو حبیب کہاں من موہے | کوئی نظریا ہے چت بورائے گیو۔۔۔۔۔

زمانہ شباب اور مدرسی میں ان کی طبیعت ریاضی اور حساب میں بہت ہی زیادہ تیز تھی ہر ایک کے مشکل سے مشکل سوالات آناً فاناً میں حل کر دیتے تھے۔ مگر آخری عمر میں تصوف کا اس قدر غلبہ ہو گیا تھا کہ سب کو بھلا بیٹھے تھے۔ اور جب کبھی ایسے مسائل کا تذکرہ آتا تو فرما دیتے کہ اب میں سب بھول گیا۔ جفاکش اسقدر تھے کہ جس احاطہ میں مکان بنوایا ہے چھ سات کنویں اور پاخانے

اور بالوعے اپنے ہاتھوں سے کھودے۔ حالانکہ وہاں کی زمین جس پتھر جمے ہوئے کنکروں والی ہے) بڑی مشکلوں سے گھنٹہ بھر میں ڈیڑھ دو بالشت زمین کھودی جاتی تھی۔

موصوف مدینہ منورہ میں یا تو ذکر و فکر اور اوراد و وظائف صلوٰۃ و سلام میں مشغول رہتے تھے یا کبھی کبھی اپنے ہم عمر مہاجرین ہند اہل صلاح و تقویٰ کے پاس بیٹھکر دل بہلاتے تھے۔ عام لوگوں سے میل جول نہایت کم تھا اور نہ فضول اور لایعنی باتوں میں وقت ضائع فرماتے تھے۔ حقہ پینے کے بہت عادی تھے۔ اور چونکہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب مرحوم حقہ پیتے تھے اس لئے ان کا ہر مرید تقریباً اس کا عادی پایا جاتا تھا۔ عرب میں خمیر تمباکو نہ ہونے کی وجہ سے ہم لوگ کوشش کر کے تمباکو لیجانے اور منگوانے کی کوششیں کرتے تھے۔ ترکی حکومت کے سخت کسٹم کی وجہ سے اس میں دقتوں کا سامنا بھی ہوتا تھا۔ پان اور تمباکو کھانے کے عادی بھی تھے۔

۳۴-۱۳۳۳ھ میں جبکہ جنگ عمومی ہو رہی تھی اور حکومت ترکیہ بھی داخل جنگ تھی اور حضرت مولانا شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز اور مولانا خلیل احمد صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز حجاز تشریف لیگئے تھے اور شریف حسین نے انگریزوں سے ملکر بغاوت کردی تھی تو مختلف اسباب کی بناء پر مدینہ منورہ کی پولیس کو ہمارے خاندان سے خصوصاً اور تمام ہندوستانیوں سے عموماً بدظنی پیدا ہوگئی (جس کا کچھ ذکر آگے آئے گا) بنا بریں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے مدینہ منورہ سے روانگی مکہ کے بعد جناب والد صاحب کو مع میرے دو بھائیوں مولانا سید احمد صاحب مرحوم و عزیزم محمود سلمہ کے اڈریانوپل بے خبری کی حالت میں گرفتار کر کے بھیجدیا گیا۔ بچوں اور عورتوں کو مدینہ منورہ ہی میں چھوڑ دیا گیا۔ بہت کچھ عرض کیا گیا۔ مگر فوجی احکام تھے کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ اس زمانہ میں مولانا عبدالحق صاحب مدنی مہتمم مدرسہ شاہی مسجد مرادآباد کی ایک بہن بھائی سید احمد صاحب مرحوم کے نکاح میں تھیں علاوہ ازیں موصوف سے اور تعلقات قدیمہ بھی تھے۔ بدیں وجہ انھوں نے بچوں اور عورتوں کی خبر گیری میں بہت زیادہ ہمدردی اور جفاکشی کا ثبوت دیا۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء۔

اس وقت عورتوں اور بچوں میں میری زوجہ اور ایک لڑکی دس گیارہ برس کی زہرہ اور ایک لڑکا

اشفاق تقریباً ڈیڑھ سال کا اور بھائی سید احمد صاحب کی اہلیہ اور عزیزم محمود کی اہلیہ اور والد صاحب مرحوم کی اہلیہ ضعیف العمر تھیں۔ اس تعدی اور ظلم کا اثر اُن کی طبیعت پر نہایت زیادہ ہونا ضروری تھا۔ طبعی طور پر ان ضعفاء سے جدائی اور پھر تمام عمر کی وہ خواہش کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضری (جسکی وجہ سے وہ کسی جگہ حتی کہ مکہ معظمہ اور حج کے لئے بھی مدینہ منورہ سے نکلنا گوارا نہ کرتے تھے اور یہیں دفن ہونے کے آرزومند تھے) کے فوت ہونے کی وجہ سے غیر معمولی اثر ان کے قلب اور دماغ پر پڑا تھا

اڈریانوپل نہایت سرد شہر ہے وہاں پر ان تینوں کو لیجا کر نظر بند کر دیا گیا۔ شہر سے ایک میل باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ تین اشرفی (نوٹ) ہر ایک کے لئے ماہوار مقرر کر دیا گیا۔ ترکی نوٹ اس وقت میں بہت زیادہ گر گیا تھا۔ والد صاحب مرحوم کی ضعیف طبیعت وہاں کی سخت سردی کو برداشت نہ کر سکی اور ذات الجنب میں مبتلا ہو کر اڈریانوپل پہونچنے کے ایک ماہ بعد وفات پا گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ ایڈریانوپل ہی میں مدفون ہوئے۔

والد صاحب مرحوم مستجاب الدعوات بہت زیادہ تھے۔ ایسے بہت سے واقعات پیش آئے تھے کہ جس نے انکو ستایا یا جس کے واسطے اُنھوں نے بد دعا کی وہ پنپنے نہیں پایا۔ رحمہ اللہ ورضی عنہ وارضاہ۔ واقعہ یہی ہے کہ والدین مرحومین میں اللہ تعالیٰ نے جو خوبیاں جمع کی تھیں وہ بہت کم لوگوں میں اجتماعی طور پر پائی جاتی ہیں ؎

ابونا اب لو کان للناس کلھم　　　　اب مثلہ اغناھم بالمناقب

والد صاحب مرحوم کا آخری حصۂ عمر بالخصوص والدہ مرحومہ کی وفات کے بعد بہت زیادہ مکدر اور رنجیدہ گذرا ہے ان کی اولاد اور اولاد کی اولاد اور گھرانے کے نفوس تقریباً چالیس نفر یکے بعد دیگرے وفات پا گئے خود فرماتے تھے کہ تقریباً چالیس نفر اپنے گھرانے کے میں نے اپنے ہاتھ سے مدینہ منورہ میں دفن کئے ہیں۔ مگر انتہائی ضبط اور صبر و استقلال پر عمل پیرا رہے۔ آخری زمانہ میں ان کی امیدوں اور آرزوں کا خون اس طرح ہونا انتہائی مصیبت تھا کہ وفات اور دفن بھی مدینہ منورہ میں حاصل نہ ہو سکا۔ ذلک تقدیر العزیز العلیم۔ میں اس زمانہ میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ انگریزی اسارت

میں تھا۔ مالٹہ میں ان کے انتقال کی خبر پہونچی تو نہایت قلق ہوا مگر بجز صبر و شکر چارہ ہی کیا تھا۔
فللہ الحمد والشکر علی ما قدر وقضی۔

میری تعلیم و تربیت در ایام طفولیت مجھکو ہوش و حواس جب آئے تو میں نے اپنے آپ کو ٹانڈہ میں پایا۔ بانگرمئو بالکل یاد نہیں۔ والدین مرحومین کو اولاد کی تعلیم و تربیت کا غیر معمولی اور بہت زیادہ خیال تھا اور اس کے لئے والد مرحوم بہت زیادہ سختی کرتے تھے۔ ہر بچہ کو جبکہ وہ چار برس کا ہو جاتا تھا پڑھنے کے لئے بٹھا دیتے تھے اور نہ پڑھنے اور نہ یاد کرنے اور کھیلنے پر خوب مارتے تھے۔ اسلئے مجھکو کھیلنے کا موقعہ آزادی کے ساتھ صرف چار برس کی عمر تک ملا ہے۔ جب اس عمر کو پہنچا تو گھر میں والدۂ مرحومہ کے پاس قاعدہ بغدادی اور اس کے بعد سیپارہ پڑھنا پڑتا تھا۔ صبح سے ساڑھے نو بجے تک تو یہ قید اور پڑھائی گھر میں ہوتی تھی اور ساڑھے نو بجے کھانا کھا کر والد مرحوم کے ساتھ اسکول میں جانا پڑتا تھا اسکول الہداد پور سے تقریبًا ایک میل یا کچھ زائد دوری پر ہے۔ اسکول کی تعلیم میں بھی مدرسین اس زمانہ میں خوب مار پیٹ کرتے تھے۔ اس وقت مجھکو دفعہ آٹھ میں داخل کر دیا گیا (اس زمانہ میں درجوں کی ترتیب اسی طرح تھی۔ مڈل کلاس کو اول درجہ کہا جاتا تھا اور سب سے نیچے کا درجہ آٹھواں کہلایا جاتا تھا) چار بجے شام تک اسکول میں مقید رہنا پڑتا تھا۔ اس کے بعد والد صاحب مرحوم کے ساتھ ہی گھر آنا ہوتا تھا۔ گھر پر بھی سخت قید تھی باہر نکلنا۔ گانوں کے لڑکوں کے ساتھ کھیلنا اس کی بالکل اجازت نہ تھی اور اگر کبھی غفلت دیکر یا والد صاحب کی غیبوبت میں نکل کر کچھ کھیلنے کے لئے نکلنا معلوم ہوتا تھا تو سخت مار پڑتی تھی۔ ایک بکری بھی والد صاحب نے اچھی نسل کی پال رکھی تھی اسکول جاتے اور واپس آتے ہوئے اسکو اور اسکے بچوں کو ساتھ رکھنا پڑتا تھا چونکہ اسکول کا احاطہ بڑا تھا تو وہ لانبی رسی میں باندھدی جاتی تھی اور دن بھر اس طرح چرتی رہتی تھی اور دیگر اوقات فارغہ یا تعطیل میں مکان کے قریب جنگل میں اس کو اور اس کے بچوں کو چرانا پڑتا تھا (اس طرح یہ سنت نبوی علیہ السلام ادا کرنی پڑی) گانوں میں میرا ہم عمر لڑکا ماموں زاد بھائی جواد حسین مرحوم تھا موقعہ پاکر اسکے ساتھ گولی کھیلتا تھا۔ صرف دو گھروں میں ہم آزادی کے ساتھ جاسکتے تھے ایک تائے صاحب مرحوم کے یہاں اور دوم ماموں تفضل حسین

صاحب مرحوم کے گھر میں۔ مگر چونکہ تائے صاحب کے یہاں کوئی ہم عمر لڑکا نہ تھا اس لئے وہاں
جانا بے سود ہوتا تھا۔ جواد حسین مرحوم کے یہاں بھی کھیلنے کی اگر خبر ہو جاتی تھی تو مار پڑتی تھی۔ بہرحال
ایام طفولیت میں صرف گولی کھیلنے کی نوبت آئی اور وہ بھی لک چھپ کر۔ آزادی کے ساتھ وہ بھی
نصیب نہ ہوا۔ پتنگ اڑانا یا گیند کھیلنا یا گلی ڈنڈا کھیلنا وغیرہ کبھی وہاں نصیب ہی نہ ہوا۔ گانوں میں
بعض ہم عمر اور بھی لڑکے تھے نگران کے گھروں میں جانے کی اجازت نہ تھی۔ بھائی سید احمد صاحب مرحوم
اور میں اوپراتلی کے تھے اس لئے وہ ہمیشہ کاٹ کرتے تھے (جیسے کہ فطرتاً اوپر تلی کے بھائیوں کی عادت
ہوتی ہے) وہ طبعی طور پر ابتدا سے سلیم الطبع تھے کھیل کود کی طرف بہت کم رغبت رکھتے تھے اور والدین
مرحومین کی منشار کے مطابق زیادہ رہتے تھے۔ چھوٹے بچوں کی خبر گیری میں والدہ مرحومہ کی بہت زیادہ
امداد کرتے تھے۔ میں جب کبھی غفلت دیکر کھیلنے کے لئے نکل جاتا تھا تو وہی تلاش کرنے کے لئے بھیجے
جاتے تھے۔ اور وہ گوشمالی کرتے ہوئے لاکر والد صاحب مرحوم کے سامنے پیش کر دیتے تھے۔ اور
پھر مار پڑتی تھی۔ الحاصل آٹھ برس اس طرح وطن میں قیام رہا اس میں پانچویں سیپارہ تک والدہ
مرحومہ سے اور پانچ سے اخیر تک والد مرحوم سے قرآن شریف ناظرہ پڑھنا ہوا اس کے بعد آمدنامہ
دستور الصبیان، گلستاں کا کچھ حصہ مکان پر پڑھنا ہوا اور اسکول میں دویم درجہ تک پڑھنا ہوا۔
اس وقت اسکول میں فنون اور کتب بہت زائد تھے۔ تمام اقسام حساب جبر و مقابلہ تک مساحت اور
اوقلیدس مقالہ اولی تمام جغرافیہ عمومی و خصوصی، تاریخ عمومی و خصوصی مساحت عملی (تختہ جریب وغیرہ
سے زمین ناپ کر باقاعدہ نقشہ بنانا) تحریر، املا شکست لکھنا اور پڑھنا۔ اردو کورس وغیرہ سب اس عمر
میں پوری طرح یاد اور مشق کر چکا تھا۔ اور ہر چیز میں اس قدر مہارت ہو چکی تھی کہ از بر خوبی جواب دے سکتا تھا
جبکہ تیرھواں سال عمر کا شروع ہوا۔ اور بھائی سید احمد صاحب مرحوم اردو مڈل کلاس پاس کر کے
دیوبند بھیجدیئے گئے (ذیقعدہ ۱۳۰۸ھ میں وہ وہاں بھیجے گئے) بڑے بھائی صاحب پہلے سے وہاں
پڑھتے تھے اور ان کی کتابیں آخری تھیں جب وہ شادی ہو جانے کے بعد جانے لگے تو بھائی سید احمد
صاحب بھی ان کے ساتھ کر دیئے گئے۔ اب ہم مکان پر اس حیثیت سے آزاد ہو گئے کہ ہمکو ڈھونڈھ کر

گھروں میں سے نکال لانے اور والد مرحوم پر پیش کر دینے والا کوئی نہیں رہا۔ طبیعت میں کھیل کود کا شوق تھا ہی۔ جہاں والد صاحب مرحوم نے کسی کام کو یا کسی کو بلانے کے لئے بھیجا تو اس کو انجام دیا اور ماموں صاحب کے گھر میں گھس گئے اور جواد حسین مرحوم کے ساتھ کھیلنا شروع کیا۔ وہاں ہر ایک ہم سے محبت سے پیش آتا تھا اور ہماری اس مظلومیت پر کہ ہمکو کھیلنے کا موقع نہیں دیا جاتا ہے تیلی کے بیل کی طرح دن رات لکھنے پڑھنے میں لگا رہنا پڑتا ہے۔ ہم سے ہمدردی رکھتا تھا۔ اس وجہ سے والد صاحب کو سخت کلفت پیش آئی اگرچہ مارا پیٹا بھی بہت زیادہ مگر بے سود معلوم ہوا دو چار دن مار کا اثر رہا پھر وہی کھیل کا شوق سوار ہوا۔ بالآخر والد صاحب مرحوم نے طے کر لیا کہ اس کو یہاں نہ رکھنا چاہئے اور دیوبند ہی بھیجدینا چاہئے۔ چنانچہ تین مہینہ بھائی صاحبوں کے روانگی کے گذرنے کے بعد جناب منشی فیروزالدین صاحب بٹالوی مرحوم کے ساتھ دیوبند بھیجدیا منشی صاحب مرحوم بٹالہ ضلع گورداسپور پنجاب کے باشندہ اور والد صاحب مرحوم کے بہت زیادہ دوست اور فیض آباد میں محافظ دفتر تھے۔ پیر بھائی ہونے کی وجہ سے آپس میں بہت زیادہ خلوص اور ربط تھا۔ وہ کسی ضرورت سے اپنے وطن بٹالہ کو جا رہے تھے۔ والد صاحب مرحوم نے انکو کہا کہ حسین احمد کو اپنے ساتھ لیتے جایئے اور دیوبند پہنچا دیجئے۔ چونکہ سہارنپور ہی ہو کر ان کا راستہ تھا اس لئے ان کو کوئی دقت نہ تھی۔ چنانچہ اوائل صفر ۱۳۰۹ھ میں میں ان کے ساتھ دیوبند پہونچ گیا اور ہر دو بھائیوں کے زیر سایہ اُنھیں کے کمرہ میں حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ کے مکان کے قریب رہنے لگا۔ یہ کمرہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد کے سامنے کوٹھی میں واقع تھا یہاں پہونچنے کے بعد گلستاں اور میزان شروع کی۔ بڑے بھائی صاحب مرحوم نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے درخواست کی کہ آپ تبرکاً اسکو دونوں کتابیں شروع کرا دیں۔ مجمع میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب مرحوم اور دوسرے اکابر علماء موجود تھے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا خلیل احمد صاحب سے فرمایا کہ آپ شروع کرا دیں چنانچہ انھوں نے ہر دو کتابوں کو شروع کرا دیا اور پھر بھائی صاحب نے میزان، منشعب پڑھائی۔ اگرچہ تیرھواں سال عمر کا شروع ہو چکا تھا مگر جسم اسقدر

دبلا اور پستہ تھا کہ کوئی دیکھنے والا یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اس کی عمر گیارہ سال سے زائد ہے اس وجہ سے مجھ پر وہاں شفقت زیادہ کی گئی وہاں اسقدر دور کے نوعمر اور چھوٹے طالب علم عموماً نہیں جاتے ہیں۔ اور چونکہ میں تحریر و حساب وغیرہ سے بخوبی واقف تھا۔ خط بھی فی الجملہ اچھا تھا اس لئے اساتذہ کے یہاں خانگی خطوط اور خانگی حسابات کی خدمت اور گھروں میں جانا اور پردہ کا نہ کیا جانا وغیرہ کا سلسلہ کئی برس تک جاری رہا۔ بالخصوص حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ محترمہ (رحمہا اللہ تعالیٰ) بہت زیادہ شفقت فرماتی تھیں۔ مستوراتی متبنیٰ مشہور ہوگیا تھا۔

دیوبند پہونچنے کے بعد وہ ضعیف سی کھیل کود کی آزادی جو کہ مکان پر تھی وہ بھی جاتی رہی۔ دونوں بھائی صاحبان اور بالخصوص بڑے بھائی صاحب سب سے زیادہ سخت تھے۔ خوب مارا کرتے تھے۔ والد صاحب مرحوم تو ممکن ہے کہ ان کو مارتے وقت یا بعد میں کچھ شفقت آجاتی ہو مگر یہاں تو وہ بھی نہ تھی۔ بہر حال اس تقید اور نگرانی نے مجھ میں علمی شغف زیادہ سے زیادہ اور لہو و لعب کے شغف کو کم سے کم کر دیا۔ فرحمھم اللہ وجازاھم احسن الجزاء۔

دارالعلوم دیوبند کی تعلیمات بھائی صاحب مرحوم نے گلستاں کے تو شاید ایک ہی دو سبق پڑھائے مگر میزان منشعب خوب توجہ سے پڑھائی جب دونوں خوب یاد ہوگئیں تو اس کے بعد پنج گنج، صرف میر حضرت حکیم محمد حسن صاحب مرحوم کے پاس یکے بعد دیگرے پڑھیں۔ اور یہ اسباق مدرسہ کے اوقات کے علاوہ خارج میں ہوئے اور اسی طرح بہت سے اسباق خارج اوقات میں عصر کے بعد مغرب کے بعد عشا کے بعد ہوتے رہے جنکی وجہ سے مجھکو جلد ترقی کرنے کا موقعہ ملتا رہا اور اپنے ہم سبقوں کو نیچے درجات میں چھوڑ کر اگلی جماعتوں اور کتابوں میں شمول کا امتیاز حاصل ہوا کیا۔ اور اس شغف اور پابندی کو دیکھ کر اساتذہ کرام نے بھی اپنی عنایتیں زیادہ سے زیادہ مبذول فرمائیں۔

خلاصہ یہ کہ صفر ۱۳۰۹ھ سے شعبان ۱۳۱۶ھ تک دیوبند میں قیام رہا اس مدت میں

مندرجہ ذیل کتابیں مندرجہ ذیل اساتذہ کے پاس ہوئیں۔

(۱) حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز۔ دستور المبتدی، زرادی، زنجانی، مراح الارواح قال اقول، مرقات، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی تصدیقات۔ قطبی تصورات، میر قطبی مفید الطالبین، نفحۃ الیمن، مطول، ہدایہ اخیرین، ترمذی شریف، بخاری شریف، ابوداؤد، تفسیر بیضاوی شریف، نخبۃ الفکر، شرح عقائد نسفی، حاشیہ خیالی، موطا امام مالک، موطا امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ۔

(۲) مولانا ذوالفقار علی صاحب والد ماجد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہما۔ فصول اکبری

(۳) مولانا عبدالعلی صاحب مرحوم مدرس دوم دارالعلوم رحمۃ اللہ علیہ۔

مسلم شریف۔ نسائی شریف۔ ابن ماجہ۔ سبعہ معلقہ۔ حمد اللہ۔ صدرا۔ شمس بازغہ۔ توضیح تلویح تصریح۔

(۴) مولانا خلیل احمد صاحب مرحوم مدرس دارالعلوم دیوبند تلخیص المفتاح۔

(۵) مولانا الحکیم محمد حسن صاحب مرحوم مدرس دارالعلوم دیوبند

پنج گنج۔ صرف میر۔ نحو میر۔ مختصر معانی۔ سلم العلوم۔ ملا حسن۔ جلالین شریف۔ ہدایہ اولین

(۶) مولانا المفتی عزیز الرحمٰن صاحب مرحوم مدرس دارالعلوم دیوبند۔

شرح جامی بحث فعل۔ کافیہ۔ ہدایۃ النحو۔ منیۃ المصلی۔ کنز الدقائق۔ شرح وقایہ۔ شرح مأتہ عامل اصول شاشی۔

(۷) مولانا غلام رسول صاحب مرحوم بفوی مدرس دارالعلوم دیوبند۔

نورالانوار۔ حسامی۔ قاضی مبارک۔ شمائل ترمذی۔

(۸) مولانا منفعت علی صاحب مرحوم۔

میر زاہد رسالہ۔ میر زاہد ملا جلال۔ میبذی۔ خلاصۃ الحساب۔ رشیدیہ۔ سراجی

(۹) مولانا الحافظ احمد صاحب مرحوم۔ شرح ملا جامی بحث اسم۔

(۱۰) مولانا حبیب الرحمٰن صاحب - مقامات حریری. دیوان متنبی

(۱۱) بڑے بھائی صاحب مرحوم - میزان الصرف - منشعب - ایسا غوجی -

غرضیکہ ان مختلف علوم و فنون کی جو کہ سڑسٹھ کتابیں سترہ فنون سے ساڑھے چھ برس کی مدت میں پڑھنے کا شرف حاصل ہوا - یہ کتابیں عموماً درس نظامی اور نصاب درس ولی اللٰہی سے تعلق رکھنے والی ہیں جو کہ ہندوستان کی عربی درسگاہوں میں جاری ہیں - کچھ کتابیں ادب، ہیئۃ عروض، طب وغیرہ کی جو کہ داخل نصاب تھیں باقی رہ گئیں تھیں. سفر حجاز کی وجہ سے وہ پوری نہ ہو سکیں -

حضرت شیخ الہند صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدرس اول تھے اور ان کے پاس طلبہ کی بڑی بڑی کتابیں ہوتی تھیں - ابتدائی کتابیں ان کے پاس نہوتی تھیں اور نہ ہو سکتی تھیں - مگر چونکہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے حقیقی بھتیجے منشی حبیب حسن صاحب ہماری جماعت میں تھے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو ان سے بوجہ ان کی حقیقی والدہ کے فوت ہو جانے اور قرابت قریبہ کے بہت زیادہ انس تھا اور اس وجہ سے بھی کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو ہم تینوں بھائیوں پر بہت زیادہ شفقت تھی اور بڑے بھائی صاحب مرحوم خدمت میں غیر معمولی حاضری دیتے اور امور خدمت انجام دیتے رہتے تھے اس لئے رعایت خاصہ فرماتے رہے اور مندرجہ بالا ابتدائی کتابیں بھی مجھکو پڑھائیں اور اکثر کتابیں خارج اوقات مدرسہ میں پڑھائیں - پڑھنے میں بدشوق میں ہمیشہ رہا ہوں. کتابوں کا پوری طرح مطالعہ کرنا اور سبق پڑھنے کے بعد کتاب کو دیکھنا یا تکرار کرنا بہت کم ہوا - البتہ اس کا ہمیشہ التزام کیا کہ اسباق میں حاضری ضرور دیتا رہا اور حتی الوسع مقام درس میں سبق سمجھ لینے کی پوری جد و جہد کرتا تھا - جب تک ابتدائی کتابیں ہوئیں جن کا تقریری امتحان ہوتا تھا امتحانوں میں عمدہ اور اعلیٰ نمبروں سے پاس ہوتا رہا مگر جب تحریری کتابیں آئیں (یعنی درجہ وسطے اور اوپر کے درجہ کی وہ کتابیں جن میں تحریری امتحان ہوتا تھا) ان میں پہلے سال چھ کتابوں میں سے تین میں فیل ہو گیا چونکہ تحریری امتحانوں میں تمام کتاب میں سے صرف تین سوال

دیئے جاتے تھے اور کوئی تعین بحث اور باب وفصل کی طالب علم کو بتلائی نہیں جاتی تھی اسلئے اگر پوری کتاب پر اچھی طرح عبور نہ ہو اور مباحث اچھی طرح یاد نہ ہوں امتحان میں کامیاب ہونا سخت مشکل ہوتا تھا۔ نیز قاعدہ یہ بھی تھا کہ تینوں سوالوں کے انفرادی نمبروں کو تین پر تقسیم کر کے اوسط نمبر نکالا جاتا تھا جس پر مدار کامیابی کا ہوتا تھا اس لئے اگر دو سوالوں کے جوابات عمدہ سے عمدہ بھی لکھے جائیں اور ایک کا جواب کچھ نہ ہو تو نمبر اوسط تین پر تقسیم ہونیکے بعد کامیابی کے نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لئے سخت محنت کرنا ضروری ہوتا تھا اور بغیر اس کے پاس ہونا انتہائی دشوار ہوتا تھا۔ اس بنا پر میں نے ایام امتحان میں یہ طریقہ اختیار کیا کہ رات کو کتاب ابتداء سے اخیر تک مطالعہ کرتا تھا اور تمام رات میں صرف ایک گھنٹہ یا اس سے بھی کم سوتا تھا۔ نیند کے دور کرنے کے لئے انگیٹھی چار کا انتظام کرتا تھا جب بھی نیند غالب آتی تھی اس چار کو پیتا تھا جس سے گھنٹہ دو گھنٹہ کو نیند جاتی رہتی تھی کیونکہ میں ہمیشہ سے نیند سے مجبور رہتا ہوں اور بالخصوص کتب بینی کے وقت تو نیند بہت ہی غالب آجاتی ہے۔ اس طریقہ پر عمل کرنے کی وجہ سے مجھکو تحریری امتحان کی مشکلات پر غلبہ حاصل ہو گیا۔ اس کے بعد بحمد اللہ کسی کتاب میں فیل ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ بلکہ اپنی جماعت میں اکثر امتیازی نمبر حاصل کرتا رہا۔

دارالعلوم دیوبند کا امتحان دارالعلوم دیوبند کا امتحان ابتداء سے نہایت سخت رکھا گیا ہے خواہ تقریری ہو یا تحریری۔ طالب علم کو تقریری امتحان میں کوئی جگہ بتائی نہیں جاتی۔ جہاں سے ممتحن چاہے فوری طور پر پوچھتا ہے طالب علم کو موقع امتحان پر غور و فکر کا موقع اور وقت نہیں دیا جاتا۔ البتہ داخلہ کے امتحان میں کچھ آسانیاں کی جاتی ہیں۔ اور تحریری امتحان میں بھی کسی جگہ کو کتاب میں سے متعین نہیں کیا جاتا۔ صرف اس دن اور وقت کا اعلان کر دیا جاتا ہے جس میں امتحان ہونے والا ہے۔ پرچہ ہائے سوالات نہایت حفاظت سے چھپوائے جاتے ہیں۔ جنکا پتہ لگنا طلبہ کو محال ہوتا ہے۔ تمام کتاب میں سے جس مقدار کو طلبہ نے پڑھا ہے صرف تین سوال دیئے جاتے ہیں مفروضہ نمبر کچھ نہیں ہوتے اور نہ زائد سوالات دیئے جاتے ہیں تاکہ طالب علم ان دس بارہ سوالات

میں سے انتخاب کر کے جو سوالات پسند آئیں ان کو لکھے اور مفروضہ نمبروں سے ایک تہائی حاصل کر لینے پر کامیاب شمار کیا جا سکے۔ کاش اگر ایسا کیا جا سکتا جیسا کہ سرکاری کالجوں اور یونیورسٹیوں وغیرہ میں رائج ہے) تو شاید ناکام طلباء کا وہاں وجود ہی باقی نہ رہتا۔ امتحان گاہ میں حفاظت وغیرہ کا انتظام مکمل کیا جاتا ہے جسکی بناء پر طلبہ کو استمداد و استعانت کا موقعہ بالکل حاصل نہیں ہوتا مگر افسوس ہے کہ دوسرے مدارس عربیہ میں اسقدر نگہداشت اور سختی نہیں ہوتی جس کی وجہ سے عربی تعلیم میں بہت زیادہ خامیاں ہوتی ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ اور ممتحنین بھی دوسرے مدارس کے امتحانات اور پرچہ ہائے امتحان اور جوابات میں مجبور کئے جاتے ہیں کہ وہ کہیں بھی ایسی سختی عمل میں نہ لائیں جس کے وہ دارالعلوم میں عادی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب دارالعلوم کا طالب علم کسی ادارہ (مولوی فاضل۔ مولوی عالم وغیرہ) میں داخل ہو جاتا ہے یا انگریزی زبان کے درجات میں تعلیم حاصل کر کے امتحان دیتا ہے تو وہ اپنی جماعتوں میں غیر معمولی امتیاز حاصل کر لیتا ہے جس کی نظیریں بکثرت موجود ہیں۔

دارالعلوم میں میں جب داخل ہوا تو اہتمام جناب حاجی عابد حسین صاحب مرحوم کا تھا۔ تھوڑے عرصے کے بعد جناب منشی فضل حق صاحب مرحوم مہتمم مقرر کئے گئے اور حضرت حاجی صاحب مرحوم مذکور الصدر بمنزلہ صدر مہتمم و رکن مجلس شوریٰ ان کے نگہبان ہو گئے۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ مہتمم مقرر ہوئے پھر بعض وقائع کی بناء پر غالباً ۱۳۱۲ھ ہجری میں مولانا الحافظ احمد صاحب خلف الصدق حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہما اللہ تعالیٰ مہتمم مقرر ہوئے اور تاحیات یعنی ۱۳۴۷ھ ہجری تک عہدہ اہتمام پر رونق افروز رہے۔ ان کے زمانہ اہتمام میں دارالعلوم نے بہت زیادہ ترقی کی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ وارضاہ آمین۔

جس زمانہ میں میں داخل مدرسہ ہوا اس زمانہ میں بیشتر طلبہ کی امداد اہالی دیوبند کھانوں سے کیا کرتے تھے۔ اصحاب استطاعت ایک ایک یا دو دو یا اس سے زائد طالب علموں کا کھانا دو وقتہ اپنے یہاں مقرر فرما دیتے تھے اور یہی طریقہ ابتدائی قیام مدرسہ کا تھا۔ وظائف خوراک

نقدی صورت میں ابتداءً بہت کم تھے مگر بعد میں ایسے ناخوشگوار واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے عام طلبہ کو خوراک کے نقدی وظائف دارالعلوم کی طرف سے جاری کرنے ضروری معلوم ہوئے اور پھر کچھ عرصہ کے بعد دارالعلوم میں مطبخ کا انتظام ہوگیا۔ جس کی بنا پر اہل شہر کی امداد طعام اور نقدی وظیفہ تقریباً نفی کے حکم میں ہوگیا۔

ہم تینوں بھائیوں کا بھی اُس زمانہ میں دارالعلوم کی طرف سے کھانا مقرر کیا گیا چنانچہ میرا کھانا حضرت مولانا حافظ احمد صاحب خلف الصدق مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہما کے یہاں اور بڑے بھائی صاحب کا حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں اور بھائی سید احمد صاحب کا دوسری جگہ مقرر ہوا۔ میری مدت اقامت میں تقریباً تمام مدت میں میرا کھانا حضرت حافظ صاحب موصوف رحمۃ اللہ علیہ کے در دولت پر ہی رہا۔ جزاہم اللہ خیر الجزاء۔

کھانوں کے تقرر کی وجہ سے طالب علم بالکل متفرغ ہو کر مشاغل علمیہ میں منہمک ہو سکتا تھا نقدی وظائف یا اپنے پاس سے کھانے میں وقت بہت ضائع ہوتا تھا اگرچہ میں بدشوق اور محنت وجفاکشی سے جان چور ہمیشہ سے تھا مگر بحمداللہ جوں جوں آگے بڑھتا گیا علمی شغف اور طبعی تناسب بھی روز افزوں ہوتا گیا۔ اور اسی وجہ سے لہو ولعب بھی غیر مرغوب ہوگیا۔ اگرچہ بعد میں قیود شدیدہ سے آزاد ہوگیا تھا مگر مجھکو اس سے بہت کم دوچار ہونے کا موقع ملا۔

ابتداءً ابتداء میں مجھکو منطق اور فلسفہ سے بہت شغف رہا۔ پھر علم ادب سے شغف ہوگیا۔ مقامات حریری اور دیوان متنبی اور سبعہ معلقہ کے قصائد اور عبارتیں کی عبارتیں از بر یاد ہوگئیں تھیں۔ پھر علم حدیث سے شغف ہوگیا اور پہلے دونوں شغفوں میں کمی آگئی اور علم حدیث کے انہاک ہی میں دور طالبعلمی ختم ہوگیا۔

ابتداءً نمبر ہائے امتحانیہ ۱۸- ۱۹- ۲۰ مقرر تھے۔ اول درجہ بیس کا تھا اور اوسط اونیس کا اور ادنیٰ اٹھارہ کا اس سے کم نمبر پر طالب علم انعامی نمبروں سے گرا ہوا شمار ہوتا تھا اور اس کو فیل ہونیوالا کہا جاتا تھا۔ اگر کوئی طالب علم غیر معمولی استعداد والا ہوتا تھا اس کو ممتحن بیس سے زائدہ نمبر بھی دیتا تھا جو کہ

درجہ اعلیٰ کے نمبروں میں سے سمجھا جاتا تھا۔ بحمد اللہ اس زمانہ میں اکیس اکیس اور بائیس بائیس اور تئیس تئیس بھی متعدد کتابوں میں نمبر آتے رہے۔ اسکے بعد اراکین مدرسہ نے امتحانی اور تعلیمی ضرورتوں کی بناء پر اس قاعدہ میں تبدیلی کی اور ادنیٰ درجہ کامیابی کا چالیس اور متوسط درجہ پینتالیس اور اول درجہ پچاس مقرر کیا۔ اس تغیر کے بعد امتحانات میں اکاون، باون، ترپن اور صدرا میں پچپن نمبر تک حاصل ہوئے۔ واللہ الحمد۔

ہندوستان سے مدینہ منورہ کا سفر ۱۳۱۶ھ میں جبکہ میں اکثر کتب درسیہ سے فارغ ہوچکا تھا صرف علم ہیئۃ میں سے شرح چغمینی۔ سبع شداد اور ادب میں سے حماسہ۔ تاریخ یمینی طب میں سے موجز قانونچہ، شرح اسباب نفیسی اور علم عروض کی رائج کتابیں۔ فقہ میں سے درمختار وغیرہ باقی تھیں کہ والدصاحب مرحوم کا سامان سفر حجاز دعرب مکمل ہوگیا۔ مزروعہ میں جسقدر بھی والدصاحب مرحوم کے حصہ میں الہداد پور اور جڑاون پور میں تھی اس کو ٹانڈہ کے ایک رئیس نے خرید لیا اور سکنائی زمین اس خیال سے نہیں بیچا کہ مبادا کوئی شخص اولاد میں سے واپس آئے تو کم ازکم اس کے رہنے کے لئے تو کوئی جگہ باقی رہ جائے۔ مسکونہ مکان کی قیمت بھی نہایت کم ملتی تھی اس لئے بھی اس کو فروخت نہیں کیا۔ زمین کی آمدنی اور تنخواہ وغیرہ سے کچھ روپیہ والدصاحب نے پس انداز کر رکھا تھا اس لئے مجموعہ تقریبًا پانچ ہزار روپے ہوگیا تھا ضروریات سفر فرش، لباس وغیرہ بھی سب مکمل کرکے والدصاحب مرحوم نے اعلان کردیا کہ شعبان ۱۳۱۶ھ میں روانہ ہوجائیں گے۔ میں نے استدعا کی کہ مجھکو ایک سال کے واسطے چھوڑ دیا جائے تاکہ میں بقیہ کتب پڑھ لوں اس کے بعد میں آجاؤں گا تو اس کی اجازت نہ دی اور فرمایا کہ مدینہ منورہ میں چل کر پڑھ لینا۔ خلاصہ یہ کہ بارہ آدمیوں کا مختصر سا قافلہ اس سفر کے لئے تیار کیا گیا۔ والدین مرحومین[۲]۔ بھائی محمد صدیق صاحب مرحوم[۴] معہ زوجہ و پسر وحید احمد۔ بھائی سید احمد صاحب مرحوم معہ زوجہ۔ حسین احمد[۹] معہ زوجہ۔ عزیزم[۱۰] محمود احمد سلمہ ہمشیرہ[۱۱] عزیزہ ریاض فاطمہ مرحومہ۔ عزیزم[۱۲] جمیل احمد مرحوم۔

اس برس میں بمبئی اور سواحل بحر ہند میں طاعون تھا اس لئے مغربی ہند کے تمام بندر بند تھے کسی سے جہاز کو سفر کرنے کی اجازت نہ تھی۔ صرف مشرقی ہند خلیج بنگالہ میں چاٹگام سے اجازت شمالی اور مشرقی ہند کے حصوں کے باشندوں کو دیگئی تھی اور قرنطینہ کے لئے پنجاب میں انبالہ، یوپی میں الہ آباد۔ بنگال میں چاٹگام مقرر کیا گیا تھا اور ہر جگہ پر ان میں سے کیمپ جہاز بنائے گئے تھے۔ الہ آباد کیمپ میں شعبان کے آخر میں ہمارا قافلہ داخل ہوا۔ یہ کیمپ شہر سے باہر دریا کے قریب جہاں پر گنگا جمنا ملتے ہیں ایک پرانی کوٹھی میں بنایا گیا تھا۔ دس بارہ دن یہاں قیام کیا گیا۔ ڈاکٹری معائنہ ہوتا تھا۔ اہل شہر میں سے کسی کو ہم سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ کیمپ میں سوائے مامورین کے کسی کو داخل نہیں کیا جاتا تھا۔ مولانا محمد حسین صاحب مرحوم الہ آبادی تشریف لائے تو ان کو بھی اندر داخل ہونے نہیں دیا گیا۔ صرف دروازہ کیمپ پر دور دور سے باتیں ہوسکیں۔ اس عرصہ میں ہمارے تمام کپڑے خواہ مستعمل تھے یا غیر مستعمل ایک بڑے کڑاہ میں دوا ڈالے ہوئے کھولتے ہوئے پانی میں پکائے گئے جس سے ریشمین اور اونی کپڑے اور نئے تھان وغیرہ خراب ہوگئے۔ (حالانکہ دوسرے بڑے بڑے مقامات قرنطینہ میں صرف مستعمل سوتی کپڑے بھاپ کے انجن میں ڈیس فکٹ کئے جاتے ہیں۔ کامران، بمبئی، کراچی وغیرہ میں یہی حال ہے) اگرچہ مدت قرنطینہ صرف دس روز تھی مگر گاڑی وغیرہ کے انتظام کی وجہ سے کچھ دیر لگ گئی اور رمضان کی دسویں یا بارھویں کو ہم روانہ ہوسکے۔ ریل گاڑی میں ایسا ڈبہ منگایا گیا تھا جس میں ایک کمرہ سلاخوں والا تھا جسمیں عموماً خطرناک قیدی سفر کرائے جاتے ہیں۔ اس میں ہم سبھوں کو بٹھایا گیا اور عام مسافروں سے بالکل الگ تھلگ رکھا گیا۔ محافظ کیمپ ہمارے ہمراہ تھا۔ جو کہ اسٹیشنوں پر ہماری حفاظت کرتا تھا کہ کسی شخص سے ہماری ملاقات نہ ہونے پائے۔ اس طرح ہم سفر کرکے الہ آباد بنڈیل، نہٹی گوالنڈو، چاندپور ہوتے ہوئے چاٹگام پہونچے۔ جبتک ہم ای۔آئی۔آر پر سفر کرتے رہے ہماری پوری نگرانی ہوتی رہی۔ جس اسٹیشن پر ایکسپریس ٹھہرتی تھی وہاں سے تار پہونچ جاتا تھا

اور سپاہی کمرہ کے سامنے آکر محافظت کے لئے کھڑا ہو جاتا تھا۔ بنڈیل کے بعد یہ تمام انتظام ختم ہوگیا صرف محافظ کمپ جو کہ ہمدرد مسلمان تھا اس کی نگرانی باقی رہی۔ کرایہ ریل اور جہاز ہم سے پہلے ہی الہ آباد میں وصول کرلیا گیا تھا۔ چاٹگام اسٹیشن سے ایک دو اسٹیشن پہلے پہاڑتلی اسٹیشن کے قریب ریلوے لائن کنارے حجاج کا کمپ بنوایا گیا تھا۔ جو کہ وہاں کی ریتلی پہاڑیوں سے ملا ہوا تھا ایک انگریز افسر تمام کمپ کا مع چند کانسٹبلوں کے محافظ تھا۔ ہم سب اس کمپ میں داخل کردئے گئے اور خس پوش بانس کی پردہ دار بارک میں ہمکو ٹھرا دیا گیا اس کمپ میں پہلے سے صرف صوبہ بنگال کے مختلف اضلاع کے حجاج موجود تھے۔ یوپی سے فقط ہمارا خاندان تھا۔ آخر میں پنجاب سے بھی کچھ لوگ سیالکوٹ وغیرہ کے آگے تھے۔ کچھ ترکستان چینی اور سرحد کے لوگ بھی آئے۔ جہاز کے انتظار میں اسی کمپ میں ایک مہینہ سے کچھ زائد ٹھہرنا پڑا۔ اواخر شوال میں حاجی قاسم کمپنی کا زبیدہ جہاز چاٹگام پہونچا اور ہماری انتظار کی گھڑیاں اختتام کو پہونچیں۔ اس سال اس جہاز کے بعد ایک دوسرا جہاز مرزاپور بھی چاٹگام سے روانہ ہوا تھا۔ اس کے بعد کوئی جہاز نہیں گیا۔

سپرنڈنٹ کیمپ ہملوگوں پر کچھ مہربان ہو گیا تھا اس نے کپتان جہاز سے اوپر کے حصہ پر ایک بہت بڑا کمرہ جو کہ جہاز کے وسطانی حصہ میں کسی زمانہ میں ڈاک کے لئے مخصوص تھا (کیونکہ یہ جہاز غالباً پی لو کمپنی سے حاجی قاسم کمپنی نے خریدا تھا) دلوا دیا جس کی وجہ سے نہایت اطمینان سے تمام خاندان ایک ہی محفوظ و پردہ دار کمرہ میں سفر کرسکا۔ تقریباً سترہ اٹھارہ دن سفر کرکے جہاز عدن ہوتا ہوا کامران پہونچا۔ وہاں ہم سب اتارے گئے اور دس دن تک حجاج کمپ میں ٹہرنا پڑا۔ فی کس دس دس روپیہ فیس قرنطینہ دینی پڑی۔ اب قاعدہ بدل گیا ہے۔ جہاز کے کرایہ کے ساتھ ساتھ کامران کی فیس دس دس روپیہ وصول کرلی جاتی ہے۔

جہاز کامران پہونچتا ہے اور قرنطینہ کے افسر اور ڈاکٹر جہاز پر آکر فیس وصول کرکے اجازت روانگی کی دیتے ہیں۔ کپتان اور جہاز کے ڈاکٹر کی رپورٹ در بارہ صحت مسافرین قابل اعتماد

بھی جاتی ہے۔ ہاں اگر جہاز میں بیماری ہیضہ وغیرہ ہو اور ڈاکٹر رپورٹ کر دے تو مسافروں کو اتارنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔

وہاں سے روانگی کے تیسرے دن جہاز جدہ پہونچا۔ جدہ کے پورٹ اسٹیشن پر پورٹ اسٹیشن کی فیس تقریباً ۸ یا کچھ زائد فی کس لی گئی۔ نیز کرایہ کشتی بھی وصول کیا گیا اسکے بعد ہمکو مطوف کے کارندہ کے حوالہ کر دیا گیا۔ اب پورٹ کی فیس وغیرہ کا قاعدہ بدل گیا ہے جہاز کے ٹکٹ کے ساتھ یہ بھی وصول کر لیا جاتا ہے اور کپتان فی کس مقررہ مقدار حکومت حجاز کو ادا کر دیتا ہے۔ یا کمپنی کے نمایندہ سے حکومت حجاز وصول کر لیتی ہے۔ مشہور ہے کہ اب فی کس ۵۵ روپیہ وصول کئے جاتے ہیں۔ البتہ کرایہ کشتی اب بھی پورٹ اسٹیشن پر وصول کیا جاتا ہے۔ وہاں نکلنے پر کسٹم میں تمام اسباب معائنہ کیا جاتا ہے اور اگر کوئی محصولی مال ہو تو اس پر مقررہ محصول وصول کیا جاتا ہے۔ اور بالآخر ذیقعدہ کی ۲۴ یا ۲۵ تاریخ کو ہم مکہ معظمہ پہونچے۔ سید ابوبکر رشیدی مرحوم کو مطوف بنایا گیا تھا ان کے ایک صبی (کارندہ) بنگالی تھے ان کے مکان پر محلہ جیاد میں قیام کیا۔ اگرچہ ان کا مکان نہایت تنگ تھا مگر ہم لوگ بالکل ناواقف تھے اور ٹھہرنا بھی کم تھا اس لئے کچھ کنج وکاو نہیں کیا گیا مختلف قسم کی تکالیف پر صبر کیا گیا۔ طواف قدوم سے فارغ ہو کر حضرت قطب عالم مولانا الحاج امداد اللہ صاحب تھانوی قدس اللہ سرہٗ العزیز کی بارگاہ عالی میں حاضری کا شرف حاصل کیا۔ اور پھر روزانہ حاضر ہوتے رہے۔ درمیان میں مجھکو چند روز بخار بھی آیا جس سے حاضری میں کمی ہوئی۔ حج اور عمرہ کے مناسک ادا کرنے کے بعد غالباً ۲۵ یا ۲۶ ذی الحجہ کو مدینہ کی روانگی ہوئی اور تقریباً بارھویں دن محرم ۱۳۱۷ھ کی ابتدائی تاریخوں میں مدینہ منورہ میں شرف حضور حاصل ہوا۔ حرم نبوی کے باب النساء کے قریب زقاق البدور کے کنارہ پر ایک مکان کرایہ پر لیکر قیام کیا گیا۔ مگر چونکہ وہ مکان تنگ تھا اس میں کمرے اتنے نہ تھے کہ چار پردہ دار علیحدہ علیحدہ رہ سکیں نیز اس میں کنواں بھی نہ تھا اس لئے سخت تکالیف کا

سامنا ہوا۔

(نوٹ) مدینہ منورہ میں ہر مکان میں کنواں ہونا ضروری ہے جو مکان کنویں سے خالی ہو وہ نہایت کم کرایہ پر اُٹھتا ہے اور لوگ اس میں رہنے سے احتراز کرتے ہیں۔ کیونکہ استعمال کیلئے وضو، غسل، برتنوں کے دھونے، کپڑوں کے دھونے، استنجا، وغیرہ کے لئے پانی کی بہت ضرورت ہوتی ہے اگران مصارف کے لئے سقہ سے پانی منگایا جائے تو بہت زیادہ خرچ پڑتا ہے وہاں پر سقہ اس زمانہ میں صرف ایک مشک پانی پر ڈھائی روپیہ (ایک مجیدی) ماہوار لیا کرتا تھا۔ عموماً سقوں کو صرف پینے اور کھانا پکانے کے پانی کے لئے رکھا جاتا ہے سقے نہر زرقا سے (جس کے تمام شہر میں متعدد مخزن بنے ہوئے ہیں) پانی لاتے ہیں۔ یہ پانی نہایت شیریں اور ہلکا ہے۔ گھروں میں جو کنویں پائے جاتے ہیں ان کا پانی شیریں نہیں ہوتا بلکہ کم و بیش کھاری ہوتا ہے جو کہ استعمال کے لئے کافی ہوسکتا ہے۔

نہر زرقا کی مجمل کیفیت نہر زرقا بنی امیہ کی زمانہ کی جاری کی ہوئی نہر ہے جو کہ قبا کی پہاڑیوں میں سے کھود کر نکالی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مروان بن حکم نے جبکہ وہ وہاں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے حاکم تھا ان کے حکم سے نکلوایا تھا۔ چونکہ اس کی آنکھیں ازرق یعنی نیلگوں تھیں اس لئے اس نہر کو زرقا کہا گیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ مروان بن حکم کی ماں یا دادی کا لقب یا نام زرقا تھا اس لئے اس نہر کا نام زرقا ہو گیا۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کا پانی نہایت صاف و شفاف تھا اور دور سے ازرق یعنی نیلگوں معلوم ہوتا تھا اسلئے اس کو زرقا کہا گیا۔ اب بھی اس کا وہ سوت جو کہ قدیمی ہے اور پہاڑ کی طرف سے مجمع الماء (وہ کنواں جس میں دو سوت جمع کئے گئے ہیں) میں گرتا ہے نہایت صاف اور شفاف ہے اوپر سے نیلگوں ہی معلوم ہوتا ہے۔ غرضکہ یہ نہر بہت قدیمی ہے اور تمام شہر مدینہ منورہ میں اسی کا پانی استعمال کیا جاتا ہے مگر یہ نہر کاریزہ کی طرح سے زمین دوز ہے۔ سطح زمین کی اونچائی کی وجہ سے نیچے نیچے لائی گئی ہے اور شہر میں مختلف مقامات پر اس کے مخزن بنائے

گئے جنہیں پتھر کی وسیع پیمانہ پر سیڑھیاں لگا دی گئی ہیں لوگ نیچے اُتر کر نہر سے پانی بھرتے ہیں لوہے کی ٹونٹیوں سے ہر وقت پانی گرتا رہتا ہے اس سے مشکیں اور برتن بھرے جاتے ہیں۔ یہ ٹونٹیاں دن و رات جاری رہتی ہیں۔ بعض جگہوں پر اسی نہر میں کنواں بنا دیا گیا ہے اس میں ڈول رسی سے کام لیا جاتا ہے چونکہ قدیمی نہر کا پانی بعد کو شہر کے لئے کافی نہیں ہوتا تھا اس لئے قبا کے چند کنوؤں کا بھی پانی (جس میں سے بیر ادیس بھی ہے جسکو بیر خاتم بھی کہتے ہیں کیونکہ اسی کنویں میں جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی انگوٹھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے یا ان کے غلام سے گر کر مفقود ہوگئی تھی) ملا دیا گیا ہے قباء کے باہر ایک مجمع الماء ہے جو کہ بشکل وسیع کنویں کے بنا ہوا ہے وہاں دونوں سوت آکر مل جاتے ہیں۔ کنوؤں والا سوت اگرچہ شیریں ہے مگر اس کا پانی گدلا ہے۔ قبا کے تمام کنویں شیریں ہیں اور زمین بھی شیریں ہے اور اسی طرح قربان اور عوالی کا بھی حال ہے اس کے علاوہ چند اور بھی زمین دوز نہریں قبا اور دیگر اونچی سطحوں سے نکالی گئی ہیں مگر وہ شہر کے باہر باہر گذرتی ہیں ان کا پانی اسقدر شیریں نہیں ہے۔ یہ نہریں باغوں کے واسطے نکالی گئی ہیں۔ مدینہ منورہ کے شمال و مغرب کی زمین بہت پست ہے وہاں پہنچکر یہ نہریں سطح باغات پر آجاتی ہیں اور باغوں میں کھیتی اور درختوں کی آب پاشی انھیں نہروں سے ہوتی ہے۔ جبل اُحد کے غربی اور شمالی جوانب میں ایسے بہت سے باغات ہیں۔ ان کو عیون کہتے ہیں۔ انھیں میں یہ نہریں گذرتی ہیں اور ان کا پانی انہیں میں ختم ہو جاتا ہے۔ حضرت امیر معاویہ رضؓ کے زمانہ میں ان کی جد و جہد کی وجہ سے بہت سی نہریں نکالی گئی تھیں اور مدینہ منورہ میں اس قدر زراعت بڑھ گئی تھی کہ غلہ مدینہ منورہ کے مصارف سے بچکر ملک شام وغیرہ کو تجارت کے لئے ہزاروں من کی مقدار میں جاتا تھا۔ مگر درمیانی زمانہ کے انقلابات نے ان نہروں کو بند کر دیا تھا۔

سلطان عبدالمجید خاں مرحوم نے اس طرف توجہ کی اور تعمیر حرم محترم نبوی علیہ السلام کے

بعد کچھ نہریں جنکا سراغ مل سکا صاف کرائیں (واضح ہو کہ موجودہ تعمیر مسجد نبوی کی سلطان موصوف ہی کی بنوائی ہے جس میں بہت زیادہ مصارف کی نوبت آئی ہے) ان باغوں اور نہروں سے غلّہ اور کھجوریں وغیرہ پیدا ہوتے ہیں مگر کافی نہیں ہوتے۔

(نوٹ) مدینہ منورہ کی جنوبی اور مشرقی جانب اونچی ہے اس کی سطح پر متعدد بستیاں کچھ فاصلہ پر آباد ہیں درمیان میں کھجوروں، انار، انگور، انجیر، آڑو وغیرہ کے باغات ہیں۔ انھیں بستیوں کو عوالی کہتے ہیں انہیں میں سے قربان اور قبا بھی ہیں۔ زمانہ رسالت (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) اور زمانہ خلافت میں یہاں آبادیاں بہت تھیں مگر اب بہت کم رہ گئیں ہیں۔

نہر زرقاء کے لئے ترکی حکومت نے اخیر زمانہ میں انجن لگوا کر نلوں کے ذریعہ پانی شہر میں تقسیم کر دیا تھا جس کی وجہ سے اہل شہر کو بہت آسانی ہو گئی ہے مگر وہ مخازن سابقہ بحالہا قائم ہیں۔

الغرض زقاق البدور کے اس مکان کی دشواریاں دیکھ کر دوسرے مکان کو لینے اور پہلے عقد اجارہ کو فسخ کرنے کا ارادہ کیا گیا۔ مدینہ منورہ میں مکانات ماہواری کرایہ پر نہیں ملتے بلکہ سالانہ کرایہ پر ملتے ہیں البتہ حجاج کو یومیہ کے حساب سے یا تا قیام قافلہ کرایہ پر دئے جاتے ہیں جو کہ بہت گراں پڑتا ہے۔ ماہ محرم میں مکانات کرایہ پر اٹھائے جاتے ہیں۔ حارۃ الآغادات میں ایک وسیع مکان لیا گیا اور اس میں قیام کیا گیا غالباً وہ مکان ایک سو بیس ۱۲۰ روپیہ میں لیا گیا تھا۔

حضرت والد صاحب مرحوم نے مدینہ منورہ پہونچکر جو مقدار نقود کی مصارف سے بچی تھی حسب حصص شرعیہ ہم لوگوں پر تقسیم کر دی اور فرمایا کہ میں نے تو ہجرت کی نیت کی ہے اس لئے میں تا زیست یہاں ہی رہونگا۔ تم لوگوں کو اختیار ہے کہ یہاں رہو یا ہندوستان چلے جاؤ۔ یہ روپیہ واپسی کے لئے کافی ہے۔ ہم لوگوں نے ہجرت کی نیت نہیں کی تھی

کیونکہ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہُ العزیز اور پھر حضرت قطب عالم حضرت حاجی امداداللہ صاحب قدس سرہ العزیز نے ہجرت کی نیت کرنے سے منع فرمادیا تھا اور یہ ارشاد فرمایا تھا کہ ہجرت کرنے والوں پر امتحانات شدیدہ ہوتے ہیں جس میں اکثر لوگ پھسل جاتے اور ہجرت توڑ کر اوطان کو واپس ہو جاتے ہیں اور گنہگار ہوتے ہیں۔ صرف قیام کی نیت کرنا اگر احوال سازگار ہوئے قیام کرنا ورنہ جب جی چاہے واپس ہو جانا۔ حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے تو یہ بھی فرمایا تھا کہ میں نے بھی ہجرت کی نیت اس وقت کی تھی جبکہ میں ایک مرتبہ بیمار ہو کر زندگی سے مایوس ہو گیا تھا اور فرمایا کہ جس کو صرف دنیا مقصود ہو تو وہ جدہ میں رہے اور جس کو دین و دنیا مقصود ہو تو وہ مکہ معظمہ میں رہے اور جس کو صرف دین مقصود ہو وہ مدینہ منورہ میں رہے کیونکہ ہندوستانیوں کیلئے خصوصاً اور دوسروں کے لئے عموماً جدہ میں اسباب معیشت بہت اور آسان ہیں اور مکہ معظمہ میں اس سے زیادہ اور سہل تھے مکہ معظمہ میں ہندوستانی بکثرت آباد بھی ہیں مگر مدینہ منورہ میں اسباب معیشت نہایت ہی کم ہیں اور گرانی زیادہ ہے۔ بہرحال ہم میں سے کسی نے بھی سوائے حضرت والد صاحب مرحوم کے ہجرت کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ صرف قیام کا ارادہ تھا مگر والد صاحب مرحوم کو اکیلا چھوڑ کر چلا آنا نہ والدہ ماجدہ مرحومہ کو گوارا ہوا اور نہ اور کسیکو سب نے ایک زبان ہو کر کہا کہ ہم جبتک آپ زندہ ہیں یہاں ہی رہیں گے۔ والد صاحب مرحوم نے فرمایا کہ یہ نقد ہمیشہ کے لئے کافی نہیں ہو سکتا کوئی آمدنی ہندوستان سے ہمیشہ جاری رہنے والی نہیں ہے۔ عموماً اہل مدینہ کی گذران ان وظائف اور تنخواہوں پر ہے جو کہ ان کو ترکی حکومت یا دوسرے ممالک سے ہے اس لئے کوئی طریقہ معیشت کیلئے عمل میں لانا چاہیے۔ اسلئے قرار پایا کہ تجارت کی جائے۔ کیونکہ کوئی دوسری صورت ملازمت یا دستکاری یا زراعت وغیرہ کی ممکن نہ تھی۔ جنانچہ باب الرحمۃ اور باب السلام کے درمیان میں ایک دوکان کرایہ پر لیگئی جس میں پرچونی سامان چاء، شکر، صابن، چانول، دال وغیرہ

رکھا گیا۔ تھوک فروش تاجروں سے خرید کر مال لایا جاتا تھا اور وہاں پھٹکر طریقہ پر فروخت کیا جاتا تھا۔ نیز قرار پایا کہ کھجوروں کے موسم میں جبکہ باغوں سے کھجوریں نکلکر نیلام کے بازار میں آتی ہیں خرید لی جائیں اور ان کو محفوظ مخزنوں میں ذخیرہ کر لیا جائے اور موسم حج میں ان کو فروخت کر دیا جائے۔ مدینہ منورہ میں کرایہ کے ایسے مکانات ہیں جن میں بڑے بڑے مغربی مٹکے رکھے ہوئے ہیں۔ یہ مٹکے افریقہ کے مغربی شمالی حصہ میں مٹی کے نہایت مضبوط بنائے جاتے ہیں۔ ان کا منہ چھوٹا ہوتا ہے۔ نہایت مضبوط ہوتے ہیں افریقہ سے جہازوں اور کشتیوں پر عرب کے بندرگاہوں تک لائے جاتے ہیں اور پھر اونٹوں پر لاد کر کے مدینہ منورہ پہونچائے جاتے ہیں۔ مدینہ منورہ میں لوگوں کی آمدنی کے لئے یہ جائداد کا حکم رکھتے ہیں۔ ان کا کرایہ سال بھر کے لئے کیا جاتا ہے۔ اگرچہ عرب اور مدینہ منورہ میں بکثرت مٹکے بڑے منہ والے مختلف مقدار کے بنائے جاتے ہیں مگر وہ اتنے مضبوط اور کارآمد نہیں ہوتے وہ اقسام کھجوروں کے جن میں کیڑے لگجانے کا خوف زیادہ ہوتا ہے۔ ان مٹکوں میں بھر کر خوب دبا دی جاتی ہیں اور پھر اوپر سے ام جردان (حلیۃ) کھجور بھر کر پھر نمک بھر کر مٹی سے مٹکوں کا منہ بند کر دیا جاتا ہے اس طرح سے کھجوریں سال سال دو دو سال محفوظ رہتی ہیں

مدینہ منورہ میں کھجوروں کی بہت سی قسمیں پیدا ہوتی ہیں خلاصۃ الوفا اور دیگر تاریخی کتابوں میں ان کے اقسام تقریباً ایک سو تیس ذکر کئے گئے ہیں ہر ایک قسم کا مزہ، رنگ، وضع وغیرہ جدا جدا ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں تقریباً چالیس قسمیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ ہر ایک صنف علیحدہ علیحدہ فروخت ہوتی ہے۔ ام جردان بھی ایک قسم کھجوروں کی ہے اس زمانہ میں اس کا نام حلیۃ ہے۔

رطب (تازہ و تر کھجور) کے زمانہ میں سب سے پہلے اس کی ہی رطب ہوتی ہے اور بکثرت کھائی جاتی ہے سوکھنے کے بعد یہ سیاہ اور سخت ہو جاتی ہے۔ اس کے دانے چھوٹے ہوتے ہیں اور سوکھنے کے بعد اس میں جلے ہوئے گڑ کا مزہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی پیداوار بہت ہے۔ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے جب پہلے پہل قبا میں وارد ہوئے تو آپ کے سامنے کلثوم

بن الہدم رضی اللہ عنہ نے اسی کا خوشہ پیش کیا تھا وہ زمانہ رطب کا تھا آپ نے اس کے لئے دعا فرمائی تھی۔ اس کھجور کو مٹکوں میں رکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

خلاصہ یہ کہ کئی سو روپے کی کھجوریں اس طرح خرید لی گئیں اور رباط العجم میں مخزن کرایہ پر لے لیا گیا اور وہ اس کے مٹکوں میں بھر دی گئیں اور بعض اقسام جو کہ بغیر مٹکوں میں بھرنے کے محفوظ رہ سکتی ہیں جیسے ام جرذان (حلیہ)، لُبانہ، سُخَل (بیدانہ) وغیرہ وہ سکونت کے مکان میں کھلی جگہ ذخیرہ کر لی گئیں۔ تھوک مال کی خرید بڑے بھائی مولانا محمد صدیق احمد صاحب مرحوم کرتے تھے ان کو اس کا شوق بھی تھا اور مہارت بھی بہت جلد حاصل ہو گئی تھی۔ دوکان پر میں اور بھائی سید احمد صاحب مرحوم باری باری بیٹھتے تھے اور کبھی کبھی بڑے بھائی صاحب مرحوم بھی بیٹھتے تھے۔ تھوڑے عرصہ میں تجربہ سے معلوم ہوا کہ اس طریقہ سے اگرچہ آمدنی ہے مگر کرایہ دوکان اور دیگر مصارف منہا کرنے کے بعد آمدنی اتنی نہیں ہو سکتی جو کہ روزمرہ کے اخراجات کو کافی ہو سکے۔ اس لئے میں نے سلسلہ کتابت علی الاجرت شروع کر دیا۔ عربی نسخ خط میں کتابیں نقل کرتا تھا اور اجرت حاصل کرتا تھا۔ مدینہ منورہ میں اس وقت دو کتب خانہ منتظم تھے ایک کتب خانہ شیخ الاسلام[1] اور دوسرا محمودیہ۔ ان دونوں میں قلمی کتابیں نایاب بکثرت تھیں۔ مجاورین مدینہ (باہر کے باشندے جو مدینہ منورہ میں قیام پذیر ہیں) اور اہالی شہر اور زائرین کو بسا اوقات کسی کتاب کی ان کتبخانوں میں سے ضرورت پڑتی ہے تو وہ ان کو نقل کرواتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی مصر یا مغربی افریقہ وغیرہ سے بھی لوگ کسی کتاب کی نقل چاہتے ہیں تو اپنے نمایندوں کے ذریعہ سے یہاں سے نقل حاصل کرتے ہیں۔ مگر ہر دو کتب خانوں میں اس کی اجازت نہیں تھی کہ کتاب کتبخانہ سے باہر نکالی جائے۔ البتہ انتظام تھا کہ جو شخص کسی کتاب کو نقل کرنا یا مطالعہ کرنا چاہے وہ کتبخانہ

---

[1] کتب خانہ شیخ الاسلام اب بھی منتظم حالت میں ہے مگر کتب خانہ محمودیہ منتظم نہیں رہا۔ ان دونوں کے لئے استنبول میں اوقات تھے جنکی آمدنی کا بڑا حصہ اس نظام کے لئے صرف ہوتا مگر موجودہ حکومت ترکیہ نے ان کو ضبط کر لیا ہے۔

ہی میں آکر استفادہ کرے۔ روزانہ کتب خانہ ۳ بجے عربی (یعنی ۹ بجے افرنجی) سے لیکر ۱۰ بجے عربی (۴ بجے افرنجی) تک کھلا رہتا تھا۔ اس لئے بجز اس مدت کے دوسرے اوقات میں لکھنا ممکن نہ ہوتا تھا۔ بنا بریں آمدنی بہت تھوڑی ہوتی تھی۔ اس زمانہ میں چند اور بھی اشخاص یہ مشغلہ کرتے تھے۔ باقی اوقات میں مشاغل سلوک اور درس وتدریس کا سلسلہ میں نے جاری کرلیا تھا۔ نیز چونکہ ادبیات میں بعض کتابیں باقی رہ گئی تھیں اس لئے مدینہ منورہ کے مشہور اور معمر ادیب مولانا الشیخ افندی عبدالجلیل برادہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس شام کو کچھ ادب کی کتابیں ہم تینوں بھائی پڑھتے رہے۔ مشاغل سلوک کی تفصیل علیحدہ آئے گی۔

مدینہ منورہ میں درس وتدریس کا سلسلہ

درس وتدریس کی تفصیل یہ ہے کہ اواخر شعبان ۱۳۱۶ھ میں جبکہ ہم تینوں بھائی دیوبند سے آخری طور پر روانہ ہوئے تو منجملہ رخصت کرنے والوں کے خود حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز ساتھ ساتھ اسٹیشن دیوبند تک پیدل تشریف لائے تھے۔ راستہ میں پُر زور طریقہ پر ہدایت فرمائی کہ پڑھانا ہرگز نہ چھوڑنا۔ چاہے ایک دو ہی طالب علم ہوں۔ اس لئے تعلیمی مشغلہ کا خیال بہت زیادہ ہوگیا تھا۔ مدینہ منورہ پہونچنے کے بعد بعض بعض طلبہ ہندوستانی اور عرب بعضی کتابوں کی تدریس کے خواستگار ہوئے اگرچہ عربی زبان میں عرصہ تک کتابیں پڑھنے کی نوبت آئی تھی مگر بولنے کی مشق نہ تھی اس لئے اشکال کا سامنا ہوا مگر حسب ہدایت حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اوقات کتابت کے علاوہ دوسرے اوقات میں اس کام کو شروع کردیا (اس زمانہ میں بہت سے علماء اعزازی طریقہ پر حرم محترم نبوی (مسجد نبوی علیہ السلام) میں پڑھایا کرتے تھے۔ اس سے مجکو ایک تو یہ فائدہ ہوا کہ ابتدائی کتابیں صرف ونحو وفقہ وغیرہ کی محفوظ ہوگئیں۔ اور دوسرے یہ کہ زبان صاف ہوگئی اہل علم میں عموماً اور علماء حجاز میں خصوصاً حسد اور رقابت کا مادہ بہت ہوتا ہے۔ اس لئے جب کوئی عالم آتا ہے تو اس کی طرف آنکھیں بہت اٹھتی ہیں اور تنقیدی معاملات اکثر پیش آتے ہیں۔ علماء ہند چونکہ عربی بولنے کے عادی نہیں ہوتے اس لئے بسا اوقات شکست کھاجاتے ہیں

اگرچہ مدینہ منورہ میں پہلے سے علمائے ہند کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی کیونکہ حضرت شیخ محمد عابد انصاری سندی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے بعد حضرت شاہ عبد الغنی نقشبندی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے بعد حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ردولوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد اسحٰق صاحب امرتسری رحمۃ اللہ علیہ بڑے بڑے پائے کے علماء گذرے تھے جنکے غیر معمولی علم اور اعلیٰ استعداد و قابلیت کا سب کو اقرار تھا۔ بہت سی تصانیف اور بہت سے شاگرد ان کے وہاں موجود تھے۔ آخر الذکر ہر دو حضرات اس زمانہ میں زندہ بھی تھے۔ اگرچہ حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب کی جلالی اور زاہدانہ طبیعت کی وجہ سے عام طور پر لوگوں کو استفادہ ممکن نہ ہوسکا تھا مگر انکی اعلیٰ استعداد اور انتہائی قابلیت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔

بہرحال ہمارے جیسے ٹٹ پونجیوں کے لئے ان عربی علماء کے میدان امتیاز و امتحان میں پیش قدمی یا اعتبار پیدا کرنا نہایت مشکل امر تھا اس لئے ہمارا گوشۂ گمنامی میں ایک ایک دو دو طالب علموں کو پڑھانا اور ابتدائی کتب نحو و صرف و فقہ وغیرہ سے اشتغال رکھنا بہت مفید ہوا۔ سنہ ۱۳۱۶ھ شوال تک میں اسی طرح ابتدائی کتابیں مختلف فنون کی دو دو چار چار طالبعلموں کو پڑھاتا رہا۔ حلقات درس و تدریس میں کوئی امتیازی شان پیدا نہیں ہوئی اس لئے کسی کی تنقیدی نظر نہیں پڑی۔ سنہ ۱۳۱۶ھ ذیقعدہ میں حضرت قطب عالم مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز کے ارشاد کے موافق گنگوہ شریف کا سفر کیا اور سنہ ۱۳۱۷ھ ماہ محرم میں واپس مدینہ منورہ پہونچا اس وقت سے سلسلہ تعلیم بڑے پیمانہ پر جاری ہوا۔ جس کا مفصل حال آگے آئیگا۔

مدینہ منورہ کی معیشت ان ایام کی | اگرچہ حسب دعوات نبویہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ) مدینہ منورہ میں برکات مادیہ بھی بڑے درجہ میں پائی جاتی ہیں اور پیمانہ ہائے ارزاق صاع و مد و وزن وغیرہ میں اسقدر برکت محسوس ہوتی ہے کہ اور جگہ مکہ معظمہ میں بھی اس کا آدھا تہائی حصہ بھی نہیں پایا جاتا۔ اور کیوں نہ ہو۔ ارشاد ہے اللھم اجعل بالمدینۃ ضعف ما بمکۃ

من البرکۃ اور دوسری روایت ہے ضعف مایمکۃ من البرکۃ - مگر باوجود اس کے وہاں گرانی اور مالوفات وطنیہ کے نہ پائے جانے اور اسباب معیشت کی قلت بلکہ عدم موجودگی وغیرہ کی وجہ سے ہر ملک کے باشندوں کو نہایت سختیاں پیش آتی ہیں نیز باشندگان مدینہ منورہ اگرچہ عموماً نرم طبیعت اور خوش اخلاق ہیں مگر اپنے آپ کو تمام عالم اسلامی سے اشرف اور سب کا پیرزادہ سمجھتے ہیں کسی بیرونی شخص کو مساوات کا درجہ اپنے قلب اور دماغ میں نہیں دے سکتے ہیں۔ حالانکہ عموماً بیرونی ہی اشخاص کی اولاد میں کسی کو دو کسی کو تین کسی کو چار یا کم وبیش پشتیں مدینہ منورہ میں رہتے ہوئے ہوگئی ہیں۔ زمانہ سعادت علیہ الصلوٰۃ والسلام سے آج تک کا رہنے والا کوئی خاندان وہاں نہیں ہے۔ ایک گھرانہ انصار میں سے کہا جاتا ہے مگر اس کی بھی دو یا تین پشتیں باہر گذری ہیں۔ مگر جو شخص بھی مدینہ منورہ میں پیدا ہوا ہے وہ باہر کے لوگوں کو اپنے سے نیچا اور کمتر دیکھتا ہے چاہے وہ لوگ اس کے باپ دادا کے ہم وطن بلکہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ بالخصوص اگر بیرونی شخص کی زبان عربی نہ ہو وہ تو اور بھی گرا ہوا ان کی نظروں میں معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایک امر طبعی بھی ہے کیونکہ ہر ملک اور قوم میں غریب الوطن خواہ وہ اپنے وطن میں کیسا ہی عزت والا کیوں نہ ہو۔ کم درجہ کا اور ضعیف شمار ہوتا ہے۔ پھر اہل مدینہ کو جناب رسالتمآب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ شرف مجاورت (پڑوسی ہونا) کا شرف نہایت غیر معمولی شرف ہے اس کی وجہ سے ان کو جو بھی برتری حاصل ہو کم ہے۔ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے المدینۃ مھاجری ومضجعی من الارض وحق علی امتی ان یکرموا جیرانی ما اجتنبوا الکبایر فمن لم یفعل ذلک سقاہ اللہ من طینۃ الخبال عصارۃ اھل النار (قط فی الافراد عن جابر) (طب عن معقل بن یسار) اس کے علاوہ شرف مدینہ اور مجاورین مدینہ کے متعلق کنز العمال جلد ٦ اور دیگر کتابہائے حدیث موجود ہیں۔

علاوہ ازیں اپنے وطنی رشتہ داروں اور احباب جن سے سلاسل زندگانی وطن میں وابستہ

تھے وہ سب چھوٹے ہوئے ہوتے ہیں اور سابقہ ان لوگوں سے پڑتا ہے جو کہ بالکل اجنبی اور نئے ہوتے ہیں وہ اس نو وارد کے مرتبہ اور عزت سے واقف نہیں ہوتے اور نہ وہ اُن لوگوں کے مراتب سے واقف ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ مختلف وجوہ سے نو وارد آفاقیوں کو وہاں پر سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا من صبر علی لاوائھا کنت لہ شفیعا او شہیدا یوم القیامۃ (جس نے مدینہ کی سختیوں پر صبر کیا تو میں اس کی خصوصی شفاعت قیامت میں کروں گا یا یہ فرمایا کہ میں اس کی بہتری کی گواہی دوں گا) دوسری روایت میں فرمایا۔ من استطاع ان یموت بالمدینۃ فلیمت بھا فانی اکون لہ شفیعا او شہیدا یوم القیامۃ (جس سے یہ ہو سکے کہ مدینہ منورہ میں مرے تو یہاں ہی مرے کیونکہ میں اس کی خصوصی شفاعت کروں گا یا فرمایا کہ خصوصی گواہی دوں گا۔)

ہم لوگوں کو بھی بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا بالخصوص عورتوں کو۔ ان کے وطن اور اعزہ سے تو ان کو جدا ہونا ہی پڑا تھا۔ یہ مصیبت بجائے خود کیا کم تھی مگر وہاں قیام کی صورت میں افلاس اور عادات و رسوم و اختلاف مواسم و ہوا وغیرہ کی وجہ سے بھی نئی نئی مشقتیں اُٹھانی پڑیں۔ اگرچہ ہمارا خاندان غریب تھا مگر تاہم بہت سے کاروبار خانہ داری برتن مانجھنا یا دھونا جھاڑو دینا وغیرہ گھر میں نوکر عورتیں انجام دیا کرتی تھیں مگر وہاں پہنچکر یہ سب کام بھی انھیں کو کرنے پڑتے تھے۔ کھانا پکانا تو یہاں وطن میں بھی حسب معمول غرباان کو انجام دینا ہوتا ہی تھا مزید براں اُن کو آٹا بھی خود ہی پیسنا پڑا۔ حالانکہ یہ مشقت کبھی بھی ان کو وطن میں تحمل کرنی نہ پڑی تھی۔ والدہ مرحومہ باوجود ضعیف العمری بہت زیادہ جفاکش اور عالی ہمت تھیں اپنی ہر بہو کی اگرچہ باری مقرر کردی تھی مگر خود ہر ایک کے ساتھ چکی پیسنے میں اور دوسرے کاروبار میں لگی رہتی تھیں۔ علی ہذا القیاس عورتوں کو اپنے اور اپنے خاوندوں اور بچوں کے کپڑے بھی

دھونے پڑتے تھے حالانکہ اس کا سابقہ کبھی بھی ان کو وطن میں نہ ہوا تھا۔ مگر مدینہ منورہ میں سب لوگ اپنے اپنے گھروں ہی میں کپڑے دھوتے ہیں۔ متوسط طبقہ اور غریب طبقہ والوں کی بیویاں دھوتی ہیں اور بڑے طبقہ والوں کی باندیاں دھوتی ہیں۔ عموماً گھروں میں استری اور کلف کا سامان پایا جاتا ہے۔ اہل مدینہ نہایت خوش پوشاک اور خوش خوراک ہیں مگر دھوبیوں کا دستور نہیں۔

اس میں عورتوں کو ابتدا ابتدا میں ناگواری ہوئی مگر چارہ ہی کیا تھا کرنا پڑا اور آہستہ آہستہ عادت ہوگئی۔ ہم مردوں کو بھی بسا اوقات کپڑوں کا دھونا اور مشکوں میں میٹھا پانی کندھوں پر لاد کر لانا پڑتا تھا جس کو ہم رات کو جبکہ نہر کے مخزن کی بھیڑ کم ہو جاتی تھی انجام دیتے تھے یہ کام مجھکو اور بھائی سید احمد صاحب مرحوم کو انجام دینا پڑتا تھا۔ کیونکہ ایک مشک پانی جو کہ روزانہ سقہ سے لیا جاتا تھا بارہ آدمیوں کے پینے اور کھانے میں ڈالنے کے لئے کافی نہ ہوتا تھا۔

کھانا بھی سرمایہ اور محاصل کی کمی کی وجہ سے نہایت معمولی ہوتا تھا۔ والد مرحوم نہایت منتظم طبیعت کے تھے اکثر بازار کی سستی سے سستی ترکاری لاتے تھے اور کبھی کبھی گوشت اور اکثر دال پکتی تھی۔ روٹی اور چانول حسب عادت وطن مستعمل ہوتے تھے۔ کھجوروں کی تجارت مذکورہ میں نفع تو ہوا مگر کم۔ البتہ کھجوریں کھانے میں بہت آئیں۔

۱۳۱۶ھ کے محرم میں ایک دوسرا مکان کرایہ پر لیا گیا جو کہ بہ نسبت پہلے کے زیادہ صاف اور وسیع تھا۔ سرمایہ روزانہ مصارف میں کم ہوتا گیا۔ کیونکہ دوکان کی آمدنی کم ہوتی تھی اور بہت سے لوگوں نے قرض لے کر ادا کرنے کا نام تک نہیں لیا اس کی وجہ سے بہت زیادہ سرمایہ ضائع ہو گیا۔ ہم میں اتنی طاقت نہ تھی کہ عربوں وغیرہ سے لڑائی کریں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو فی الجملہ آمدنی حد کفالت تک ضرور ہوتی۔ مختلف تجربوں کے بعد ۱۳۱۶ھ کے اواخر میں یہی مناسب معلوم ہوا کہ دوکان اٹھالی جائے۔ بھائی سید احمد صاحب مرحوم کو

بعض نووارد سیٹھوں کے یہاں بچوں کے تعلیم کی ملازمت ملگئی - اور مجھکو اور بڑے بھائی
صاحب کو ذیقعدہ ۱۳۱۸ھ میں سفر ہندوستان پیش آگیا - ہر دو کے پاس تقریباً ساٹھ
ساٹھ روپیہ سفر کے لئے تھا - (اس کی تفصیل علیحدہ آئے گی) یہ زمانہ گھروالوں پر نہایت
سخت گذرا - بھائی سید احمد صاحب مرحوم کی تنخواہ صرف ۲۰ روپیے ماہوار تھی - اندوختہ
باقی نہ تھا - ہم دونوں سفر میں تھے - اس لئے تنگ ہوکر والد صاحب مرحوم نے ۵۰ روپئے
ایک اپنے ملنے والے میمن سیٹھ سے قرض لئے اور اس کی دال چانول خریدی - ایک وقت
کھچڑی اور ایک وقت نمکین بیچھ پر تمام گھر والوں کا گذران کئی ماہ تک رہا - ہم جبکہ ہندوستان
پہونچے تو والد صاحب مرحوم کے پیر بھائیوں نے جن کے والد صاحب مرحوم سے بہت
زیادہ تعلقات تھے کچھ روپئے آپس میں چندہ کرکے ہدیۃً والد صاحب مرحوم کو دیئے اُن کو
ہم نے بذریعہ ہنڈی بھیجا تب والد صاحب مرحوم نے وہ قرض ادا کیا اور کسی درجہ میں کھانے
پینے میں وسعت کی - یہ ہی چند مہینے ہمارے گھر والوں پر سختی کے مدینہ منورہ میں گذرے ہیں
اس کے بعد آہستہ آہستہ فراخی ہوتی گئی - بحمد اللہ فاقوں کی نوبت کسی کو اور کبھی نہیں آئی - حالانکہ
بہت سے لوگوں کو مہینوں فاقوں کی نوبت آئی ہے - قطب عالم حضرت حاجی امداد اللہ
صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کو فرماتے ہوئے میں نے خود سُنا کہ ایک ہفتہ تک موصوف
کو صرف زمزم کے پانی پر گذارہ کرنا پڑا - اس اثناء میں ایک مخلص دوست سے جو کہ بہت
زیادہ اخلاص کا مدعی تھا چند پیسے قرض مانگے تو اس نے ناداری کا بہانہ کرکے انکار کر دیا حالانکہ
واقع میں وہ نادار نہ تھا - حضرت قدس اللہ سرہٗ العزیز نے فرمایا کہ میں اس کے انکار سے
سمجھا کہ منشاء الوہیت یہی ہے اس لئے میں بھی صبر کرکے چپکا ہو گیا - ایک ہفتہ گذر جانیکے
بعد جبکہ ضعف و نقاہت بہت زیادہ ہو گیا تھا رات میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی
قدس اللہ سرہ العزیز کو خواب میں دیکھا کہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم نے تمکو اپنے باورچی خانہ کا ناظم
اور مہتمم بنا دیا - صبح کو اندھیرے میں ایک شخص نے دروازہ کھٹکھٹایا میں نے دروازہ کھولا تو اس نے

ایک تھیلی دی جس میں سو ریال تھے اور پھر چلا گیا۔ اس کے بعد سے عسرت نہیں ہوئی۔ اسی طرح حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مجددی دہلوی اور حضرت شاہ احمد سعید صاحب مجددی دہلوی قدس اللہ اسرارہما اور ان کے خاندان والوں پر عرصہ تک فاقوں کی نوبتیں آتی رہیں مگر ہمارے خاندان والے اس امتحان شدید سے محفوظ رہے اور ہونا بھی یہی چاہئے تھا ایمان کی قوت کے موافق امتحان ہونا چاہئے۔ اشد الناس بلاءً الانبیاء ثم الامثل فالامثل۔

حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دعا بھی رخصت کرتے وقت ہمارے لئے فرمائی تھی کہ اللہ تعالیٰ اس خاندان کو امتحانات شدیدہ میں مبتلا نہ فرمائے کیا عجب ہے کہ یہ اسی کا اثر ہو۔

۱۳۵۰ھ کے آخر میں یہ واقعہ پیش آیا کہ جبکہ ہم سفر ہند میں تھے کہ مالک مکان نے (جس میں سب سکونت پذیر تھے اور امتحان کی شدید گھڑیاں گذر رہی تھیں) نوٹس دیا کہ سال ختم ہو رہا ہے یا تو سال بھر کا کرایہ مع زیادتی دو یا گھر خالی کرو۔ یہ امر نہایت دشوار تھا روزمرہ کا خرچ تو دو چار آنہ میں چل سکتا تھا مگر کرایہ مکان سال بھر کا بجز سوا سو ڈیڑھ سو کے نہیں ادا ہو سکتا۔ اگر مرد ہی مرد ہوں تو کہیں بھی گلی کوچہ مدرسہ میں رہ کر (مسافرخانہ وغیرہ) میں گذر کر لے پردہ نشین عورتوں اور بچوں کو کہاں لیجایا جائے۔ مالک مکان سے کچھ مہلت طلب کی گئی مگر وہ راضی نہوا۔ مدینہ منورہ میں بعض بعض مسافرخانہ (رباطین) پردہ دار خاندانوں کے لئے وقف ہیں مگر کوئی جگہ خالی نہ تھی۔ بہت زیادہ دوڑ دھوپ کے بعد بیرون باب مجیدی ایک مکان ایک حیدر آبادی رئیس نواب جانی میاں صاحب کا ملا جو کہ زیر تعمیر تھا۔ روپیہ ختم ہو جانے کی وجہ سے اس کی تعمیر رکی ہوئی تھی۔ اس میں متعدد کمرے پردہ دار تھے۔ اس کے متولی صاحب ڈاکٹر محمد خواجہ مرحوم حیدرآبادی نے مہربانی کر کے رہنے کو تا اجراء تعمیر مفت دیدیا۔ اس مکان میں دروازے کھڑکیاں طاقچے وغیرہ نہیں تھے صرف صدر دروازہ چیر کی لکڑی کا لگا ہوا تھا مگر حضرت والد صاحب مرحوم کو یہ ہی غنیمت معلوم ہوا۔

مالک مکان حیدرآباد ہی میں تھے۔ الحاصل تمام گھرانہ یہاں آگیا۔ اور ٹاٹ کے پردوں وغیرہ سے ہوا اور سردی وگرمی اور پردے کا تحفظ کرلیا گیا۔ مگر ان حالتوں سے حضرت والد صاحب کی سمجھ میں آگیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو مکان بنانا ضروری ہے۔ بغیر مکان کے رہنا نہیں ہوسکتا۔ وہ اس فکر میں تگ و پو کرنے لگے۔ عمارت میں مدینہ منورہ میں بہت زیادہ خرچ ہوتا ہے اور نقد کچھ پاس نہ تھا مگر ان کی عالی ہمتی میں کمزوری نہ ہوئی ایک افتادہ زمین جس میں کسی زمانہ میں کھجوروں کا باغ تھا فروخت ہوتی ہوئی قریب میں معلوم ہوئی۔ یہ زمین حجرہ مطہرہ نبویہ کے خاص خادموں آغادات حرم (خصی غلام خادمین حجرہ مطہرہ نبویہ) پر وقف تھی ایسی زمینیں بیکار رہنے کے بعد بحکم قاضی فروخت کیجاتی ہیں جس میں منافع زمین فروخت کردئے جاتے ہیں اور اصل زمین برائے وقف باقی رکھی جاتی ہے جس کا کرایہ سالانہ خریدار کو حسب قرارداد متولی وقف دینا پڑتا ہے یہ کرایہ معمولی ہوتا ہے زمینیں بحسب مخازن فروخت ہوتی ہیں (ایک مخزن بیس گز لانبا اور پانچ گز چوڑا ہوتا ہے) فی مخزن کچھ قیمت مقرر ہوجاتی ہے۔ اس زمانہ میں زمینیں سستی تھیں۔ وہاں مکانات مثل ہندوستان پھیلے ہوئے صحن والے نہیں بنائے جاتے بلکہ تین تین چار چار طبقہ کے اونچے مثل بمبئی کلکتہ وغیرہ کے بنائے جاتے ہیں اس لئے اگر کوئی پھیلا ہوا مکان بنائے بھی تو اولاً گرانی زمین کی وجہ سے خرچ زیادہ پڑتا ہے۔ ثانیاً اردگرد کے اونچے مکانات کی وجہ سے پردہ محفوظ نہیں ہوسکتا۔ چونکہ اس وقت والد صاحب مرحوم کے پانچ بیٹے اور ایک بیٹی تھی اس لئے اتنا بڑا قطعہ خریدنا ضروری ہوا جس میں چھ مکان بنجائیں۔ چنانچہ ایک نقشہ بنا کر اتنا بڑا قطعہ خرید لیا اس قطعہ میں باغ کا اصلی کنواں اور مٹی کا بہت بڑا ڈھیر بھی پڑتا تھا جو کہ زمانہ قدیمہ میں باغ کی عمارت کا گرا ہوا ڈھیر تھا۔ روپیہ پاس نہ تھا مگر جب حضرت والد صاحب مرحوم نے سفر سے بچا ہوا سرمایہ تقسیم کیا تھا تو بہن (ریاض فاطمہ مرحومہ) کا حصہ بھی لگایا تھا۔ سبھوں کا روپیہ تو ضروریات میں خرچ ہوتا رہتا تھا مگر اس کا حصہ اس کے نکاح

کے مصارف کے لئے محفوظ رکھا تھا اس میں سے پانچسو روپیہ قرض لیکر زمین کی قیمت میں ادا کیا گیا۔ ایک اور مشکل حائل تھی کہ حسب قوانین دولت ترکیہ کسی غیر رعایا کو کوئی ملکیت حاصل کرنے کا اختیار نہ تھا۔ رعیت نامہ حاصل کرنے کے لئے عرصہ درکار تھا۔ اس لئے فوری کارروائی یہ کیگئی کہ زمین بنام ڈاکٹر رفاقت علی صاحب مرحوم والد ماجد مولانا عبدالحق صاحب مدنی مہتمم مدرسہ شاہی مسجد مراد آباد (جو کہ عرصہ دراز سے مدینہ منورہ میں مقیم اور حکومت ترکیہ میں بعہدہ ڈاکٹر افواج ملازم اور میجری کا رتبہ رکھنے والے اور اصلی باشندہ دیوبند تھے) خریدی گئی اور بیعنامہ انھیں کے نام رجسٹری کرالیا گیا۔ اور اُدھر رعیت نامہ کی درخواست دیدی گئی۔ چونکہ کسی انگریزی یا دوسری حکومت کی رعیت کے لئے اسی وقت رعیت نامہ دیا جاسکتا تھا جبکہ اس کی سابقہ حکومت اجازت دیدے اور دعویدار نہ ہو۔ اسلئے وہ عرضی جدہ میں انگریزی وائس کونسل کے پاس باضابطہ بھیجی گئی اور وہاں سے بعد از استصواب حکومت ہند تحریر آئی کہ ہم کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تب حضرت والد صاحب مرحوم کے نام پر رعیت نامہ جاری کیا گیا۔ اس میں تقریباً چھ مہینے یا زیادہ لگ گیا۔

رعیت نامہ آجانے کے بعد ڈاکٹر صاحب مرحوم نے زمین کا بیعنامہ حضرت والد صاحب مرحوم کے نام کردیا۔ اسی زمانہ میں وہ روپیہ جو والد صاحب مرحوم کے پیر بھائیوں اور احباب نے دیا تھا اور ہم نے ہنڈی کرکے بھیجدیا تھا پہونچ گیا۔ جس سے ہمشیرہ مرحومہ کا روپیہ بھی ادا کردیا گیا۔ اور مٹی کے ڈھیر سے کچی اینٹیں تھپوالی گئیں۔ اس ڈھیر میں دبے ہوئے بہت سے پتھر قدیم عمارت کے نکلے جو کہ عمارت میں کام آئے اور بہت مفید ثابت ہوئے۔ اور تھوڑے سے پتھر خرید بھی لئے گئے اور ضروری سمجھا گیا کہ تمام قطعہ زمین کا احاطہ بنوالیا جائے۔ چنانچہ ہمارے پہنچنے سے پہلے تمام زمین کا چاروں طرف سے احاطہ بنوالیا گیا۔ بنیادوں میں پتھر لگائے گئے اور اوپر کی دیوار کچی اینٹوں کی تقریباً بارہ تیرہ فٹ یا زیادہ اونچی بنوالی گئی جس سے تمام قطعہ کی زمین محفوظ اور مستور ہوگئی۔

ہم دونوں بھائی جبکہ سنہ ۱۳۱۸ھ کے محرم میں گنگوہ شریف سے واپس حج بدل وعمرہ
اداکرتے ہوئے مدینہ منورہ پہونچے تو یہ احاطہ بنا ہوا تھا (ہماری واپسی ہندوستان سے
حج بدل پر ہوئی تھی بجز اس کے کوئی صورت واپسی کی قلت سرمایہ کی وجہ سے نہیں ہو سکتی
تھی حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز ہی نے یہ دونوں حج بدل اپنے بعض رشتہ داروں
کے دلوائے تھے جس میں مدینہ منورہ تک پہونچ جانے کا صرفہ تھا) اس وقت تمام
خاندان ان حیدر آبادی رئیس کے مذکورہ بالا مکان میں مقیم تھا۔ مدینہ منورہ پہونچنے کے بعد
میں شمسیہ باغ معروف بہ تواطیہ کے مدرسہ میں (جس کو اس زمانہ ہی میں جاری کیا گیا تھا)
بعہدہ مدرسی عہ روپیے ماہوار میں ملازم ہو گیا۔ بڑے بھائی صاحب مرحوم بھی ایک
نو وارد سورتی سیٹھ کے یہاں اس کے بچوں کی تعلیم کے لئے ملازم ہو گئے۔ میں نے اس زمانہ
میں مشغلہ کتابت ترک کر دیا اور چونکہ طلبہ کا ہجوم ہوا اس لئے خارج از مدرسہ اوقات میں
حرم محترم نبوی میں کتابیں پڑھانے لگا۔ صبح کی نماز کے بعد، عصر کے بعد، مغرب کے بعد
بلکہ عشا کے بعد بھی مختلف علوم و فنون کی کتابیں شروع کرادیں۔ اب اس وقت میں طلبہ
کی مقدار کی زیادتی کی وجہ سے لوگوں کی آنکھیں اٹھیں اور تنقیدات کا ارادہ کیا گیا۔ مگر چونکہ
زبان عربی صاف ہو چکی تھی اور ابتدائی کتابیں منج گئی تھیں ادھر میں نے حافظہ کی تقویت کے
لئے علماء خیر آباد کا طریقہ اختیار کیا تھا کہ نفس کتاب یا شرح یا حاشیہ پڑھاتے وقت سامنے
نہ رکھتا تھا بلکہ طالب علم کے قراءت عبارت کے بعد مسائل پر تقریر کرتا اور سمجھاتا تھا
گھر پر کتاب اور اس کی شرح و حواشی خوب دیکھ کر مسائل کو منضبط کر کے جاتا تھا (حالانکہ
علماء مدینہ وغیرہ نہ صرف کتاب بلکہ اس کی شرح بھی ہاتھ میں لیکر پڑھایا کرتے تھے اور تقریر
کرتے وقت اکثر عبارت شرح یا حاشیہ کی سنا دیتے تھے بالعموم یہی طریقہ رائج تھا البتہ
خاص خاص ماہر حضرات بلا کتاب پڑھاتے تھے مگر ان کے پاس نہ تمام علوم و فنون کی
کتابیں ہوتی تھیں اور نہ وہ زیادہ وقت صرف کرتے تھے) اس لئے عام طلباء اور علماء میں

دھاک بیٹھ گئی اور سمجھنے لگے کہ اس کو تمام فنون درسیہ میں نہ صرف مہارت ہے بلکہ محفوظ بھی ہیں۔ اسی بناء پر سمجھدار اور جد وجہد کرنے والے طلبہ کا اجتماع میرے پاس بہت زیادہ ہو گیا۔ جس سے متعدد مدرسین حرم محترم کو حسد ہوا اور رقابت بھی پیدا ہو گئی ناظر مدرسہ شمسیہ باغ کو اصرار تھا کہ جو طلبہ تجھ سے پڑھتے ہیں وہ مسجد نبوی میں نہیں بلکہ مدرسہ میں آکر پڑھا کریں مگر سب طلبہ اس پر راضی نہ ہوئے۔ طلبہ صرف اہل مدینہ ہی نہ تھے بلکہ ترک۔ بخاری، قازانی قزق، ترکستانی، کابلی، مصری، وغیرہ بھی تھے۔ ناظر مدرسہ کا یہ بھی اصرار تھا کہ خارج از مدرسہ اوقات میں کہیں بھی نہ پڑھایا جائے۔ اس قسم کی چند اور باتیں پیش آئیں جن کی وجہ سے بمجبوری مدرسہ کی ملازمت سے استعفا دینا پڑا اور یہ ارادہ کر لیا گیا کہ لوجہ اللہ بلا معاوضہ حرم محترم میں اسباق پڑھائے جائیں اور رزق کو اسکے کفیل جناب باری عز اسمہ کی کفالت پر رکھا جائے۔ چنانچہ استعفار دینا پڑا۔ اور کتب درسیہ کا میدان وسیع کر دیا گیا۔ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز کی بارگاہ میں ان اسباق کی فہرست اور مشاغل کی تفصیل لکھی اور یہ عرض کیا کہ جو تعلیم طریقت کے شغل کی عالیجاہ نے فرمائی ہے جب اس کے لئے بیٹھتا ہوں تو نیند غالب آجاتی ہے۔ نیز خطرات اور وساوس سخت پریشان کرتے ہیں ادھر طلباء علوم کا اصرار بہت زیادہ ہے مجبور ہو کر میں نے دن ورات کا اکثر حصہ اسی میں صرف کر رکھا ہے۔ جواب میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ پڑھاؤ خوب پڑھاؤ۔ اس سے ہمت زیادہ بڑھ گئی۔ روزانہ چودہ اسباق پڑھاتا تھا۔ پانچ سبق صبح کو تین یا چار ظہر کے بعد دو عصر کے بعد دو مغرب کے بعد ایک عشاء کے بعد۔ وہاں ظہر کی نماز زوال ہوتے ہی پڑھی جاتی ہے اور عصر کی بعد مثلین ہوتی ہے اس لئے ظہر اور عصر کے درمیان میں بہت وسیع وقت ملتا ہے۔

ڈاکٹر محمد خواجہ صاحب مرحوم ناظر مدرسہ شمسیہ کو ان کی عدم تابعداری اور استعفار کیوجہ سے کاوش ہو گئی اور انھوں نے نوٹس دیدیا کہ مکان خالی کر دو ہمکو تعمیر کرانی ہے ایک مہینہ کی مہلت تم کو دیجاتی ہے اس بناء پر والد صاحب مرحوم نے ضروری سمجھا کہ احاطہ مذکورہ میں ہی

چند کمرے گذران کے لائق اپنے ہاتھوں سے بنالئے جائیں کیونکہ نہ کسی مکان کے مستقل کرایہ پر لینے کی طاقت ہے اور نہ مکان بنوانے کی ۔ سرمایہ کوئی نہ تھا اور اگر کچھ ہوتا بھی تو دوسرے کے مکان میں خرچ کرنے سے بہتر اپنے مکان میں خرچ کرنا تھا۔ کچی اینٹیں پتھوائی ہوئی موجود تھیں ۔ عورتوں اور بچوں کو لیکر روز وہاں جاتے تھے اور خود اپنے ہاتھ سے دیوار بناتے تھے اور ہم تینوں اینٹیں ڈھوتے تھے اور عورتیں گارا لاتی تھیں ۔ الحاصل اسی طرح احاطہ کے جانب شرقی شمالی میں پانچ کوٹھریاں ایک غسل خانہ ایک پاخانہ اور ایک پردہ کی دیوار ان تمام کوٹھریوں کے سامنے اپنے ہی ہاتھوں سے سب نے ملکر بنائی ۔ کوٹھریوں کی دیواریں کچی اینٹوں کی تھیں ۔ چھت اتنی اونچی بنائی گئی کہ اگر چارپائی پر کھڑے ہوں تو سر چھت میں نہ لگے مگر زیادہ نیچی بھی نہ رہے ۔ کڑی کی جگہ ببول کی موٹی موٹی شاخیں جو کہ بدوی لوگ شہر میں فروخت کرنے کے لئے لاتے ہیں دور دور لگائی گئیں اور ان پر کھجور کے پتوں کے ڈنٹھر قریب قریب بچھائے گئے اور ان پر کھجور کے بوریئے بچھا دیئے گئے اور ان پر گلاوہ (تر مٹی) بچھا کر خشک مٹی ڈالدی گئی ۔ چھت اتنی مضبوط نہ تھی کہ بلا تکلف اس پر آدمی چل سکے اور نہ اتنی موٹی تھی کہ زور کی بارش کو روک سکے ۔ چھپر کی طرح ڈھلوان رکھی گئی تھی ۔ اس طرح پر دھوپ اور سردی سے حفاظت ہو گئی معمولی بارش کی بوندوں سے بھی حفاظت ہوتی تھی مگر زور کی بارش میں (جو کہ مدینہ منورہ میں بہت کم ہوتی ہے) سب پانی اندر آتا تھا ۔ اس طرح پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرات کی مشابہت حاصل ہو گئی ۔ تقریباً پندرہ بیس روز کی محنت و مشقت میں یہ تعمیر پوری ہو گئی پڑھنا پڑھانا ان دنوں بالکل بند کر دیا گیا تھا ۔ زیادہ تر محنت حضرت والد صاحب مرحوم کرتے تھے وہ اگرچہ ضعیف العمر تھے ۔ مگر عالی ہمت اور جفاکش ہم نوجوانوں سے بہت زیادہ تھے ۔ ان سے بلا مشغلہ بیٹھا نہیں جاتا تھا ۔ اس عمارت کے تیار ہو جانے پر ہم سبھوں کو اس قدر خوشی ہوئی کہ جو حد بیان سے باہر تھی ۔ گویا کہ ہم سب قید غلامی سے آزاد ہو گئے ۔ اپنے مکان میں جہاں چاہیں بیٹھیں جہاں چاہیں سوئیں جہاں چاہیں پانی گرائیں

روشنی کھلی ہوئی تھی ہوائیں بڑے صحن دار مکان کی طرح آتی تھیں کوئی ٹوکنے اور کہنے والا نہ تھا کرایہ کا فکر تقاضوں کا کھٹکا باقی نہ رہا تھا۔ پانی بھی اس کنویں کا تقریباً شیریں تھا۔ صرف پینے اور کھانا پکانے کے لئے ایک مشک پانی سقہ لاتا تھا۔ الحاصل بہت زیادہ اطمینان کی صورت یہاں پیدا ہوگئی۔ اور سابقہ مکان کو جس میں پہلے سے رہتے تھے ایک مہینہ کی میعاد سے پہلے ترک کر کے یہاں چلے آئے۔ ان ہی کوٹھریوں میں نہایت آزادی اور بشاشی کے ساتھ کئی سال متواتر جب تک احاطہ کے جنوب و مغرب والا مکان کے دو طبقہ مکمل تیار نہ ہوگئے رہنا ہوا۔ اس تعمیر کو دیکھ کر اور لوگوں کو بھی شوق پیدا ہوا اور ارد گرد میں تھوڑے ہی عرصہ میں متعدد عمارتیں بن گئیں۔ اور آبادی روز افزوں ترقی کرنے لگی۔ زمینیں گراں ہوگئیں۔ بالخصوص جبکہ ریل آگئی تو اس طرف کی آبادی بہت زیادہ بڑھ گئی۔ افسوس کہ شریف حسین کے فتنہ کے بعد یہ تمام حصہ اجاڑ ہوگیا اور اس قدر بدامنی بعد کے زمانہ میں پھیلی کہ وہاں بود و باش مشکل ہوگئی۔

بھائی سید احمد صاحب مرحوم کا سفر گنگوہ شریف

جناب بھائی سید احمد صاحب بھی سفر مدینہ منورہ زیدشرفا کرتے وقت حضرت قطب عالم گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے تھے مگر جبکہ میں طلب کیا گیا اور بڑے بھائی صاحب مجھ سے پہلے چھپکر روانہ ہوگئے تھے اور پھر مکہ معظمہ سے ملکر ساتھ ساتھ ہندوستان اور گنگوہ شریف پہونچے تھے (جیسا کہ آگے مفصل آئیگا) تو بھائی سید احمد مرحوم کا ہماری واپسی پر تقاضا ہوا کہ اب مجھکو اجازت ہونی چاہئے تاکہ میں بھی بارگاہِ رشیدیہ میں پہونچکر منازل سلوک طے کروں۔ والدین ماجدین رحمۃ اللہ علیہما ایسے مقاصد جلیلہ میں بہت زیادہ شیر دل تھے انھوں نے خوشی سے اجازت دیدی اور ۱۳۲۰ھ کے اواخر میں وہ روانہ ہوکر گنگوہ شریف پہونچے اور تقریباً تین سال متواتر ان کو اس بارگاہ عالی میں حاضر باشی اور خدمت گذاری کا شرف حاصل رہا۔ حضرت قطب عالم رحمۃ اللہ علیہ کا وصال بھی انہیں کے زمانہ حاضری میں ہوا۔ وصال کے چند مہینہ کے بعد وہ واپس مدینہ منورہ ہوئے۔ ان کو اگرچہ حضرت قدس اللہ سرہٗ العزیز نے

اجازت بیعت اور خلافت عطا نہیں فرمائی تھی مگر حضرت شیخ الہند اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہما نے بعد کو اجازت عطا فرمادی تھی۔ تاہم جہاں تک مجھے معلوم ہے بھائی صاحب مرحوم نے سلسلہ ارشاد و تلقین جاری نہیں فرمایا۔ واللہ اعلم

ہاں ان کی عالی ہمتی اور بے انتہا جد وجہد سے مدرسہ شرعیہ مدینہ منورہ وجود میں آیا جس سے بحمد اللہ علوم دینیہ اور حفظ و قراءت قرآن کا عظیم الشان سلسلہ جاری ہوا اور اب تک جاری ہے۔ یہ صدقہ جاریہ اللہ تعالیٰ کی نہایت مبارک اور اعلیٰ درجہ کی نعمت ہے۔ اللہ تعالےٰ قبول فرمائے۔ اور بانی مرحوم اور اہل امداد و اعانت کے لئے موجب فلاح و نجاح ہو۔ آمین۔

وظائف کا بہم لوگوں کے لئے تقرر

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ عموماً اہل مدینہ کی گذران کا ذریعہ انکے وہ وظائف ماہانہ یا سالانہ تھے جو کہ دولت عثمانیہ ترکیہ یا دوسری اسلامی ریاستوں اور امراء وغیرہ کی طرف سے آیا کرتے تھے اور لوگوں کو مختلف حیلوں سے دیئے جاتے تھے۔ مسجد نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ) میں تقریباً ڈیڑھ سو یا اس سے زائد اذان دینے والے مقرر تھے دو سو سے زائد امام تھے جنمیں تقریباً ستر اشخاص خطیب تھے سال میں ایک مرتبہ خطیب کی باری آتی تھی اسی طرح مسجد شریف میں جھاڑو دینے والوں، روشنی کرنے والوں، حجرہ مطہرہ نبویہ کی خدمت کرنے والوں، عماراتی کاموں کو انجام دینے والوں وغیرہ وغیرہ کی بہت بڑی تعداد تھی جن کی بڑی بڑی تنخواہیں خزینہ جلیلہ (محکمہ اوقاف حرم محترم نبوی) سے جاری تھیں۔ یہ اوقاف سلاطین آل عثمان اور دیگر امراء بلاد اسلامیہ کیطرف سے ممالک ترکیہ اور عربیہ وغیرہ میں زیر نظارت حکومت ترکیہ سے اسی طرح اور بہت سے امراء اسلام کی طرف سے خصفے تھے۔ وہاں خصفہ اس جماعت کو کہتے ہیں جو کہ وقت معین پر مسجد نبوی میں جمع ہو کر قرآن شریف یا بخاری شریف یا دلائل الخیرات یا حزب اعظم وغیرہ پڑھکر صاحب خیرات کے لئے دعا کرتے ہیں اور ماہوار ان کو تنخواہ دی جاتی ہے اس دعاگوئی کی جماعتوں کی بہت بڑی تعداد ہمیشہ رہتی تھی۔ اگرچہ مدینہ منورہ میں تجارت اور زراعت پیشہ لوگ

بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں اور اس زمانہ میں بھی تھے مگر وہاں کی تجارت اور زراعت اور دیگر پیشے اسقدر کمزور تھے کہ وہاں کی گرانی اور اعلیٰ معیار معیشت کو (جوکہ وہاں کے لوگوں میں بہت زیادہ پھیل گیا تھا) متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ حجاج کی آمد کے وقت میں اکثر لوگ سائل اور بھیک مانگنے والے نظر آتے ہیں۔ اُن کے معیشت کے اعلیٰ معیار کے لئے یہ آمدنیاں بھی کافی نہیں ہو سکتیں اور یہی وجہ ہے کہ اکثر اہل مدینہ مقروض ہو کر دیار اسلامیہ کا سفر کرتے ہیں اور مسلمانوں سے استدعا اعانت و امداد کرتے ہیں۔ زمانہائے سابق میں معیار معیشت نہایت سادہ اور قلیل المصارف بدویانہ تھا۔ اس لئے وہ ایسے شرمناک اطوار اختیار نہ کرتے تھے اور قناعت و صبر کی زندگی جفاکشی اور محنت کا طریقہ اختیار کئے ہوئے تھے۔

زراعت میں صرف وہی شخص کامیاب ہو سکتا ہے جس کے پاس سرمایہ بھی ہو اور خود اپنے اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ دن رات زراعت میں لگا رہے۔

افسوس کہ جنگ عمومی کے بعد جبکہ حکومت ترکیہ کا تعلق حجاز، شام، فلسطین، عراق سے اوٹھ گیا اور شریف حسین اور عربوں کی غداری نے عالم اسلامی اور بالخصوص ملک عرب کو اعداء اسلام کے آہنی پنجوں میں ڈالدیا تو یہ وجوہ وظائف وخیرات اور آمدنی اوقاف ممالک ترکیہ سب بند ہو گئیں، استنبول اور ایشیائی روم کے اوقاف پر نئی حکومت ترکیہ نے قبضہ کرلیا اور ان کو قومی اور ملکی مصارف میں صرف کرنے لگے۔ جو وظائف سلاطین آل عثمان اپنی جیب خاص سے اہل حرمین کو دیتے تھے جس میں بڑا حصہ اہل مدینہ کا تھا وہ بوجہ ابطال ملوکیت سب بند ہو گیا۔ شام کے اوقاف پر فرانس نے قبضہ کرلیا۔ وعلیٰ ہذا القیاس عراق اور فلسطین وغیرہ میں بھی ایسی ہی صورتیں پیش آئیں اس لئے اہل حرمین کی حالت نہایت ناگفتہ بہ ہو گئی۔

ریاست بھوپال اور حیدر آباد سے بھی خصفے وہاں جاری تھے، بالخصوص رئیس

بھوپال نواب سلطان جہاں بیگم مرحومہ کے جانے کے بعد بھوپال سے یہ خیرات بہ نسبت سابق زیادہ ہو گئی تھی۔ مکہ معظمہ میں تو اس کا سلسلہ نواب سکندر جہاں بیگم مرحومہ والدہ ماجدہ نواب شاہ جہاں بیگم مرحومہ والیہ ریاست بھوپال کے زمانہ سے جاری تھا مگر مدینہ منورہ میں بہت تھوڑی مقدار پر نواب شاہ جہاں بیگم نے جاری کیا تھا۔ ریاست حیدرآباد کی طرف سے پہلے سے بڑے پیمانہ پر اس قسم کے خیرات کے مختلف سلسلے جاری تھے رباطین، مسافرخانے، ہسپتال وغیرہ خود ریاست کی طرف سے بھی اور بعض بعض امراء ریاست کی طرف سے بھی جاری تھے۔ ہندوستانی مہاجرین اور مقیمین حرمین شریفین کی ان وسائل سے عموماً پرورش ہوتی تھی۔ خلاصہ یہ کہ عموماً اہل مدینہ منورہ کے معاشیات کا دارومدار ان ازمنۂ اخیرہ میں بالخصوص سلطان عبدالحمید خاں مرحوم کے زمانہ سے وظائف پر ہو گیا تھا اعلیٰ طبقہ کے لوگ دیگر ذرائع کی طرف بہت ہی کم توجہ کرتے تھے۔ اس سے پہلے زمانہ میں آبادی بھی کم تھی اور حجاز کی کفالت دولت مصریہ کے سپرد تھی وہاں کے ترکی گورنر اور خدیوی یکے بعد دیگرے متعدد اوقاف کی آمدنیوں سے حجاز کی خبر گیری رکھتے تھے۔ وقفی زمینوں سے خاندانوں کے نام گیہوں کی مقداریں سالانہ جاری تھیں اس مقدار کو اردب کہتے تھے (ایک اردب غالباً چوبیس مد کا ہوتا ہے اور ایک مد چھ سیر پختہ کا ہوتا ہے) اس طرح سے کسی کے نام ایک کسی کے نام دو یا زیادہ اردب سرکاری دفتر میں لکھے ہوئے تھے سالانہ یہ غلہ مصر سے آتا تھا اور ایک مخزن میں جسکو شونہ کہتے تھے جمع کیا جاتا تھا اور حسب کاغذات اہالی مدینہ منورہ اور اہالی مکہ کو تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ بدوؤں کے قبائل کے لئے بھی اسی طرح غلہ مقرر تھا۔ علاوہ ازیں بدوی قبائل کے لئے نقد بھی مقرر تھا۔ جو کہ محمل شامی کے ساتھ (استنبول اور شام و روم کے اوقاف وغیرہ سے) اور محمل مصری کے ساتھ (مصر کے اوقاف وغیرہ سے) آتا تھا اور ہر منزل پر بدوی قبائل کے شیوخ کو اور بعض بعض کو مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ میں دیا جاتا تھا۔ ان وظائف اور غلہ جات سے صرف

بدوی قبائل کی پرورش ہی مقصود نہ تھی بلکہ یہ بھی مقصود اعظم تھا کہ یہ حجاج و زوار کو نہ ستائیں بلکہ اُن کی حفاظت کے ذمہ دار بنیں۔ زمانہ سابق میں لوٹ مار کرنے والے قبائل نے اپنے افلاس کا اظہار کر کے لوٹ مار کا سبب یہ ہی بتایا تھا اس لئے سلاطین سابقہ نے اُنکے لئے یہ وظائف مقرر کر دیئے تھے تاکہ بسر اوقات کی صورت ہو اور قبائل حجاج کو نہ ستائیں۔ زیادہ خرابیاں حجاز میں جو بدوی قبائل سے ظہور میں آتی رہیں ان کا سبب بھی یہی ہوا۔ کیونکہ شرفائے مکہ جو کہ حکومت مصریہ اور بعد کو حکومت ترکیہ کی طرف سے مقرر ہوئے تھے اور قبائل عربان (بدوی) اور اہل حجاز کی نگرانی اُنکے ذمہ کی جاتی تھی وہ جائز یا ناجائز وجوہ سے یہ مقررہ وظایف قبائل کو وقت پر نہیں پہونچاتے تھے اس لئے وہ قبائل قوافل حجاج کو لوٹتے تھے۔ اگر یہ چیز سلاطین سابقہ سے مقرر نہ ہوئی ہوتی یا مقرر ہونے کے بعد وقت پر پہونچتی رہتی تو یہ مشکلات پیش نہ آتیں۔

چنانچہ عثمان پاشا مرحوم جبکہ والی حجاز مقرر ہوا تو اس نے شریف مکہ کے اختیارات میں مداخلت کر کے ان کو عضو مفلوج بنا دیا اور تمام قبائل بدویہ کا مقررہ وظیفہ ان کے منازل میں پہونچانے کا انتظام دائمی کر دیا۔ اس کا اثر اس قدر قوی ہو گیا کہ لوٹ و غارت بالکل بند ہو گئی اور امن کامل حجاز میں ایسا پھیل گیا کہ حجاج و زوار ایک ایک دو دو اونٹ پر سفر کرتے تھے اور کوئی گزند ان کو نہیں پہونچتا تھا۔ حکومات اسلامیہ مصریہ اور ترکیہ نے اپنے تمام قلمرو میں ہتھیار کی آزادی دے رکھی تھی اس لئے بدوی قبائل بارہا حکومت کے مقابلہ پر بھی آجاتے تھے اور کشت و خون کی نوبت آتی تھی۔ آج بھی حکومت سعودیہ نے اُسی قسم کا مکمل امن و امان قائم کر دیا ہے۔ جو کہ عثمان پاشا کے زمانہ میں تھا۔ مگر یہ سیاست دہشت کی اور جابرانہ ہے جس کو ترکی حکومت نے ممالک اسلامیہ میں کبھی جاری نہیں کیا بمجبوری کبھی کبھی ایسی دہشت کی نوبتیں آتی تھیں مگر بہت کم اور اس میں بھی جانب لطف و مرحمت ملحوظ رہتی تھی۔ سعودی حکومت نے شریر اور سر برآوردہ فسادی لوگوں کو قتل کر دیا

اور تمام قبائل سے ہتھیار چھین لئے اور پولیس و فوج کی شدید نگرانی قائم کردی جس کی وجہ سے حجاز کی کایہ پلٹ ہوگئی اور مکمل امن و امان کا دور دورہ ہوگیا۔ موجودہ بدوی قبائل اور عربی طبائع کے لئے ہمیشہ سے یہی طریقہ موزوں ہے۔

علاوہ ازیں حکومت مصریہ کا دونوں جگہوں (مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ) میں مستقل لنگرخانہ قائم تھا اور اب تک قائم ہے جس میں روزانہ فقراء اور مساکین کو صبح کو روٹی اور شوربا تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس لنگرخانہ کو تکیہ مصریہ کہتے ہیں۔ اس کی نہایت شاندار اور وسیع عمارت مدینہ منورہ میں باب العنبریہ کے پاس قشلہ کے مقابل موجود ہے اور اسی طرح مکہ معظمہ میں بھی ہے۔ بہت سے مساکین صرف اسی پر گذران کر لیتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ ۱۳۲۰ھ ہی میں بعض کرم فرماؤں کی عنایت و توجہ سے حضرت والد صاحب مرحوم کے لئے پندرہ بیس روپیہ ماہوار کا وظیفۂ دعاگوئی بھوپال سے مقرر ہوگیا۔ جس سے بڑی ڈھارس پیدا ہوگئی۔

نواب سلطان جہاں بیگم مرحوم کی آمد پر لوگوں نے ان کو خصفہ بنانے کی ترغیب دی چنانچہ انھوں نے دس بارہ آدمیوں کو بخاری شریف روزانہ پڑھنے اور دعا کرنے کے لئے مقرر کیا ان میں کچھ لوگ اہل مدینہ تھے اور کچھ ہندوستانی۔ ہندوستانیوں میں بڑے بھائی صاحب کا اور میرا نام بھی تھا۔ اور کچھ عرصہ بعد بھائی سید احمد صاحب کا بھی نام آگیا تھا۔ ہر شخص کو دس دس روپیہ ماہوار مقرر کیا گیا تھا۔ بعض لوگوں کو خصوصی وظائف بھی بیگم صاحبہ مرحومہ نے مقرر فرمائے تھے مسجد نبوی میں ٹھنڈے پانی کی سبیل بھی بیگم صاحبہ مرحومہ نے جاری فرمائی تھی۔ چونکہ نقشوں کا مرتب کرنا اور خط و کتابت اور مراسلات وغیرہ کو انجام دینا ناظر ایصال وظایف مدینہ منورہ شیخ حسن عبدالجواد صاحب سے نہیں ہو سکتا تھا وہ اردو نوشت و خواند اور حساب سے واقف نہ تھے اس لئے محرر کی ضرورت پڑی اور انھیں کی درخواست پر مجھکو ۱۵؎ ماہوار پر یہ خدمت بھی سپرد کی گئی۔ میں تعطیل کے ایام میں یعنی جمعہ اور سہ شنبہ کو اس کو ہمیشہ انجام دیتا تھا کیونکہ حرمین

شریفین میں ہفتہ میں یہ دو دن تعطیل کے ہوتے ہیں۔ انمیں درس و تدریس عام طور پر نہیں ہوتی۔ پھر آخر میں میرا نام خصفہ میں باقی نہیں رہا بلکہ پوری تنخواہ للعہ ماہوار انھیں تحریرات کے سلسلہ میں کردی گئی۔ نواب بھاولپور مرحوم بھی بسلسلہ زیارت حرمین و حج و عمرہ تشریف لے گئے تو مولانا رحیم بخش صاحب مرحوم (جو کہ وزیر اعظم ریاست اور بہت دخیل تھے اور جن سے پہلے بھی ہماری کچھ شناسائی تھی کیونکہ وہ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز کے متوسلین میں سے تھے اور نواب صاحب مرحوم کی آمد سے پہلے بھی مدینہ منورہ آچکے تھے) کی سعی سے لمنہ روپیہ ماہوار مقرر ہو گئے مگر یہ رقم سالانہ سالگرہ کے جشن پر آیا کرتی تھی۔

اس طرح پر مجموعہ خاندان کی ایک دائمی آمدنی رفتہ رفتہ ہو گئی اور فی الجملہ اتنی آمدنی ہو گئی کہ قناعت اور اطمینان کے ساتھ مشاغل علمیہ و دینیہ میں منہمک ہو سکیں۔ اگرچہ اس درمیان میں کھانے پینے کی تنگیاں پیش آئیں مگر بفضلہ تعالیٰ ایسی نوبت کبھی پیش نہیں آئی کہ کوئی فرد خاندان بھی کسی کے سامنے دست سوال دراز کرتا یا اس قسم کے پیشے کا ارادہ کرتا جس میں ایسی نوبتیں آتیں ہیں یا ایسی کارروائیاں کرنے پر مجبور ہوتا جس میں حلال و حرام کا امتیاز نہیں ہوتا والحمد للہ۔ ہم نے بہت سے مہاجرین کو ایسے ناشائستہ اعمال میں مبتلا پایا ہے۔ جو آمدنی اس طرح ہوتی تھی سب والد صاحب مرحوم کے سامنے پیش کردی جاتی تھی وہ حسب رائے خود صرف فرماتے تھے۔

علیحدگی خورد و نوش مدینہ منورہ پہونچنے کے بعد بھی ایک عرصہ تک تمام کاروبار خانہ داری مشترک تھا۔ والدہ ماجدہ مرحومہ نے اپنی تینوں بہوؤں میں باری مقرر کر رکھی تھی۔ کھانا سب کا ایک ہی جگہ پکتا تھا والدہ صاحبہ تقسیم فرمادیا کرتی تھیں۔ باری والی عورت پخت و پز کے تمام کام اپنی باری پر انجام دیتی تھی اور زائد مشاغل میں سب شریک رہتی تھیں مگر طبعی طور پر ان تینوں عورتوں میں کچھ تنافس اور تنافر کی نوبت آئی۔ بالخصوص اس بناء پر کہ بھائی سید احمد صاحب مرحوم کی اہلیہ مرحومہ والدہ ماجدہ مرحومہ کی حقیقی بھتیجی تھیں اور باقیماندہ دو عورتیں اجنبی خاندانوں کی تھیں۔ اس لئے وہ چاہتی تھیں کہ تمام نظام خانہ داری ہر ایک کا علاحدہ کردیا جائے مگر قلت سرمایہ اس کی اجازت نہ دیتی تھی۔ ناگوار

امور پر صبر کرنا اور کرانا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ جبکہ ہم دونوں بھائی گنگوہ شریف کے سفر میں تھے ایک روز والدہ ماجدہ مرحومہ نے خواب میں دیکھا کہ حجرۂ مطہرہ نبویہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں قبر شریف پر چارپائی بچھی ہوئی ہے اور اس پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیٹے ہوئے آرام فرمارہے ہیں اور والدہ ماجدہ پیچھے بیٹھی ہوئی آپ کی کمر دبا رہی ہیں۔ یکایک سامنے سے بڑے بھائی صاحب مرحوم کی اہلیہ (وحید مرحوم کی والدہ) آئیں تو جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے والدہ ماجدہ کو مخاطب کرکے فرمایا کہ "تم ان کو جدا کیوں نہیں کر دیتی ہو" یہ خواب والدہ صاحبہ نے صبح کو والد ماجد سے ذکر کیا تو اسی روز والد صاحب نے سب کو جُدا کر دیا۔ مگر چونکہ بھائی سید احمد صاحب کی اہلیہ خواہشمند نہ تھیں اور قرابت قریبہ کی وجہ سے کوئی گرانی اُن پر نہ آتی تھی اس لئے وہ والدہ ماجدہ ہی کے ساتھ رہیں۔ جو جو جنسیں غلہ وغیرہ اور گوشت ترکاری اور دیگر ضروریات کی آتی تھیں خام تقسیم کر دی جاتی تھی۔ بعد اجرار وظائف بھی عرصہ تک یہ طریقہ جاری رہا۔ مگر بعد میں والد صاحب نے ارشاد فرمایا کہ اپنی اپنی آمدنی کو اپنی ضروریات میں خرچ کرو۔

پختہ مکانوں کی تعمیر اگرچہ فوری طور پر جلدی میں مذکورہ بالا چند کوٹھریاں اپنے ہاتھوں بنا لی گئی تھیں مگر یقیناً ان میں گذران نہیں ہو سکتی تھی۔ گرمی کے زمانہ میں مدینہ منورہ کی لوہ اور شدت تمازت میں ان میں بسر کرنا ازحد مشکل تھا۔ علیٰ ہذا القیاس سردی کے شدت کے زمانہ میں اور زور کی بارش میں۔ اس لئے ضروری تھا کہ پختہ مکان بنایا جائے اور جلد بنایا جائے۔ اس لئے اس کی طرف پوری توجہ والد صاحب مرحوم نے اسی وقت سے کر دی۔ جو رقوم ان کے پیر بھائی اور احباب ہندوستان سے بھیجتے تھے یا جو رقوم ہمارے بعض احباب وغیرہ موسم حج و زیارت میں دے جاتے یا اور کوئی بالائی آمدنی ہو جاتی تھی اس کو روزمرہ کے مصارف خانہ داری میں صرف نہیں کرتے تھے بلکہ تعمیر میں ہی لگانا ضروری سمجھتے تھے جس کی وجہ سے نہایت تنگی اور نہایت معمولی غذا پر سب کو بسر کرنا پڑتا تھا۔ کبھی پتھر خرید لئے۔ مدینہ منورہ کے شرق اور غرب اور جنوب میں زمین دوز سنگ خارا کے پہاڑ ہیں انہیں کو حَرّہ اور لابہ کہتے ہیں یہ پتھر سیاہ اور

نہایت سخت ہوتے ہیں انھیں سے مدینہ منورہ کی عمارتیں بنائی جاتی ہیں۔ اونچے پہاڑ بھی قریب میں واقع ہیں بالخصوص سلع مگران کے پتھر سنگ خارا کی قسم کے نہیں ہیں اور نہ اتنے مضبوط ہیں پتھروں کی تجارت اور گھڑائی کرنے والے انھیں زمین دوز حرّون میں سے بارود سے پتھروں کو توڑ کر پھر پتھروں سے ٹکڑے کر کے گدہوں اور خچروں پر لادتے اور مواضع تعمیر تک پہنچاتے ہیں اور فی حمل (بوجھ) بھاؤ مقرر ہو جاتا ہے۔

کبھی لکڑی خرید لی (مدینہ منورہ میں کڑیوں کے لئے کھجوروں کے تنے عموماً کام میں آتے ہیں اور مضبوط ہوتے ہیں۔ جو لوگ بہت زیادہ امیر ہیں اور اپنی عمارت امیرانہ بنوانا چاہتے ہیں وہ چھت میں جاوی لکڑیاں تین تین چار چار انچہ موٹائی والی لگاتے ہیں۔ چونکہ یہ جاوی لکڑیاں بہت گراں پڑتی ہیں اس لئے عام طور پر کڑیوں میں استعمال نہیں ہوتیں۔ البتہ دروازوں، کھڑکیوں، طاقچوں اور طاقوں، روشندانوں وغیرہ میں جاوی ہی لکڑیاں مستعمل ہوتی ہیں۔ معمولی اور غرباء کے مکانات میں جھاؤ اور ببول کی موٹی شاخیں بجائے کڑی کے استعمال کی جاتی ہیں۔ کڑیوں پر کھجور کے پتوں کے ڈنٹھر (جریدے) رکھے جاتے ہیں اور اس پر کھجور کے بورئے بچھائے جاتے ہیں۔ اور ان کے اوپر گلاوہ (گارا) اور اس پر خشک مٹی بچھائی جاتی ہے)

کبھی اور ضروریات خرید لیں کبھی اس مجموعہ ضروریات سے عمارت تعمیر کرالی۔ معماروں اور مزدوروں کے ساتھ خود بھی لگے رہتے تھے اور ہم بھائیوں کو بھی ساتھ لگنے کی تاکید فرماتے تھے۔ بسا اوقات میں مسجد نبوی میں بیٹھا ہوا کتاب پڑھاتا ہوتا تھا اور آدمی آتا کہ والد صاحب بلاتے ہیں طلبہ کو رخصت کر کے حاضر ہوتا تو فرماتے کہ مٹی اٹھانے والا یا اینٹ اُٹھانے والا مزدور نہیں آیا تم اس کام کو انجام دو۔ مجبوری تمام دن یہ کام کرنا پڑتا اور تمام اسباق کو معطل کرنا پڑتا۔ بسا اوقات ایک ایک دو دو ہفتہ اسباق کو معطل کر کے تمام اوقات اسی تعمیری خدمات میں صرف کرنا پڑا۔ بڑے بھائی صاحب مرحوم اور دوسرے بھائیوں اور بچوں کو بھی ایسا کرنا پڑتا تھا۔ مگر چونکہ میں سب میں زیادہ مضبوط اور نوجوان تھا اس لئے مجھ پر نزلہ زیادہ گرتا تھا۔ چھوٹے

بھائی جمیل احمد مرحوم اور محمود احمد بھی اگر اپنی تعلیمات سے فارغ ہوتے تو وہ بھی یہ کام انجام دیتے۔ گارا بنانا، گارا ڈھونا، اینٹیں پاتھنا، اینٹیں معمار تک پہنچانا، پانی بھرنا، دگارے کے لئے وغیرہ تمام ضروریات عمارت ہم لوگ انجام دیتے رہے۔ البتہ تعمیر کرنا اور پتھروں کا گھڑنا اور ان کو موقع تعمیر تک پہونچانا یہ ہم سے نہیں ہو سکتا تھا اس لئے اس کے کرنے والے مزدور ضرور رکھے جاتے تھے۔ اس طرح تقریباً دو سال میں پہلے مکان کے دو طبقے تیار ہو گئے۔ تب ان عارضی اور چھوٹے کمروں سے منتقل ہو کر سب یہاں آگئے۔ ان دو طبقوں میں سات کمرے وسیع ہوادار تیار ہوئے۔ ہر طبقہ میں پائخانہ غسلخانہ باورچی خانہ اور کنواں تھا۔ تیسرے طبقہ اور چھت کی پردہ دار تعمیر بعد میں ہوئی۔ اس کے بعد والد صاحب مرحوم نے دو مکانات اور تعمیر کرائے مگر ان میں ہم لوگوں نے زیادہ کام نہیں کیا کیونکہ تعلیمی مشاغل کا بہت حرج ہوتا تھا۔ اگرچہ والد صاحب مرحوم خود لگے رہتے تھے۔ البتہ زیادہ مشقت کا کام نہیں کرتے تھے۔ جس زمانہ میں تعمیری کام نہیں ہوتا تھا اس زمانہ میں بھی والد صاحب مرحوم خالی نہیں بیٹھتے تھے۔ اوقات وظائف و اوراد سے فارغ ہونے کے بعد نیلام کے بازار میں چلے جاتے اور لکڑیاں یا اور مفید چیزیں خرید لاتے جلانے کی لکڑیوں میں سے جو لکڑی کارآمد ہوتی اس سے چارپائیوں کے پائے یا پٹی یا کھونٹیاں وغیرہ اپنے ہاتھ سے بنا لیتے۔ اگرچہ یہ کام کبھی ہندوستان میں نہیں کیا تھا مگر ضرورت ہر چیز کی تعلیم دیدیتی ہے۔ نیلام کے بازار سے بڑھئی کے اوزار ہر قسم کے خرید لاتے تھے اُن سے یہ معمولی کام کر لیتے تھے۔ چنانچہ اپنے ہی ہاتھوں سے سب کے لئے چارپائیاں وغیرہ بنادی تھیں۔ رحمہ اللہ تعالیٰ وارضاہ وجازاہ عنا احسن الجزاء۔

والد صاحب مرحوم نے بعد کو اس تمام تعمیر کو اس خوف سے کہ مبادا کوئی شخص اولاد میں سے فروخت کر کے چلا جائے وقف علی الاولاد کر دیا۔ شریف حسین کے زمانہ حکومت میں یہ تمام محلہ اجڑ ہو گیا تھا بلکہ بیرون باب مجیدی جو کہ قبل از جنگ عمومی نہایت آباد اور قیمتی متعدد محلات کو مشتمل ہو گیا تھا۔ صرف ان محلوں کی آبادی تقریباً تیس ہزار تک پہنچ گئی تھی مگر شریف موصوف کی

بغاوت کی وجہ سے وہ آفت آئی کہ صرف چند سو کی آبادی رہ گئی۔ تمام مدینہ منورہ تقریباً سوا لاکھ یا اس سے زائد مردم شماری رکھتا تھا۔ جنگ کے بعد امن کے زمانہ میں صرف بارہ تیرہ ہزار کی مردم شماری رکھنے لگا۔

سور البلد (شہر پناہ کی دیوار) کے باہر کی آبادی نہایت خطرناک ہو گئی۔ چوروں اور قزاقوں کا دور دورہ ہو گیا۔ امن و امان کافور ہو گیا۔ لوگ اپنے اپنے بیرونی مکانات چھوڑ کر (جو باقی رہ گئے تھے) اندرون شہر پناہ رہنے پر مجبور ہو گئے۔

بعد از واپسی از اڈریانوپل و شام بھائی سید احمد صاحب اور محمود احمد نے اپنے اس مکان کی سکونت نہیں چھوڑی چوروں نے حملہ کیا اور بھائی صاحب مرحوم پر گولی چلائی مگر اللہ تعالیٰ کے فضل سے زخم معمولی ہوا اس لئے مجبوراً مکان خالی کر کے اندرون شہر پناہ متصل باب النسا کرایہ پر مکان لیکر سکونت اختیار کی اور بیرونی مکان کی حفاظت کے لئے کہ کہیں چور دروازوں اور کڑیوں اور طاقوں وغیرہ کو اُکھاڑ نہ لیجائیں تنخواہ دیکر تکرونیوں کو رکھ دیا۔

نفوس کا ابتلاء اور امتحان کھانے پینے اور سکونت کرنے کا جو کچھ کڑا اور سخت امتحان پیش آیا اور جس طرح بتوفیق اللہ تعالیٰ اس کا تحمل کیا گیا اس کی مختصر سرگذشت تو گذر چکی اس کے ساتھ نفوس کا ابتلاء بھی عجیب و غریب گذرا۔ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ والد صاحب مرحوم کے اولاد ہم پانچ لڑکے مع ایک لڑکی تھے۔ جو کہ بوقت سفر مدینہ منورہ موجود اور زندہ تھے اس سے پہلے دو تین لڑکیاں اور لڑکے خورد سالی ہی میں فوت ہو چکے تھے۔ وہ رفیق سفر نہیں ہو سکے تھے۔ یہ چھ موجودہ اولاد ہی تھی جن میں سے تین کی شادیاں ہندوستان ہی میں ہو چکی تھیں۔ بڑے بھائی صاحب صاحب اولاد بھی تھے (وحید احمد مرحوم جو کہ ۱۳۱۳ھ میں ٹانڈہ ہی میں پیدا ہوا تھا اور اس سفر حجاز میں تقریباً چار برس کا تھا۔) والد صاحب کی باقی تین اولاد شادی کی عمر کو نہیں پہونچی تھی۔ والد صاحب مرحوم کا ارادہ تھا کہ مدینہ منورہ ہی میں ان کی شادی کر دیں گے۔ اور یہ بھی خیال تھا کہ چونکہ میں نے اولاد کو عربی پڑھائی ہے اس لئے وہاں پر ان کی ملازمتیں بھی بآسانی ہو جائیں گی۔ اور یہ بھی خیال تھا کہ یہ سب میری اولاد پھلے پھولے گی اور آپس میں

اپنی اولاد کی بیاہ شادی کر کے ترقی کر جائے گی اور ایک اچھا خاصہ کنبہ اور خاندان بن جائیگا۔ مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ ملازمتوں کا سلسلہ تو خیال خام ابتدا ہی میں نکلا۔ اگرچہ کچھ عرصہ کے بعد اس میں کامیابی ہوتی گئی۔ بالخصوص چھوٹے بھائیوں کی ترکی تعلیم کے بعد۔ جمیل احمد مرحوم (جو کہ ۱۳۰۲ھ ہجری میں ٹانڈہ میں پیدا ہوا تھا اور بوقت وفات تقریباً اکیس برس کی عمر رکھتا تھا) کا اگر انتقال نہ ہو جاتا تو قوی امید تھی کہ وہ کسی بڑے عہدے پر فائز ہوتا اور اچھی تنخواہ ہوتی۔ محمود احمد سلمۂ (جو کہ ۱۳۰۸ھ ہجری شوال میں بمقام ٹانڈہ پیدا ہوا اور اس سفر حجاز میں آٹھ برس کی عمر رکھتا تھا) جبکہ ترکی کالج سے فراغت حاصل کی تو اس کو فوراً محکمہ قضا میں عارضی جگہ محرری کی دیدی گئی جس میں وہ ترقی کرتے کرتے بڑے عہدوں تک پہونچ گیا۔ اسی طرح انھوں نے وحید مرحوم کو بھی ترکی کالج میں داخل کر دیا تھا۔ چنانچہ اس نے بھی ترکی میں اچھی استعداد پیدا کر لی تھی۔ مگر نسل اور اولاد کے متعلق والد صاحب مرحوم کا خیال بالکل غیر قابل تعبیر خواب ثابت ہوا۔

میں جس وقت ۱۳۱۶ھ کے آخر میں گنگوہ شریف کو روانہ ہوا تو گھر میں حمل تھا اور بڑے بھائی صاحب کا دوسرا بچہ حمید احمد پیدا ہو چکا تھا۔ جو کہ مدینہ منورہ میں ۹ جمادی الاول ۱۳۱۶ھ میں پیدا ہوا تھا۔ میرے سفر کے ایام میں بچی پیدا ہوئی۔ ۱۳۲۰ھ کے ابتدا میں جبکہ ہم دونوں ہندوستان سے واپس آئے تو پہلے پہل کچھ دنوں کے بعد میری بچی کا انتقال ہوا۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد بڑے بھائی صاحب کے دوسرے بچے حمید احمد کا انتقال ہوا۔ بھائی سید احمد صاحب مرحوم کے کئی بچے پیدا ہوئے مگر سب کے سب ایام رضاعت ہی میں انتقال کرتے گئے۔ بالآخر ان کی اہلیہ نسوانی امراض میں مبتلا ہو گئیں۔ مدینہ منورہ میں بہت کچھ علاج کیا گیا مگر فائدہ نہ ہوا۔ میرے سفر ثانی ہند میں (جس کا تذکرہ آگے آئیگا) وہ ہندوستان گئیں کیونکہ ان کے حقیقی بھائی ڈاکٹر ہیں انھوں نے تقاضا کیا تھا کہ ہمشیرہ کو یہاں بھیجدو میں علاج کروں گا وہ اپنے بھائی کے پاس تقریباً ایک سال یا زیادہ رہیں مگر کوئی معتد بہ فائدہ نہیں ہوا۔ ۱۳۲۶ھ میں انکو پھر مدینہ منورہ بھیجدیا گیا اور یہاں آکر چند ماہ بیمار رہکر ۱۳۲۹ھ ہجری میں انتقال کر گئیں۔

سنہ ۱۳۲۲ھ میں والدہ صاحبہ مرحومہ کا انتقال ہوا اور اس کے کچھ عرصہ کے بعد جمیل احمد مرحوم استنبول سے تپ دق اور سل میں مبتلا ہو کر آیا اور چند مہینہ زندہ رہکر راہی ملک عدم ہوا۔ والدہ مرحومہ کے انتقال کی وجہ سے والد صاحب مرحوم کو اپنی خدمات ضروریہ میں سخت تکالیف برداشت کرنی پڑتی تھیں اس وجہ سے ہم بہوں نے مناسب سمجھا کہ والدہ مرحومہ کی خالہ زاد بہن کو جو عرصہ دراز سے لاولد بیوہ تھیں اور ان کے تعلقات بھی والدہ صاحبہ مرحومہ اور ہم بہوں سے بہت زیادہ تھے ان کو بلالیا جائے اور والد صاحب سے ان کا نکاح کرادیا جائے۔ چنانچہ والد صاحب مرحوم کو اس پر راضی کرلیا گیا۔ اور بھائی سید احمد صاحب مرحوم کو لکھدیا گیا کہ واپس ہوتے ہوئے تم خالہ صاحبہ کو اپنے ساتھ لیتے آؤ۔ سنہ ۱۳۲۴ھ کے ابتدا میں وہ معہ خالہ صاحبہ کے آئے اور والد صاحب سے ان کا عقد ہوگیا۔ اس سے اگرچہ فی الجملہ ان کو کچھ راحت ہوئی مگر جو آرام والدہ مرحومہ کی موجودگی میں جو کہ مزاج اور عادت سے واقف تھیں حاصل ہوتا تھا وہ حاصل نہ ہوا۔ والد صاحب مرحوم کو حقہ کی اسقدر عادت تھی کہ پائخانہ میں بھی حقہ لیکر جاتے تھے اور رات میں اُٹھ اُٹھ کر پیا کرتے تھے۔ بدن دبوانے کی بھی عادت تھی۔ بہر حال وہ بھی کچھ دنوں زندہ رہکر رحلت فرماگئیں۔

بھائی سید احمد صاحب مرحوم کو یہ بھی لکھا گیا کہ ماموں زاد بھائی فاروق احمد کو بھی اپنے ساتھ لیتے آئیں تاکہ ہمشیرہ کا عقد اس سے کردیا جائے۔ والدہ مرحومہ کو اس رشتہ کی خواہش بھی تھی کیونکہ وہ ان کا حقیقی بھتیجا تھا۔ اگرچہ والد صاحب اس کے غیر تعلیمیافتہ ہونے کی وجہ سے پسند نہ کرتے تھے مگر خاندان میں کسی دوسرے لڑکے کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے راضی ہوگئے تھے۔ فاروق احمد موصوف کے والدین اس وقت موجود تھے وہ اس رشتہ پر راضی تھے اُن سے والد صاحب مرحوم نے یہ وعدہ کیا تھا کہ فاروق احمد کو میں یہاں رکھوں گا اور عربی تعلیم دلواؤں گا چند سال رہنے اور تعلیم حاصل کرنے کے بعد جی چاہے گا وہ معہ اپنے متعلقین کے ہندوستان چلا جائیگا اور جی چاہے گا یہاں ہی قیام پذیر رہے گا۔ چنانچہ وہ بھی بھائی

سید احمد صاحب مرحوم کے ساتھ آگیا اور اس کا عقد ہمشیرہ مرحومہ سے کردیا گیا اور اس کی تعلیم و تربیت کا انتظام کردیا گیا۔ عربی کی ابتدائی کتابیں شروع کرائی گئیں۔ مگر وہ بدنصیب ایک سال رہکر خفیہ طریقہ پر بھاگ گیا۔ اس نے اپنی بیوی کے کچھ زیور خفیہ طریقہ پر فروخت کر کے زاد راہ حاصل کیا اور ہندوستان پہونچ گیا۔ چند مہینوں کے بعد اس کے لڑکی ۱۸ محرم ۱۳۲۵ھ کو مدینہ منورہ میں پیدا ہوئی۔ اس کے والدین مرحومین کا تقاضا رہا کہ ہماری پوتی اور بہو کو ہندوستان بھیجدو مگر والد صاحب مرحوم کو فاروق احمد موصوف کی نالائقی سے اس قدر صدمہ ہوا تھا کہ وہ بھیجنے پر راضی نہیں ہوئے۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد بڑے بھائی صاحب مرحوم کی اہلیہ مرحومہ (والدہ وحید) بیماریوں میں مبتلا ہو کر تپ دق اور سل میں راہی ملک عدم ہوئی تھی۔ صرف وحید احمد مرحوم ایک لڑکا چھوڑا۔ بھائی صاحب مرحوم کو تنہائی کی سخت تکالیف پیش آئیں۔ سید فرزند علی صاحب مرحوم بریلی کے ایک مہاجر تھے ان کی لڑکی سے بھائی صاحب مرحوم کا عقد کردیا گیا اس نکاح کو تقریباً ڈیڑھ سال یا اس سے کچھ ہی زانہ گذرے تھے کہ ایام زچگی میں اس کا بھی انتقال ہوگیا۔ بچہ بھی زندہ نہ رہا۔ پھر بھائی صاحب مرحوم نے ایک بنارس کی مہاجرہ عورت سے (جو کہ اس زمانہ میں بیوہ تھیں اور کشمیری خاندان سے تھیں) نکاح کیا۔

۱۳۲۶ھ کے ابتدا میں میری پہلی اہلیہ مرض دق وسل میں مبتلا ہو کر چند مہینوں بیمار رہ کر راہی ملک عدم ہوئی۔ ایک لڑکی زہرا کو جو کہ ۱۳۲۳ھ میں پیدا ہوئی تھی چھوڑ گئی۔ جو کہ ۱۳۳۷ھ میں بمقام دمشق فوت ہو گئی۔

ہمشیرہ مرحومہ بھی مرض دق وسل میں مبتلا ہوئی اور تقریباً سال بھر سے زیادہ بیمار رہکر ۱۳۲۹ھ کے ابتدا میں راہی ملک عدم ہوئی اس کے کچھ عرصہ کے بعد اس کی لڑکی بھی انتقال کرگئی جو کہ تقریباً چار برس کی تھی۔ بڑے بھائی صاحب مرحوم کے اس تیسری زوجہ سے بچہ پیدا ہوا مگر وہ بھی کچھ عرصہ زندہ رہکر فوت ہوگیا۔ اور اس کے کچھ عرصہ کے بعد یہ ان کی تیسری اہلیہ بھی انتقال کرگئیں۔

عزیزم محمود احمد سلمہ کا عقد ایک بریلی ہی کے خاندان میں شیخ ریاض الدین صاحب مہاجر کی ہمشیرہ سے کیا گیا۔ چند مہینوں کے بعد والد صاحب مرحوم سے اور شیخ ریاض الدین صاحب اور ان کے خاندان سے نااتفاقی ہو گئی جس کی وجہ سے آمد و رفت بند ہو گئی۔ صلح کی کوششوں میں ناکامی ہوئی۔ آخرکار اہلیہ محمود احمد بیمار رہوئی اور تپ دق میں مبتلا ہو کر راہی ملک عدم ہو گئی۔ بڑے بھائی صاحب مرحوم کا چوتھا عقد ڈاکٹر رفاقت علی صاحب مرحوم کی لڑکی سے ہو گیا۔ اس سے ایک لڑکا بھائی صاحب کے ہوا جو کہ پیدا ہونے کے چند دنوں بعد فوت ہو گیا۔ پھر بھائی صاحب بھی ۱۳۳۰ھ میں وفات پا گئے۔ اس طرح خاندان کے افراد کا برابر وفیاتی سلسلہ جاری رہا۔ والد صاحب مرحوم کے سامنے ہی تقریباً بتیس یا تینتیس نفوس مدینہ منورہ میں وفات پا گئے۔ اور خاندان کے بڑھنے کی امیدیں خاک میں مل گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بیعت وحضوری بارگاہ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز

(استفادہ طریقت و روحانیت) پہلے ذکر آچکا ہے کہ خاندان کے اسلاف اہل معرفت وطریقت تھے صرف اخیر میں دو تین پشتیں دنیادار زمینداروں کی ہو گئی تھیں۔ نیز یہ بھی ذکر آچکا ہے کہ شاہان دہلی سے خاندان کو چوبیس گانوں دئے گئے تھے شاہ مدن رحمۃ اللہ علیہ کے بعد شاہ نور اشرف مرحوم نے سجادہ اور طریقت سنبھالا اور دوسرے بیٹے تراب علی مرحوم نے جائداد کا انتظام سنبھالا اس طرح خاندان میں دو پٹیاں قائم ہو گئیں مگر خاندان میں کوئی شخص باہر کسی دوسرے خاندان سے بیعت نہ ہوتا تھا۔ والد صاحب مرحوم سب سے پہلے باہر بیعت ہوئے جس کی صورت یہ پیش آئی کہ ان کی شادی نانا اکبر علی مرحوم کی دختر سے ہوئی۔ (نانا صاحب مرحوم ۵۷ھ میں تمام جائداد کے متصرف تھے اور ۵۷ھ میں امن قائم ہونے پر ضلع بستی سے واپس آتے ہوئے دریائے گھاگرا میں کشتی کے الٹ جانے سے ڈوب گئے تھے) نانی صاحبہ مرحومہ نندرولی ضلع فیض آباد کی رہنے والی تھیں اور صاحب کشف و نسبت تھیں انھوں نے اپنے ماموں سے میکہ ہی میں سلوک طے کیا تھا ان کے ماموں بہت بڑے صاحب نسبت تھے۔ والد صاحب مرحوم کو انھوں نے ہدایت کی کہ تمھارے گھرانے میں مرید کرنے کا طریقہ جاری ہے مگر

یہ غلط ہے جبتک کسی کامل سے بیعت ہو کر منازل سلوک طے نہ کر لئے جائیں مرید کرنا جائز نہیں۔ قیامت میں سخت وبال ہو گا۔ اس لئے والد صاحب مرحوم کو شیخ طریقت کی تلاش تھی۔ خاندان کے دوسرے لوگوں نے بغیر سلوک خاندانی نام پر یہ سلسلہ جاری کر رکھا تھا۔ اور ان خاندانوں میں جو کہ اضلاع بستی، گونڈہ، گورکھپور وغیرہ میں سلسلہ اسلاف میں داخل ہوتے جاتے تھے اور نذرانہ وغیرہ وصول کرتے تھے اور لوگوں کو مرید بھی کرتے تھے۔ والد صاحب مرحوم جب صفی پور میں مدرس اور ہیڈ ماسٹر ہوئے تو چونکہ گنج مراد آباد شریف قریب تھا اور اُن اطراف میں حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا شہرہ تھا۔ ان کی کرامت اور بزرگی بہت زیادہ زبان زد عوام و خواص تھی۔ اس لئے حضرت مولانا موصوف کی خدمت میں آمد و رفت شروع کی اور وہ کمالات جو اہل اللہ میں ہونے چاہئیں دیکھ کر گرویدہ ہو گئے اور انھیں سے بیعت ہو گئے اور حسب تعلیم و ارشاد فرائض سلوک انجام دینے لگے۔ جہاں تک معلوم ہے حضرت مولانا قدس اللہ سرہٗ العزیز نے طریقہ قادریہ کا سلوک حضرت والد صاحب مرحوم کو تلقین فرمایا تھا۔ اور پھر جب تبدیلی بانگرمئو کی ہو گئی تو بہت زیادہ حاضری کا موقعہ مل گیا کیونکہ بانگرمئو بہت ہی زیادہ قریب گنج مراد آباد کے واقع ہوا ہے غالباً دو یا تین ہی میل کا فاصلہ ہے۔ پھر والدہ مرحومہ کو بھی مولانا رحمۃ اللہ علیہ ہی سے بیعت کرایا۔

خاندان کے لوگوں نے والد مرحوم پر باہر بیعت کرنے پر اعتراضات بھی کئے مگر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ والد صاحب کے ارشاد پر ہم تینوں بھائیوں مولانا محمد صدیق صاحب مرحوم اور مولانا سید احمد صاحب مرحوم اور راقم الحروف کو بھی دیوبند سے بعض اوقات میں واپسی پر گنج مراد آباد بارگاہ میں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔

جب بڑے بھائی صاحب مرحوم (مولانا محمد صدیق صاحب) دیوبند میں فارغ التحصیل ہوئے تو انھوں نے حضرت مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز سے بیعت ہونے کی اجازت والد صاحب مرحوم سے طلب کی۔ والد صاحب کی منشا طبعی طور پر یہی تھی کہ وہ حضرت گنج مراد آبادی قدس اللہ

سرہٗ العزیز ہی سے بیعت ہوں۔ دونوں میں عرصہ تک خط وکتابت رہی بالآخر والد صاحب مرحوم نے ان کو حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز سے بیعت ہونے کی اجازت دیدی اور وہ ان سے بیعت ہو گئے۔ اس عرصہ میں بھائی صاحب مرحوم بلند شہر اور سہوارہ وغیرہ بصیغہ تدریس ملازم رہے اور حسب تعلیم ذکر وشغل بھی برابر کرتے رہے۔ سنہ ۱۳۱۶ھ میں جبکہ والد صاحب مرحوم نے بعد وفات حضرت مولانا گنج مراد آبادی قدس اللہ سرہٗ العزیز ارادہ ہجرت کیا (چونکہ والد صاحب مرحوم کو حضرت مولانا قدس اللہ سرہ العزیز سے بہت گہرا تعلق تھا اور تقریباً ان میں فنا تھے۔ اسلئے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے وصال سے ان کو اس قدر صدمہ ہوا کہ ہندوستان میں بسر کرنا نہایت ناگوار معلوم ہونے لگا۔ اسی وقت سے اس فکر میں ہو گئے کہ کوئی انتظام کر کے مع جملہ متعلقین مدینہ منورہ میں گذر بسر کی جائے۔) اور ماہ شعبان میں بارادہ توجہ وطن بھائی صاحب جائے ملازمت سے دیوبند پہونچے تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے بھائی صاحب مرحوم سے فرمایا کہ ان دونوں (بھائی سید احمد صاحب اور حسین احمد) کو حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز سے بیعت کرا دو خدا جانے یہاں سے جانے کے بعد کس کے پلّے پڑ جائیں۔ کہیں کسی بدعتی سے وابستہ نہ ہو جائیں۔ بھائی صاحب مرحوم نے ہم سے فرمایا میں نے عرض کیا کہ میں تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوں گا۔ واقعہ یہ تھا کہ اگرچہ گنگوہ میں ایام طالبعلمی میں بارہا حاضری کی نوبت آچکی تھی مگر حسن عقیدت اور محبت حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ہی سے تھا بچپن سے ان کی خدمت میں رہنا ہوا تھا اور ابتدائی کتابوں سے لیکر آخری کتابوں تک کا اکثر حصہ اُنھیں سے پڑھتا رہا تھا مضامین علمیہ اور اخلاق عالیہ اور اعمال صالحہ کے مشاہدات حاصل ہوئے تھے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ایسے الطاف وکرم فرماتے تھے جو کہ اولاد کے لئے ہوتے ہیں۔ اس لئے پوری وابستگی انھیں سے تھی۔ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز کو بہت بڑا عالم ضرور جانتا تھا مگر قلبی تعلق ایسا نہ تھا اور نہ طریقت کا کامل سمجھتا تھا۔ بھائی صاحب مرحوم نے جواب دیا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بیعت نہیں کرتے میں نے خود بہت کوشش اپنے لئے کی تھی جب نہیں راضی ہوئے اور حضرت گنگوہی

قدس اللہ سرہ العزیز سے بیعت ہو جانے کا ہی ارشاد فرمایا تب میں وہاں بیعت ہوا تم دونوں کے لئے بھی ان کا یہی ارشاد ہے۔ بالآخر وہاں ہم دونوں حاضر ہوئے۔ اس زمانہ میں حضرت استاذ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب دیوبندی وہاں ہی خانقاہ میں رہتے تھے اور مشاغل سلوک کے انہماک کے ساتھ حضرت قطب عالم رحمۃ اللہ علیہ کی ڈاک کی خدمات بھی انجام دیتے رہتے تھے۔ بھائی صاحب مرحوم نے ان کو خط لکھدیا تھا کہ ان دونوں کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کرا دیجئے۔ جب ہم دونوں وہاں پہونچے تو حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم نے دونوں کو یہ کہکر پیش کر دیا کہ مولوی صدیق احمد صاحب نے اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں مولوی سید احمد اور حسین احمد کو بیعت ہونے کے لئے بھیجا ہے وہ حاضر ہیں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی عادت تھی کہ بیعت فرمانے میں بہت زیادہ رد و قدح فرمایا کرتے تھے بالخصوص لکھے پڑھے اور عربی تعلیمیافتہ لوگوں کے متعلق تو بہت زیادہ کج وکاؤ اور گفت وشنید کی نوبتیں آتی تھیں۔ بعض حاضرین اور بے تکلف خدام مثل مولانا محمد یحییٰ صاحب مرحوم کاندھلوی کے دریافت کرنے پر یہ فرمایا کہ میں دیکھتا ہوں کہ کس شخص کو مجھ سے قلبی مناسبت ہے۔ اور کتنی مناسبت ہے۔ اگر مناسبت نہیں ہوتی تو میں انکار کر دیتا ہوں ورنہ بیعت کر لیتا ہوں بہر حال ہم دونوں پیش ہوئے تو کچھ پس وپیش نہیں فرمایا مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے پیش فرمایا۔ اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بیعت فرمالیا۔ مگر کچھ تلقین نہیں فرمایا بلکہ یہ فرمایا کہ میں نے بیعت تو کر لیا اب تم مکہ معظمہ جا رہے ہو وہاں حضرت حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز موجود ہیں ان سے عرض کرنا وہ ذکر تلقین فرمادیں گے۔ پس اسی روز ہم دیوبند واپس آگئے۔ اور پھر وطن کو روانہ ہوگئے۔ دیوبند سے رخصت ہوتے وقت حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ پیدل اسٹیشن تک ساتھ ساتھ تشریف لائے اور راستہ میں صدر چوکی کے پاس وصیت فرمائی کہ پڑھانا نہ چھوڑنا خواہ ایک ہی طالب علم پڑھنے والا ہو۔

بیعت کے برکات اگرچہ یہ بیعت بادل ناخواستہ ہوئی تھی مگر اس کے آثار مبارکہ میں نے اپنے اندر اسی دن سے محسوس کئے۔ اس سے پہلے نماز کبھی کبھی چھوٹ جاتی تھی مگر اس روز سے برابر مداومت ہوگئی کبھی قضا نہیں ہوئی اور اگر کسی عذر قوی سے بلا اختیار قضا بھی ہوگئی جو کہ شاذ و نادر ہوا تو قضا کر لیگئی

رجو نمازیں بیعت سے پہلے کبھی کبھی فوت ہوئیں تھیں ان کو بھی ایام اسارت احمد آباد میں تخمینہ کر کے ادا کرنے کی توفیق ہوئی وللہ الحمد) بیعت کے بعد میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک میدان ہے اور اس کے بیچ میں ایک قبر ہے جو کہ حضرت خواجہ علاؤ الدین صابر رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ خواب میں میں ایک ہی قبر کو دونوں بزرگوں کی قبر سمجھ رہا ہوں۔ میں اس قبر کی طرف جا رہا ہوں اور بالکل قریب پہنچ گیا ہوں۔ میں نے اس خواب کو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے پاس لکھ کر بھیجا۔ وطن پہونچتے ہی الہ آباد کو جو کہ اس زمانہ میں یوپی کے حجاج کے لئے قرنطینہ کا مقام مقرر کیا گیا تھا روانگی ہوگئی۔ وہاں تقریباً پندرہ بیس دن قیام کرنا پڑا۔ یہ جگہ شہر کے باہر پراگ کے قریب خصوصی انتظام کے ساتھ حجاج کے لئے علیحدہ بنائی گئی تھی۔ وہیں جواب منگایا۔

حضرت اس وقت گنگوہ شریف میں بارادہ قیام رمضان شریف مقیم تھے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اس خواب کو حضرت قطب عالم گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا تو تعبیر میں فرمایا کہ لکھدو کہ منزل مقصود کو پہونچیگا۔ یہ جوابی خط الہ آباد میں قرنطینہ کے کیمپ میں موصول ہوا۔ سفر حج کرتے ہوئے جبکہ اواخر ماہ ذیقعدہ ۱۳۱۶ھ میں حاضری مکہ معظمہ نصیب ہوئی تو جائے قیام پر اسباب وغیرہ منظم کرنے کے بعد حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے یہاں صبح کو حاضر ہونے کی عزت نصیب ہوئی۔ موصوف اس وقت بہت ضعیف ہوگئے تھے اکثر لیٹے رہتے تھے صبح کو مثنوی شریف پڑھایا کرتے تھے اس وقت پلنگ پر کچھ دیر بیٹھ جاتے تھے۔ مولانا محب الدین صاحب مرحوم اور مولانا شفیع الدین صاحب مرحوم اور چند حضرات حاضر درس ہوتے تھے۔ جب ہم سب مع والد مرحوم حاضر بارگاہ ہوئے تو حضرت قطب عالم نے بہت توجہ فرمائی۔ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز کا سلام و پیام سنکر بہت خوش ہوئے اور دیر تک نہایت محبت سے تذکرہ فرماتے رہے اور فرمایا کہ تمنا ہے کہ ایک مرتبہ پھر زندگی میں ان سے ملاقات ہو جاتی۔

بالآخر ہم دونوں بھائی سید احمد صاحب اور راقم الحروف نے عرض کیا کہ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے ہم کو بیعت تو کر لیا تھا مگر یہ فرمایا تھا کہ تلقین ذکر حضرت سے حاصل کر لینا تو آپ نے پاس انفاس کی تلقین فرمائی اور فرمایا کہ روز صبح کو آکر یہاں بیٹھا کرو اور اس ذکر کو کرتے رہو۔ چنانچہ جبتک مکہ معظمہ میں رہنا ہوا حتی الامکان روز حاضر ہوتے رہے۔ چونکہ زمانہ حج قریب تھا اس لئے جلد ہی وہ وقت آگیا کہ جس میں عرفات منیٰ وغیرہ کا سفر ہوا حج سے فارغ ہونے کے بعد پھر خدمت میں چند دنوں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ جب قافلہ حجاج اخیر عشرہ ذی الحجہ ۱۳۱۶ھ میں مدینہ منورہ کو روانہ ہونے لگا تو خلاف معمول بعد از ظہر ہم تینوں کو حاضری کا شرف حاصل ہوا حضرت نے بہت شفقت فرمائی اور سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا کہ تمکو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہوں۔ ہم نے سکوت کیا تو فرمایا کہ کہو کہ ہم نے قبول کیا ہم نے حسب تلقین عمل کیا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے دعا فرمائی ہم نے رخصتی مصافحہ کیا۔ اور پھر مدینہ منورہ کو روانہ ہوگئے مدینہ منورہ پہونچنے کے بعد کچھ ایسی مشغولیتیں پیش آئیں کہ تعلیم کردہ ذکر پر مداومت نہ ہوسکی۔ چند مہینہ کے بعد حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کا ماہ جمادی الاول میں وصال ہوگیا۔

مکہ معظمہ سے روانہ ہونے کے بعد چوتھے روز جبکہ قضیمہ سے رابغ کو قافلہ جارہا تھا مات میں اونٹ پر سوتے ہوئے خواب میں دیکھا کہ جناب سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے ہیں میں قدموں پر گر گیا آپ نے میرا سر اٹھا کر فرمایا کہ کیا مانگتا ہے میں نے عرض کیا کہ جو کتابیں پڑھ چکا ہوں وہ یاد ہو جائیں اور جو نہیں پڑھی ہیں انکے سمجھنے کی قوت ہو جائے تو فرمایا کہ تجھکو دیا۔

مدینہ منورہ پہونچنے کے کچھ عرصہ پر بعض ہندوستانیوں اور بعض عربوں کی خواہش ہوئی کہ سلسلۂ تعلیم جاری کیا جائے۔ نحو وصرف وغیرہ کی کتابیں ایک ایک دو دو آدمیوں کو خالی اوقات میں حسب ارشاد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ حرم محترم نبوی میں پڑھانے لگا

اور دن کے باقی اوقات میں دوکان کا کام کرتا تھا یا کتابت کا۔ کیونکہ روزگار کی کوئی صورت نہ تھی۔ اس لئے یہ مشغلہ تھا کہ اجرت پر بعض کتابوں کو کتبخانہ سے نقل کرنا اور کبھی کبھی اس دوکان پر بیٹھنا (جس کو بڑے بھائی صاحب نے بازار میں شکر، چار، چانول، صابون وغیرہ کی کھولا تھا اور نوبت بنوبت ہم تینوں اس پر بیٹھتے تھے) ان مشاغل نے اس قدر مشغول کیا کہ ذکر پر کوئی مداومت نہ ہوسکی۔ حضرت قطب عالم قدس اللہ سرہٗ العزیز کے وصال کے بعد شوق پیدا ہوا کہ تعلیم کردہ ذکر پر مداومت کی جائے۔ چنانچہ حرم محترم (مسجد نبوی) میں بیٹھکر پاس انفاس کیا کرتا تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں حضرت قطب عالم گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز سے محبت اور تعلق قلب میں بڑھنا شروع ہوا اور محسوس ہوتا تھا کہ جس طرح بعض درخت جلد جلد بڑھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اس طرح حضرت گنگوہی کی محبت بڑھ رہی ہے یہاں تک کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے تعلق پر ان کا تعلق بہت بڑھ گیا حالانکہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق کم نہیں ہوا۔ بلکہ اپنی حالت پر ہی قایم رہا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد سلسلہ چشتیہ قدس اللہ اسرارہم کی نسبت کے آثار ظاہر ہونے لگے اور گریہ کی حالت طاری ہونی شروع ہوگئی۔ اس اثنا میں رویا صالحہ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت باسعادت خواب میں بکثرت ہونے لگی۔ نیز ذکر کی وجہ سے جسم میں بے اختیاری حرکات بھی ہونے لگیں مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ میں چونکہ مجمع لوگوں کا ہر وقت رہتا ہے اس لئے ایسا وقت مقرر کیا جس میں کم سے کم مجمع رہے وہ وقت آفتاب نکلنے کے ایک گھنٹہ بعد کا تھا۔ چنانچہ روزانہ ایسے وقت میں ناشتہ کرکے باوضو مسجد شریف میں داخل ہوکر تحیۃ المسجد ادا کرکے مواجہہ شریف (قبر مبارک کے سامنے کی وہ جگہ جو کہ چہرہ مبارکہ کے سامنے ہے) میں حاضر ہوتا۔ آداب والفاظ شرعیہ زیارت کے بعد جس قدر ممکن ہوتا الفاظ صلوۃ وسلام بجا لاکر پھر مسجد شریف میں جہاں خالی جگہ پاتا وہاں بیٹھکر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ (جسقدر جی لگتا تھا) ذکر میں مشغول رہتا تھا۔ مگر جب آثار ذکر جسم پر زیادہ ظاہر ہونے لگے تو لوگوں کی شرم کی وجہ سے شہر کے باہر جنگل میں جانے لگا مسجد شریف کی مشرقی جانب جدھر بقیع شریف

ہے (مدینہ منورہ کا مقبرہ) آبادی نہیں ہے اُدھر نکل جاتا تھا اور کبھی مسجد الاجابہ میں (یہ مسجد مشہور ہے اور اب بالکل جنگل میں واقع ہے یہاں پر بعض ادعیہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مقبول ہوئی ہیں) اور کبھی اسی کے قریب کھجوروں کے جھنڈوں میں تنہا بیٹھکر ذکر کرتا رہتا تھا۔ اسی حالت پر ایک مدت گذری جو حالتیں یا رؤیا صالحہ وغیرہ پیش آتی تھیں ان کو قلمبند کر کے گنگوہ شریف بھیجا کرتا تھا۔ ایک روز مسجد نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں بانتظار جماعت بوقت ظہر یا عصر بیٹھا ہوا تھا یکبارگی ایسا معلوم ہوا کہ میرا تمام جسم حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز کا جسم ہو گیا ہے یہ حالت اس قدر قوی ہو گئی کہ میں اپنے جسم کو اپنا نہیں پاتا تھا اور تعجب سے ہاتھ کو دانتوں سے کاٹتا تھا کہ دیکھوں یہ میرا جسم ہے یا نہیں اگر نہ ہوگا تو تکلیف محسوس نہ ہوگی۔ یہ حالت تھوڑی دیر گھنٹہ دو گھنٹہ رہی پھر زائل ہو گئی۔ میں نے اس حالت کو بھی لکھا، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا کہ یہ حالت فنافی الشیخ ہونے کی ہے۔

۱۳۱۵ھ شوال میں والانامہ گنگوہ شریف سے وارد ہوا کہ اگرچہ وہاں سب کچھ ہے مگر بہتر ہوتا کہ تو ایک مہینہ کے لئے گنگوہ آجاتا۔ چونکہ والد صاحب مرحوم اور بھائی صاحبان میری مشغولی ذکر اور بعض رویا وغیرہ سے واقف تھے ادہر اس والانامہ سے بھی واقف ہو گئے تھے اس لئے جبکہ میں نے اس والانامہ کے مضمون کی وجہ سے سفر کی اجازت طلب کی تو والد صاحب مرحوم نے بجز قلت خرچ اور کوئی عذر پیش نہیں فرمایا اور یہ واقعی تھا کیونکہ اس مدت میں سرمایہ تقریباً قریب الختم ہو چکا تھا اس لئے مجبوراً سکوت کرتا اور سفر سے باز رہنا پڑا۔ مگر بڑے بھائی صاحب کو (مولانا محمد صدیق صاحب مرحوم) جو کہ تمام کاروبار تجارت اور ضروریات کے انجام دینے والے تھے اور ہندوستان سے روانگی پر جبکہ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز سے انھوں نے اپنی ذکر و شغل میں ناکامی کی شکایت کی تھی اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا تھا کہ اب تو چلے جاؤ پھر وہاں سے سب کو چھوڑ کر چلے آنا؛ یہ مقولہ یاد آگیا اور ان کی آتش شوق بھڑک اٹھی اور انھوں نے خفیہ طریقہ پر انتظام شروع کر دیا۔ ماہ ذی قعدہ میں جبکہ

ایک قافلہ مدینہ منورہ سے رابغ کو روانہ ہو رہا تھا اس کے ساتھ چھپکر بارادہ ہندوستان روانہ ہوگئے اور اپنے ساتھ ساٹھ یا ستر روپے لیگئے۔ گھر میں جب دن بھر نہیں آئے تو تلاش ہوئی ان کے کمرہ میں ایک تحریر لٹکتی ہوئی پائی گئی جس میں انھوں نے اپنے ارادہ وغیرہ کا تفصیلی ذکر کیا تھا۔ اسپر مطلع ہونے کے بعد حضرت والد صاحب مرحوم نے مجھکو فرمایا کہ اب تو بھی جا۔ تجھکو تو وہاں سے طلب کیا گیا تھا مگر وہ روانہ ہوگئے ہیں۔ خرچ کے نہ ہونے کی وجہ سے میں متوقف تھا۔ ان کو راستہ میں تنہائی کی وجہ سے تکلیف ہوگی۔ چنانچہ انھوں نے زادِ راہ کا انتظام کردیا۔ بھائی صاحب مرحوم رابغ سے بادبانی جہاز پر جدہ پہونچے راستہ میں تکلیف زیادہ ہوئی۔ طبیعت میں استقلال اور جفاکشی کم تھی۔ تنہائی بھی تھی۔ جدہ میں کوئی جہاز ہندوستان جانے والا نہ ملا۔ دو چار روز جدہ میں رہکر پریشان ہوگئے اور والد صاحب مرحوم کو مفصل خط لکھا کہ اب میں اپنے کئے پر پشیمان ہوں اور چونکہ حج کا زمانہ قریب آگیا ہے حج کرکے واپس آجاؤں گا۔ والد صاحب مرحوم عزائم کے بہت پختہ تھے ان کو ناگوار ہوا اور مجھکو کہا کہ تو جاکر ان کو واپسی کے ارادہ سے باز رکھ اور تم دونوں ہندوستان کو روانہ ہوجاؤ۔ مجھکو بھی تقریباً ساٹھ روپے سفر خرچ کے لئے عطا فرمایا اور مال لانے والے قافلہ میں جبکہ وہ مال پہونچا کر واپس ینبع البحر کو جا رہا تھا تاجروں کے ذریعہ پشت شتر کرایہ کرکے روانہ کردیا۔ اگرچہ قوافل ینبع سے پانچ یا چھ دن میں آتے ہیں مگر یہ خالی اونٹ تھے مختصر راستوں سے پہاڑوں میں ہوتے ہوئے رات دن چلکر دو یا تین دن میں ینبع پہونچگئے۔ اتفاق سے خدیوی ڈاک کا جہاز جدہ جانے والا آیا ہوا تھا فوراً اسپر سوار ہوگیا اور اگلے روز جدہ پہونچگیا۔ وہاں پہونچکر معلوم ہوا کہ بھائی صاحب مرحوم گھبرا کر مکہ معظمہ روانہ ہوگئے ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک جہاز بمبئی سے آیا ہوا ہے اور وہ بمبئی واپس ہونے والا ہے۔ میں نے اسکو غنیمت کبریٰ سمجھکر یہ چاہا کہ میں جلد سے جلد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت اقدس میں بھائی صاحب مرحوم سے پہلے پہونچ جاؤں اور ان کو اس جلد بازی اور چھپکر چلے آنے کی سزا دیدوں۔ اس کا ٹکٹ چالیس روپے میں خرید لیا اور ایک خط مکہ معظمہ میں بھائی صاحب کو اور ایک مدینہ منورہ

میں والد صاحب مرحوم کو تفصیل لکھدیا اور اپنی روانگی کی اطلاع دیکر جہاز پر سوار ہو گیا۔ مگر ایک روز کے بعد ہی بمبئی سے تار آگیا کہ جہاز بمبئی نہ آئے بلکہ جدہ ہی میں ٹھہرا رہے حج کے بعد حجاج کو لیکر واپس ہو۔ اس بناء پر ایک یا دو دن جہاز میں رہنے کے بعد جدہ واپس آنا پڑا۔ یہ تاریخیں اواخر ذی قعدہ کی تھیں۔ ٹکٹ کے روپئے واپس لیکر اب یہی ضروری معلوم ہوا کہ مکہ معظمہ روانہ ہو کر نعمت حج اور رفاقت بھائی صاحب مرحوم سے شرف حاصل کیا جائے چنانچہ والد صاحب مرحوم کو اطلاع دیدی اور چونکہ خرچ کم تھا۔ اور اسباب بھی زائد نہ تھا۔ یکم ذی الحجہ کو شام کے وقت پیدل مکہ معظمہ روانہ ہو گیا۔ قرب حج کی وجہ سے راستہ میں پیدل جانیوالوں کی کثرت تھی۔ اخیر شب میں بحرہ پہونچکر کچھ آرام کیا اور پھر دن بھر چلکر شام کو مکہ معظمہ پہونچا۔

بھائی صاحب مرحوم میرے خط اور جہاز کی خبر سے سخت پریشان اور پشیمان ہو گئے تھے۔ اس واقعہ سے بہت خوش ہوئے۔ بفضلہ تعالیٰ ادا مناسک حج سے فارغ ہو کر جب جدہ پہونچے تو کرایہ جہاز فی کس ۶۵ روپیہ تھا۔ ہم دونوں کے پاس مصارف مکہ معظمہ اور مصارف حج کی وجہ سے اس قدر مقدار باقی نہیں رہ گئی تھی جو کہ اس وقت کے دخانی جہازوں کے کرایہ کے لئے کافی ہو سکے اگرچہ حج پیدل ہی دونوں نے کیا تھا۔ قیام بھی مولانا شفیع الدین صاحب کے پاس تھا مگر خورد و نوش وغیرہ کے مصارف میں اس قدر خرچ ہو چکا تھا کہ ہر ایک کے پاس چالیس چالیس روپیہ تقریبًا باقی تھا۔ جہاز کے کرایہ کی کمی کا انتظار کیا گیا مگر کم نہ ہوا اور وہ روانہ ہو گیا۔ پھر دوسرا جہاز آیا اور اس کا بھی کرایہ اسی قدر گراں تھا وہ بھی روانہ ہو گیا۔ اب بجز اس کے کوئی صورت نہ تھی کہ یا تو جدہ میں مہینہ دو مہینہ ٹھہرا جائے اور آخری جہاز کا جب وقت آئے تو مساکین کیساتھ روانہ ہوں جو کہ قلت حجاج کی وجہ سے یقینی نہ تھا یا مدینہ منورہ واپس ہو جائیں یا بادبانی کشتیوں میں مسقط یا مکلا یا عدن کو روانہ ہو جائیں اور وہاں سے کراچی یا بمبئی کو دخانی جہازوں پر روانہ ہوں۔ مگر جدہ کا خرچ پہلے امر کی اجازت نہ دیتا تھا۔ وقت بھی ضائع ہوتا تھا۔ دوسرا امر مقصد کے بالکل مخالف تھا۔ تیسرے امر پر بھائی صاحب راضی نہ ہوتے تھے کیونکہ رابغ سے جدہ تک وہ بادبانی

کشتی ہی میں آئے تھے اور اس میں ان کو سخت تکلیف اٹھانی پڑی تھی۔ بلکہ وہ تقریباً ارادہ توڑ چکے تھے۔ جدہ میں ہم یمنوں کی رباط (مسافرخانہ) میں مقیم تھے۔ ایک شخص مستری غلام محمد مرحوم امرتسر کے باشندہ وہ بھی ہندوستان جانا چاہتے تھے اور قلت خرچ کی وجہ سے دخانی جہاز میں سفر نہ کرسکے تھے۔ میں نے اور انھوں نے بھائی صاحب مرحوم کو تیسرے امر پر بمشکل آمادہ کیا اور ایک بڑی کشتی مسقط جانے والی بادبانی جسکو بغلہ کہتے ہیں حاصل کی۔ بمبلغ دس روپیہ فی کس میں اس کا ٹکٹ لیا۔ جب چھوٹی کشتی پر سوار ہوکر (کیونکہ بغلے اپنی بڑائی کی وجہ سے وسط سمندر میں رہتے ہیں) وہاں پہونچے تو معلوم ہوا کہ بغلہ چھوٹ گیا مجبور ہوکر واپس ہوئے۔ اب بھائی صاحب مرحوم اور بھی مخالف ہوگئے۔ مگر ایک دوسرے بغلہ کا پتہ چلا اس کے لئے بمشکل تمام بھائی صاحب کو آمادہ کیا۔ انھوں نے اس کو بمشکل اس شرط پر قبول فرمایا کہ اگر یہ بغلہ نہ ملا تو پھر ضرور بالضرور واپس مدینہ منورہ کو ہوجائیں گے۔ اور اس پر اسی کرایہ میں سوار ہوگئے یہ بغلہ بحرین کے تاجروں کا تھا وہ کھجوریں لیکر آئے تھے اور ان کو فروخت کرکے نیز حج سے فارغ ہوکر واپس ہورہے تھے۔ اسمیں تقریباً ایک سو بیس مسافر تھے۔ کچھ اباضی (خارجی) مسقط کے باشندے تھے اور تقریباً ستر یا اسّی بنگالی حجاج تھے اور تین شخص ہم ہندوستانی تھے۔ اور دس پندرہ کشتیبان بحرین کے تھے چونکہ ہوا قدرے مخالف تھی اس لئے بغلہ کو وسط سمندر میں کشتیبان نہیں چھوڑتے تھے بلکہ کنارہ کنارہ پر چلاتے تھے۔ اور چونکہ اس دریا میں کنارے پر پہاڑیاں پانی میں زیادہ ہیں اسلئے رات کو ٹھہر جاتے تھے اور دن بھر چلاتے تھے۔ پندرہ دن میں عدن کے قریب پہونچنا ہوا مگر وہاں پر ہوا بالکل مخالف ملی اسلئے مکلہ باوجودیکہ صرف ایک دن کی مسافت دخانی جہاز کی رکھتا ہے پندرہ دن میں پہونچنا ہوا۔ خلاصہ یہ کہ جدہ سے ایک مہینہ میں مکلہ پہونچنا ہوا۔ باوجودیکہ ہم نے احتیاطی طور پر کافی خورد و نوش کا سامان لے لیا تھا مگر سب ختم ہوگیا۔ جس کی وجہ سے کشتی والوں سے چاول وغیرہ قرض لیتے تھے اور پھر مکلہ پہونچکر ان کو ادا کیا گیا۔ مکلہ پہونچنے تک مخالف ہوا کی وجہ سے بغلہ میں حرکت بہت زیادہ ہوتی تھی۔ اسی لئے بھائی صاحب مرحوم اور

مستری غلام محمد صاحب کو چکر ادرتے بہت آتی رہی۔ سائبان نہونے کی وجہ سے سایہ کی بھی تکلیف رہتی تھی۔ مگر مکلہ سے ہوا موافق ملی تو کشتیبانوں نے بغلہ کو وسط سمندر میں ڈالدیا۔ رفتار بھی خوب تیز ہوگئی۔ اور رات دن چلتا ہوا اسلئے سات دن میں مسقط پہونچگئے۔ حرکت بھی ایسی نہیں ہوئی جس سے متلی یا چکر یاتے ہوتی۔ مجھکو چونکہ بحری سفر میں چکر نہیں آتا اس لئے اس تمام سفر میں کوئی خاص تکلیف نہیں ہوئی۔ اس بحری سفر میں میں نے ایک شب میں خواب میں دیکھا کہ حضرت قطب العالم حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں مکہ معظمہ میں حاضر ہوا ہوں آپ نے فرمایا کہ تو جو کھجوریں مدینہ منورہ کی دیگیا ہے اس کو آکر تقسیم کردے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت میں تو آپ کے لئے لایا ہوں۔ میرے یہاں تو ان کی دوکان ہے۔ تو فرمایا کہ نہیں تو ان کو تقسیم کردے میں جانتا ہوں کہ ہندوستان میں یہ کھجوریں کن دقتوں سے حاصل ہوتی ہیں۔ اس خواب کو میں نے گنگوہ شریف پہونچکر جب حضرت مرشد قدس اللہ سرہ العزیز سے ذکر کیا تو فرمایا کہ تجھکو حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے یہاں سے اجازت ہوگئی میرے یہاں سے بھی ہو جائے گی۔ اس تعبیر پر میں شرمندہ ہوگیا کیونکہ میرے وہم وخیال میں بھی اس وقت اجازت حاصل کرنے کی طلب نہ تھی۔ اور خیال ہوا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سمجھیں گے کہ طلب خلافت اس کی غرض وغایت ہے۔

مسقط کے قریب ہی ایک آبادی مطرح ہے اس میں صرف اہل سنت والجماعت رہتے ہیں مگر مسقط کی زیادہ تر آبادی اباضیوں (خوارج) کی ہے اگرچہ حکومت دونوں جگہ سلطان مسقط ہی کی ہے جو کہ اباضی ہے۔ اس لئے بغلہ والوں نے مطرح میں ہی ہمکو اتارا۔ کیونکہ وہ سب سنی شافعی تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ڈاک کا جہاز کراچی جانے والا ایک روز پہلے جا چکا ہے۔ اب چھ سات دن کے بعد جائے گا۔ اس لئے وہاں سات دن ٹھہرنا پڑا۔ انگریزی عہدیدار کسٹم کا ہندوستانی مسلمان تھا اس نے جگہ دیدی وہاں قیام کیا گیا اور ساتویں دن جب جہاز آیا تو دو دو روپیہ فی کس پر کراچی کا ٹکٹ لیکر اوس پر سوار ہوگئے اور ایک دن رات سفر کرنے کے بعد کراچی پہونچنا ہوگیا

ڈیڑھ مہینہ سے کچھ زیادہ میں یہ سفر طے ہوا۔ ربیع الاول کا وسط ہو چکا تھا۔ ہمارے پاس جو کچھ نقد تھا وہ اس قدر خرچ ہو چکا تھا کہ سہارنپور کا ٹکٹ لینے کے بعد راستہ میں کھانے کے لئے صرف تین چار آنہ باقی رہ گیا تھا مگر جب ہم نے ڈاک گاڑی پر بیٹھنا چاہا تو ٹکٹ کلکٹر نے روک دیا اور کہا کہ اسباب زائد ہے اس کو وزن کرواؤ۔ ہم نے دکھلایا کہ وزن زائد نہیں ہے گاڑی کا وقت قریب ہے جانے دیجئے مگر اس نے نہ مانا۔ تلوانے اور بعض غیر ضروری چیزوں کے پھینکنے میں اسقدر دیر لگ گئی کہ گاڑی چھوٹ گئی۔ بالآخر دوسری پسنجر گاڑی میں روانگی ہوئی جو کہ لاہور تک نہیں جاتی تھی اس لئے اس نے راستہ میں چھوڑ دیا اور وہاں ایک شب پڑا رہنا پڑا اور جو چند آنے کھانے کے لئے ہمارے پاس تھے وہ بھی خرچ ہو گئے۔ اگلے دن ڈاک گاڑی میں روانگی ہوئی تو کھانے کا کچھ سامان نہ تھا۔ بالآخر مطرح سے کچھ مسقط کے حلوے کے ڈبے ہم نے ہدیہ کے لئے خریدے تھے ان کو مسافروں کے ہاتھ فروخت کر کے روٹی کھائی۔ اخیر شب میں گاڑی سہارنپور پہونچی۔ چونکہ ہمارے پاس مدینہ منورہ کی کھجوریں اور دیگر تبرکات تھے اور کھجوروں پر چنگی لگنی ضروری تھی۔ پیسے پاس نہ تھے اس لئے میں معہ اسباب اسٹیشن کی مسجد میں ٹھہر گیا اور بھائی صاحب حضرت مولانا خلیل احمد صاحب مرحوم کی خدمت میں اس لئے چلے گئے کہ وہاں سے کچھ پیسے لا کر چنگی والوں کو دیدئے جائینگے مگر مولانا مرحوم نے ان کو روک لیا اور کسی خادم کو معہ پیسوں کے بھیجدیا۔ پھر حضرت مولانا کی خدمت میں حاضری کی سعادت مجھکو بھی نصیب ہوئی۔ بھائی صاحب مرحوم وہاں سے براہ راست گنگوہ شریف روانہ ہو گئے مگر میں نے یہ مناسب سمجھا کہ پہلے دیوبند حاضر ہو لوں اس کے بعد وہاں سے گنگوہ شریف کا قصد کروں گا۔ جو ہدایا وہاں کے حضرات کے ہیں وہ بھی پہونچا دیئے جائیں گے اور ان کی زیارت کا بھی شرف حاصل ہو جائے گا اور پھر باطمینان گنگوہ شریف میں قیام ہو سکے گا۔ گنگوہ شریف کے لئے جو تبرکات عامہ تھے وہ بھائی صاحب اپنے ساتھ لے گئے مگر حجرہ شریفہ کا غبار، مسجد شریف کی کھجوریں (اس زمانہ میں صحن مسجد نبوی میں بھی چند درخت کھجوروں کے تھے) اور بعض خصوصی دیگر تبرکات میرے ہی پاس تھے چونکہ حجرہ مطہرہ

نبویہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے خاص خدام جنکو آغاوات کہتے ہیں مجھ سے پڑھا کرتے تھے اس لئے خصوصی تبرکات مجھکو حاصل کرنے میں آسانی ہوتی تھی۔ میں اول دیوبند گیا اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اساتذہ کرام سے شرف ملاقات حاصل کیا میری ایک غرض اس میں یہ بھی تھی کہ میں حضرت مرشد قدس اللہ سرہٗ العزیز کی بارگاہ میں تنہا اور پیادہ حاضر ہوں۔ بھائی صاحب پیادہ چلنے پر راضی نہ تھے۔

چونکہ ہمکو جدہ سے روانہ ہوکر تقریباً دو ماہ گذر چکے تھے اس لئے حضرت والد صاحب مرحوم بیتاب تھے کیونکہ اس مدت طویل میں ان کو کوئی خبر ہماری نہیں ملی تھی وہ اس خیال میں تھے کہ جہاز آٹھ دس دن میں بمبئی پہونچتا ہے تو پندرہویں سولہویں دن بمبئی یا کراچی پہونچنے کی خبر آجانی چاہئے اس لئے انھوں نے گنگوہ شریف حضرت قطب عالم رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں خط بھیجا کہ بقصد حاضری بارگاہ عالی میرے فلاں فلاں لڑکے روانہ ہو چکے ہیں مگر ابھی تک کوئی خبر اُن کے پہونچنے کی معلوم نہیں ہوئی اس لئے فکر ہے۔ اس لئے وہاں بھی انتظار تھا بھائی صاحب مرحوم کے پہونچنے سے پہلے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے دو جوڑے نئے کپڑوں کے کرتہ پائجامہ تیار کرا رکھے تھے۔ جب بھائی صاحب پہونچے تو فرمایا کہ میں نے تم دونوں کے لئے ایک ایک جوڑا کپڑوں کا تیار کرا رکھا ہے۔ مگر جب دونگا کہ حسین احمد آجائے۔ نیز پوچھا کہ حجرہ شریفہ کا غبار بھی لائے ہو یا نہیں بھائی صاحب نے فرمایا کہ وہ حسین احمد کے ساتھ ہے۔ جو تبرکات کھجوریں، زمزم وغیرہ بھائی صاحب لے گئے تھے ان کو پیش کیا اور شرف بقبولیت ہوئے۔

دیوبند میں ایک دن قیام کرنے کے بعد ظہر کے بعد پیدل روانہ ہوا اور چونکہ گرمیوں کے دن تھے اس لئے راتوں رات چلکر صبح کو نو دس بجے گنگوہ شریف پہونچا۔ اپنی نالائقی اور تن پروری اور راہ طریقت میں کسلمندی وغیرہ کی وجہ سے خجالت اور شرمندگی کا اثر قوی برابر تھا۔ اس لئے راستہ میں برابر گریہ طاری رہتا تھا۔ اور شوق حضوری بارگاہ کشاں کشاں قدم بڑھا رہا تھا بالآخر حاضر خدمت ہوا اور شرف ملاقات سے فیضیاب ہوا بہت زیادہ شفقت فرمائی اور وہ دونوں جوڑے

عنایت فرمائے۔ چونکہ ان میں عمامے نہ تھے اس لئے بھائی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت ہم اپنے اپنے عمامے لے آتے اور پیش کرتے ہیں آپ اپنی طرف سے ہمکو وہ عطا فرما دیں تاکہ جوڑا مکمل ہوجائے تو ارشاد فرمایا کہ نہیں پھر دیکھا جائیگا اس کے بعد ذات بحت کا مراقبہ تعلیم فرمایا اور کہا کہ یہ چیز وہاں کس طرح لکھی جاسکتی تھی۔

اس زمانہ میں حضرت مولانا محمد یحیٰی صاحب مرحوم کاندھلوی حاضر باش خدمت تھے اُن سے کہلوایا کہ دونوں سے پوچھو کیوں آئے ہیں اگر مدرسی یا ملازمت کے قصد سے آئے ہوں تو کوئی کوشش کی جائے۔ مجھکو اس پر تعجب ہوا میں نے عرض کیا کہ میں کسی دنیاوی امور نفسانی غرض سے نہیں آیا ہوں۔ میرا مقصد بجز طلب ذات حق سبحانہ اور کوئی نہیں ہے۔ ارشاد ہوا تھا کہ ایک مہینہ کے لئے تو یہاں آجا اس لئے حاضر ہوا ہوں۔ میں کوئی دوسرا مقصد نہیں رکھتا اس کو سنکر سکوت فرمایا۔

خانقاہ قدوسیہ میں ہر ایک کو ایک ایک حجرہ ملگیا اور وہاں رہنے لگے کھانے کیلئے ارشاد فرمایا گیا کہ ہمارے یہاں سے دونوں کا کھانا آیا کرے گا۔ چنانچہ جب تک قیام رہا حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں سے ہی کھانا آتا رہا۔ غبار حجرہ مطہرہ پیش کیا گیا اس کو سرمہ میں ڈلوایا اور روزانہ اس سرمہ کو استعمال فرماتے رہے۔ مسجد نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کھجوروں کے تین دانے پیش کئے گئے ان کو تقریباً (۲۰) حصہ میں کرکے تقسیم فرمائے۔ مدینہ منورہ کی کھجوریں جو تقسیم کی گئیں ان کے متعلق ہدایت فرمائی کہ ان کی گٹھلیاں پھینکی نہ جائیں ان کو ہاون دستہ میں کٹوا کر رکھ لیا اور روزانہ اس میں سے تھوڑا سا پھانک لیا کرتے تھے۔

میں نے تعلیم کردہ شدہ مراقبہ پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ عصر کے بعد جبکہ صحن میں مجلس عمومی فرماتے تھے تو اسی مراقبہ میں حجرہ قدوسیہ (جسمیں حضرت رحمۃ اللہ علیہ رہتے تھے) کے برآمدہ میں ستون کے پیچھے تقریباً دو تین گز فاصلہ سے میں مشغول ہوجاتا تھا مغرب کے وقت تک اس میں وہاں ہی مشغول رہتا تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں مثل مشائخ نقشبندیہ کوئی مجلس توجہ اور حلقہ کی

نہ تھی البتہ مسترشدین اپنی اپنی جگہ پر اپنے مشغلہ قلبی میں مشغول ہو جاتے تھے۔ عادت شریف یہ تھی کہ صبح کی نماز کے بعد حجرہ شریفہ میں داخل ہوتے اور دروازہ بند کر لیتے۔ مشاغل روحانیہ میں مشغول رہ کر ڈیڑھ دو گھنٹہ دن چڑھنے کے بعد دروازہ کھلتا اور صحن میں گولر کے درخت کے نیچے بیٹھتے تھے۔ مہمانوں سے باتیں۔ خطوط کے جوابات۔ فتاوی وغیرہ اسی وقت انجام پاتے تھے۔ یہ عام مجلس تقریباً گیارہ بجے تک رہتی تھی۔ مسترشدین کو اگر کوئی بات مجمع میں پوچھنی ہوتی تھی اس وقت پوچھتے تھے۔ ذاکرین اپنے کمروں میں مشغول رہتے تھے۔ اسکے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ مکان تشریف لیجاتے تھے اور کھانے کے بعد تشریف لاکر قیلولہ فرماتے تھے ظہر کے بعد حجرہ شریفہ میں دروازہ بند کر کے تلاوت قرآن شریف وغیرہ میں تھوڑی دیر مشغول رہتے تھے پھر دروازہ کھلتا تھا۔ اس زمانہ میں اسی وقت میں معجم کبیر طبرانی کا قلمی نسخہ آیا ہوا تھا چونکہ آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے اس لئے مجھ سے پڑھوا کر سنا کرتے تھے۔

عصر کے بعد خدمت میں قریب بیٹھ کر مشغولیت مراقبہ سے مجھکو نہایت قوی اور بہت زیادہ فائدہ ہوتا تھا۔ چند دنوں کے بعد میں نے خواب میں دیکھا کہ کسی میدان میں وہ گولر جو صحن حجرہ میں تھا اور اس کے سایہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ بیٹھا کرتے تھے کھڑا ہے اور اسمیں گولر پکے ہوئے لگے ہیں کچھ لوگ ڈھیلے پھینک رہے ہیں تاکہ پکا ہوا گولر حاصل کریں میں نے بھی بہی کوشش کی مگر کوئی گولر ہاتھ نہیں آیا۔ یکایک دیکھا کہ ایک پکا ہوا گولر مع اس ٹہنی کے جس میں وہ لٹک رہا تھا (ڈھینپی) خود بخود ٹوٹا اور لٹکتا ہوا نیچے اترتا ہوا آہستہ آہستہ میرے پاس آگیا اور میں نے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اس خواب کو میں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا تو فرمایا کہ ثمرۂ مقصود ہاتھ آئیگا۔ ایک روز عشا کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا بدن منجملہ دیگر خدام دبا رہا تھا۔ میں پشت کی طرف تھا دباتے دباتے آنکھ جھپک گئی تو دیکھا کہ ایک شخص کہتا ہے کہ چالیس دن گذرنے کے بعد مقصود حاصل ہوگا۔ اس تاریخ کے ٹھیک چالیس دن گذرنے پر عصر کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بھائی صاحب مرحوم سے فرمایا کہ

اپنے اپنے عمامے لے آؤ بھائی صاحب لے آئے۔ حضرت نے ہر ایک کے سر پر اس کا عمامہ باندھ دیا۔ جس وقت حضرت رحمۃ اللہ علیہ میرے سر پر عمامہ باندھ رہے تھے مجھ پر زوردار گریہ طاری تھا اور اپنی کم مایگی اور خجالت کا شدید احساس تھا۔ اس کے بعد بھائی صاحب سے فرمایا کہ جانتے ہو یہ کیسی دستار ہے بھائی صاحب نے عرض کیا کہ دستار فضیلت ہے فرمایا کہ "نہیں یہ دستار خلافت ہے۔ میری طرف سے تم دونوں کو اجازت ہے۔

بھائی صاحب مرحوم کو بہت خوشی تھی مگر مجھ پر اس وقت سخت صدمہ تھا اور بار بار روتا تھا کیونکہ اپنی ناقابلیت اور نامرادی بدحالی مشاہد تھی اور اس صدمہ کا اثر چہرہ اور گفتار رفتار وغیرہ پر ظاہر تھا۔ مولانا صادق الیقین صاحب مرحوم نے (موصوف کرسی ضلع لکھنؤ کے باشندہ اور حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز کے خاص خلفاء میں سے تھے) جبکہ اس صدمہ کا مذاکرہ ہو رہا تھا اور میں نے اپنی بے بضاعتی اور بدحالی کا تذکرہ کیا تھا فرمایا کہ مخبر صادق نے خبر دی ہے اس کا اعتبار ہونا ضروری ہے۔ اس کے دو تین دن بعد میں نے عرض کیا کہ سلسلہ نقشبندیہ کا سلوک بھی میں طے کرنا چاہتا ہوں تو فرمایا کہ جو تعلیم میں نے دی ہے وہ سب کی بالکل آخری تعلیم ہے یہاں پر تمام سلاسل مل جاتے ہیں۔ اسی کی مشق کرو۔ اسی میں جد و جہد کر کے پیر مرید سے بڑھ جائے یا مرید پیر سے بڑھ جائے۔

اس میں شک نہیں کہ اس مدت میں جو احوال اور کیفیات قلب پر وارد ہوتی تھیں یا جو رویا صالحہ وغیرہ پیش آتی تھیں ان کا تذکرہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے کر دیا کرتا تھا۔ اثنا سلوک میں انوار مکاشفات الہامات وغیرہ بالکل پیش نہیں آئے۔ ایک مرتبہ برقی کیفیت کے انوار پیش آئے حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا تو وہ کیفیت بھی جاتی رہی۔ ہاں یہ بہت پیش آیا کیا کہ اپنے سامنے بدریا تیز روشنی کی شمع یا دائیں جانب ایک ایک یا دو دو شمع بین النوم والیقظہ دیکھتا تھا۔ جسکی تعبیر ظاہر ہے۔ یہ حالت مدینہ منورہ میں بھی اور بعد میں احمد آباد جیل وغیرہ میں بھی کبھی کبھی رہتی تھی۔ جس سے حضرت مرشد قدس اللہ سرہ العزیز اور جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی روحانی امداد

معلوم ہوتی ہے۔

دو ماہ سے دو چار دن تقریباً زیادہ حاضر باشی کو ہو گئے تھے کہ یکبارگی بعد از اجازت یہ کیفیت پیش آئی کہ نماز میں بھی اور باہر بھی یہ تمام فضا بین السموات والارض مجھکو تنگ معلوم ہونے لگی اور نماز میں اسقدر اس کا اثر ہوا کہ جی چاہتا تھا کہ نماز توڑکر بھاگ جاؤں حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا تو فرمایا کہ جاؤ کلیر شریف وغیرہ ہو آؤ۔ حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بھی جب قبض پیش آتا تھا تو ایسے مقامات پر تشریف لیجاتے تھے چنانچہ ہم دونوں کلیر شریف اور دیوبند وغیرہ گئے اور چند دنوں میں واپس آ گئے۔ یہ حالت اس سفر میں جاتی رہی واپسی کے بعد تقریباً پندرہ دن قیام رہا۔ پھر فیض آباد اور بھوپال وغیرہ کا سفر پیش آگیا۔ وہاں سے واپسی پر موسم حج قریب آگیا تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے دو حج بدل اپنے اعزہ کے عطا فرمائے جن سے مدینہ منورہ تک واپسی کی صورت ہو گئی۔ اس زمانہ میں بھی بمبئی اور کراچی کے بندر بند تھے۔ پوربندر سے حجاج کی جہاز کی روانگی مقرر ہوئی تھی غالباً ابتدائی شوال میں جہاز روانہ ہوا۔ ذیقعدہ کے ابتدا میں جدہ پہونچا اور پھر بعد از حج ابتدائے ۱۳۳۲ھ میں مدینہ منورہ پہونچنے کا شرف حاصل ہوا۔

اس مدت میں طلبہ میں کافی شہرت ہو چکی تھی۔ ابتدائی کتابیں بھی صاف ہو چکی تھیں۔ عربی تقریر کی مشق بھی اچھی طرح ہو گئی تھی۔ اس لئے طلبہ کا ہجوم زیادہ ہوا۔ ضروری تھا کہ کچھ وقت مشاغل طریقت کے لئے روزانہ مقرر کیا جاتا اور اُس میں تعلیم کردہ شدہ اشغال کو انجام دیا جاتا مگر بدقسمتی سے جب بھی اس کے لئے بیٹھتا تو ہجوم خواطر و احادیث نفس و غلبہ نوم سے پریشان ہو جاتا۔ ادھر طلبہ کے ہجوم نے اس پر مجبور کر دیا کہ جس قدر بھی ممکن ہو ان کو اوقات تعلیم کے لئے دیئے جائیں۔ بالآخر اپنی بدقسمتی اور شومی احوال کی شکایت اور مشاغل تدریسیہ کی کیفیت حضرت قطب العالم قدس اللہ سرہ العزیز کی بارگاہ میں لکھی تو جواب آیا کہ "پڑھاؤ اور خوب پڑھاؤ" نفس کو یہ جواب خوب پسند آیا۔ مشاغل طریقت تو تقریباً چھوٹ گئے اور مشاغل تعلیمیہ

اس قدر جملہ فنون میں بڑھ گئے کہ دن رات میں تقریباً تین گھنٹہ بمشکل سونا ہوتا تھا باقی اوقات تدریس اور مطالعہ اور شخصی ضروریات میں صرف ہوتے تھے۔ اس سے علوم و فنون میں تو وقت بحمداللہ ترقی کرتی رہی مگر معارف و طریقت میں پسماندگی ہی رہی۔

یہ کس قدر بدنصیبی تھی کہ حضرت قطب عالم مرشد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر باشی کا شرف تین مہینہ کامل بھی نصیب نہ ہوا۔ حالانکہ ان کی بارگاہ میں حاضری اور مشغولیت سے جو فیض روحانی میں محسوس کرتا تھا وہ نہایت ہی عظیم تھا۔ اور اصلاح حال بہت زیادہ ہوتی تھی کاش کچھ عرصہ تک اس کے حصول کی نوبت آتی تو خدا جانے کہاں تک ترقی ہو جاتی مگر ؎

تہیدستان قسمت راچہ سود از رہبر کامل

کہ خضر از آب حیوان تشنہ می آرد سکندر را

بدقسمتی نے چاروں طرف سے گھیر لیا اور ایسے اسباب و عوارض پیش آ گئے جنھوں نے قیام نہ کرنے دیا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ گھر کے لوگوں پر مدینہ منورہ میں سخت عسرت کا حال گذر رہا تھا۔ والد صاحب مرحوم کے بھی تقاضے آتے تھے۔ جنکی بنا پر یہ بھی حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے جلد واپسی کا ارشاد فرمادیا۔ بہر حال شومی قسمت اور طبعی رذالت، تن پروری، کسلمندی، عدم استقلال، راحت طلبی وغیرہ نے ایسے گل کھلائے کہ باوجود ہر قسم کے سامان ترقی کے محرومیت ہی کا منہ دیکھنا پڑا ؎

سودہ گشت از سجدۂ راہ بتاں پیشانیم

چند برخود تہمت دین مسلمانی نہم

اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل و کرم سے ایسی مقدس اور بابرکت اور کاملین اہل اللہ کے دروں تک پہونچایا کہ جو نہ صرف اپنے زمانہ کے ممتاز اور مایۂ ناز اور آسمان طریقت و شریعت کے درخشندہ آفتاب تھے بلکہ صدیوں میں بھی زمانہ کو ایسی ہستیاں نصیب نہیں ہوئی تھیں مگر اپنی دنارت اور خست کی وجہ سے میں حقیقی معنوں میں ان بزرگوں بلکہ تمام

سلسلہ کے لئے ننگ اور عار ہوا۔ کاش ان اقدام کی برکت سے مغفرت اور اصلاح حال کی نعمت اور رضا طلبی حاصل ہو جائے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

یظن الناس بی خیراً وانی ؛ لشر الناس ان لم یعف عنی

بشارات اور رویا رصالحہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ بیعت ہونے کے بعد ہی سے برکات سلسلہ اور فیوض اکابر طریقت میں اپنے اندر محسوس کرنے لگا تھا۔ بالخصوص جب سے بالالتزام ذکر مدینہ منورہ میں کرنے لگا تھا۔ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز فرماتے تھے کہ اکابر نے ارشاد فرمایا ہے کہ کچھ عرصہ سے۔ (تقریباً سو برس یا اس سے زائد سے) ہندوستان میں برکات ذکر و شغل اوٹھ گئی ہیں یا اٹھتی جاتی ہیں۔ وہ فیض جو زمانہ قدیم میں حاصل ہوتا تھا اب نہیں ہوتا۔ حرمین شریفین میں فیض بدرجہ اتم موجود ہے۔ (اوکما قال)

بہر حال مدینہ منورہ زیدشرفا میں سلسلہ رویا رصالحہ وغیرہ بکثرت جاری رہا۔ مگر اس وقت لکھنے اور ضبط کرنے کا خیال نہیں ہوا۔

خواب میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام، اولیاء عظام، ائمہ فخام، اور جناب باری عز اسمہ کو بارہا دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ چونکہ قلمبند کرنے کی نوبت نہیں آئی اس لئے بلا ترتیب زمانہ جس قدر یاد ہے لکھتا ہوں۔

(۱) ایک مرتبہ دیکھا کہ آقائے نامدار جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مسجد شریف کے شمالی دروازہ باب مجیدی کے باہر بجانب شمال منہ کئے ہوئے (قبلہ مدینہ منورہ اور مسجد نبوی کا بجانب جنوب ہے) مسجد سے نکلکر کھڑے ہیں اور آپ کے لپ میں (دونوں ہاتھوں کا مجموعہ) بیٹھے کدو (جس کو کھنڈا اور عرب میں دبار رومی کہتے ہیں) کے بیج بھرے ہوئے ہیں میں سامنے سے حاضر ہوا جب میں قریب پہونچا تو آپ نے لپ کو نیچے سے کھولدیا کچھ بیج نیچے کو گرے تو میں نے دامن میں لے لیا ان کی مقدار تقریباً تیس عدد تھی۔

(نوٹ) مسجد نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کا شمالی دروازہ باب مجیدی کہلاتا ہے

اور سورالبلد کا دروازہ جو اس باب کے سامنے بجانب شمال واقع ہے اس کو بھی باب مجیدی کہتے ہیں۔ ہر دو دروازے سلطان عبدالمجید خاں مرحوم کے بنوائے ہوئے ہیں۔ اسلئے ہر دو کو باب مجیدی کہتے ہیں۔

(نوٹ) مدینہ منورہ میں میٹھے کدو کے بیج بکثرت پائے جاتے ہیں لوگ ان کو بھاڑ میں بھنوا کر دوکانوں پر فروخت کرتے ہیں اس کا مغز (گری) لوگ کھاتے ہیں مگر مجھکو خواب میں یہ احساس نہ تھا کہ یہ بیج بھنے ہوئے حسب عادت گری کھانے کے لئے ہیں۔ یا کچے ہیں جو کہ بونے کیلئے ہوتے ہیں بلکہ یہی آخری امر غالب خیال تھا۔

(۲) دیکھا کہ میں مسجد شریف میں منبر شریف کے سامنے بکریہ کے نیچے (وہ اونچی چھت دار جگہ جسپر تکبیر کہنے والے چڑھ کر تکبیر کہتے اور اثنا رنماز میں انتقالات پر بلند آواز سے مقتدیوں کو آگاہ کرتے ہیں یہ جگہ مسجد شریف میں منبر کے سامنے چار یا پانچ گز بجانب شمال واقع ہے) لیٹا ہوں اور مجھ پر سبز شال پڑی ہے اور ایک شخص یہ کہتا ہے کہ تیرے قدم جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قدم جیسے ہیں۔ اس کی تعبیر حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اتباع سنت سے دی تھی۔

(۳) دیکھا کہ ایک جگہ پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کھلی ہوئی ہے میں نے دیکھا کہ لاش مبارک سفید کفن میں قبر کے پاس باہر ہے۔ کفن کھلا ہوا ہے۔ چہرہ مبارک نہایت تروتازہ گورا گورا اور تمام جسم مبارک بھی تروتازہ ہے اور آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام چت سو رہے ہیں مگر آپ کی لبیں اور ناخن بڑھے ہوئے ہیں۔ میں نے قینچی سے آپ کی لبیں کتریں اور ناخونوں کو بھی کترا۔

(۴) روضہ مطہرہ (وہ حجرہ شریفہ جس میں قبر مبارک ہے) اُس کے جنوبی دیوار (مواجہہ شریفہ) کی جڑ میں ایک پختہ خندق تقریباً ڈیڑھ دو ہاتھ گہری اور کئی گز لانبی بنی ہوئی ہے جس کی لمبائی دیوار کی جڑ سے متصل سر مبارک کی طرف سے پاؤں کی طرف کو چلی گئی ہے۔ اور کچھ لوگ کھڑے ہو کر لانبی جھاڑو سے اس میں جھاڑو دے رہے ہیں۔ میں ایسی ہی لانبی جھاڑو لیکر پہونچا تو وہ سب

ہٹ گئے۔ میں نے تمام خندق کو جھاڑو دیا اور پانی ڈالکر پانی کو جھاڑو ہی سے صاف کیا یں جھاڑو سے پانی کو صاف کرتا ہوں اور صاف کردہ جگہ میں پانی خشک ہوتا جاتا ہے۔ پھر دیکھتا ہوں کہ اس میں رومی قالین خوش رنگ بچھ گئے ہیں۔ خندق کے آگے بجانب قبلہ قبر شریف کی طرف چہرہ کئے ہوئے کچھ لوگ تلاوت قرآن شریف میں مشغول ہیں۔

(۵) دیکھا کہ میں باب السلام سے (مسجد نبوی کا سب سے بڑا دروازہ جو کہ بجانب مغرب واقع ہے) مسجد میں داخل ہوا اور حجرہ مطہرہ کی طرف جا رہا ہوں اور جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قبر مبارک پر ایک کرسی پر رونق افروز ہیں۔ قبلہ کی طرف آپ کا چہرہ مبارک ہے میں داہنی جانب سے حاضر ہوا۔ (باب السلام مسجد نبوی میں قبلہ رو ہونے والے کے لئے داہنی جانب پڑتا ہے) جب میں بالکل قریب پہونچا تو آپ نے مجکو چار چیزیں عطا فرمائیں اون میں سے ایک علم ہے باقی تین اشیاء کو نہیں جانتا کیا تھیں۔ اس کے بعد میں کرسی کے پیچھے سے ہوتا ہوا ایک باغ میں جو کہ بجانب قبلہ آنحضرت علیہ السلام کے آگے تقریباً دس بارہ گز دوری پر واقع ہے داخل ہوا اسمیں میوہ دار درخت ہیں جن کی اونچائی قد آدم سے کچھ تھوڑی ہی زیادہ ہے ان درختوں کے پتے سیب کے پتوں جیسے ہیں اور ان میں پھل کالے کالے لگے ہوئے ہیں اور کچھ لوگ ان درختوں میں سے پھل چن چن کر کھا رہے ہیں۔ میں نے بھی ان سیاہ پھلوں کو توڑ کر کھایا۔ مقدار میں یہ پھل چھوٹے انجیر کے برابر تھے مگر ان کا مزہ ان موجودہ پھلوں سے سب سے علیحدہ اور اسقدر لذیذ تھا کہ اُس قدر لذیذ پھل میں نے کبھی نہیں کھائے۔ اس کے بعد میں نے ایک درخت اُسی باغ میں بڑے شہتوت کا دیکھا جس میں شہتوت لگے ہوئے ہیں جن میں کے پکے ہوئے پھل زرد رنگ کے ہیں۔ میں نے اس میں سے پکے ہوئے شہتوت توڑے اور میں سمجھ رہا ہوں کہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طبیعت کسی قدر ناساز ہے۔ یہ شہتوت آپ کے واسطے لیجا رہا ہوں۔

(نوٹ) میں نے اس خواب کو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا اور عرض کیا کہ حضرت معلوم نہیں کہ اُن چار چیزوں میں سے جو کہ مجھکو عطا فرمائیں علاوہ علم کے باقی تین کیا تھیں تو حضرت نے

فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ بھی ملے وہ خیر ہی ہے۔

(۶) ایک روز ایک کتاب اشعار کی دیکھ رہا تھا اس میں ایک مصرعہ تھا "ہاں اے حبیب رخ سے اٹھادو نقاب کو" یہ اس وقت بہت بھلا معلوم ہوا۔ میں مسجد شریف میں حاضر ہوا۔ اور مواجہ شریفہ میں بعد ادائے آداب و کلمات مشروعہ انہیں الفاظ کو پڑھنا اور شوق دیدار میں رونا شروع کیا۔ دیر تک یہی حالت رہی جب یہ محسوس ہونے لگا کہ مجھ میں اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کچھ حجاب دیواروں اور جالیوں وغیرہ کا حائل نہیں ہے اور آپ کرسی پر سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ کا چہرہ مبارک سامنے ہے اور بہت چمک رہا ہے۔

(۷) جبکہ میں کراچی سے گنگوہ شریف کے قصد سے سفر کر رہا تھا اور گاڑی ملتان کے قریب چل رہی تھی خواب میں دیکھا کہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف لائے ہیں اور ہر دو صاحبوں کے ہاتھ ایک کے دوسرے سے تشبیک کئے ہوئے ہیں۔

(۸) میں نے خواب میں امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ کو دیکھا تو ان سے دونوں ہاتھ ملا کر بیعت کی اور یہ الفاظ کہے۔ "ابایعك علی ما بایعت بہ النبی صلے اللہ علیہ وسلم"

(۹) دیکھا کہ کوئی شخص کہتا ہے کہ ائمہ مذاہب اربعہ یا کہا کہ ائمہ طرق اربعہ تیرے لئے دعا کرتے ہیں کیونکہ تو اثناء درس میں جب کسی کا ذکر آتا ہے تو ان کے لئے رحمہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے یا کہا کہ دعا کرتا ہے اور میں نے خواب ہی میں دیکھا کہ کچھ لوگ مختلف مقامات پر گرد و پیش بیٹھے ہوئے ہاتھ اُٹھائے دعا کر رہے ہیں۔

(نوٹ) میں نے اپنی عادت ہمیشہ سے کر رکھی تھی کہ جب کسی پیغمبر کا اسم گرامی آئے تو علیہ وعلی نبینا الصلوۃ والسلام یا علیہ السلام کہوں اور اگر کسی صحابی کا نام تنہا آئے تو رضی اللہ عنہ کہوں اور اگر سند حدیث میں دوسرے اکابر کے ساتھ آئے تو رضی اللہ عنہ وعنہم کہوں اور اگر ائمہ مذہب اور علماء و اولیاء سلف کا نام آئے تو اگر تنہا ایک کا نام آئے تو رحمہ اللہ تعالیٰ اور اگر چند کا نام آئے

تو رحمہم اللہ تعالیٰ کہوں۔ خواہ وہ اپنے مذہب کے ہوں یا شافعی، مالکی، حنبلی وغیرہ ہوں۔ بشرطیکہ اہل سنت والجماعت ہوں۔

(نوٹ) افسوس ہے کہ اہل درس و طلباء اس کا خیال نہیں کرتے حالانکہ یہ امر بہت مہتم بالشان ہے اور کتب اصول حدیث وغیرہ میں اس کی تاکید کی گئی ہے۔ ملفوظات قطب عالم حضرت سید احمد صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ مسمیٰ بہ صراط مستقیم میں حضرت شاہ محمد اسمٰعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ ۱۳۵ھ میں فرماتے ہیں۔

"ونیز سالک ایں سلوک را باید کہ در ادای حقوق انبیا و اولیا بلکہ سایر مومنین وتعظیم ایشاں کوشش بلیغ کند کہ ہمہ ایشاں ساعی و شافع وے شوند وسعی وشفاعت انبیاء و اولیا پر ظاہر است اما سعی ہر مومن پس دعائے خیر است۔ پس بتوقع دعائے خیر کہ کار آمدنی دراں مقام است تفقد و خاطرداری ہر مسلمان کند و ہمہ حقوق وتعظیمات در اتباع عزائم شرع شریف مودّی میشود۔"

(۱۰) حضرت خواجہ ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا کہ ایک کرسی پر رونق افروز ہیں میں حاضر ہوا تو ایک کھجور کا تہائی حصہ مجکو عطا فرما کر کہا کہ باقی دو حصے اور مشائخ کے ذریعہ سے پہنچائے جائیں گے۔

(۱۱) دیکھا کہ گیارہ یا رہ اولیاء اللہ کبار مشائخ میں سے تشریف لائے ہیں اور سب نے اجازت بیعت عطا فرمائی ہے۔

(۱۲) دیکھا کہ ایک بہت بڑا میدان ہے اور اس میں آسمان سے معلق ڈول لٹک رہے ہیں جنکے وہ تار جن سے آسمان تک ان کا علاقہ ہے میں دیکھ رہا ہوں وہ ڈول برابر یکے بعد دیگرے آتے ہیں اور میں ڈولوں کو الٹتا ہوں تو مٹھائی زمین پر اقسام مختلفہ کی ڈھیر ہوجاتی ہے میں دیکھ رہا ہوں کہ بہت بڑا ڈھیر مٹھائی کا ہوگیا ہے اور لوگ اس کو وہاں کھا رہے ہیں۔

(۱۳) اس زمانہ میں التزام کرتا تھا کہ باوضو سویا کروں۔ چنانچہ باوضو شب کو چھت پر سویا تھا

اور یہ مکان بقیع شریف اور حجرہ مطہرہ کے تقریباً بیچ میں واقع تھا۔ نصف شب کے پہلے دیکھا کہ ایک شخص کہتا ہے کہ مجھکو امام زماں اور افسر حج بنائیں گے۔ میں نے اس خواب کو شرم کیوجہ سے نہ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز سے اور نہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا۔ اور اسی طرح والد صاحب مرحوم اور بھائی صاحب بلکہ غالباً سوائے حکیم فرزند علی صاحب مرحوم دہلوی (مہاجر مدینہ منورہ) کسی سے بھی ابتک ذکر نہیں کیا۔ اپنی سیہ کاری اور بد اعمالی اور اپنی نالائقیت و دنارت ذاتی اسقدر اس کے خلاف ہر طرف سے حاوی ہے کہ جس سے ایسے امور کا خیال بھی لانا اجتماع نقیضین کو خیال میں لانا ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کو سب کچھ قدرت ہے مگر عالم اسباب میں موجودہ اسباب کسی طرح بھی اس کے مساعد نہیں معلوم ہوتے۔

(۱۴) ایک بہت بڑا درخت ہے جس کی ٹہنیاں چاروں طرف پھیلی ہوئی سایہ افگن ہیں اس درخت کے سب سے فوقانی سطح پر سمجھ رہا ہوں کہ جناب باری عز اسمہ جلوہ فرما ہے۔ ہیبت و جلال بے حد محسوس کر رہا ہوں اور کچھ اوپر سے ارشاد ہو رہا ہے (جس کی تفصیل پوری یاد نہیں رہی)

(۱۵) ایک روز مسجد نبوی کے اگلے حصہ کے محراب میں جس کو محراب عثمانی کہا جاتا ہے (جہاں پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نماز پڑھاتے وقت کھڑے ہوتے تھے) میں ذکر کر رہا تھا کہ نیند آگئی دیکھتا ہوں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تشریف فرما ہیں۔ ان کو بارگاہ الٰہی سے حکم ہوا کہ تم فنا ہو جاؤ انھوں نے ایک برش پر جو کہ مثل اولٹے تشت کے ہے اپنا سر فنا ہونے کے لئے رکھدیا۔ اس خواب کو گنگوہ شریف لکھا تو جواب آیا کہ تیری نسبت عثمانی ہے۔ اور اسی وجہ سے تو لوگوں کی حیار کی بنار پر مسجد شریف چھوڑ کر جنگل میں ذکر کے لئے جاتا ہے۔

(۱۶) ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ میں مسجد شریف میں چار زانو بیٹھا ہوا ہوں اور حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز بائیں جانب تشریف فرما ہیں جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم داہنی طرف سے تشریف لائے اور آپ کے دست مبارک میں کوئی کتاب ہے۔

(نوٹ) چونکہ عادت یہ تھی کہ اگر کوئی تکلیف یا مصیبت آنے والی ہوتی تھی تو اس قسم کا کوئی

خواب دیکھا تھا جس میں بجز معیت وامداد اور کوئی امر مفہوم نہیں ہوتا تھا تو مجھکو یہ فکر پیدا ہوئی کہ وہ کونسی صعوبت ہے جس کے دفعیہ کے لئے ہر دو مقدس آقا تشریف ارزانی اور امداد فرمارہے ہیں دو ہی چار روز گذرے تھے کہ مولوی احمد رضا خاں بریلوی آئے اور انھوں نے وہ عظیم الشان فتنہ ہمارے اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ اور ہم سبھوں کے متعلق اٹھایا کہ الامان والحفیظ مگر بفضلہ تعالیٰ وہ اور ان کی جماعت اس فتنہ میں جو کہ ہم سبھوں کے متعلق تھا کامیاب نہیں ہوئی اگرچہ اس کا اثر دیر تک کچھ نہ کچھ رہا۔

ان رویا، صالحہ کے علاوہ اور بھی رویار واقع ہوئیں مگر مرور زمانہ کی بنا پر پوری پوری یاد نہیں رہیں جن میں سے متعدد میں دودھ یا چھاچھ وغیرہ کا پینا بھی ہے۔ اگرچہ حسب ارشاد نبوی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) ذھبت النبوۃ وبقیت المبشرات قالوا وما المبشرات یا رسول اللہ قال الرؤیا الصالحۃ یراھا المومن او تری لہ اور حسب ارشاد علیہ السلام من رآنی فی المنام فقد رآنی فان الشیطان لا یتمثل بی (او کما قال علیہ السلام) ان رویا، صالحہ سے بہت کچھ امیدیں وابستہ کیجا سکتی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ حسب ارشاد حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ و دیگر اکابر بعض اشیا، عالم مثال میں متحقق ہوتی ہیں مگر ان کا وجود اس قدر ضعیف ہوتا ہے کہ عالم شہادت تک پہنچتے پہنچتے وہ مضمحل ہو جاتی ہیں اس لئے اگرچہ رویا، صادقہ میں عالم مثال کی کوئی چیز دیکھی گئی ہے مگر بعض اوقات میں عالم شہادت میں وہ متحقق الوقوع نہیں ہوتی۔ نیز ہر رویا، کے لئے شروط وموانع وغیرہ ہوتے ہیں جو کہ بسا اوقات دیکھنے والے کے ذہن سے جاتے رہتے ہیں اس لئے ان کو متیقن الوقوع نہیں کہا جا سکتا۔ بنا بریں ان رویا صالحہ وغیرہ پر کوئی یقین بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اولاً یہی امر مشتبہ ہے کہ آیا یہ رویار منجملہ رویار صالحہ ہے بھی یا نہیں کہیں خیالات مستقرہ فی القلب کا عکس تو نہیں ہے۔ یا کسی خلط کے غلبہ کا شگوفہ یا اضغاث احلام وغیرہ میں سے تو نہیں ہے۔ اور اگر رویار صالحہ میں سے ہو تو بھی اس کا من کل الوجوہ محفوظ رہنا بھی مشتبہ ہے پھر اگر محفوظ بھی مانا جائے تو تعبیر مشتبہ رہ جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بجز انبیاء علیہم السلام کی رویا کے کسی کی خواب شریعت میں حجت نہیں۔ نہ کسی کا کشف اور الہام قابل احتجاج ہے۔ ہاں امیدیں باندھنا اور جناب باری عزاسمہ کی رحمتوں پر نظر رکھنا ہمیشہ بندوں کا فریضہ ہے لَا تَقْنَطُوْا مِن رحمة الله اور انا عند ظن عبدی بی جیسے ارشادات عالیہ بہت کچھ امیدیں دلانے والے ارشادات ہیں۔ اگرچہ نہایت افسوس کے ساتھ مجبوراً یہ ظاہر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اپنی بداعمالی اور سوء احوالی اور آرام طلبی نفس پروری وغیرہ ہر طرف سے مایوسی ہی دکھلا رہی ہیں۔ کیا عجب ہے کہ اکابر و اسلاف کی جوتیوں کے طفیل میں مستقبل میں کسی وقت فضل و کرم خداوندی دستگیری فرمائے۔ وما ذلك على الله بعزیز

(۱۷) احمد آباد جیل میں خواب میں دیکھا کہ ایک شخص اوپر سے کہہ رہا ہے کہ جو رحمت خداوندی حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز کی طرف دنیا میں متوجہ کی گئی تھی۔ وہ اب تیری طرف پھیر دی گئی۔

(۱۸) ایک مرتبہ ایک خواب بہت مفصل دیکھی جس میں سے اس قدر یاد ہے کہ میں حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں حضرت بہت زیادہ الطاف فرما رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت مجھکو اپنے ضمن میں لیلیجئے۔ غالباً حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے قبول فرمایا اور پھر اُسی خواب میں حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھی شرف حاضری حاصل ہونا دیکھا۔

نکاح ثانی کیلئے میرا سفر ہندوستان ۱۳۲۶ھ میں جبکہ میری پہلی اہلیہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ والد صاحب مرحوم نے ارشاد فرمایا کہ تجربہ سے معلوم ہوا کہ یہاں کی عورتوں سے خواہ وہ مہاجرین کی لڑکیاں ہوں یا اہالی شہر کی ہماری غربت اور ہمارے تمدن سے نباہ نہیں ہو سکتا اس لئے تجھکو ہندوستان جانا چاہئے اور وہاں عقد کرنا چاہئے چنانچہ ۱۳۲۶ھ کے آخر میں روانہ ہو کر ۱۳۲۷ھ میں دیوبند پہونچا اور وطن میں رشتہ داروں کے پاس خطوط بھیجے اور متعدد مقامات پر کوششیں کیں۔ حضرت والد صاحب مرحوم نے بھی خطوط بھیجے تھے مگر وطن میں کوئی شخص رشتہ داروں

میں سے لڑکی دینے کو راضی نہ ہوا اور یہ جواب سب نے دیا کہ اگر ہندوستان ہی میں قیام کرے تو ہم عقد کرنے کو تیار ہیں مگر اس کے لئے تیار نہیں ہیں کہ وہ نکاح کرکے لڑکی مدینہ منورہ لیجائے اس خط وکتابت اور گفت وشنید میں تقریباً چھ ماہ گذر گئے۔ جبکہ اپنے کنبہ اور برادری کی طرف سے مایوسی ہوگئی تو پھر باہر گفت وشنید شروع کی گئی۔ حضرت حافظ زاہد حسن صاحب امروہی کی عنایات ہم لوگوں پر اور بالخصوص مجھ پر بہت زیادہ رہتی تھیں اور اب تک ان کی عنایات بے انتہا مجھ پر مبذول ہیں۔ مدینہ منورہ میں بھی میری موجودگی میں وہ گئے تھے اور طالبعلمی کے زمانہ سے ان سے تعلقات تھے۔ انھوں نے کوشش فرمائی۔ حکیم غلام احمد صاحب مرحوم بچھرایونی نہایت نیک خیال حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز کے متوسل تھے اور اپنے اکابر سے بہت گہرا تعلق رکھتے تھے انھوں نے حافظ زاہد حسن صاحب مرحوم سے اپنی منجھلی لڑکی کے متعلق پہلے سے کہہ رکھا تھا کہ کوئی مناسب جگہ خیال میں رکھیں۔ جب میرے ارادوں کی اطلاع حافظ صاحب موصوف کو ہوئی تو انھوں نے حکیم غلام احمد صاحب موصوف سے تحریک کی۔ چنانچہ حکیم صاحب موصوف عقد پر ان دو شرطوں سے راضی ہوگئے کہ عقد نکاح میں تمام بڑے اساتذہ اور حضرت حکیم مسعود احمد صاحب مرحوم۔ اور مولانا خلیل احمد صاحب مرحوم شرکت فرمائیں۔ اور حسین احمد صاحب بھی ہندوستان سے حجاز جائے تو ایک یادو برس رہنے کے بعد ایک مرتبہ معہ اپنی اہلیہ یہاں آئے۔ ان دونوں شرطوں میں مجھے پس وپیش ہوئی مگر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ راضی اور متکفل ہوگئے۔ چنانچہ عقد ہوگیا۔ اور حسب شرط سب حضرات وہاں تشریف لے گئے۔ مرحومہ سے دو لڑکے الطاف احمد اور اشفاق احمد پیدا ہوئے اور یکے بعد دیگرے معہ اپنی ماں کے ایام اسارت مالٹا میں وفات پاکر مدینہ منورہ میں مدفون ہوئے ہر دو خوردسالی میں فوت ہوئے۔

مدینہ منورہ کی تعلیمی حالت اور دیوبند جانے کی اصلی ضرورت

۱۳۲۰ھ سے ۱۳۲۶ھ تک مسلسل طور پر میرا مشغلہ علمی مدینہ منورہ میں جاری رہا جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے تمام مشاغل

معاش وغیرہ سے دست بردار ہو کر میں سفر گنگوہ سے واپس ہوتے ہی مسجد نبوی میں تعلیمی مشاغل میں تدریجاً منہمک ہو گیا حتی کہ روزانہ چودہ چودہ کتابیں مختلف فنون کی پڑھاتا تھا اور چونکہ مدینہ منورہ میں منگل اور جمعہ کو تعطیل ہوتی ہے تو ان تعطیل کے ایام میں بھی خصوصی دروس چار پانچ ہوتے تھے۔ بہت سی ایسی کتابیں جنکو ہندوستان میں پڑھایا نہیں جاتا ہے اور مدینہ منورہ، مصر، استبول کے نصاب میں وہ داخل ہیں پڑھانی پڑیں۔ مثلاً اجرومیہ، دحلان، کفراوی، الفیہ، ابن عقیل، شرح الفیہ ابن ہشام وغیرہ (نحو میں) شرح عقود الجمان، رسالہ استعارات، رسالہ وضعیہ للقاضی عضد وغیرہ (معانی وبیان میں) بدیعیۃ ابن حجہ (بدیع میں) نور الایضاح، ملتقی الابحر، دُرّ وغیرہ وغیرہ (فقہ میں)، شرح جمع الجوامع للسبکی وشرح مستصفی الاصول، ورقات۔ وشرح منتہی الاصول وغیرہ۔ (اصول شافعیہ ومالکیہ میں) مسامرہ شرح مسایرہ، شرح طوالع الانوار، جوہرہ وغیرہ (عقاید میں) الفیۃ اصول الحدیث، بیقونیہ ودیگر رسائل اصول حدیث میں۔ اسی طرح فرائض اور منطق وغیرہ کے متعدد رسائل اور کتابیں جنکو یہاں سنا بھی نہ تھا پڑھانا پڑا۔ چونکہ نفس فن میں ان فنون سے مناسبت تھی اس لئے کچھ دشواریاں پیش نہیں آئیں۔ جن کتابوں کو یہاں پڑھا تھا۔ خواہ تفسیر کی یا حدیث، معانی، کلام، فقہ یا اصول وغیرہ کی انکی بھی بارہا نوبت آئی اور بحمد للہ نہایت کامیابی کے ساتھ یہ دروس جاری رہے۔ اکابر اساتذہ رحمہم اللہ تعالیٰ کی برکتیں اور دعائیں اور فضل خداوندی شامل حال تھا اس سے علمی ترقی ہوتی گئی اور افاضہ اور استفاضہ کا حلقہ روز افزوں ہوتا رہا اگر حافظہ جید اور عمدہ ہوتا تو یقیناً بہت بڑی استعداد اور ذخیرہ علمی حاصل ہو جاتا۔ اس امر کا التزام تھا کہ کوئی کتاب بلا مطالعہ اور بغیر شروح وحواشی پر پوری طرح نظر ڈالنے اور سمجھنے کے نہ پڑھایا جائے اسی وجہ سے دن ورات میں تقریباً تین ساڑھے تین گھنٹہ سونا ملتا تھا باقی اوقات مطالعہ یا تدریس یا ضروریات بشریہ وغیرہ میں صرف ہوتے تھے۔ البتہ کبھی کبھی تمام دروس کا ناغہ کر کے دن کو بھی چھ سات گھنٹہ سو جاتا تھا جس سے ہفتہ بھر کا تکان رفع ہو جاتا تھا۔ اس زمانہ تعلیم میں جبکہ خوب سمجھ کر اور شروح وحواشی کو مطالعہ کر کے کتابیں پڑھانی پڑیں تو مضامین مستحضر ہو گئے کتب عالیہ

حدیث وتفسیر وعقاید واصول وغیرہ ہیں اور بالخصوص حدیث وتفسیر میں بعض بعض شبہات اور مشکلات پیش آتی رہیں جنکو حل کرنے کی کوئی صورت نہ تھی اور طبعی طور پر روز دار خواہش ہوتی تھی کہ کسی طرح حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز کی بارگاہ تک رسائی ہو تو کتب حدیث پھر پڑھوں کیونکہ طالبعلمی کے زمانہ میں اس طرح مضامین مستحضر نہ تھے اس لئے مشکل مسائل کے حل کرنے کی صورت پوری طرح سے نہ ہوسکی تھی اور عمر کا وہ حصہ لاابالی پن کا بھی تھا مگر اب اشد ضرورت ہے۔ پہلی اہلیہ مرحومہ کے انتقال کے بعد جبکہ والد صاحب مرحوم نے ہندوستان کے سفر کا ارشاد فرمایا تو میں نہایت خوشی سے اس پر تیار ہوگیا اور سیدھا دیوبند پہونچا اور ترمذی شریف اور بخاری شریف میں شریک ہوگیا اور بالالتزام ان دونوں کتابوں کو پھر پڑھا مسائل پر پوری ابحاث کیا کرتا تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ بھی اس مرتبہ غیر معمولی توجہ فرماتے تھے اور خلاف عادت تحقیقی جوابات نہایت وضاحت سے دیتے تھے۔ جس سے بہت فائدہ ہوا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ پہلے بھی بہت شفقت فرمایا کرتے تھے مگر اس مرتبہ بہت زیادہ عنایات فرمائیں۔ اور علاوہ علمی افادات کے دنیاوی اور معاشی امور میں بھی مثل والد حقیقی بلکہ زیادہ توجہ فرماتے رہے میرا قیام بھی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں رہا۔ دوسرے نکاح کے بعد بھی اہلیہ کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مکان ہی پر رکھا۔ سفر حضر میں ساتھ رہا۔ دارالعلوم میں ملازم بھی تدریس کتب کے لئے ہوگیا۔ ایک مرتبہ ہدایہ اخیرین میں ایک مسئلہ ایسا آگیا کہ بہت غور وفکر اور حواشی وشروح کے مطالعہ سے بھی حل نہ ہوسکا سخت عاجز ہوکر حجرہ مطہرہ نبویہ پر حاضر ہوا اور بعد سلام و درود عرض کیا تھوڑی ہی دیر میں سمجھ میں آگیا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف میں ایسے ایسے حکم اور علمی مضامین ملتے تھے کہ تمام مطولات وکتب قدیمہ میں ہاتھ نہیں آتے تھے ان سے طبیعت کو بہت زیادہ اطمینان اور شرح صدر ہوتا تھا اور یہی حالت ابتک ہے۔ ان مضامین کو دیکھ کر ارمان پیدا ہوتا تھا کہ کاش یہ علوم مجھکو بھی حاصل اور محفوظ ہوجائیں کیونکہ حضرت نانوتوی مرحوم کی تحقیقات نہایت ہی بلند پایہ اور مفید ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی قدس اللہ سرہٗ

العزیز کی تصانیف میں بھی تحقیقات اور حکمتیں بھری ہوئی ہیں اور نہایت مفید اور بلند پایہ ہیں مگر مجھکو جو طمانینت اور بلند پائیگی حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف میں ملتی تھی وہ وہاں نہ تھی۔ اگرچہ تحقیقات کے انتہائی بلند پایہ ہونے کی وجہ سے بہت سے مضامین سمجھ میں آنے دشوار ہوتے تھے اور چند صفحوں کے مطالعہ کے بعد طبیعت تھک بھی جاتی تھی اور بہت سی باتیں سمجھ میں بھی نہیں آتی تھیں تاہم ان سے بہت سکون اور شرح صدر ہو جاتا تھا افسوس کہ حافظہ کی کمزوری کی بنا پر بہت سے مضامین تھوڑے عرصہ میں ضائع ہو گئے اور ہوتے ہے ایک روز بہت غلبہ شوق پیدا ہوا اور ان علوم کے حاصل ہونے کی رغبت اسقدر زیادہ ہوئی کہ مواجہ شریفہ نبویہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ) میں حاضر ہو کر بہت رویا اور ان علوم کے حاصل ہونے کی استدعا اور درخواست کرتا رہا اور اپنی بے بضاعتی اور جہالت کا شکوہ بھی کیا۔ دیر تک اسی حالت گریہ میں رہ کر واپس ہوا تو چند قدم ہی چلا تھا کہ یکایک قلب میں وارد ہوا۔ لا تقنطوا من رحمۃ اللہ مگر افسوس کہ آج تک محرومی ہی ہے۔ ممکن ہے کہ آئندہ اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال ہو جائے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

علوم میں جد و جہد کرنے والے طلبہ کا ہجوم اسقدر ہوا کہ اور علماء و مدرسین کے حلقہ ہائے دروس میں اُس کی مثال نہیں تھی۔ عوام کے اجتماع سے بعض بعض حلقے بڑے بڑے ہوتے تھے مگر پڑھنے والے اور جد و جہد علمی کرنے والے اوروں کے یہاں کم تھے اور میرے یہاں حال برعکس تھا۔ عوام کو اس وجہ سے دلچسپی نہ ہوتی تھی کہ علمی ابحاث ان کی سمجھ میں آنی دشوار ہوتی تھیں۔ بعض بعض علماء ایسے بھی تھے کہ ان کے یہاں پہلے پہل رجوع بہت زیادہ تھی مگر بعد میں کم ہو گئی اور ان کے یہاں کے طلبہ بھی میرے یہاں آنے لگے۔ یہ سب برکتیں ان ذوات مقدسہ کی تھیں جن کی جوتیاں اٹھانے کا شرف بعنایت ایزدی حاصل ہوا تھا ورنہ میں تو بالکل ہی ناکارہ اور خالی تھا اور آجتک خالی ہی ہوں ؎

قبولیت اسے کہتے ہیں مقبول ایسے ہوتے ہیں ٭ عبید سود کا اُنکے لقب ہے یوسف ثانی

کا منظر نظر آتا تھا۔ اس کی بناء پر جس طرح بہت بڑی جماعت محبین اور ارباب عقیدت کی پیدا ہوگئی
اسی طرح ایک جماعت حاسدین اور رقباء کی بھی پیدا ہوئی۔ اس میں غیر علمی ہندوستانیوں اور
غیر ہندوستانیوں کی وہ جماعت بھی تھی جو کہ محض اس بناء پر بغض رکھتی تھی کہ اس خاندان کو اسقدر
قبولیت اور رفعت کیوں حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ اگرچہ میرے طرز عمل اور اکابر کے اتباع
اخلاق و اعمال اور تواضع کی وجہ سے ان کی کامیابی کی صورتیں منصہ ظہور پر نہیں آسکیں مگر پھر
بھی ان کے دلوں میں حسد کے زخم ہرے ہوتے رہے

مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کا فتنہ

۱۳۲۴ھ کے ابتداء میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز بعد از فراغت حج مدینہ منورہ تشریف لائے اور تقریباً
پندرہ روز قیام فرمایا چونکہ موصوف میرے اساتذ کرام میں سے تھے اسلئے طلباء مدینہ منورہ
کا انکی طرف بہت ہجوم ہوا اور عموماً علماء مدینہ بھی ان کی زیارت اور دست بوسی کے لئے حاضر
ہوتے رہے اور بہت بڑے مجمع نے اوائل کتب احادیث سنا کر مسجد شریف کے اندر بڑے
حلقہ میں اجازت کتب حدیث و علوم لی۔ یہ امر متعدد ان ہندوستانیوں کو نہایت شاق گذرا جو کہ
خود یا ان کے اکابر حضرات علماء دیوبند اور ان کے اسلاف رحمہم اللہ تعالیٰ سے کسی قسم کا خلاف
رکھتے تھے۔ نیز جاہل ہندوستانیوں کو بھی ان کے حسد نے اس پر مجبور کیا۔ ہم پر تو ان کا داؤ
اس لئے ابتک نہ چلا تھا کہ اہل مدینہ اور وہاں کے عماید وغیرہ سے ہمارے تعلقات قوی ہو گئے
تھے۔ وہ خود یا ان کے لڑکے اور احباب ہم سے پڑھتے تھے یا دوستی وغیرہ کا تعلق تھا۔ نیز ہماری
کوئی تصنیف بھی جس سے ان کو غلط افواہ پھیلانے کا موقعہ ملے موجود نہ تھی۔ ہر قسم کی کتب درسیہ
اہل سنت والجماعت کی زیر تدریس تھیں اس لئے ان کی غلط بیانیوں کی کوئی وقعت نہیں ہو سکتی
تھی۔ مگر حضرت مولانا مرحوم کی یہ عظمت اور شوکت دیکھ کر ان کے کلیجوں پر سانپ لوٹنے لگا۔ کتاب
براہین قاطعہ حضرت مولانا مرحوم کی اہل بدعت کے لئے جسقدر سیف قاطع اور دلوں کی زخمی کرنے
والی ہے اس کو اہل بدعت کا کلیجہ ہی جانتا ہے۔

چونکہ حضرت مولانا مرحوم قافلہ کی واپسی پر مجبور تھے اس لئے پندرہویں دن معہ اپنے رفقاء کے واپس ہوگئے مگر مخالفین کے سینوں میں زخم کر گئے۔ حضرت مولانا موصوف مرحوم کی واپسی کے بعد میں نے خواب دیکھا کہ میں مسجد شریف میں بیٹھا ہوا ہوں اور میرے ایک طرف حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز تشریف فرما ہیں اور دوسری طرف (غالباً داہنی جانب) جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کوئی کتاب لئے ہوئے تشریف لائے ہیں۔ بیداری پر مجھکو فکر ہوئی کہ کیا بات ہے کہ ہر دو آقا میری امداد فرما رہے ہیں۔ دو تین دن کے بعد مولوی احمد رضا خانصاحب بریلوی مدینہ منورہ پہونچے۔ وہ مکہ معظمہ میں بعد از حج اپنے ایک رسالہ حسام الحرمین پر دستخط کرانے کے لئے کچھ ٹھہر گئے تھے۔ ان کی آمد پر یہ زخمی جماعت (مخالف ہندوستانیوں وغیرہ کی) ان کے ارد گرد جمع ہوگئی۔ اور ہماری بڑھتی ہوئی وجاہت اور رفعت سے جو خطرات ان کو اپنے عقاید اور خیالات کے متعلق اور اپنی اپنی پوزیشنوں کے بارہ میں نظر آرہے تھے پیش کیا۔ نیز یہ کہا کہ رسالہ حسام الحرمین کے خلاف اگر حسین احمد نے کوشش کی تو کامیابی نہ ہو سکے گی اور یہی عظیم الشان مقصد مولوی احمد رضا خانصاحب کا تھا یعنی یہ کہ اس رسالہ کی تصدیق علماء مدینہ کر دیں اس لئے مشورہ ہوا کہ بڑے بڑے حکام سیاسی اور مذہبی سے ملاقات اور تعارف کرایا جائے اور ان کی خدمات میں نذرانے پیش کئے جائیں، وسائط مہیا کئے جائیں، متعدد رسائل مولوی صاحب موصوف کے پیش کر کے ان کی علمیت سے مرعوب کیا جائے اور کوشش کیجائے کہ اس فیض آبادی خاندان کو شہر بدر اور جلاوطن کر دیا جائے ایسا پہلے بہت مرتبہ ہو چکا تھا کہ کسی آفاقی عالم کا شہرہ علمی ہوا اور اس سے علماء یا اکابر مدینہ منورہ کو نفسانی یا واقعی خلاف پیش آیا تو اس کو بذریعہ حکومت جلاوطن کرا دیا چنانچہ علامہ شیخ محمود شنقیطی اور حجری وغیرہ سے ایسا معاملہ پیش آیا تھا کہ نفسانی اغراض مذہبی رنگ میں ظاہر ہوتی تھیں جیسا کہ عموماً دیکھا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس پر عملدرآمد شروع کیا گیا اور بہت بڑی تعداد نقود کی خرچ کی گئی دوڑ دھوپ شروع ہوگئی اور سازشوں کا جال پوری طرح پر بچھا دیا گیا۔ ہم بالکل بے خبر تھے کہ خبر پہونچی کہ کسی رسالہ پر دستخط لئے جا رہے ہیں اور

ہمارے اور اساتذہ کرام کے متعلق وہابیت کا ہر بااثر شخص سے پروپگنڈا کیا جارہا ہے۔ چونکہ سلطان عبدالمجید خاں مرحوم کے اوائل زمانہ حکومت میں نجدیوں کا حجاز پر غلبہ ہوچکا تھا اور انھوں نے دس برس مکہ معظمہ میں اور تین برس اخیر کے مدینہ منورہ میں حکومت کی تھی یہ لوگ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے پیرو تھے اور اپنے عقائد و اعمال میں نہایت سخت غالی تھے انھوں نے اہالی حرمین پر بہت زیادہ تشددات کئے تھے اور اپنے مخالف عقائد و اعمال والوں کو بہت زیادہ ستایا تھا اس لئے اہل حرمین کو ان سے بہت زیادہ بغض اور تنفر تھا۔ بالآخر سلطان عبدالمجید خاں مرحوم نے خدیوی محمد علی پاشاہ مرحوم والی مصر سے بوقت صلح شرط کی کہ وہ اہل نجد کو حجاز سے نکالے چنانچہ خدیوی مرحوم نے اپنے بیٹے ابراہیم پاشا کو جرار فوج کے ساتھ بھیجا اور اس نے نجدیوں کے قبضہ سے حجاز کو واگذاشت کیا۔ اس زمانہ سے حجاز میں یہ طریقہ جاری ہوگیا تھا کہ جس شخص سے تنفر پھیلانا منظور ہو اس کو وہابیت کی طرف نسبت کردیا جائے۔ اہل حجاز کو وہابیت سے اس قدر نفرت مظالم مذکورہ کی وجہ سے ہوگئی تھی کہ عیسائیت اور یہودیت وغیرہ سے بھی اتنی نفرت نہ تھی۔ یہی طریقہ انگریزی حکومت نے بھی ہندوستان میں اپنے مخالفین کے ساتھ جاری کیا۔

بڑی مشکلوں سے رسالہ حسام الحرمین بعض ان شخصوں کے پاس سے جن کے پاس تصدیق کے لئے گیا ہوا تھا دیکھنے کو مل گیا جس پر ہم نے فوراً اس کی غلط بیانی اور افترا پردازی کا پول تیار کرلیا۔

رسالہ حسام الحرمین کی حقیقت علمائے دیوبند اور ان کے اسلاف کرام رحمہم اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے جامعین شریعت وطریقت پکے حنفی اور متبع اسلاف اہل سنت والجماعت ہیں اور سلسلہ تلمذ حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مجددی ثم المدنی حضرت شاہ محمد اسحق صاحب دہلوی ثم المکی حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس اللہ اسرارہم سے رکھتے ہیں جس طرح سلسلہ ارادت حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز

اوران کے مشائخ طریقت چشتیہ، نقشبندیہ، قادریہ، سہروردیہ رحمہم اللہ تعالیٰ ورضی عنہم وارضاہم سے رکھتے ہیں۔ عقاید میں وہ اہل سنت اشاعرہ اور ماتریدیہ کے متبع اور اعمال و فروع میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے مقلد ہیں۔ انکا علم محض زبانی نہیں ہے بلکہ اون کے قلوب اور جوارح بھی حقیقۃً تقوی سے مزین اور منصبغ ہیں۔ اسی بنا پران کا اثر محبوبیت اور مقبولیت کا مسلمانوں میں نہایت زیادہ اور گہرا ہمیشہ سے رہا ہے جیسا کہ اسلاف کرام میں بھی ایسے ہی لوگوں کا رہا کیا ہے۔ قرآن شریف اور احادیث صحیحہ ایسے لوگوں کی قبولیت عامہ کے گواہ عادل ہیں سورۂ مریم میں ہے ان الذین امنوا وعملوا الصالحات سیجعل لھو الرحمٰن ودا مگر چونکہ حسب ارشاد قرآنی عادت خداوندی ہمیشہ سے یہ بھی جاری ہے کہ ہر پیغمبر کے لئے اہل باطل جنات وانسان میں سے کھڑے ہو کر آوازہ عداوت و تنفیر اٹھائیں اور سچے پیغمبروں کے خلاف سازشیں کریں۔ پارہ ہشتم میں ہے۔ وکذلک جعلنا لکل نبی عدوا شیاطین الانس والجن یوحی بعضھو الی بعض زخرف القول غرورا ولو شاء ربك ما فعلوہ فذرھم وما یفترون (ترجمہ) (اور اسی طرح ہم نے ہر پیغمبر کے لئے انسانوں اور جنات کے شیطانوں کو دشمن بنایا جو کہ ایک دوسرے پر سجائے ہوئے (جھوٹے) قول کو دھوکا دینے کے لئے القا کرتے رہتے ہیں اور تیرا رب اگر چاہتا تو یہ نکرتے پس چھوڑدے توان کو اور ان کی افترا کی ہوئی باتوں کو) انیسویں پارہ میں ہے وکذلک جعلنا لکل نبی عدوا من المجرمین وکفی بربك ھادیا و نصیرا۔ ترجمہ (اور اسی طرح ہم نے اہل جرائم میں سے ہر نبی کے دشمن بنائے اور تیرا رب ہدایت اور امداد کے لئے کافی ہے) غرض اس عالم امتحان وابتلا میں عادت خداوندی یہ بھی ہے کہ ہر پیغمبر کے (خواہ وہ کتنا ہی بڑا اور معجزات والا کیوں نہ ہو) دشمن انسان اور جنات میں سے کھڑے کئے جاتے ہیں اور وہ طرح طرح کی افترا پردازیاں اور سازشیں ان خدا کے سچے بندوں کے خلاف اٹھا کر مخلوق کو دھوکے دیتے اور پیغمبروں کو ستاتے رہتے ہیں۔ چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے واقعات اور سیر اس پر پوری روشنی ڈالتے ہیں

ہیں۔ جبکہ انبیاء علیہم السلام کا یہ حال ہوا تو ان کے سچے وارثوں کو اس نعمت میں سے بھی حصہ ملنا ضروری ہے۔ چنانچہ ہر زمانہ میں اکابر علماء راسخین اور اتقیاء صالحین کو ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی امام احمد، امام بخاری شمس الائمہ سرخسی وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو کچھ پیش آیا تواریخ کے صفحات اس سے بھرے ہوئے ہیں۔ اسی طرح اکابر صوفیہ کرام کے واقعات بھی صفحۂ عالم پر نمایاں ہیں۔ ہندوستان میں بھی انھیں اعداء اہل المدینہ کی ریشہ دوانیوں میں سے ملتانی وغیرہ علماء سوء کا فتویٰ تکفیر مرتب کرنا اور اس پر حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف علماء حرمین شریفین سے تصدیق کرانا۔ جہانگیر کے دربار میں شکایات کرا کے قلعہ گوالیار میں حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کو قید کرانا۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پہونچے اُتروا دینا، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اور ان کے بھائیوں اور اہل و عیال کو پیدل شہر بدر کرا دینا اور مکان وغیرہ کو ضبط کرا دینا۔ حضرت مرزا جان جانان رحمۃ اللہ علیہ کو شہید کرانا۔ حضرت سید احمد صاحب شہید بریلوی اور شاہ محمد اسمٰعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہما کے خلاف طوفان کو کھڑا کرنا وغیرہ ہوتا رہا۔ جس سے ایک جماعت کی عاقبت برباد ہوئی اور ان اسلاف کرام کے لئے درجات کی بلندی اور زلات و سیئات کے محو ہونے کی بے بہا نعمت ہاتھ آئی۔

بہر حال اکابر علماء دیوبند کو بھی اسی وراثت نبوی میں سے عظیم الشان حصہ ملنا ضروری تھا چنانچہ ملکر رہا۔ اور ایسا کھلا ہوا جھوٹ ان کے خلاف استعمال کیا گیا کہ جس کی نظیر نہیں ملتی۔ اولاً ان کو اس رسالہ میں وہابی ظاہر کیا گیا حالانکہ محمد بن عبدالوہاب اور اس کے فرقہ سے ان حضرات کو دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ وہ عقاید و اقوال جو طائفہ وہابیہ کے مشہور اور مابہ الامتیاز بین اہل السنۃ وبینہم ہیں ان کے خلاف ان حضرات کی تصانیف بھری ہوئی ہیں۔ وہابیہ انبیاء علیہم السلام کی حیات جسمانی اور بقاء علاقہ بین الروح والجسم کے بعد وفات ظاہری منکر ہیں، اور یہ حضرات صرف اسکے قائل ہی نہیں بلکہ مثبت بھی ہیں اور بڑے زور شور سے اس پر دلائل قائم کرتے ہوئے متعدد رسائل اس بارہ میں تصنیف فرما کر شائع کر چکے ہیں رسالہ آبحیات نہایت مبسوط رسالہ خاص اسی مسئلہ

کے لئے لکھا گیا ہے۔ نیز ہدیۃ الشیعہ۔ اجوبہ اربعین حصہ دوم اور دیگر رسائل مطبوعہ مصنفہ حضرت نانوتوی قدس اللہ سرہ العزیز اس مضمون سے بھرے ہوئے ہیں۔ وہابیہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لئے سفر کرنے کو ممنوع قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فقط مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کے لئے سفر کرنا چاہئے وہاں پہونچنے کے بعد زیارت بھی کرلی جائے۔ ہمارے اکابر زیارت مطہرہ کے لئے سفر کرنے کو نہ صرف جائز بلکہ افضل المستحبات اور قریب واجب قرار دیتے ہیں بلکہ محض زیارت کے لئے سفر کرنا جس میں اور کوئی دوسری قربت منوی اور ملحوظ نہ ہو۔ افضل اور اعلیٰ قرار دیتے ہیں چنانچہ رسالہ زبدۃ المناسک مصنفہ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز باب زیارۃ المدینہ اسپر شاہد عدل ہے۔

وہابیہ توسل بالانبیاء والاولیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو بعد الوفاۃ ممنوع اور حرام قرار دیتے ہیں۔ یہ حضرات اس کو نہ صرف جائز بلکہ ارجی للاجابت اور مفید تر قرار دیتے ہیں شجرات حضرات چشت رحمہم اللہ تعالیٰ اور آداب زیارت وادعیہ مدینہ منورہ اسپر شاہد عدل ہیں۔ جو کہ حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ اسرارہم کے متعدد تصانیف میں شائع ہیں۔

وہابیہ بارگاہ نبوت میں گستاخانہ کلمات استعمال کرتے رہتے ہیں اور یہ حضرات بارگاہ نبوت (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں اس قدر اظہار عقیدت فرماتے ہیں کہ ظاہر بیں اسکو غلو اور تجاوز عن الحد شمار کرنے لگتا ہے۔ رسالہ زبدۃ المناسک باب زیارۃ المدینۃ المنورہ میں تو الفاظ مدحیہ وغیرہ مصرحہ فقہاء کرام مذکور ہی ہیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ تو جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شان مبارک میں وہ عالی مضامین ارشاد فرماتے ہیں کہ جن تک پہونچنے سے بہت سے علماء ظاہر کے افہام تو درکنار کان بھی نا آشنا ہیں۔ رسالہ آبحیات، قبلہ نما، تحذیر الناس، ہدیۃ الشیعہ، اجوبۂ اربعین، قاسم العلوم، مناظرہ عجیبہ وغیرہ ایسے مضامین سے بھرے ہوئے ہیں۔ اجوبہ اربعین حصہ دوم صفحہ ۱۲۸ میں ہے۔

"اور سرا سمیں یہ ہے کہ افاضہ وجود و کمالاتِ وجود مخلوقات کی جانب اگرچہ خزانہ خداوندی ہی سے ہوتا ہے مگر بشہادۃ آیت النبی اولی بالمومنین اور آیہ خاتم النبیین چنانچہ تقریرات مرقومہ بالا سے واضح ہو چکا اور نیز بشہادۃ دیگر آیات و تائید تحقیقات ارباب مکاشفات وہ سب افاضہ بواسطہ حضرت خاتم المرسلین صلے اللہ علیہ وسلم ایسی طرح ہوتا ہے جیسے شب کو بواسطہ قمر افاضہ نور آفتاب ہوا کرتا ہے۔"

تمام انبیاء علیہم السلام کے جملہ کمالات اور علوم بلکہ نبوت و رسالۃ کو بھی جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے حاصل ہونا نہایت مدلل اور مفصل طریقہ پر ثابت فرماتے ہیں کمالات ولایت و قرب وغیرہ تو درکنار بلکہ نفس وجودِ جملہ عوالم و عالمیان کو بھی آپ ہی کے ذریعہ سے ثابت فرما رہے ہیں۔ قصیدہ مدحیہ میں ارشاد فرماتے ہیں۔

لگا تا ہاتھ نہ پتلے کو بو البشر کے خدا	اگر وجود نہ ہوتا تمہارا آخر کار
جلو میں تیرے سب آئے عدم سے تا بوجود	بجا ہے تمکو اگر کہئے مبدأ الآثار
بجز خدائی نہیں چھوٹا تجھ سے کوئی کمال	بغیر بندگی کیا ہے لگے جو تجھ کو عار
جو انبیاء ہیں وہ آگے تری نبوت کے	کریں ہیں امتی ہونے کا یا نبی اقرار
جہاں کے سارے کمالات ایک تجھ میں ہیں	ترے کمال کسی میں نہیں مگر دو چار
تو بوئے گل ہے اگر مثل گل ہیں اور نبی	تو نور دیدہ ہے گر ہیں وہ دیدۂ بیدار
بجز خدا کے بھلا تجھ کو کوئی کیا جانے	تو شمس نور ہے شپر نما او لو الابصار

یہ اشعار کسی اَل فَل مارنے والے، اطراء مادح کرنیوالے فی کل وادٍ یہیمون کے مصداق، مبالغ اور مفرط غالی شاعر کے نہیں ہیں بلکہ ایک خدا رسیدہ محقق مجسمہ معرفت و حقیقت امام اہل صدق و غواص بحر طریقت امام اہل کشف و شہود عارف بے بدل اور فاضل بے مثل کے ہیں جو کہ حقیقت اور واقعیت کے سوا کسی غلط مجاز اور مبالغہ کا روادار نہیں ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

ذرا ان مضامین عالیہ اور استدلالات عجیبہ اور عظیمہ کو جو کہ مذکورہ بالا رسائل وغیرہ میں ہیں اہل فہم

غور سے دیکھیں اور پھر اس واہی الزام و افترا پر غور کریں کہ معاذ اللہ یہ حضرات جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بڑائی صرف اس قدر مانتے ہیں جیسے ہم میں بڑے بھائی کو چھوٹے بھائی پر ہوتی ہے۔ جناب سید المرسلین خاتم النبیین علیہ السلام کے متعلق تمام انبیاء و مرسلین اور تمام اولیاء اور مومنین اور تمام صحابہ کرام و صدیقین کی ابوت روحانی کا بلکہ آپکا تمام کمالات وجود اور وجود کے لئے اہل عالم اور پروردگار کے درمیان میں واسطہ ہونا ثابت کرنے والا شخص اور اس کے متوسلین کیا اس لغو اور بیہودہ قول کے قائل ہو سکتے ہیں۔ ہاں اس حدیث کا انکار بھی نہیں کیا جاسکتا ہے جس میں رویت اخوان کی تمنا ظاہر فرمائی گئی ہے لیکن ہر چیز کا محل اور موقعہ ہے۔

ع ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مقامے دارد۔

(۵) وہابیہ تصوف اور بیعت طریقت اور اس کے اشغال ذکر و مراقبہ و توجہ حلقہ ہائے ذکر وغیرہ کے سخت منکر ہیں۔ اور یہ حضرات سب کے سب ان کے پابند ہیں۔

(۶) وہابیہ کے اکثر لوگ تقلید شخصی کے مخالف ہیں اور جو لوگ قائل بھی ہیں وہ نہایت ڈھیلے ہیں مگر یہ حضرات سب کے سب تقلید شخصی کو واجب اور اس کے تارک کو گنہگار فرماتے ہیں سراج الامہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے تمام جزئیات و کلیات میں مقلد ہیں اور نہایت مضبوطی اور سختی سے ان کا اتباع کرتے ہیں۔

(۷) وہابیہ ائمہ طریقت حضرت جنید بغدادی سری سقطی، ابراہیم بن ادہم، شبلی، عبد الواحد بن زید، خواجہ بہاء الدین نقشبند، خواجہ معین الدین چشتی، غوث الثقلین شیخ عبد القادر جیلانی، شیخ بہاء الدین سہروردی، شیخ اکبر ابن عربی شیخ عبد الوہاب شعرانی وغیرہ قدس اللہ اسرارہم اجمعین کی شان میں سخت گستاخی اور بے ادبی کے کلمات کہتے ہیں اور یہ حضرات ان کی محبت اور تعظیم اور توسل کو بہت مفید اور ضروری اور باعث برکات اور موجب رضاء خداوندی سمجھتے ہیں۔

الغرض وہابیہ کے عقاید و خیالات اور ان کے اعمال سے ان بزرگواروں کو دور کا بھی تعلق نہیں ہے اور نہ تھا، وہ مسلمانوں کو ذرا ذرا سی بات میں مشرک اور کافر قرار دیتے ہیں اور

دن کے مال اور خون کو مباح جانتے ہیں اور جانتے تھے جیسا کہ علامہ شامی رحمہ اللہ علیہ نے ردالمحتار میں لکھا ہے اور جیسا کہ غلطغط وغیرہ کے معاملات سے حجاز میں ظاہر ہوا۔ اور ان اکابر کا متفق علیہ قول یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان کے کسی قول اور عقیدہ میں سُو (۱۰۰) احتمال ہوں جن میں سے ننانوے احتمال کفر کے ہوں اور ایک احتمال بھی ایمان کا ہو تو اس کی تکفیر جائز نہیں ہے اور نہ وہ مباح الدم والمال ہوسکتا ہے بلکہ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز اپنے مکتوب انوار القلوب میں تصریح فرماتے ہیں کہ یہ قول فقہاء و ننانوے احتمال کا تحدیدی نہیں ہے بلکہ اگر کسی کے کلام میں ہزار احتمال ہوں جن میں سے نو سو ننانوے احتمالات کفریہ ہوں اور صرف ایک احتمال ایمان کا ہو تو اس کی بھی تکفیر جائز نہیں۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

خلاصہ یہ کہ ان حضرات کی طرف تہمت وہابیت ایسی ہی تھی اور ہے جیسے کہ زنگی کو کافور اور دن کو رات کہنا۔ مگر انگریزی پروپگنڈوں اور ڈیوائیڈ اینڈ رول کی پالیسی اور نفسانی سازشوں نے سب کچھ کرایا۔ ؎

خرد کا نام جنوں رکھ لیا جنوں کا خرد ⁘ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

بہر حال اہل حرمین کے جذبات برانگیختہ کرنے کے لئے وہی طریقہ اختیار کیا گیا جو کہ عوام مسلمانوں میں ہندوستان میں خاندان ولی اللّٰہی اور حضرت امام زماں سید احمد صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہم اور ان کے متوسلین کے لئے حکومت انگریزی اور اس کے آلہ کار اشخاص نے کیا تھا۔ اور اس کے ذریعہ سے جذبہ جہاد و حریت کو بڑے درجہ تک مسلمانوں سے فنا کردینے اور ان مجاہدین فی سبیل اللہ سے بالکلیہ متنفر کردینے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ عوام میں تو اس قدر نفرت نام تو اہب سے پھیلائی گئی کہ شرک و کفر، عیسائیت اور یہودیت، ہندویت اور بت پرستی سے مسلم عوام کو اتنی نفرت نہیں ہوئی جتنی کہ وہابیت سے ہوئی۔ مجھکو بخوبی یاد ہے کہ غالباً ۱۹۲۵ء یا اسی کے قریبی زمانہ میں پنجاب کے اخباروں میں ایک واقعہ چھپا تھا کہ کسی گاؤں کا

امام وہاں کے ایک ہندو بنئے کا مقروض تھا قرضہ بڑھ گیا تھا بنئے نے تقاضا کیا اور آیندہ قرض دینا بند کردیا امام صاحب نے اس کو سمجھایا مگر وہ بنیا نہ مانا اور کہا کہ جبتک پہلا قرضہ ادا نہ کردو میں تم کو کچھ قرض نہ دوں گا۔ امام صاحب دھمکی دے کر چلے گئے اور مسجد میں بعد نماز جمعہ اعلان کیا کہ فلاں بنیا وہابی ہوگیا ہے اس لئے اس سے کسی قسم کا معاملہ خرید و فروخت آمد و رفت کا جائز نہیں ہے۔ تمام باشندگان دیہہ نے بنئے کا بائیکاٹ کردیا۔ بنیا بیچارہ دن بھر دوکان پر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا تھا کوئی آدمی اس کی دوکان پر نہیں آتا تھا اُس نے بعض لوگوں سے پوچھا تو انھوں نے جواب دیا کہ امام صاحب فرماتے ہیں کہ تو وہابی ہوگیا ہے اس لئے ہم تجھ سے لین دین نہیں کرسکتے۔ بالآخر بنئے نے جاکر امام صاحب سے صلح کی تو امام صاحب نے اگلے جمعہ کو اعلان کردیا کہ بنئے نے وہابیت سے توبہ کرلی ہے اب لین دین جاری کردو چنانچہ بازار کھل گیا۔ خیال کیجئے کہ بنئے کا ہندو اور بت پرست مشرک ہونا تو لین دین میں حارج نہ تھا مگر وہابی ہونا حارج ہوگیا۔

اہل اغراض اس طرح ہمیشہ بھولے بھالے مسلمانوں کو دھوکے دیتے رہے ہیں۔ بمبئی، کاٹھیاواڑ دکن، پنجاب وغیرہ میں اس کے ذریعہ سے کیا کیا فتنے نہیں اٹھائے گئے اور کتنے خون نہیں بہائے گئے (خدا ہی خوب جانتا ہے) اپنے الو کو سیدھا کرنے اور مخالف کو نیچا دکھانے کے لئے یہ ہتھیار نہایت مفید ان لوگوں کو دیدیا گیا تھا۔ اگرچہ اب عام مسلمانوں کی بیداری کی وجہ سے وہ کامیابی نہیں حاصل ہوتی جو پہلے ہوتی تھی مگر اب بھی موقعہ پر ضرور اس سے کام لیا جاتا ہے۔

رسالہ حسام الحرمین میں اس کے ساتھ ساتھ دوسری چال یہ چلی گئی کہ مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے دعاوی مہدویت و نبوت اور توہین حضرت مسیح علیہ السلام اور ائمہ اہل بیت رضی اللہ عنہم وغیرہ کو ابتدا میں معہ توہب ذکر کیا گیا جسپر ہر مسلمان طیش میں آجاتا ہے۔ اہل حرمین نے قیاس کیا کہ اسی طرح دوسرے اشخاص بھی ہوں گے۔ ہم نے ان مکاید کی تفصیل رسالہ شہاب ثاقب میں تفصیلاً لکھدی ہے اس لئے اب اس پر روشنی ڈالنا تطویل کا باعث ہے۔ مختصراً چند ضروری

باتیں عرض کرتا ہوں۔

حضرت شمس الاسلام حکیم الامۃ امام زماں مولانا محمد قاسم صاحب بانی دارالعلوم دیوبند رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق یہ کھلی ہوئی تہمت لگائی کہ موصوف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت زمانی یعنی نبی آخرالزماں ہونے کے منکر ہیں اور رسالہ تحذیرالناس کی کاٹ چھانٹ کر ایک عبارت مع ترجمہ پیش کی۔ یہ عبارت مسلسل ذکر کی گئی تھی۔ حالانکہ اس کا پہلا ٹکڑا وسطانی اوراق تحذیرالناس کا تھا اور دوسرا حصہ اخیر کا اور تیسرا حصہ ابتدا کا۔ ان تینوں ٹکڑوں میں کوئی فاصلہ بھی نہیں دیا گیا تھا۔ اور نہ یہ دکھلایا تھا کہ اتنا ٹکڑا فلاں صفحہ کا ہے اور اتنا فلاں کا۔

الفاظ عبارت حسب ذیل ہیں۔

"بلکہ اگر بالفرض آپ کے زمانہ میں بھی کہیں اور کوئی نبی ہو جب بھی آپ کا خاتم ہونا بدستور باقی رہتا ہے بلکہ اگر بالفرض بعد زمانہ نبوی بھی کوئی نبی ہو تو بھی خاتمیت محمدی میں کچھ فرق نہ آئیگا۔ عوام کے خیال میں تو رسول اللہ کا خاتم ہونا بایں معنے ہے کہ آپ سب میں آخر نبی ہیں مگر اہل فہم پر روشن ہے کہ تقدم یا تاخر زمانہ میں بالذات کچھ فضیلت نہیں۔ (ترجمہ حسام الحرمین صہ ۱۳)

اس عبارت میں شروع سے (بدستور باقی رہتا ہے) تک کی عبارت صفحہ ۱۴ سطر ۱۵ کی ہے اور (بلکہ اگر بالفرض سے لیکر فرق نہ آئیگا) تک کی عبارت صفحہ ۲۸ سطر ، کی ہے اور (عوام کے خیال سے لیکر اخیر) تک کی عبارت صفحہ ۳ سطر ۳ کی ہے۔

ایک ظاہر بیں جو کہ رسالہ مذکورہ اور حضرت مولانا مرحوم سے واقف نہ ہو یقیناً ایسی عبارت سے دھوکہ کھا جائیگا اور سمجھنے لگیگا کہ صاحب تحذیرالناس اس مسلسل عبارت کو بتمامہا ایک جگہ لکھتے ہیں اور یہی ان کا عقیدہ ہے۔ مگر ایسے تصرف سے تو ہر ایک کے کلام میں بلکہ کلام اللہ سے بھی معانی کفریہ پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ کہا جاسکتا ہے (معاذاللہ) ان الذین امنوا وعملوا الصالحات اولئک اصحاب النار ھم فیھا خالدون۔

اس عبارت اور رسالہ مذکورہ کو دیکھ کر میری حیرت اور استعجاب کی کوئی انتہا نہ رہی کیونکہ اس رسالہ کے صفحہ ۱۴ و ۱۰ پر نہ صرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیۃ زمانی کا اقرار کیا گیا ہے بلکہ متعدد دلائل سے اس کو ثابت بھی کیا گیا ہے اور پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ جناب رسول اللہ علیہ وسلم کی خاتمیۃ زمانی اور آخر النبیین زمانًا ہونے کے انکار کرنے والے کے کفر کو بھی ثابت کیا ہے اور اس کے دلائل قائم کئے ہیں۔

تحذیر الناس صفحہ ۱۰ سطر ۳ پر فرماتے ہیں۔

"سو اگر اطلاق اور عموم ہے تب تو ثبوت خاتمیت زمانی ظاہر ہے ورنہ تسلیم لزوم خاتمیت زمانی بدلالت التزامی ضرور ثابت ہے۔ ادھر تصریحات نبوی مثل أنت منی بمنزلۃ ہارون من موسی الا انہ لا نبی بعدی او کما قال جو بظاہر بطرز مذکور اسی لفظ خاتم النبیین سے ماخوذ ہے اس باب میں کافی ہے کیونکہ یہ مضمون درجہ تواتر کو پہونچ گیا ہے۔ پھر اس پر اجماع بھی منعقد ہو گیا ہے گو الفاظ مذکور بسند متواتر منقول نہ ہوں سو یہ عدم تواتر الفاظ باوجود تواتر معنوی یہاں ایسا ہی ہو گا جیسا تواتر اعداد رکعات فرائض و وتر وغیرہ باوجودیکہ الفاظ احادیث مشعر تعداد رکعات متواتر نہیں جیسا اس کا منکر کافر ہے ایسا ہی اس کا منکر بھی کافر ہوگا۔" (تحذیر الناس صفحہ ۱۰)

اور اسی رسالہ میں اور دوسرے صفحات میں بھی آپ کی خاتمیۃ زمانی کا اقرار کیا گیا ہے۔ ایسی کھلی ہوئی تصریح کے بعد بھی ان کی طرف ایسی تہمت نہایت زیادہ تعجب خیز بات تھی جس پر سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی معمولی مسلمان بھی جرات کر سکے چہ جائیکہ ایک مدعی علم و تصوف اور مدعی ماہریت علوم و فنون ایسی گھڑی ہوئی باتیں لکھ کر تکفیر کرے اور لوگوں سے اپنی تصدیق ہندوستان سے لیکر علماء حرمین تک سے کراتا پھرے۔ کیونکہ تکفیر اور لعن کا مسئلہ نہایت خطرناک ہے حسب تصریح احادیث صحیحہ اگر تکفیر اور لعن کسی غیر مستحق کی طرف عائد کی جائے گی تو خود تکفیر اور لعنت کرنے والا اس کا مستحق ہو جاتا ہے اور وہ تکفیر و لعن اس پر لوٹ آتا ہے۔ مگر مجھ میں نہیں آتا

کہ مولوی احمد رضا خاں صاحب اور انکی جماعت کس بھروسے پر اسقدر جری ہوئے۔ اختلافات کتنے بھی ہوتے۔ رقابتیں کتنے ہی درجہ کی ہوتیں مگر اپنے ایمان کی سلامتی تو اشد ضروری تھی۔ حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی دوسری تصانیف جیسے مناظرہ عجیبہ 'آب حیات'، قاسم العلوم وغیرہ میں اگر اثبات خاتمیۃ زمانی کے دیکھنے کی نوبت نہیں آئی تھی اور اس سے غفلت تھی تو خیر یہی مگر اس رسالہ پر مطلع ہونا بالخصوص جبکہ اس سے بعد کی عبارات بھی پیش کی گئی ہیں ضروری تھا۔ یہ راز آجتک سمجھ میں نہیں آیا۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولانا نانوتوی قدس اللہ سرہ العزیز جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کے لئے تین قسم کی خاتمیت ثابت فرماتے ہیں۔

اولؔ خاتمیت ذاتی جس کو خاتمیت مرتبی بھی کہتے ہیں یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم وصف نبوت کے ساتھ موصوف بالذات ہیں اور دوسرے انبیا علیہم السلام موصوف بالعرض اور آپ کے واسطے سے۔ جیسے کہ تمام اوصاف عرضیہ کا حال ہوتا ہے کہ موصوف بالذات ایک اور اول ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ سے اوصاف متعدی ہو کر دوسروں تک بعد میں پہونچتے اور ان کو موصوف بالوصف کر دیتے ہیں۔ جیسے عالم اسباب میں موصوف بالنور بالذات آفتاب ہے اور اس کے ذریعہ سے تمام کواکب و سیارات قمر وغیرہ اور دیگر اشیا ارضیہ متصف بالنور ہیں۔ یہی حال وصف نبوت کا ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے متصف بالذات ہیں اور اسی وجہ سے آپ کو سب سے پہلے نبوت ملی جیسا کہ ارشاد ہے کنت نبیا وادم منجدل بین الماء والطین۔ اور دوسرے حضرات آپ کے واسطہ سے بعد میں متصف بالنبوۃ ہوئے اسی لئے سب سے آپ پر ایمان لانے اور مدد کرنے کا عہد و پیمان عالم ارواح میں لیا گیا۔ اور یہی راز اس ارشاد کا ہے "لو کان موسیٰ حیا لما وسعہ الا اتباعی" اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آخر میں آکر آپ کی شریعت پر چلنے کا بھی یہی راز ہے۔ اور جس طرح اس عالم میں بادشاہی عہدوں اور قرابت میں سب سے اونچا اور آخری عہدہ اور منصب وزارت عظمیٰ کا ہے اس طرح مراتب قرب خداوندی میں سب سے

آخری اور بلند مرتبہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے جس طرح شہنشاہی عہدوں میں وزارت عظمیٰ پر تمام عہد ہائے شہنشاہی ختم ہو جاتے ہیں اسی طرح جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تمام مراتب قرب خداوندی ختم ہو جاتے ہیں. اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتمیۃ ذاتی اور مرتبی کے موصوف ہیں۔

دوم خاتمیۃ زمانی یعنی آپ کا زمانہ نبوت اس عالم مشاہدہ و اجسام میں تمام انبیاء علیہم السلام کے آخر میں ہے۔ آپ کے بعد کوئی نبی نہ ہو گا۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اسی رسالہ میں دلائل سے ثابت فرماتے ہیں کہ متصف بالنبوۃ الذاتیہ کے لئے خاتمیۃ زمانیہ لازم ہے اگرچہ بالنظر الی الذات نہ ہو مگر بالنظر الی الوجوہ الاخر لازم ہے اور اس کو مفصل طور سے ذکر فرمایا ہے۔ اور متعدد دلائل قائم فرمائے ہیں (دیکھو صفحہ ۸ تحذیر الناس)

سوم خاتمیۃ مکانیہ یعنی وہ زمین جس میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ افروز ہوئے وہ تمام زمینوں میں بالاتر اور آخری ہے اس کے اوپر کوئی زمین نہیں ہے اور اس کے دلائل بھی قائم فرمائے ہیں۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ لفظ خاتم النبیین کو جو کہ واردفی القرآن ہے ان تینوں قسم کی خاتمیتوں کا حاوی فرماتے ہیں۔ عام علماء اس سے فقط خاتمیۃ زمانی سمجھتے ہیں وہ اس حصر پر انکار فرماتے ہیں۔

یقیناً جو تحقیق حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس رسالہ تحذیر الناس میں خاتمیۃ اور جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مراتب علیا کی ارشاد فرمائی ہے وہ نہایت اعلیٰ اور احکم اور نہایت دقیق و پر مغز ہے جس سے بڑے بڑے علماء مصنفین کی تحریریں خالی ہیں۔ البتہ شیخ اکبر اور علامہ سبکی رحمہم اللہ تعالیٰ کی تصانیف میں اس مضمون کا پتہ چلتا ہے مگر چشم بد اندیش کہ برکندہ باد ؛ عیب نماید ہنرش درنظر ؛ نے بجائے اس کے کہ شکریہ ادا کیا جاتا اور اس سے فائدہ حاصل کر کے ایمان اور قلب کو مسرور اور قوی کیا جاتا معاملہ بالکل برعکس کر دیا۔

اس قسم کی صریح بے ایمانی اور دروغگوئی وافتراپردازی وجرارت کی نظیر دنیا میں نہایت کم بلکہ غالباً پائی ہی نہیں جاتی یہ صرف مولوی احمد رضا خاں صاحب ہی کی جدت طرازی کا نتیجہ تھا۔

حضرت مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز پر افترار

حضرت قطب عالم مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز پر یہ افترار کیا کہ میرے پاس (مولوی احمد رضا خاں صاحب کے پاس) ایک فوٹو حضرت گنگوہی کے فتوے کا ہے۔ اس فتوی میں موصوف فرماتے ہیں کہ "معاذ اللہ اگر کوئی اللہ تعالی کی نسبت یہ کہتا اور اعتقاد رکھتا ہے کہ اللہ تعالی جھوٹ بولتا ہے تو اس کو کافر مت کہو"۔ اس فتوی اور فوٹو کی وجہ سے تکفیر اور تشنیع شدید کی گئی تھی حالانکہ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز کے فتاوی اس واقعہ کے کئی برس پہلے چھپ کر شائع ہو چکے تھے جس میں تصریح موجود ہے کہ معاذ اللہ اگر کوئی شخص اللہ تعالی کو جھوٹا اور کاذب بالفعل کہتا یا عقیدہ رکھتا ہے تو وہ کافر ملحد و زندیق ہے۔ یہ فتوے نہ صرف اردو زبان میں ہے بلکہ عربی میں بھی ہے اور اس کی تصدیق علمار حرمین شریفین سے بھی کرائی گئی ہے جو کہ فتاوی رشیدیہ میں بعینہ موجود ہے۔ مگر اس بے ایمانی اور جھوٹی تہمت تراشی کا کیا کیا جاوے جو کہ کھلے بندوں ایسے لوگوں سے ظہور پذیر ہوئی جنکو ایک جماعت اپنا مقتدار اور امام اور پیر و مرشد مانتی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون (دیکھو فتاوی رشیدیہ جلد اول صفحہ ۱۱۸ و ۱۱۹)

ہاں مسئلہ امکان کذب ایک مشہور و معروف مسئلہ ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ کلام لفظی میں جناب باری عز اسمہ سے کذب کا صادر ہونا ممتنع بالغیر ہے یعنی داخل تحت القدرۃ ہو کر ممتنع ہے۔ اشاعرہ کے نزدیک شرعاً فقط اور ماتریدیہ کے نزدیک شرعاً وعقلاً دونوں طرح پر۔ بہرحال اہل سنت والجماعت جناب باری کے کلام لفظی میں خلاف واقع بات ہونے کو ممکن بالذات ممتنع بالغیر کہتے ہیں۔

حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز اپنے رسالہ جہد المقل فی تنزیہ المعز والمذل صفحہ ۴۲ جلد اول محل نزاع کی تفصیل فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

واضح رہے کہ جملہ فرق اسلامیہ حق تعالیٰ شانہ کے متکلم ہونے کے قایل ہیں کیفیت تکلم حقیقت کلام میں مختلف ہونا جدا امر ہے مگر کلام لفظی کے عقد و اصدار کو سب مقدور باری کہتے ہیں بالخصوص اہل سنت والجماعت تو انعقاد کلام لفظی کو پوری صراحت کے ساتھ بیان فرما رہے ہیں کسی قسم کا نزاع ہی نہیں البتہ سیزدہم صدی کے بعض علماء نے یہ خلاف کیا کہ جملہ غیر مطابق للواقع کا عقد و تنزیل قدرت قدیمہ سے خارج ہے یعنی حالت قیام زید میں تو حق تعالیٰ شانہ جملہ زید قائم کو منعقد اور نازل فرما سکتا ہے لیکن حالت قعود زید میں جملہ مذکورہ کا ارشاد و انعقاد اس کی قدرت سے خارج اور اسکے اخبار سے ذات واجب معذور و عاجز ہے اور ایک دوسرے فریق کا یہ قول ہے کہ اہل سنت کے نزدیک جملہ مذکورہ کے تکلم پر دونوں حالتوں میں قادر مطلق کی قدرت میں سر مو تفاوت نہیں مگر چونکہ وہ ذات بابرکات اپنے صفات و افعال میں جملہ قبایح سے منزہ اور تمام ذمایم سے مقدس ہے اس لئے کسی کلام غیر مطابق واقع کے تکلم کا ارادہ محقق نہیں ہو سکتا۔ اگر بالفرض حضرت آدم علیہ السلام سے اکل شجرہ یا فرعون لعین سے دعوی ربوبیۃ محقق نہ ہوتا تو بھی جملہ عصیٰ آدم ربہ اور فقال انا ربکم الاعلیٰ کے عقد و تکلم پر حق تعالیٰ کو ایسی قدرت حاصل ہوتی جیسی اب ہے لیکن بوجہ کمال صدق و حکمت اور بسبب مقتضائے تقدس و رحمت ان جملوں کے تکلم کی نوبت آنی محال تھی اور جسقدر کلامین حق تعالیٰ شانہ کی ظاہر ہو چکی ہیں اور جن کے تکلم و ظہور کی نوبت آگے کو آئیگی سب ضروری الصدق ہیں کسی کلام میں بھی اگر کوئی بوجہ احتمال کذب اس کی تصدیق و تسلیم میں متأمل ہو تو زندیق و ملحد اور اسلام سے خارج ہے خلاصہ نزاع یہ نکلا کہ صدق کے وجوب اور کذب کے امتناع پر سب متفق ہیں مگر حضرت مولانا اسمٰعیل شہید علیہ الرحمۃ اور ان کے اتباع بوجہ ارادہ و اختیار حق تعالیٰ شانہ صدق کو ضروری اور کذب کو محال فرماتے ہیں اور فریق ثانی بوجہ عدم قدرت و مجبوری صدق باری کو واجب اور کذب کو ممتنع بتلاتا ہے یعنی ان کے نزدیک تو ایزد تعالیٰ نے اپنے اختیار سے صدق کا التزام اور کذب سے احتراز فرما رکھا ہے اور ان کے نزدیک بوجہ مجبوری و عجز حق تعالیٰ سے صدق صادر اور کذب متروک ہو رہا ہے۔

یہی مسلک حضرت گنگوہی اور اسلاف دیوبند اور حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہید قدس اللہ اسرارہم کا ہے۔ اس کو شرح مواقف، مسایرہ، تحریر الاصول وغیرہ معتبر کتب اہلِ کلام میں ذکر کیا گیا ہے۔ شرح مواقف میں ہے۔

اوجب جمیع المعتزلۃ والخوارج عقاب صاحب الکبیرۃ اذا مات بلا توبۃ ولم یجوزوا ان یعفوا اللہ عنہ بوجہین الاول انہ تعالیٰ اوعد بالعقاب علی الکبایر واخبر بہ ای العقاب علیہا فلو لم یعاقب علی الکبیرۃ وعفا لزم الخلف فی وعیدہ والکذب فی خبرہ وانہ محال والجواب غایۃ وقوع العقاب فاین وجوب العقاب الذی کلامنا فیہ اذ لا شبہۃ فی ان عدم الوجوب مع الوقوع لا یستلزم خلفا ولا کذبا لا یقال انہ یستلزم جوازہما وہو ایضا محال لانا نقول استحالتہ ممنوعۃ کیف وہما من الممکنات اللتی تشملہا قدرتہ تعالیٰ۔

علامہ تفتازانی رحمہ اللہ تعالیٰ شرح مقاصد میں خاتمہ بحث قدرت میں فرماتے ہیں۔

المنکرون لشمول قدرتہ طوائف منہم النظام واتباعہ القائلون بانہ لا یقدر علی الجہل والکذب والظلم وسایر القبائح اذ لو کان خلقہا مقدورا لہ لجاز صدورہ عنہ واللازم باطل لافضائہ الی السفہ ان کان عالما بقبح ذلک وباستغنائہ عنہ والی الجہل ان لم یکن عالما والجواب لا نسلم قبح الشئ بالنسبۃ الیہ کیف وہو تصرف فی ملکہ ولو سلم فالقدرۃ لا تنافی امتناع صدورہ نظرا الی وجود الصارف وعدم الداعی وان کان ممکنا اھ

علامہ محقق کمال ابن ہمام حنفی شارح ہدایہ اوران کے تلمیذ علامہ ابن ابی الشریف مقدسی شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ مسایرہ اور اس کی شرح مسامرہ میں فرماتے ہیں۔

"ثم قال ای صاحب العمدۃ ویوصف اللہ تعالیٰ بالقدرۃ علی الظلم والسفہ

والکذب لان المحال لا یدخل تحت القدرۃ ای لا یصلح متعلقا لہا وعند المعتزلۃ

یقدر تعالی علی کل مما ذکر ولا یفعل انتہی کلام صاحب العمدۃ۔ وکان انقلب علیہ ما نقلہ عن المعتزلۃ اذ لا شک ان سلب القدرۃ عما ذکر من الظلم والسفہ والکذب ہو مذہب المعتزلۃ واما ثبوتہا ای القدرۃ علی ما ذکر ثم الامتناع عن متعلقہا اختیارا فبمذہب ای فہو بمذہب الاشاعرۃ الیق منہ بمذہب المعتزلۃ ولا یخفی ان ہذا الالیق ادخل فی التنزیہ ایضا اذ لا شک فی ان الامتناع عنہا ای عن المذکورات من الظلم والسفہ والکذب من باب التنزیہات عما لا یلیق بجناب قدسہ تعالی فیسبر بالبناء للمفعول ای یختبر العقل فی ان ای فصلین ابلغ فی التنزیہ عن الفحشاء أہو القدرۃ علیہ ای علی ما ذکر من الامور الثلثۃ مع الامتناع ای امتناعہ تعالی عنہ مختارا لذلک الامتناع او الامتناع ای امتناعہ عنہ لعدم القدرۃ علیہ فیجب القول بادخل القولین فی التنزیہ وہو القول الالیق بمذہب الاشاعرۃ اھ"

شرح عقائد عضدیہ مصنفہ محقق دوانی رحمہ اللہ تعالیٰ کے حاشیہ کلنبوی رحمہ اللہ تعالیٰ میں ہے:

"وبالجملۃ کون الکذب فی الکلام اللفظی قبیحا بمعنی صفۃ نقص ممنوع عند الاشاعرۃ ولذا قال الشریف المحقق انہ من جملۃ الممکنات وحصول العلم القطعی بعدم وقوعہ فی کلامہ تعالی باجماع العلماء والانبیاء علیہم السلام لا ینافی امکانہ فی ذاتہ کسائر العلوم العادیۃ القطعیۃ وہو لا ینافی ما ذکرہ الامام الرازی الخ"

تحریر الاصول محقق ابن ہمام رحمہ اللہ تعالیٰ اور اس کی شرح تقریر و تحبیر الاصول ابن امیر الحاج رحمہ اللہ تعالیٰ میں ہے۔

"وحینئذ ای وحین کان مستحیلا علیہ ما ادرک فیہ نقص ظہر القطع باستحالۃ اتصافہ ای اللہ تعالی بالکذب ونحوہ تعالی عن ذلک وایضا لو لم یمتنع اتصاف فعلہ بالقبح یرتفع الامان عن صدق وعدہ وصدق خبر غیرہ ای الوعد منہ تعالی وصدق النبوۃ ای لم یجزم بصدقہ اصلا وعند الاشاعرۃ کسائر الخلق القطع

بعدم اتصافہ تعالیٰ بشئی من القبائح دون الاستحالۃ العقلیۃ کسائر العلوم اللتی یقطع فیھا بان الواقع احد النقیضین مع استحالۃ الاٰخر لو قدر انہ الواقع کالقطع بمکۃ وبغداد ای بوجودھما فانہ لایحیل عدمھما عقلاً و حینئذ ای وحین کان الامر علی ھذا لایلزم ارتفاع الامان لانہ لایلزم من جواز الشئی عقلاً عدم الجزم بعدمہ والخلاف الجاری فی الاستحالۃ والامکان العقلی لھذا اجاز فی کل نقیصۃ اقدرتہ تعالیٰ علیھا مسلوبۃ ام ھی ای النقیصۃ بھا ای بقدرتہ مشمولۃ والقطع بانہ لایفعل ای والحال القطع بعدم فعل تلک النقیصۃ الخ الفصل الثانی فی الحاکم ص۹۶ ج۲

حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز نے اپنے رسالہ جہد المقل فی تنزیہ المعز والمذل میں نہایت بسط سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے اور حضرت مولانا احمد حسن صاحب مرحوم کانپوری مصنف رسالہ تنزیہ الرحمٰن اور مولانا عبداللہ صاحب ٹونکی مرحوم مصنف رسالہ عجالۃ الراکب جو کہ امتناع ذاتی کے قائل ہیں ان کے دلائل کے واضح جوابات دیتے ہوئے ائمہ اہل سنت والجماعۃ کے نصوص استدلال میں پیش کئے ہیں یہ رسالہ نہایت مفید اور اس لائق ہے کہ اس کو ہمیشہ حرز جان بنایا جائے۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر افترا

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ صدر مدرس مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور و خلیفۂ خاص حضرت گنگوہی و حضرت قطب عالم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ اسرارہما کے متعلق یہ افترا کیا کہ موصوف اپنی کتاب براہین قاطعہ میں معاذاللہ شیطان کے علم کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم سے زائد کہتے ہیں اور اس کو آپ سے اعلم قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ بھی افترا محض ہے۔ براہین قاطعہ میں یہ مضمون نہ صراحۃً موجود ہے اور نہ یہ امر التزاماً بالالتزام الصریح کسی عبارت سے لازم آتا ہے سیاق اور سباق اس مضمون کے مخالف ہے۔ حضرت مولانا مرحوم تمام علوم عالیہ اور کمالات علمیہ و عملیہ میں جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اعلم اور اشرف تمام عالم سے مانتے ہیں کوئی

شخص بھی اولین و آخرین جن و انس ملک اور غیر ملک میں سو آپ کا ہم رتبہ نہیں ہو سکتا ہے ہاں
علوم خسیسہ رذیلہ جنکو شرف ذاتی حاصل نہیں بلکہ ان کا حصول ہی ناجائز اور خسیس ہے ان میں اگر
کوئی بڑھ جائے اور اس کا اقرار یا ثبوت ہو جائے تو اس سے اعلمیۃ ثابت نہیں ہوتی اور نہ اسکا
موصوف صاحب شرافت ہو سکتا ہے۔ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ان
من العلم لجھلاً اور فرماتے ہیں اللھم انی اعوذ بک من علم لا ینفع الحدیث قرآن میں تصریح
وما علمناہ الشعر وما ینبغی لہ الآیۃ۔ ہُدہُد کا یہ معاملہ احطتُ بما لم تحط بہ الآیۃ۔
حضرت سلیمان علیہ السلام سے اعلمیۃ کو کسی طرح مستلزم اشرفیت نہیں براہین قاطعہ ص۵۱ و ص۵۲
کے دیکھنے سے یہ امر بخوبی واضح ہوتا ہے کہ۔ خود فرماتے ہیں "پس اعلیٰ علیین میں روح مبارک
علیہ السلام کی تشریف رکھنا اور ملک الموت سے افضل ہونے کی وجہ سے ہرگز ثابت نہیں ہوتا
کہ علم آپ کا ان امور میں ملک الموت کی برابر بھی ہو چہ جائیکہ زیادہ الخ۔

حضرت مولانا اشرف علی صاحب مرحوم کے متعلق افترا

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی خلیفہ خاص
حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ
تعالیٰ اسرارہما کے متعلق افترا کیا کہ وہ اپنے رسالہ حفظ الایمان میں لکھتے ہیں کہ معاذ اللہ
جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا علم زید و عمرو بلکہ چوپایوں کے برابر ہے۔ حالانکہ ان کی عبارت
اور سیاق و سباق بالکل اس کے خلاف ہے حضرت مولانا مرحوم اطلاق لفظ عالم الغیب کی بحث
میں فرماتے ہیں" ایسا علم غیب تو زید و عمرو بلکہ ہر صبی و مجنوں بلکہ جمیع حیوانات و بہائم کے لئے
بھی حاصل ہے الخ (حفظ الایمان ص۸) یہاں لفظ اتنا نہیں فرمایا ہے جس کا فرق ظاہر و باہر ہے۔ برابری
مقدار میں لفظ اتنا میں ہو سکتی تھی لفظ ایسا میں نہیں۔ اور خود مولانا مرحوم نے اپنے رسالہ بسط البنان فی
توضیح حفظ الایمان میں اس الزام کی تردید فرمائی ہے۔ اور اپنی عبارت کی ایسی عمدہ توضیح فرمائی ہے
جس سے کوئی شبہہ باقی نہیں رہ سکتا۔ ہم نے اپنے رسالہ الشہاب الثاقب علی المسترق الکاذب
میں ان جملہ امور کے متعلق پوری تفصیل لکھدی ہے۔

خلاصہ یہ کہ مولوی احمد رضا خاں صاحب اور ان کے ہمنوایان مجاورین اہل ہند (مجاور عرف اہل مدینہ میں ان غیر ملکوں کے باشندوں کو کہتے ہیں جو کہ مدینہ میں نہ پیدا ہوئے ہوں اور باہر سے آکر اقامت پذیر ہو گئے ہوں) نے اس رسالہ کو (جو کہ باسم حسام الحرمین علی عنق اہل الکفر والمین کے نام سے موسوم کر کے بعد میں شائع کیا گیا) تصدیق اور مہر و دستخط کے لئے وہاں کے اہل علم اور مذہبی رؤسا پر پیش کیا۔ ظاہر ہے کہ ان عنوانات سے ہر ناواقف مسلمان پورے غیظ و غضب میں آجائے گا۔ اور جو کچھ بھی اس سے ہو سکے گا کر گذریگا اور جہاں تک ممکن ہوگا برا بھلا لکھدیگا۔ چنانچہ یہی ہوا بعض بیوقوفوں نے تو غیظ و غضب میں آکر بلا شرط و استثنا تکفیر و تصدیق کردی اور اکثر سمجھدار اور محتاط لوگوں نے شرط لگائی کہ اگر واقع میں ان اشخاص کے ایسے ہی اقوال و عقائد ہیں اور ان سے اس کے خلاف ثبوت نہیں ہے اور انھوں نے رجوع کیا ہو تو بے شک جو کچھ مؤلف رسالہ نے لکھا ہے صحیح ہے۔

یہ کارروائی نہایت جد و جہد اور اختفا کے ساتھ ہو رہی تھی ہم کو صرف اسقدر معلوم ہو سکا تھا کہ یہ اشخاص علماء اور مفاتی اور اہل اثر کے پاس دوڑ دھوپ کر رہے ہیں مگر کس مقصد کے لئے یہ کارروائی ہو رہی ہے بالکل پتہ نہیں چلتا تھا اور صرف یہ خیال تھا کہ چونکہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب مرحوم ابھی تشریف لائے تھے اور ان سے یہاں کے اعاظم علماء اور اکثر طلباء ملے تھے اور سند حدیث اور اجازت وغیرہ حاصل کی تھی۔ اہل علم میں ان کی بہت مقبولیت ہوئی تھی اس لئے حاسدوں اور دشمنوں کو ان کے خلاف اور اسی ذریعہ سے ہمارے خلاف پروپگنڈا کرنا منظور ہے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی خیال تھا کہ اگر کوئی بات ہمارے یا ہمارے اکابر کے خلاف ہوگی تو کم از کم ہم سے پوچھا تو جائے گا۔ اسی حالت میں کئی روز گذر گئے۔ پھر تجسس پر یہ معلوم ہوا کہ کسی تحریر پر تصدیق کرائی جا رہی ہے تو اس کی تلاش ہوئی کہ وہ تحریر کیا ہے۔ بالآخر شیخ عبد القادر شلبی طرابلسی کے پاس جب وہ تحریر پہونچی تو انھوں نے مجھکو بلا بھیجا اور یہ رسالہ دکھلایا میں نے ان کو حقیقۃ الامر سے مطلع کیا اور پھر میں امین الفتویٰ شیخ عمر حماد مرحوم کے پاس گیا اور تحذیر الناس اور فتاویٰ رشیدیہ

وغیرہ کی عبارتیں دکھلائیں تو انھوں نے بہت افسوس کیا اور مفتی احناف افندی تاج الدین الیاس مرحوم کے پاس پہونچے اور ان سے تمام حقیقت بیان کی انھوں نے بھی افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ ہمکو تو حقیقت کا علم نہ تھا تو نے ہم کو پہلے کیوں نہ مطلع کیا۔ چونکہ میرے تعلقات ان لوگوں سے پہلے سے بہت گہرے تھے مفتی صاحب موصوف کا نواسہ میرے پاس پڑھتا تھا نیز دوسرے اہل مدینہ نوجوان بڑے خاندان والے یا احباب تھے اس لئے میں نے ان سے کہا کہ مجھکو اعتماد تھا کہ اگر میرے مشائخ اور اساتذہ یا میرے متعلق آپ کے پاس کسی قسم کی کوئی خبر پہونچیگی تو آپ ضرور بالضرور مجھ سے اس کو دریافت کریں گے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہمکو بالکل علم نہیں کہ یہ حضرات تیرے اساتذہ اور مشائخ ہیں۔ بہرحال اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ ہم نے تصدیق میں کافی احتیاط کرلی ہے اور لکھدیا ہے کہ اگر واقع میں ان اشخاص کے یہی اقوال اور عقائد ہیں اور رجوع ثابت نہیں ہے تو مؤلف رسالہ کا قول صحیح ہے۔ اگر پہلے سے اس کا علم ہوتا تو ہم ہرگز اتنی بھی تصدیق نہ کرتے۔ اسی طرح اور دوسرے اشخاص نے جواب دیا۔ اسی اثنار میں یہ بھی پیش آیا کہ افندی سید احمد برزنجی مرحوم مفتی شافعیہ کے پاس مولوی احمد رضا خاں صاحب پہونچے اور رسالہ مذکورہ کے ساتھ رسالہ علم غیب بھی پیش کیا مفتی صاحب نے بالشرط پہلے رسالہ کی تصدیق تو کردی تھی مگر مسئلہ علم غیب میں مخالفت کی آخر میں کچھ بحث ہوئی مفتی صاحب ناراض ہو گئے اور خفا ہو کر کہا کہ میری تصدیق واپس بھیجدو مگر مولوی احمد رضا خاں صاحب چلے آئے اس کے بعد مفتی صاحب نے رسالہ غایۃ المامول فی علم غیب الرسول (علیہ السلام) لکھا جو کہ ہندوستان میں چھپ کر شائع ہوا تھا۔ مولانا منور علی صاحب مرحوم رامپوری کی سعی و کوشش جو کہ اس زمانہ میں وہاں موجود تھے اس کی اشاعت میں زیادہ کارگر ہوئی۔

اس فتنہ پر یہ کوشش بڑے زور سے عمل میں لائی گئی تھی کہ انھیں حضرات کے تلامیذ اور متبعین حسین احمد اور اس کے برادران وغیرہ ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ آج تک ہم نے کوئی بات ان سے خلاف طریقہ اہل سنت والجماعت نہیں دیکھی تو یہ جواب دیا کہ وہ چھپاتے ہیں اور رفتہ رفتہ وہ سب لوگوں کو

گمراہ کردیں گے۔ اس پروپگنڈہ کو سید یٰسین مرحوم کابلی کے ذریعہ سے جو کہ عثمان پاشا والی مدینہ منورہ کے یہاں رسوخ کامل رکھتا تھا عثمان پاشا موصوف تک پہونچایا گیا مگر پول کھل جانے اور عنایت ایزدی کے شامل حال ہوجانے اور جناب رسالتمآب صلے اللہ علیہ وسلم کی برکات نے ان کو ناکام کیا اور بحمد اللہ ہمارا کوئی بال بیکا نہ کرسکے۔ کچھ عرصہ تک ہندوستانی مجاورین اور بعض ان کے ہمنواؤں میں کھچڑیاں پکتی رہیں۔ مخالفتیں بھی لوگ کرتے رہے۔ مگر میرا حلقہ درس بڑھتا ہی رہا قبولیت عامہ اہل مدینہ اور اہل علم وفضل میں روز افزوں ہوتی رہی۔ اور مخالف اشخاص کو ناکامی کے ساتھ ذلت کا بھی سامنا ہوتا رہا۔ اگرچہ ہم نے کبھی کسی سے انتقام اور توہین کا معاملہ نہیں کیا مگر منتقم حقیقی کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں دو تین ہی سال میں تمام مخالفین کا قلع قمع ہوگیا۔ وللہ الحمد والمنہ۔

سفر ہندوستان دوسری مرتبہ

پہلے گذر چکا ہے کہ ۱۳۲۶ھ میں میری پہلی اہلیہ مرحومہ چند مہینہ تپ دق میں مبتلا رہکر وفات کر گئی۔ ایک لڑکی تین چار برس کی چھوڑی۔ چونکہ معیشت کی تنگی تھی۔ تمام خاندان کی آمدنی ماہواری سو روپیہ بھی نہ تھی مدینہ منورہ کی گرانی پر یہ مقدار بڑی مشکل سے اتنے بڑے خاندان کے لئے کافی نہیں ہوسکتی تھی اگرچہ اس وقت بہ نسبت سابق بہت کچھ سہولتیں مہیا ہوگئی تھیں مگر اسی کے ساتھ حضرت والد صاحب مرحوم کا یہ ارادہ کہ میں اپنی زندگی میں چھ مکان (ہر ہر اولاد کے لئے ایک ایک) بنادوں یہ ایک ایسا عزم تھا کہ وہ کسی طرح وسعت کے ساتھ مصارف کی اجازت نہ دیتا تھا۔ ایسی صورت میں اگر مدینہ منورہ میں کسی خاندان میں خواہ اہالی مدینہ میں سے ہوتا یا مجاورین میں سے نکاح کا ارادہ کیا جاتا تو انتہائی دقتوں کا سامنا ہوتا۔ عرب کی عورتیں بہ نسبت ہندوستانی عورتوں کے زیادہ تر آزاد اور مصارف میں زیادہ تر وسعت پذیر ہیں۔ خورش اور پوشش کی فضول خرچیاں معمولی آمدنی سے پوری ہونی مشکل ہوتی ہیں۔ پھر آئے دن رشتہ داروں بالخصوص عورتوں کا آنا جانا۔ قیلہ[۱] اور اجتماعات کرنا اور ان کے مصارف کا بار گراں اٹھانا

---

[۱] قیلہ غالباً قیلولہ سے ماخوذ ہے جس کے معنے دوپہر میں آرام کرنے اور سونے کے ہیں۔ مگر اب عرف میں دن کے وقت چند احباب کا مجتمع ہونا اور کھانا اور اچار وغیرہ کا ایک مجلس میں تناول کرنا بالخصوص باغوں یا پہاڑوں یا سیلاب کے کناروں وغیرہ پر اور فرح وسرور کی باتیں عمل میں لا مراد ہوتا ہے۔ عموماً اہل حرمین اوقات فراغ میں شہر کے باہر باغوں وغیرہ میں جاتے ہیں اور اپنے ساتھ ضروریات خورونوش لیجاتے ہیں اور دو دو چار چار دن یا کم و بیش وہاں رہتے ہیں حسب مذاق وہاں خوشگواری سے

(بقیہ ص ۱۳۹)

معمولی بات تھی۔ ہندوستانی مجاورین بھی رفتہ رفتہ وہاں کی عادات سے کم وبیش متاثر ہوگئے ہیں۔ بڑے بھائی صاحب مرحوم اور عزیزم محمود سلمہٗ کے نکاحوں سے تجربہ ہوچکا تھا علاوہ ازیں کفو کا ملنا بھی سخت مشکل تھا۔ ان وجوہ کی بناپر ہندوستان کے سفر کرنے اور یہاں کفو میں عقد کرنے کا حکم والد صاحب مرحوم نے نافذ کردیا اور اپنے احباب اور رشتہ داروں کو اس کے لئے انتظام کرنے کے واسطے خطوط بھیجدیئے۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ میری اس زمانہ میں عین خواہش تھی کہ اب جبکہ کتب درسیہ اور مضامین عالیہ علم کلام وفقہ واصول حدیث وتفسیر وغیرہ کے مستحضر ہوچکے ہیں اور فنونی کتابوں پر عبور حاصل ہوچکا ہے کسی طرح حضرت استاذ الاساتذہ راس المحققین مولانا شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز تک باریابی ہوجائے تو اپنے اشکالات کو حل کرنے اور کتب حدیث کے دوبارہ پڑھنے کا شرف حاصل ہو۔ مگر اس تمنا کے پوری ہونے کے اسباب مہیا نہ تھے۔ اس حادثہ کے واقع ہونے اور حضرت والد صاحب مرحوم کے اس حکم سے آرزوں کا باغ سرسبز ہوگیا اور بلاپس وپیش میں جناب حاجی شیخ احمد علی صاحب مرحوم ومغفور کے زیر سرپرستی روانہ ہونے کو تیار ہوگیا۔

حاجی شیخ احمد علی صاحب مرحوم کے احوال شیخ صاحب مرحوم نہایت معمر بزرگ تھے تقریباً نوے برس یا اس سے زیادہ عمر تھی اگرچہ اصلی باشندہ ضلع اعظم گڈھ کے کسی دیہات کے تھے۔ مگر مدت دراز سے اعزہ واقارب اور زمینداری وغیرہ کو چھوڑ کر فیض آباد میں مقیم تھے۔ نہایت زاہدانہ اور مرتاضانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اہل فیض آباد بالخصوص حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی قدس اللہ سرہ العزیز کے متوسلین ان سے بہت زیادہ مانوس تھے۔ حضرت والد صاحب مرحوم سے بھی ان کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ مرحوم دو سال یا کم وبیش سے مدینہ منورہ میں ہمارے ہی مکان میں مقیم تھے۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی مرتبہ حجاز کا سفر کرچکے تھے۔

(بقیہ حاشیہ ص۳) اوقات کاٹتے ہیں عورتیں بھی جاتی ہیں اور بسا اوقات یہ اجتماعات گھروں ہی میں ہوتے ہیں)

مرحوم بہت زیادہ عابد وزاہد اور اتباع سنت کے شائق تھے انھوں نے فیض آباد میں کوشش کرکے مدرسہ دینیہ کی بنیاد بھی ڈالی ٹاٹ شاہ مرحوم کی مشہور مسجد کے ایک کمرہ میں اقامت پذیر تھے اور وہیں لڑکے بھی پڑھتے تھے اُنہیں کے نام پر یہ مدرسہ مدرسہ احمدیہ حنفیہ کے نام پر مشہور ہوا انھوں نے اس زمانہ میں لائق مدرس کی خواستگاری کی چنانچہ مولانا محمد ضرغام الدین صاحب صدیقی ساکن قصبہ کوال ضلع مظفر نگر مناسب تنخواہ پر بھیجے گئے۔ مولانا موصوف ایک معزز اور شریف خاندان کے ممبر ہیں۔ ان کے اسلاف بادشاہی زمانہ میں قصبہ کوال کے قاضی تھے انکے خاندان میں علمی شغف اور دلچسپی برابر چلی آتی تھی اگرچہ انقلابات زمانہ سے معاشی مشکلات میں مثل دیگر شرفا اسلام ان کا خاندان بھی مبتلا ہو گیا تھا۔ مگر علمی مذاق اور شرفاء کے عزائم واخلاق بڑے پیمانہ پر موجود تھے۔ مولانا موصوف بہت سی کتابوں میں میرے ہم سبق بھی رہے ہیں۔ ابتداء سے ان کی طبیعت نہایت صالح اور زاہد و مرتاض واقع ہوئی ہے۔ نوجوانی کی شوخیاں اور شرارتیں ان میں زمانہ طالب علمی میں بھی نہ تھیں۔ جب مدرس ہو کر فیض آباد پہونچے ہیں تو اُن سے جناب شیخ احمد علی صاحب مرحوم کی بہت موافقت آئی اور رفتہ رفتہ موصوف وہاں کے مستقل رہنما اور قطب بن گئے۔ مدرسہ بھی مستقل عمارت اور وسعت کے ساتھ بن گیا اور بحمد اللہ ابتک شیخ صاحب مرحوم کا یہ فیض جاری ہے۔

شیخ صاحب مرحوم کی سرپرستی میں یہ سفر مدینہ منورہ سے ہندوستان تک نہایت خوشگواری اور برکات سے قطع ہوا۔ اور راستہ میں نعمت حج وعمرہ بھی حاصل ہوئی۔ بمبئی سے روانگی پر جھانسی تک اُنھیں کے زیر سایہ سفر رہا اس کے بعد وہ کانپور کو روانہ ہو کر فیض آباد چلے گئے اور میں دہلی ہوتا ہوا دیوبند پہونچا۔ ترمذی شریف کا بہت تھوڑا حصہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ہو چکا تھا اس میں شریک ہو گیا اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ ہی کے در اقدس پر قیام کیا۔ پھر مدرسہ میں ایک مخصوص حجرہ لیکر رہنے لگا۔

دیوبند کی حاضری کی باطنی وجہ ۱۳۲۳ھ تک دار العلوم کی سرپرستی حضرت قطب العالم

مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز کے متعلق تھی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو نہایت زیادہ خیال اسکی بہبودی اور ترقی کا تھا۔ عموماً مدرسین اور اراکین حضرت کے تلامیذ اور متوسلین ہی تھے اور تمام مشکلات اور مہمات میں آپ سے رجوع کرتے تھے اور بحمد للہ کامیاب ہوتے تھے۔ مگر ۲۳ھ میں جبکہ حضرت قطب العالم رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہوگیا۔ تو سوائے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ جماعت میں کوئی ایسا بڑا نہ تھا جو کہ فرائض سرپرستی کا قابل سمجھا جائے اور تمام اراکین دارالعلوم اور کارکنوں کا مربی ہو سکے۔ اس لئے تمام جماعت نے حضرت مرحوم ہی کو سرپرست بنالیا۔ اور طبعی طور پر ہونا بھی یہی چاہئے تھا۔ جبتک حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز کا سایہ تھا تو تمام ماتحتوں کو کوئی خصوصی فکر نہ ہوتی تھی۔ جیسے باپ ماں کی موجودگی میں اولاد کو امور خانہ داری کی طرف سے اطمینان کلی ہوتا ہے یہاں بھی یہی حال تھا۔ مگر اب حال دگرگوں ہوگیا۔ اب تمام افکار نے پسماندوں بالخصوص حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ صدر مدرس اور مولانا حافظ احمد صاحب صدر مہتمم اور مولانا حبیب الرحمن صاحب مہتمم کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اگرچہ رسمی طور پر ہر دو حضرات مہتممین کے یہ عہدے بعد میں معین کئے گئے مگر باعتبار انجام دہی فرائض پہلے ہی سے چلے آتے تھے۔ اگرچہ اس وقت میں بھی مجلس اہل شوریٰ کی بعض بعض بہت معزز ہستیاں مولانا ذوالفقار علی صاحب مرحوم و مولانا فضل الرحمن صاحب مرحوم۔ حاجی ظہور الدین صاحب مرحوم موجود تھیں مگر ان پر بھی اس قدر افکار ترقی دارالعلوم اور بہبودی نے ہجوم نہیں کیا۔ اور نہ ان کی پیرانہ سالی اس کی اجازت دیتی تھی کیونکہ وہ حضرات بھی چراغ سحری سے زیادہ قوت نہ رکھتے تھے۔ نیز عام اطراف وجوانب میں ان کی شہرت بھی ایسی نہ تھی۔ یہی تینوں حضرات جزئیات وکلیات دارالعلوم میں سرگرداں رہتے تھے اور بڑی بڑی اسکیمیں بناتے اور عمل میں لاتے رہتے تھے۔ اور فتن وشرور کے دفع کرنے میں پوری سرگرمی دکھاتے تھے۔ اور بالاخص اس کا بار حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ پر بہت ہی زیادہ تھا۔ اسی زمانہ میں غالباً ۱۳۲۵ھ یا ۱۳۲۶ھ میں ایک ایسے مجمع میں جس میں دارالعلوم کی علمی ترقی پر غور وخوض ہو رہا

تھا حضرت حافظ احمد صاحب مرحوم نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ اگر مولوی انور شاہ کشمیری۔ مولوی عبید اللہ سندھی۔ مولوی مرتضیٰ حسن چاندپوری۔ مولوی سہول بھاگلپوری۔ مولوی عبدالصمد کرتپوری۔ حسین احمد یہاں آکر جمع ہو جاتے تو دارالعلوم کی علمی ترقی بڑے اعلیٰ پیمانہ پر پہونچ جاتی۔ اس زمانہ میں حضرت مولانا انور شاہ صاحب مرحوم دہلی چھوڑ کر کشمیر میں اقامت پذیر ہو گئے تھے۔ مولانا عبید اللہ صاحب عرصہ سے سندھ ہی میں مقیم تھے۔ دیوبند کی آمد و رفت بھی عرصہ سے منقطع تھی۔ مولانا مرتضیٰ حسن صاحب دربھنگہ میں مدرس اول اور بہت بڑے صاحب نفوذ تھے۔ مولانا محمد سہول صاحب مدرسہ عالیہ کلکتہ میں بڑی تنخواہ پر ملازم تھے۔ مولانا عبدالصمد صاحب مرحوم رڑکی مدرسہ رحمانیہ میں مدرس اول تھے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو یہ بات پسند آئی اور اگرچہ بظاہر سکوت کیا مگر خدا جانے کیا باطنی تصرف کیا کہ یہ سب اشخاص بغیر کسی ظاہری جدوجہد اور خط و کتابت کے یکے بعد دیگرے دیوبند پہونچ گئے۔ ممکن ہے کہ بعض بعض اشخاص سے کچھ ظاہری جد و جہد کی نوبت آئی ہو۔ مگر اکثروں کو کسی قسم کی خط و کتابت اور طلب و فہمائش کی نوبت نہیں آئی۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اجتماع حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے باطنی تصرف سے واقع ہوا تھا۔ اس وقت مولانا عبید اللہ صاحب کا تشریف لانا کسی سیاسی اور پولیٹیکل جذبہ کے ماتحت بالکل نہیں تھا بلکہ ان کا نصب العین دارالعلوم کو ترقی دینا اور تمام ملک میں اس کی مضبوط ساکھ کا قائم ہو جانا۔ طلبا ر قدیم (جو کہ دارالعلوم سے فارغ ہو چکے ہیں) ان میں یکجہتی اور مکمل تنظیم ہو جانی اور دارالعلوم کی ہر قسم کی بہبودی اور ترقی اعلیٰ پیمانہ پر قائم ہو جانی یہی امور ان کے پیش نظر تھے اور اسی نصب العین کے ماتحت انھوں نے جمعیۃ الانصار وغیرہ حسب ارشاد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ قائم کی تھی۔ مراد آباد اور میرٹھ کے جلسے اسی اسکیم کے ماتحت ہوئے تھے۔ اسی نصب العین کے ماتحت اسلامی مدارس کی تنظیم بھی تھی۔ رولٹ رپورٹ میں جو بیانات مولانا موصوف کی آمد کے متعلق کیے گئے ہیں مثل دیگر امور کثیرہ واقعیت سے خالی ہیں۔ یہ اجتماع کچھ عرصہ تک رہا اور اس نے پھل پھول شاخیں اور کونپلیں نکالنی شروع کیں

مگر فلک کوزہ پشت کو پسند نہ آیا اور مقاصد میں کامیابی کی راہ میں اس نے سخت در سخت روڑے پیدا کر دیئے۔

دارالعلوم کی مدرسی اور جلسہ دستار بندی میں ۱۳۲۶ھ شعبان تک دارالعلوم میں کتب دورہ میں سے ترمذی اور بخاری شریف کو جد و جہد کے ساتھ پڑھتا رہا۔ ۱۳۲۶ھ شوال میں اکابر نے مجھکو تدریس کا حکم کیا۔ جلسہ اہل شوریٰ نے حضرات مہتمین رحمہما اللہ تعالیٰ کی خواہش اور تجویز کو پاس کر دیا کہ حسین احمد کو بالفعل بمشاہرہ للعہ ماہوار مدرس کر دیا جائے اور اس کے بعد جب بھی وہ مدینہ منورہ سے ہندوستان میں آئے اس کو بغیر تجدید اجازت از مجلس شوریٰ مدرس کیا جائے چنانچہ مجھکو متعدد اسباق اوپر کی کتابوں کے دیئے گئے۔ اس سے مجھکو علمی ترقی کے علاوہ مالی وسعت بھی حاصل ہوگئی۔ اور دوسری بڑی نعمت یہ حاصل ہوئی کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ جب سفر فرماتے تو میں بھی ساتھ ہوتا اور شرف خدمت گذاری سے باریابی ہوتی۔ ۱۳۲۶ھ میں تجویز ہوا کہ دستار بندی کا جلسہ عرصہ دراز سے نہیں ہوا ہے اس کو عمل میں لانا چاہیئے۔

دستار بندی کی حقیقت اور رواج زمانہائے قدیمہ میں اس امر کے ظاہر کرنے کے لئے کہ طالب علم کتب درسیہ پڑھکر اور علوم و فنون فقہ و حدیث میں ماہر ہو کر اس درجہ میں پہونچگیا ہے کہ اس کے فتاویٰ قابل اعتماد سمجھے جائیں اور اس کی تعلیم و تدریس قابل اطمینان شمار ہو دو طریقے جاری کئے گئے تھے۔ ایک سند دینا جس میں اساتذہ اپنے تلامیذ کی کتب خواندگی اور اس کی صلاحیت علمی اور عملی اور اپنی اجازت ظاہر کیا کرتے تھے اور دوسرا طریقہ دستار بندی یا خرقہ عطا کرنیکا ہوتا تھا مجمع عظیم میں اساتذہ تلمیذ کے سر پر اپنے ہاتھ سے دستار باندھ دیتے تھے یا اپنا جبہ وغیرہ خرقہائے علماء عطا کرتے تھے۔ اس طریقہ ثانیہ سے عام و خاص میں تلمیذ کی قابلیت کا علم اور چرچا ہو جاتا تھا۔ بخلاف سند کے کہ اس کو سمجھنا اور پڑھنا صرف اہل علم سے ہو سکتا تھا۔

دارالعلوم دیوبند قائم ہونے کے بعد فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کا طریقہ جاری

کیا گیا۔ دوسرے تیسرے سال اجتماع عظیم کیا جاتا تھا اور دستار بندی اور سند اور امتحان اور تقریر علمی کی رسوم جاری ہوتی تھیں۔ اس طریقہ سے دار العلوم کی شہرت بہت زیادہ ہونے لگی۔ نیز تعلیم عربی اور تحصیل علوم دینیہ کا جذبہ لوگوں میں بڑے پیمانہ پر پیدا ہوگیا۔ یہ طریقہ غالباً ۱۳۰۷ھ تک جاری رہا مگر بعد میں کچھ ایسے عوائق پیش آئے کہ اس کی انجام دہی نہیں ہوسکی۔ طلبہ کو صرف سند دیدی جاتی تھی۔ مگر عام لوگوں اور بالخصوص فارغ التحصیل طلبہ کے تقاضے دستار بندی کے برابر ہوتے رہتے تھے جنکو لطائف حیل سے ارباب اہتمام ٹالتے رہتے تھے۔ دار العلوم دیوبند ۱۳۰۷ھ سے ۱۳۱۳ھ تک مختلف مشکلات میں مبتلا ہوتا رہا داخلی اور خارجی صدمات آئے دن پیش آتے رہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب مرحوم مدرس اول کا وصال، مولانا رفیع الدین صاحب مرحوم مہتمم کی ہجرت۔ مولانا سید احمد صاحب دہلوی مدرس اول کا مدرسہ سے بیزار ہوکر سفر بھوپال ارباب اہتمام کی تبدیلی کبھی حضرت حاجی عابد حسین صاحب مرحوم کبھی منشی فضل حق صاحب مرحوم کبھی مولانا محمد منیر صاحب مرحوم نانوتوی کبھی مولانا حافظ احمد صاحب مرحوم یکے بعد دیگرے مہتمم ہوتے رہے۔ اس تغیر اور تبدل میں اندرونی انتظامات اور افکار میں بہت کچھ قلق اور شورشوں کا ظہور ہوتا رہا جس سے ارباب انتظام کو اتنی مہلت نہیں مل سکی کہ وہ اس جلسہ دستار بندی کا نظام قائم کریں۔ ۱۳۱۳ھ میں انھیں شورشوں کے دبانے کے لئے حضرت قطب عالم مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور نواب محمود علی خاں صاحب آف چھتاری مرحوم اور دیگر ملک کے اکابر جمع ہوئے۔ اور مولانا حافظ احمد صاحب مرحوم کو مستقل مہتمم بنایا گیا۔ امید تھی کہ اب شورشوں کا قلع اور قمع ہوجائیگا مگر ۱۳۱۸ھ تک قلع وقمع بالکلیہ نہ ہوسکا۔ اس کے بعد مکمل سکون پیدا ہوا۔ اس وقت سے ترقیات دار العلوم کا دروازہ بڑے پیمانہ پر کھلنے لگا۔

چونکہ ایک طرف تو فارغ التحصیل طلبہ کی مقدار بہت زیادہ ہوگئی تھی جنکا اندازہ ہزار سے زیادہ تھا اس لئے صرف عماموں کی بہم رسانی کے لئے زر کثیر کی ضرورت ہوتی۔ مگر اس سے بڑھکر مصاریف مہمانداری جو کہ ایسے اجتماع پر ضروری ہیں اُن سے منتظم حضرات بہت گھبراتے تھے

اول تو خود علماء فارغ التحصیل ہی کا شمار اتنا تھا کہ ان کی مہمانداری کے لئے کافی مقدار کی ضرورت تھی۔ ثانیاً دارالعلوم کی شہرت اس قدر بڑھ چکی تھی کہ اندازہ کیا جاتا تھا کہ معمولی اعلان پر دس پندرہ ہزار مسلمان ضرور اطراف و جوانب سے جمع ہو جائیں گے۔ چونکہ لوگوں کے مطالبے بہت زور کے اور زیادہ ہوئے۔ اس لئے ہر دو حضرات مہتممین مرحومین نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ پر اس کی انجام دہی کا زور دیا اور اس کے فوائد اور تقاضوں وغیرہ کا ذکر کیا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ بھی موافق ہو گئے اور پھر تینوں حضرات نے مجلس شوریٰ میں پیش کر کے منظوری لی۔ اور ۱۶، ۱۷، ۱۸ اپریل ۱۹۱۰ء جلسہ کا اعلان کر دیا۔ ضروریات جلسہ کے لئے بہت بڑی رقم کی ضرورت تھی اس لئے طلبہ کے وفود اطراف و جوانب میں تحصیل چندہ کے لئے روانہ کئے گئے۔ مسلمانوں نے ہر صوبہ اور ہر گوشے سے لبیک کہا کہ اور تقریباً ایک ماہ سے کم میں جبکہ وفود واپس آئے تو اٹھارہ بیس ہزار روپیے جمع ہو گئے تھے۔ اور شہرہ بھی جلسہ کا اس ذریعہ سے بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ تمام انتظامات لازمہ بڑے پیمانہ پر انجام دئے گئے۔ اور بحمد اللہ اس حسن و خوبی سے تمام امور تکمیل پائے گئے کہ عوام تو در کنار خواص اور ماہرین کو سخت تعجب ہوتا تھا کہ ان بوریہ نشین غریب علماء نے اس قدر عظیم الشان شاہانہ کام کو کس طرح انجام دیدیا۔ مسلمان جوق جوق اطراف اور جوانب سے نہایت شوق اور محبت سے آ کر جمع ہو گئے۔ اہل شہر نے اپنے اپنے مکانات مہمانوں کے لئے خالی کر دیئے۔

مہمانی کے لئے نہایت بڑے پیمانہ پر مطبخ بنایا گیا۔ دہلی سے مشہور باورچی بلائے گئے۔ ہر قسم کی ضروریات کا مکمل انتظام کیا گیا۔ جملہ امور متعلقہ کے لئے شعبے قائم کئے گئے طلبہ اور ملازمین و مدرسین کی پارٹیاں تقسیم کار کے اصول پر بنائی گئیں۔ ہر ذمہ دار اپنے اپنے کام میں منہمک اور مشغول رہتا تھا مگر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نہایت ساکت و صامت تفکر کے دریا میں غرق نظر آتے تھے۔ کبھی یہاں بیٹھ گئے کبھی وہاں۔ ان تمام ایام میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ مراقب پائے جاتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نہایت ہی عظیم الشان بار آپ کے

پڑا ہوا ہے جس کی فکر میں ڈوبے ہوئے اپنے پروردگار سے عرض معروض کر رہے ہیں۔ اور واقعہ بھی یہی تھا مشکلات خود بخود حل ہوتی جاتی تھیں جن امور کو عقدہ لاینحل اور معمولی طاقتوں سے بالاتر سمجھا جاتا تھا وہ چٹکیوں میں انجام پاتے تھے۔ لوکل حکام نے بھی مدد دینے میں کوتاہی نہیں کی۔ مدرسہ کے تالاب میں نہر سے پانی لایا گیا۔ جس کی وجہ سے مجمع کے لئے وضو وغیرہ میں بہت آسانی ہوگئی۔ ٹیوب ویل جگہ جگہ گاڑے گئے۔ پنڈال نہایت وسیع بنایا گیا۔ علاوہ ظاہری انتظامات کی تکمیل کے باطنی تصرفات اور روحانی برکات کا ہر جگہ ظہور تھا معمولی بات یہ تھی کہ باوجودیکہ ہر وقت کئی کئی سو من غلہ اور گوشت پکتا تھا مگر کسی جگہ کتا نظر نہیں آتا تھا۔ باوجودیکہ گرمیوں کا زمانہ تھا مگر مکھیوں کا اجتماع کہیں نہ تھا۔ غلاظت اور گندگی جو کہ ایسے مجامع میں عموماً پائی جاتی ہے کہیں دیکھنے میں نہیں آتی تھی۔ اس قدر عظیم الشان مجمع میں کوئی شخص کھانے اور مہمانی کے فرائض سے محروم اور شاکی نہیں پایا گیا۔ حالانکہ معمولی معمولی باراتوں اور مجامع میں اس قسم کی بے عنوانیاں سیکڑوں پائی جاتی ہیں۔ اس زمانہ میں اخبارات نے جلسہ کی غیر معمولی کامیابی پر زوردار اور طویل طویل آرٹیکل شائع کئے۔

میرے ذمہ طلبہ کو عربی میں تقریر کرانےکی خدمت تعین کی گئی تھی چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں مختلف عنوانات پر تقریباً بارہ یا پندرہ طالب علم عربی تقریر کے ماہر ہوگئے تھے۔ ارباب انتظام کی خواہش تھی کہ ان سبھوں سے مجمع عام میں عربی میں تقریر کرائی جائے گی۔

جلسہ میں اولاً جناب قاری عبدالوحید خاں صاحب مرحوم مدرس تجوید اور ان کے شاگردوں بالخصوص مولانا محمد طیب صاحب اور مولانا محمد طاہر صاحب وغیرہ نے باتجوید قرآن سنایا۔ اس کے بعد حضرت مولانا حافظ احمد صاحب مرحوم و مغفور نے اپنا مطبوعہ خطبہ موسومہ "دارالعلوم دیوبند کا زرین ماضی اور مستقبل" جو کہ نہایت مبسوط تھا اور اس میں دارالعلوم کی ماضی خدمات دینیہ اور علمیہ کو واضح طور پر ظاہر کیا گیا تھا سنایا۔ اس میں مستقبل کی ضروریات اور اراکین کے ارادوں پر بھی روشنی ڈالی گئی تھی۔ اس کے بعد سب سے پہلے عربی زبان میں حضرت مولانا انور شاہ صاحب

رحمۃ اللہ علیہ نے بسوط تقریر فرمائی۔ ان کے بعد میں نے تقریر کی جو کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل کے متعلق تھی۔ پھر دو تین طلبہ نے تقریر کی مگر طلبہ کی امنگیں مایوسی سے تبدیل ہو گئیں جبکہ عام حاضرین نے مطالبہ کیا کہ تقاریر اردو میں ہونی چاہئیں ہم لوگ کچھ نہیں سمجھتے۔ چنانچہ ارباب انتظام نے مجبور ہو کر عربی تقریریں بند کرادیں اور اردو میں تقریروں کا سلسلہ جاری کیا۔ اس کے بعد دوسرے اجلاس میں دستار بندی کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ سب سے پہلے حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دستار بندی ہوئی اُس کے بعد میری دستار بندی کی گئی۔

میری دستار بندی اور اس کا تعدد مجھکو ایک عمامہ سبز حسب اصول مدرسہ دوسرے حضرات کی طرح مدرسہ سے از دست حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بندھوایا گیا۔ اور مجھکو خصوصی طور پر علاوہ دستار مدرسہ حضرت مولانا حکیم مسعود احمد صاحب صاحبزادہ حضرت قطب العالم گنگوہی رحمۃ اللہ علیہما نے دوسری دستار عطا فرمائی پھر جناب حکیم مولانا احمد صاحب رامپوری رکن مجلس شوریٰ نے تیسری دستار عطا فرمائی۔ علاوہ عربی تقریر کے اردو میں بھی مجھکو تقریر کرنے کی نوبت آئی۔ حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقریروں اور مواعظ سے لوگوں نے بہت حظ لیا اور بہت زیادہ فوائد عام حاضرین کو حاصل ہوئے۔ افسوس کہ اتنے بڑے عظیم الشان مجمع کے لئے باوجود پنڈال کی وسعت کے مقرر کو آواز سب تک پہونچانا سخت مشکل ہوتا تھا۔ اس وقت تک لاؤڈ اسپیکر جاری نہیں ہوا تھا۔ ورنہ یہ مشکل پیش نہ آتی۔ اس مجمع میں صاحب زادہ آفتاب احمد خاں صاحب مرحوم نے بھی تقریر فرمائی تھی۔ خلاصہ یہ کہ یہ جلسہ اپنی معنوی اور مادی برکات اور عظمتوں کی بنا پر اپنا آپ ہی نظیر تھا۔ دوسری جگہ اس کی مثال نہیں پائی گئی۔ پوری تفصیلات اس کی مستقل رسالہ کی شکل میں شائع کی گئی تھیں جو کہ دار العلوم کے ریکارڈ میں محفوظ ہے۔ اس میں دار العلوم کو

بعد منہائی مصاریف بڑی مقدار چندہ کی بھی حاصل ہوئی۔ اور اس کے بعد دار العلوم نے نمایاں شہرت اور قبولیت ملک میں پیدا کر کے ایسی ترقیاں کیں جنکا وہم وگمان بھی پہلے نہ تھا۔ وللہ الحمد والمنۃ۔

ہندوستان سے واپسی حجاز چونکہ مدینہ منورہ میں والد صاحب مرحوم اور دیگر اعزہ موجود تھے اس لئے طبعی تقاضا وہاں پہونچنے کا علاوہ اس روحانی تقاضے کے جو کہ ان دیار مقدسہ کی حاضری کا ہر مسلمان کے دل میں ہوتا ہے جاری تھا مگر اس سے بڑھکر حضرت والد صاحب مرحوم کا آئے دن کا حکم تھا کہ جلد از جلد یہاں پہونچنا چاہیے۔ نیز طلباء مدینہ منورہ کے اور دیگر اعزہ کے تقاضے تھے جو کہ بذریعہ والد صاحب مرحوم بار بار ہوتے رہتے تھے۔ اسی بناء پر ۱۳۲۹ھ میں ارادہ سفر حجاز کیا گیا اور چونکہ حیفا سے (جو کہ فلسطین کا مشہور بندر ہے اور بحر ابیض کے مشرقی کنارہ پر واقع ہے۔) مدینہ منورہ تک ریلوے کا سلسلہ متصل ہو چکا تھا اس لئے یہی مناسب معلوم ہوا کہ بمبئی سے پورٹ سعید کا ٹکٹ لیا جائے اور وہاں سے حیفا جانے والے جہاز میں سفر کیا جائے اور وہاں سے مدینہ منورہ ریل میں سفر کیا جائے۔ عبد الباقی خاں صاحب مرحوم الہ آبادی نے خواہش ظاہر فرمائی کہ وہ اپنی والدہ ماجدہ کو بمعیت اپنے چھوٹے بھائی قاری عبد الوحید خاں صاحب مرحوم مدرس دار العلوم اور ایک ملازم حج کے لئے بھیجنا چاہتے ہیں نیز اپنے والد ماجد مرحوم کی طرف سے حج بدل بھی کرانا چاہتے ہیں۔ اس بناء پر اونہیں کے حسب منشاء سفر کی تیاری کیگئی چونکہ ان کی والدہ ماجدہ مرحومہ نہایت ضعیف العمر اور بھاری بدن کی تھیں اس لئے اونٹوں کا اسقدر سفر ان کے لئے موزوں نہیں ہو سکتا تھا اسی بناء پر ان کی رائے یہی تھی کہ بذریعہ جہاز ریلوے سفر کیا جائے۔ اور مع متعلقین بمبئی پہونچکر ایک اسٹرین جہاز میں تقریباً ۶۸ نی کس کرایہ پر پورٹ سعید کا ٹکٹ لیا گیا۔ دسویں دن جہاز پورٹ سعید پہونچ گیا۔ وہاں بطور قرنطینہ دیکھو نکہ حکم یہ تھا کہ کوئی بحری مسافر پورٹ سعید میں اُترنے کے بعد جبتک چند

دن وہاں قیام نہ کرے سفر نہیں کر سکتا) اور انتظار جہاز جیفہ پانچ چھ روز قیام کر کے پہونچنا ہوا اور وہاں سے ایک دن قیام کر کے مدینہ منورہ کو روانگی ہو گئی۔ غالباً اٹھارویں دن مدینہ منورہ میں پانچوں آدمی پہونچ گئے۔ مدینہ منورہ میں تقریباً ایک ماہ قیام کرنے کے بعد متعلقین کو وہاں چھوڑ کر مکہ معظمہ کو روانگی ہوئی۔ راستہ میں قاری عبدالوحید صاحب مرحوم کی والدہ ماجدہ جوکہ نہایت معمر تھیں بیمار ہو گئیں اور بعد از فراغت حج وفات کر گئیں۔ مکہ معظمہ ہی میں مدفون ہوئیں۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد قاری عبدالوحید صاحب معہ اپنے ملازم کے ہندوستان واپس آگئے اور میں مدینہ منورہ واپس ہو گیا۔ جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے۔

تیسرا سفر ہندوستان اپنے اعزہ و اقارب میں سے نکاح کے لئے کوئی اس وجہ سے راضی نہیں ہوا تھا کہ جبکہ مدینہ منورہ میں قیام ہے تو لڑکی وہاں چلی جائے گی اور پھر ملاقات نہ ہو سکیگی۔ باوجود انتہائی کوششوں کے ناکامی ہوئی تھی تو خاندان سے باہر کوشش کی گئی تھی اور جناب حافظ زاہد حسن صاحب امروہی دامت برکاتہم کی کوششوں سے حکیم غلام احمد صاحب بچھراونی مرحوم راضی ہو گئے تھے مگر انھوں نے دو شرطیں کیں ایک تو یہ کہ بارات میں جملہ اکابر دیوبند معہ صاحبزادہ جناب حکیم مسعود احمد مرحوم تشریف لائیں۔ اور دوسرے یہ کہ مدینہ منورہ پہونچ جانیکے دو برس بعد لڑکی کو یہاں پہونچایا جائے اور چند دن لڑکی ہمارے پاس رہ کر پھر مدینہ منورہ جائے پہلی شرط تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی توجہ اور حکم سے بآسانی پوری ہو گئی تھی۔ مگر دوسری شرط اگرچہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے حکم پر مان لی گئی تھی مگر اس میں بہت تشویش تھی کہ اتنا بڑا سفر اور اس قدر مصاریف کس طرح آسان ہونگے۔ چونکہ نکاح کے بعد دو برس سے زیادہ ہندوستان ہی میں اقامت ہو گئی تھی تو حکیم صاحب مرحوم سے عرض کیا گیا کہ اب تو اتنی طویل مدت یہاں گذر گئی اور آپ نے تمام معاملات اطمینان بخش ملاحظہ فرمائے اب اس شرط کو ساقط کر دیجئے۔ مگر وہ نہ مانے۔ میرے مدینہ منورہ پہونچنے کے ایک سال بعد سنہ ۱۳۳۰ھ میں وہ خود بھی حج کیلئے تشریف لائے اور مکان ہی پر ٹھہرے اور تمام معاملات اطمینان بخش دیکھے اس پر بھی ان سے

کہا گیا کہ اب تو آپ کو وہ شرط ساقط کر دینی چاہیے۔ آپ نے اپنی لڑکی سے ملاقات بھی کرلی اور ہر طرح سے معاملات دیکھ لئے۔ مگر وہ اس پر بھی نہ مانے اور فرمایا کہ میں اگرچہ مل لیا ہوں مگر لڑکی کی ماں اور بہنوں کو بجز ملاقات کوئی وجہ تسلی کی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے مجبوری ان کی شرط پوری کرنی ضروری ہوئی۔ مدینہ منورہ پہونچنے کے کچھ عرصہ بعد برخوردار الطاف احمد پیدا ہوا تھا کہا گیا کہ یہ بچہ ابھی بہت چھوٹا ہے سفر طویل اور سخت ہے اس لئے بھی مناسب نہیں کہ حسب شرط سفر ہندوستان کیا جائے مگر انھوں نے کچھ نہ مانا۔ بالآخر کچھ صورتیں مصالیف کی کر کے اوائل ۱۳۲۱ھ میں ہندوستان کے سفر کا ارادہ کیا گیا۔ چونکہ حجاز ریلوے میں طلبا ر اور ارباب علم کو حکومت ترکی کی طرف سے مفت ٹکٹ ملجایا کرتا تھا ہمارے تعلقات ارباب دفاتر وغیرہ سے بہت وسیع ہو چکے تھے اس لئے حیفا تک ٹکٹ حاصل کرنے میں خرچ تقریبًا بہت کم ہوا۔

عزیزم وحید احمد مرحوم کی معیت بڑے بھائی مولانا صدیق احمد صاحب مرحوم ۱۳۲۰ھ میں بیمار ہو کر انتقال فرما گئے تھے ان کے اگرچہ پہلی اور دوسری بیویوں سے اولادیں متعدد پیدا ہوئیں تھیں مگر بجز پہلی اولاد وحید احمد مرحوم کے اور کوئی ان کی وفات کے وقت موجود نہ تھی۔ وحید احمد مرحوم اس وقت ترکی مدرسہ میں پڑھتا تھا اور علوم جدیدہ اور زبان ترکی میں اچھی طرح ماہر ہو چکا تھا۔ عربی کی بھی تعلیم ایک درجہ تک حاصل کر چکا تھا مگر وہ قابل اطمینان نہ تھی۔ میرے سفر ہندوستان اور وہاں تین برس قیام کی وجہ سے اس کی تعلیم عربی میں بہت خلل پڑ گیا تھا۔ بڑے بھائی صاحب مرحوم (اس کے والد) اس کی تعلیم اور تربیت پوری طرح نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے دوسرے نکاحوں اور سوتیلی ماؤں کے معاملات کی وجہ سے نیز ان کے مغلوب الغضب اور زیادہ سخت ہونے کی بنا پر بھی اس کو طبعی طور پر اپنے والد مرحوم سے لگاؤ نہیں تھا بلکہ مجھ سے اور والد صاحب مرحوم سے اس کو زیادہ تعلق تھا۔ اسی بنا پر والد صاحب نے اس کو ترکی اسکول میں داخل کر دیا تھا۔ مگر وہاں کے لڑکوں کی صحبت میں

اس کے اعمال و اخلاق پر غیر مستحسن اثر پڑ رہا تھا۔ وہ طبعی طور پر نہایت ذہین تھا۔ زبان ترکی اور فنون جدیدہ رائجہ میں وہ اپنے درجوں میں ممتاز رہتا تھا۔ مگر علوم جدیدہ اور فلسفہ طبیعیات اور یوروپین فیشن کا جو زہریلا اثر مذہب کے خلاف اہل اسکول اور کالجوں پر پڑتا ہے اس سے وہ بھی مسموم ہو رہا تھا۔ اس لئے والد صاحب مرحوم کا ارشاد ہوا کہ اس کو ہندوستان لیجا اور دار العلوم دیوبند میں علوم عربیہ کی تکمیل کرا۔

اواخر محرم ۱۳۳۱ھ میں میں اور وحید اور الطاف اور اس کی والدہ مرحومہ مدینہ منورہ سے روانہ ہو کر تین چار دن میں حیفا ہوتے ہوئے پورٹ سعید پہونچے وہاں چند روز ٹھہر کر ایک اٹالین جہاز میں بکرایہ ۵۰ فی کس بمبئی روانہ ہو گئے۔ جہاز میں مال تھا مسافر بہت کم تھے۔ بالخصوص ڈیک کے مسافر صرف دو ہی چار تھے۔ اواخر صفر میں کراچی ہوتا ہوا یہ جہاز بمبئی پہونچا۔ وہاں سے متعلقین کو بچھراؤں پہونچا کر میں دیوبند پہونچا۔ الطاف مرحوم کی صحت اچھی تھی۔ چہرہ پر ذکاوت اور نجابت کے آثار زیادہ تر نمایاں تھے۔ عورتوں کے ڈبہ میں متعدد عورتیں اس کو گھور گھور کر دیکھتی تھیں۔ ایک عورت نے اس کی ماں سے کہا کہ یہ بچہ تو یہاں کا نہیں معلوم ہوتا اس کے چہرہ کی چمک اور آثار یہاں کے بچوں جیسے نہیں ہیں اس نے کہا کہ یہ مدینہ منورہ میں پیدا ہوا ہے اور حجرہ نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں وہاں کی عادت کے موافق چلہ کے بعد داخل کیا جا چکا ہے۔ اس پر اور بھی عورتوں نے اس کو گھور گھور کر دیکھنا شروع کیا۔ اور اس کی تیزی اور شوخی اور چہرہ کی نجابت وغیرہ کو سراہنے لگیں۔ تقدیر الٰہی کہ ان میں سے کسی کی نظر لگ گئی اور فوراً اس کو قے آئی اور بخار شروع ہو گیا۔ آگرہ جب گاڑی پہنچی تو اس کا بہت براحال تھا۔ اسی بیماری کی حالت میں وہ اپنے ننہال بچھراؤں پہونچا۔ اور تپ دق میں مبتلا ہو گیا۔ حضرت حکیم رحیم اللہ صاحب مرحوم بجنوری کے علاج سے فائدہ ہوا مگر اصلی حالت نے اخیر تک عود نہیں کیا۔ بالآخر مدینہ منورہ لوٹنے کے چند مہینہ بعد چیچک میں مبتلا ہو کر انتقال کر گیا۔

اس مرتبہ میرا قیام ہندوستان میں صرف چند مہینوں رہا۔ جس میں دیوبند میں رہنا زیادہ ہوا۔ اور متعدد اسفار بھی پیش آئے۔ الطاف کی بیماری کی وجہ سے اطمینان نصیب نہیں ہوا۔

واپسی مدینہ منورہ تیسری مرتبہ بہر حال اواخر ۱۳۳۱ھ میں بطور حج بدل حجاج کے جہاز میں واپسی کا سامان کیا گیا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی مگر ٹرکی اور برطانیہ کے درمیان میں اعلان جنگ نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ خبریں گرم تھیں۔ اسٹیمر میں رات کو روشنی نہیں کی جاتی تھی اور آبدوزوں اور جنگی جہازوں کے خطرات ہمیشہ ظاہر کئے جاتے تھے۔ بہر حال دسویں یا بارہویں دن جدہ پہونچنا ہوا۔ اور پھر مکہ معظمہ میں ایام حج میں قیام کر کے اونٹوں کی سواری سے مدینہ منورہ ۱۳۳۲ھ محرم میں پہونچنا ہوا۔ اسی زمانہ میں ٹرکی کا اعلان جنگ بھی ہو گیا۔ اور فوج کشی وغیرہ کے سامانوں اور جنگی تحفظات وغیرہ کا اثر حجاز میں اور بالخصوص حرمین شریفین میں شروع ہو گیا۔ میں متعلقین کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچکر مشاغل تعلیمیہ وغیرہ میں حسب سابق مشغول ہو گیا۔ اسی اثنار میں جبکہ ترکی فوجیں حدود مصر کی طرف بھیجی جارہی تھیں اور مجاہدین متطوعین (والنٹروں) کو بھرتی کیا جا رہا تھا تو ترغیب جہاد کے لئے مناخہ مدینہ منورہ میں (جو کہ غلہ بازار مدینہ منورہ میں وسیع میدان ہے اور وہیں قافلے ٹھہرا کرتے ہیں) ایک بڑا جلسہ کیا گیا۔ اور مجھکو تقریر کرنے کی نوبت آئی۔ مگر یہ تقریر اردو میں تھی۔ اور دوسرے حضرات نے بھی تقریریں کیں۔ مشہور خیری برادران بھی اس زمانہ میں وہاں پہونچگئے تھے انکی بھی تقریریں ہوئیں۔ اور ایک مجمع مجاورین اہل ہند وغیرہ کا متطوع (والنٹیر) کور میں داخل ہو گیا جن میں مولانا محمد جان قازانی اور مولانا حرمت اللہ قازانی بھی تھے۔ یہ ہر دو صاحبان روس کے باشندے تھے اور بغرض تحصیل علوم دینیہ اولاً مدینہ منورہ پھر دیوبند آگئے تھے اور کتب درسیہ سے فراغت حاصل کر کے اسی سال مدینہ منورہ پہونچ گئے تھے۔ جمال پاشا کے زیر کمان جو حملے اور کارروائیاں قنال سویز اور بیر سبع وغیرہ پر میدان تیہہ میں واقع ہوئیں ان میں یہ جماعت شریک رہی۔ اور بہت کچھ داد شجاعت و جوانمردی دیتی رہی۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ میں انقلابی نشو ونما اور جذبۂ جہاد حریت کی ابتداء اور اس کے اسباب اور اس میں میری شرکت

حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز جن کو تحریک خلافت میں مسلمانوں کی طرف سے لقب شیخ الہند دیا گیا تھا۔ قصبہ دیوبند ضلع سہارنپور کے باشندہ تھے۔ ان کے والد ماجد حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سنہ ۱۸۵۰ء میں بعہدہ ڈپٹی انسپکٹر مدارس بانس بریلی میں ملازم تھے وہاں ہی سنہ ۱۸۵۰ء کے اخیر یا سنہ ۱۸۵۱ء کے ابتدا میں مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش ہوئی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ صغیر السن ہی تھے کہ ان کے والد ماجد کی تبدیلی شہر میرٹھ کو ہوگئی۔ جبکہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی عمر چھ یا سات برس کی تھی۔ میرٹھ میں ہنگامہ انقلاب آزادی سنہ ۱۸۵۷ء واقع ہوا۔ سنہ ۵۷ء کے واقعات کو اگرچہ صغرسنی کی وجہ سے پوری طرح نہیں دیکھ سکے تھے مگر اجمالی طور سے یاد تھے۔ بڑے ہونے کے بعد اپنے والدین ماجدین اور اساتذہ اور گرد و پیش سے وہ انسانیت سوز مظالم اور درندگی و بربریت کے معاملات جو انگریزوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ کئے تھے سنتے اور معلوم کرتے رہے ذہن ثاقب، طبیعت غیور، حافظہ نہایت قوی، جرارت بےمثل قدرت نے عطا فرمایا تھا۔ بنا بریں تاریخی اطلاعات اور ان کی کھوج و تلاش اور ان کی یاد مثل دیگر امور علمیہ سینہ مبارکہ میں جاگزیں ہوتی گئی۔ پھر قدرت نے حضرت شمس الاسلام والمسلمین مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور حضرت شمس العلم والعلماء مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ اسرارہما کے در دولت تک پہونچا کر شرف شاگردی اور حاضر باشی بارگاہ عطا فرمایا۔ یہ ہر دو حضرات سنہ ۱۸۵۷ء میں جہاد حریت کے شاملی، تھانہ بھون وغیرہ میں علمبردار رہے تھے۔ اور حضرت قطب عالم مولانا الحاج امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس اللہ سرہ العزیز کی سرپرستی میں بڑے بڑے کارنمایاں کر چکے تھے۔ اور اگرچہ برطانوی درندگی ان دونوں حضرات کو بھی مثل دیگر مجاہدین حریت صفحۂ ہستی سے مٹانا چاہتی تھی اور اگرچہ غداران ملت نے ان کو بھی اپنی ناعاقبت اندیشی سے پھنسانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا۔ مگر قدرت کے خفیہ ہاتھوں نے

ان دونوں حضرات کی کھلی کھلی خوارق عادات کرامتوں سے حفاظت کی تھی۔ بہر حال حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ میں ان دونوں بزرگوں اور بالخصوص حضرت نانوتوی قدس اللہ اسرارہما کی صحبت اور شاگردی اور خدمت کی وجہ سے وہ تمام اطلاعات جنکی وجہ سے انقلاب ۵۷ء کی کوششیں ہندوستانیوں نے کی تھیں اور وہ واقعات جو اس جنگ آزادی میں پیش آئے تھے معلوم ہو کر محفوظ ہو گئے تھے جنکی بناء پر وہ جذبہ حریت و ایثار اور اس کی آگ اور امور حکومت پر تنقیدانہ نظر پیدا ہوگئی تھی کہ جسکی نظیر بجز قرون اولی عالم اسلام میں پائی جانی تقریباً ممتنع ہے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ صرف تفسیر و حدیث فقہ و اصول منطق اور فلسفہ حساب اور مساحت ہیئۃ اور معقولات کے ہی بحر ذخار نہیں تھے بلکہ ان کو ادبیات عربیہ و فارسیہ و اردو اور شعر و سخن اساتذہ فن کے مقالات اور قصائد و غزلیات اور مثنویات وغیرہ اس قدر یاد اور از بر تھیں کہ سننے والا حیران ہو جاتا تھا اور تعجب کرنے لگتا تھا کہ ان کے حافظہ میں کسقدر بے شمار علوم اور محفوظات کے خزانے بھرے ہوئے ہیں۔ اسی طرح حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی نظر تاریخی معلومات اور سیاسی واقعات پر نہایت وسیع اور گہرے پیمانہ پر حاوی تھی جسپر اطلاع پانے کے بعد انسان ششدر ہو جاتا تھا کہ یہ بیشمار امور کس طرح ان کے ذخایر علمیہ میں آ گئے۔ نیز حضرت مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ تواریخ سلاطین ماضیہ خصوصاً شہنشاہان ہند اور ان کے واقعات و انتظامات پر نہایت زیادہ عبور رکھتے تھے۔

ہندوستان کی اقتصادی، معاشی، سیاسی، تجارتی، صنعتی، تعلیمی، انتظامی، جنگی، صحی وغیرہ معلومات بھی اس قدر تھیں کہ بڑے سے بڑا ڈاکٹر اور اکانومک پروفیسر ان تک نہیں پہونچ سکتا تھا۔ اخبار بینی اور واقعات عالم پر اطلاع کا بہت شوق تھا۔ بہر حال ان کو انگریزی حکومت اور ہندوستان کے مندرجہ ذیل واقعات نے مجبور کیا کہ اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھکر انگریزی استبداد اور مظالم کا مقابلہ کیا جائے اور اس کو جڑ سے اکھاڑ دینے کی پوری جد و جہد عمل میں لائی جائے۔ اور کسی قسم کے خطرہ سے بھی ڈرنے کو راہ نہ دی جائے۔ اگرچہ

ان اسباب کی تفصیل بہت وسیع ہے جس کو ہم انشاءاللہ مستقل تالیف میں دکھلائیں گے۔ مگر مختصر طور پر ہم ان وجوہ اور اسباب کو یہاں پر انگریزوں ہی کی شہادتوں سے ذکر کرتے ہیں جن کو اکثر ہم حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زبان فیض ترجمان سے اجمالی طور پر سنا کرتے تھے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے واقعات ۵۷ء اور انگریزوں کے ہندوستانیوں پر بے شمار سنگین مظالم اور خلاف انسانیت بربریت کے مظاہرات خود دیکھے اور سنے تھے اس لئے ان کے قلب میں بہت زیادہ اثر اور جوش ان کے خلاف تھا۔ سب سے بڑے اسباب حسب ذیل ہیں۔

انگریزوں نے تمام ہندوستانی قوم کو بے حد ذلیل وخوار کردیا۔

ہندوستانیوں کی آزادی اور عزت اور شوکت تمام دنیا میں مثل دیگر آزاد اقوام ہمیشہ سے تسلیم کی جاتی تھی اور چونکہ یہاں کے علوم ہندسہ، حکمت وفلسفہ، حساب وغیرہ نے بیمثل ترقی کی تھی جس سے دوسرے ممالک ایشیا وافریقہ وغیرہ بھی فیضیاب ہوئے تھے اس لئے اور اس لئے کہ مسلمان بادشاہوں نے یہاں کی صنایع اور تجارت اور اخلاق وعلوم میں چار چاند لگا دیئے تھے اور دور دور سے بڑے بڑے نامور اساتذہ کو بلاکر بھاری تنخواہیں دے کر ان کے صنائع اور کمالات ملک میں پھیلا دئے تھے اور اس لئے کہ دور دراز ملکوں میں ان کی تجارتیں اور آمد و رفت جاری تھی تمام اقوام اور ممالک میں نہایت عزت سے دیکھے جاتے تھے۔ حکومت اور سلطنت کے یہی مالک تھے۔ اور باوجود اختلاف مذاہب تمام امور سلطنت انھیں کے ہاتھ میں تھے۔ فرقہ داریت کا نام نہ تھا۔ تمام ہندوستانی دنیا میں ایک قوم شمار کئے جاتے تھے۔ اگرچہ مسلمانوں کے آنے کے بعد شہنشاہیت مسلمانوں کی قائم ہوگئی تھی مگر مسلمان بادشاہ یہاں ہی کی باشندے بنکر یہاں کی قومیت میں مندمج ہو گئے تھے اونھوں نے اپنے علائق اپنے اصلی اوطان اور اقوام سے تقریباً منقطع کرلئے تھے اور ہندوستانی قومیت کے جزو لاینفک بن گئے تھے۔ امور حکومت میں یہاں کے اصلی باشندوں کو انھوں نے شریک ایسی طرح سے کرلیا تھا کہ جیسے ایک قوم اور ایک خاندان آپس میں شریک ہوتے ہیں شخصی سلطنت کا دار ومدار سراسر رعایا کی خوشنودی

پر تھا اور پنچایتوں کے قیام کی وجہ سے عام طور پر عوام الناس کو حکومت خود اختیاری حاصل تھی اور ادنیٰ حکام سے لیکر بادشاہوں تک کے یہاں عام وخاص دربار ہوتے تھے جن میں ہر شخص کو اظہار رائے کا موقع ملتا تھا۔ اس بارہ میں سر بارٹل فریر نے لکھا ہے "ایک دیسی شاہزادہ کا دربار بھی کونسل کے بالکل مشابہ ہوتا ہے۔ ایک اچھے حکمراں کے زیر اثر اس دربار میں سب کی رسائی ہوتی ہے اور ہر ایک کو تقریر کرنے کی بڑی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ اور یہی ذریعہ ہے جس سے وہ رعایا پر کسی قانون کے اثر کو محسوس کر سکتا ہے اور وہ اس طرح بے چینی کو پہلے ہی معلوم کر لیتا ہے۔" (رپورٹ آئینی اصلاحات مانٹیگو چیمسفورڈ ص۳۸)

(روشن مستقبل ص۱)

آپسمیں رشتہ داریاں اور بیاہ شادی جاری کرلی تھی۔ ہر قسم کے عہدے وزارت عظمیٰ اور سپہ سالاری سے لیکر ادنیٰ انتظامی اور فوجی عہدوں تک بلالحاظ نسل و رنگت اور مذہب و وطنیت حسب قابلیت مفتوح اقوام کو بھی دیتے رہتے تھے۔ اُنھوں نے ہندوؤں کو مہاراجہ، راجہ، تعلقدار بنایا۔ بڑی بڑی ریاستیں دیں۔ ہفت ہزاری، شش ہزاری، پنج ہزاری اور نیچے کے تمام منصب عطا کئے۔ سر پی سی رائے (مشہور بنگالی لیڈر) کہتا ہے۔ "اورنگ زیب کے عہد میں بنگال کے ہندوؤں کو منصبداری اور بڑی بڑی جاگیریں عطا کی گئیں اور بڑے بڑے زمیندار بنا دئے گئے۔ اورنگ زیب نے ہندوؤں کو گورنر بنایا۔ وائسرائے بنایا۔ یہاں تک کہ اس نے خالص مسلم صوبہ افغانستان پر بھی جو نائب السلطنت مقرر کیا تھا وہ ہندو راجپوت تھا۔" (روشن مستقبل ص۱۱)

شہنشاہی درباروں سے لیکر عام سوسائٹیوں تک میں سب مخلوط تھے اس لئے تمام ہندوستانی دنیا کی نظروں میں بھی اور آپس میں بھی عزت اور شوکت اعلیٰ پیمانہ پر رکھتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ اپنی بے مثل ثروت بے مثل تجارت بے مثل دستکاری۔ بے مثل تمدن اور بے مثل طاقت کی بنا پر اقوام عالم میں برتری اور سب سے فوقیت کا درجہ رکھتے تھے۔ کوئی ہندوستانی

خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھنے والا ہو غیر ممالک میں حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا اور نہ ہندوستان میں کوئی غیر قوم کا آدمی کسی ہندوستانی کو ذلیل دیکھ سکتا تھا۔

برنیر فرانسیسی کہتا ہے کہ رعایا کی حفاظت اس طرح کی جاتی ہے جس طرح بادشاہ اپنے خاندان کے افراد اور اہل و عیال کی کرتے ہیں کسی طرح گوارا نہیں کیا جاتا کہ کوئی فوجی یا پولیس یا کوئی اجنبی کسی رعیت پر کسی قسم کی دست درازی کرے۔

حرفتی کمیشن جس کے تمام ممبر انگریز تھے اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے۔

"ایسے زمانہ میں جبکہ مغربی یورپ میں جو کہ موجودہ طریق حرفت کا مولد و منتہا ہے غیر مہذب قبائل آباد تھے۔ ہندوستان اپنے حکمرانوں کی دولت اور اپنے کاریگروں کی اعلیٰ صنعت کے لئے مشہور تھا اور بہت بعد کے وقت میں جبکہ مغرب کے حوصلہ مند تاجر پہلے پہل ہندوستان میں نمودار ہونے لگے یہ ملک زیادہ ترقی یافتہ یوروپین اقوام سے کسی طرح گھٹا ہوا نہیں تھا۔"

(علم المعیشۃ)

سر تھامس منرو (برطانوی قبضہ سے قبل ہندوستانی حالت کا نقشہ کھینچتے ہوئے) کہتا ہے۔

ہندوستانیوں کا طریقہ کاشتکاری، بے مثل صنعت و حرفت ان کی صنعت و کاشتکاری کے معاملہ میں اعلیٰ استعداد، ہر قریہ میں ایسے مدارس کی موجودگی جس میں نوشت و خواند اور حساب کی تعلیم ہوتی ہو، ہر شخص میں مہمان نوازی اور خیرات کرنیکا مبارک جذبہ موجود ہو۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ صنف نازک پر پورا اعتماد کیا جاتا ہو اس کی عزت، عصمت اور عفت کا پوری طرح لحاظ رکھا جاتا ہو۔ یہ ایسے اوصاف ہیں جنکے ہوتے ہوئے ہم اس قوم کو غیر مہذب اور غیر متمدن نہیں کہہ سکتے۔ ایسے صفات کی موجودگی میں ہندوستان کو یوروپی اقوام سے کسی طرح کمتر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر انگلستان و ہندوستان کے درمیان تہذیب و تمدن کی تجارت کیجائے تو مجھے یقین کامل ہے کہ ہندوستان سے تمدن کی جو کچھ درآمد انگلستان میں ہوگی اس سے انگریزوں کو بہت فائدہ پہونچے گا۔"

لارڈ ولیم بنٹنگ (مشہور وائسرائے ہندوگورنر مدراس) ۱۸۳۰ء میں کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہتا ہے:۔

بہت سی باتوں میں اسلامی حکومتیں انگریزی راج سے کہیں بہتر تھیں۔ مسلمان اس ملک میں آباد ہو گئے جسے انھوں نے فتح کیا تھا۔ وہ ہندوستانی باشندوں میں گھل مل گئے۔ ان میں بیاہ شادی کرنے لگے۔ مسلمانوں نے ہندوستانی قوموں کو ہر قسم کے حقوق دیئے۔ فاتح اور مفتوح کے مذاق دلچسپی اور ہمدردی میں یکسانیت تھی۔ کوئی فرقہ نہ تھا بخلاف اسکے انگریزی پالیسی اس کے برعکس ہے۔ اب سرد مہری، خود غرضی، بے پرواہی ہے۔ جس میں ایک طرف حکومت کا آہنی پنجہ حکمران ہے۔ اور دوسری طرف ہر چیز پر اپنا قبضہ ہے۔ اور ہندوستانیوں کو کوئی دخل نہیں ہے" (ہندوستان میں عیسائیوں کی حکومت از میجر باسو جلد ۱ ص۶۶)

(روشن مستقبل ص۲۵، ۲۶ و انصار دیوبند مورخہ ۱۶ رجون ۱۹۲۶ء)

پنڈت سندرلال اپنی کتاب "بھارت میں انگریزی راج" میں فرماتے ہیں "اکبر جہانگیر شاہجہاں اور ان کے بعد اورنگ زیب کے تمام جانشینوں کے زمانہ میں ہندو اور مسلمان یکساں حیثیت رکھتے تھے۔ دونوں مذاہب کی مساویانہ توقیر کیجاتی تھی۔ اور مذہب کے لئے کسی کے ساتھ کسی قسم کی جانبداری نہ کی جاتی تھی۔ ہر بادشاہ کی طرف سے بیشمار ہندو مندروں کو جاگیریں اور معافیاں دی گئی تھیں الخ"۔

مگر جب سے انگریزی راج شروع ہوا اسی وقت سے ہندوستانیوں کی قومی توہین اور تذلیل اور نسلی اور وطنی امتیاز اور رنگت اور یوروپین اور نیٹو (دیسی) کا ذلیل کرنے والا تفرقہ شروع ہوا جو کہ طاقت اور قوت کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہوا انتہائی درجہ کو پہونچگیا باوجودیکہ انگریز پردیس سے بطور مہمان تجارت کے لئے آئے تھے اور شہنشاہان ہندوستان کے رحم وکرم سے تجارت کی اجازت حاصل کر کے فرمانات شاہی کے سایہ میں روز افزوں ترقی کرتے رہے اور پھر شہنشاہان اسلام پر ڈورے ڈالکر دیوانی (ریونیو) کی ملازمت حاصل کر کے

انتظامی امور میں دخیل ہوئے اور پھر غداریاں کرتے ہوئے تمام نظام سلطنت کو رفتہ رفتہ ملیامیٹ کرکے تقریباً سو برس میں ۱۷۶۵ء سے ۱۸۶۴ء تک میں ہندوستان کے بادشاہ بن گئے۔
۱۷۶۵ء کے کچھ بعد ہی سے ہندوستانی افسروں کو آہستہ آہستہ خلاف معاہدہ نکالنا شروع کیا اور جن عہدوں کو کوئی انگریز قبول کرسکتا تھا ان پر انگریزوں کو مقرر کیا۔

سر جان شور کہتا ہے (۱۸۳۳ء میں انگریزی قانون اور نظام پر بحث کرتے ہوئے) "ہر وہ عہدہ عزت اور منصب جس کو قبول کرنے کے لئے ادنیٰ سے ادنیٰ انگریز کو آمادہ کیا جاسکتا ہے۔ ہندوستانیوں کے لئے بند کردیا گیا ہے" (حکومت خود اختیاری ص۲۷)

اور جو چھوٹے عہدے تھے اور تنخواہوں کی ان میں زیادہ مقدار نہیں ہوسکتی تھی ان سے بھی مسلمانوں کو نکالکر ہندوؤں کو مقرر کیا۔ یوروپینوں اور انگلوانڈین کو ان کے عہدوں پر بہ نسبت سابق کئی کئی گنا زیادہ تنخواہیں دیں۔ فوجی عہدوں کے ذمہ دار مناصب سے ہندوستانیوں کو بالکل خارج کردیا اور حیلہ یہ کیا گیا کہ بغیر افواج پر قبضہ کرنے کے مالیات کا وصول کرنا ممکن نہیں ہے اس طرح تمام فوجی قوت بھی ہاتھ میں لے لی۔ لارڈ کارنوالس نے ایسی اسکیم بندوبست اراضی کی بنائی کہ تمام عملہ پرانے نظام کا درہم برہم ہوگیا۔ ہندوستانی حکومت کے ارکان نان شبینہ کے محتاج ہوگئے اور تمام طاقت یوروپین لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ ملک کی صنعت اور تجارت کو فنا کے گھاٹ اوتار دیا اور اس کی جگہ یوروپین تجارت اور دستکاری کو ٹھوس دیا گیا۔
جو ہندوستانی تجارت اور دستکاری سے بسر اوقات کرتے تھے وہ فاقوں میں مبتلا ہوگئے زمین کے لگان اور مالگذاری میں اسقدر اضافہ کردیا کہ کاشتکار آبادی تباہ و برباد ہوگئی۔ وصولی لگان اور قرضہ اور سود کے ایسے قوانین بنائے اور نافذ کردئے کہ کاشتکار اور زمیندار اپنے ذاتی سرمایوں گھر کے زیورات۔ کاشتکاری کے آلات اور جانوروں تک کے فروخت کرنے اور جائدادوں کو رہن رکھنے اور بیچڈالنے کے لئے مجبور ہوگئے۔ الحاصل کوئی طریقہ ہندوستانیوں کو عزت اور خوشحالی سے بسر کرنے کا باقی نہیں رکھا۔ جو سرمایہ ہندوستانیوں کے پاس مال و

دولت کا صدیوں سے چلا آتا تھا اس کو جائز اور ناجائز طریقوں اور من مانے قوانین وغیرہ سے اپنے قبضہ میں لاکر انگلستان میں منتقل کر دیا۔

سر میلکم لوئس جج عدالت عالیہ (ہائی کورٹ) مدراس و ممبر کونسل نے اپنے ایک رسالہ میں لندن سے لکھا تھا۔ "ہم نے ہندوستانیوں کی ذاتوں کو ذلیل کیا۔ ان کے قانون وراثت کو منسوخ کیا بیاہ شادی کے قاعدوں کو بدل دیا۔ مذہبی رسم و رواج کی توہین کی۔ عبادت خانوں کی جاگیریں ضبط کر لیں۔ سرکاری کاغذات میں انھیں کافر لکھا۔ امراء کی ریاستیں ضبط کر لیں۔ لوٹ کھسوٹ سے ملک کو تباہ کیا۔ انھیں تکلیف دیکر مالگذاری وصول کی۔ سب اونچے خاندانوں کو برباد کر کے اُنھیں آوارہ بنا دینے والے بند و بست قائم کئے۔" (رسالہ ہندوستان کی سیاسی ترقی ص۳۰ (روشن مستقبل ص۶۰)

لارڈ میکالے لکھتا ہے (ماخوذ از میکالے کا مضمون ہسٹنگز کے متعلق ص۶۳) دربارہ قوانین کورٹ۔

"بات بات پر حلف لئے جاتے تھے درانحالیکہ قسم کھانا آبرودار ہندوستانی کے نزدیک گناہ ہے۔ اس کے علاوہ مشرق میں کسی شریف آدمی کے زنانہ مکان میں غیر مرد کا گھس جانا یا کسی عورت کو بے پردہ دیکھ لینا ناقابل برداشت ظلم سمجھا جاتا ہے جس کا بدلہ صرف خون سے لیا جا سکتا ہے مگر یہی مصیبتیں تھیں جنکا نشانہ بنگال اور بہار کے شریف گھرانے بنائے جا رہے تھے۔ ہندی رعایا کے بدترین لوگوں کا ایک گروہ ان کے گرد جمع ہو گیا تھا جن میں حلّاف، فتنہ پرداز اور جعلساز سب ہی تھے اور ان کے سوا نظارت کا وہ قزاق عملہ تھا جس کے سامنے انگریزی حوالات کے بدترین شحنے بھی ایماندار اور رحمدل معلوم ہوتے ہیں۔ ہندوستانی شرفا جو بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے گرفتار ہو کر کلکتہ بھیجے گئے اور قید خانہ میں بند کر دئے گئے۔ .... شریفوں کے زنانخانے وہ چیز ہیں کہ مشرقی سلاطین جو کسی چیز کا احترام نہیں کرتے ان کا احترام کرتے ہیں مگر اب یہی زنانخانے تھے جہاں ناظروں اور امینوں کے گروہ گھس گھس جاتے تھے۔ ایسی مثالیں بھی دیکھی گئی ہیں کہ حرم سرا کی حفاظت میں بعض نے لڑ کر

ڈیوڑھیوں پر جانیں دیدیں۔ مرہٹوں کے حملے سے صوبہ میں یہ ہلچل نہیں پیدا ہوئی تھی جو انگریزی قانون کی اس یورش سے ظہور میں آرہی ہے۔ (روشن مستقبل ص۶۶)

روشن مستقبل ص۶۷ " مگر تمام دیگر مشکلات سے زیادہ تکلیف دہ چیز یہ تھی کہ عدالتوں میں ہندوستانیوں اور یورپینوں میں امتیاز کیا جاتا تھا۔ جبتک کمپنی کے لوگ اس ملک میں صرف تجارت کرتے تھے تو بوجہ غیر ملکی ہونے کے زیادہ بُرا نہ تھا کہ وہ اپنے ہم قوموں کی حمایت کرتے۔ مگر ملک کا حاکم بن جانے کے بعد یہ لازم تھا کہ مثل پچھلے حکمرانوں کے انصاف کرنے میں قطعی غیر جانبدار رہتے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا اور نہ صرف اہل ہند اور اہل یورپ میں بلکہ دیسی عیسائیوں اور دوسرے مذہب والے ہندوستانیوں کے درمیان امتیاز کیا۔ چنانچہ ۱۸۲۷ء میں جب جدید جیوری کا قانون نافذ ہوا تو راجہ رام موہن رائے نے اس کے خلاف ہندو مسلمانوں کی طرف سے ایک احتجاجی عرضداشت پُر زور الفاظ میں پارلیمنٹ میں بھیجی اس میں لکھا گیا کہ عدالتوں میں مذہبی امتیاز قائم کردینے سے ہندوستانیوں میں سخت ناراضی ہے۔ اس قانون کی رو سے معزز ترین ہندوستانی کا مقدمہ ایک دیسی عیسائی حاکم کرسکتا ہے۔ برخلاف اس کے دیسی عیسائی کا مقدمہ ایک معزز ہندوستانی کی عدالت میں نہیں جاسکتا۔ نیز یہ کہ ہندوستانیوں کے مقدمات کے فیصل کرنے کیلئے جوری بٹھائی جاتی ہے تو اس میں کوئی ہندوستانی اس جوری کا ممبر نہیں ہوسکتا۔ ان امور سے ہندوستانیوں کی انتہائی ذلت اور خواری ہورہی ہے۔

(سوانح راجہ رام موہن رائے (انگریزی) از نیٹسن ص۴۹)

سر تھامس منرو اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے

وضع قوانین میں ان کا (ہندوستانیوں کا) کوئی حصہ نہیں اور قوانین کے عملدرآمد میں ان کو بہت کم دخل ہے باستثنار چند نہایت چھوٹے عہدوں کے وہ کسی بڑے عہدہ تک خواہ وہ فوجی ہو یا سول نہیں پہونچتے۔ وہ ہر جگہ ایک ادنی قوم کے فرد سمجھے جاتے ہیں۔ تمام فوجی اور دیوانی

وہ عہدے جو کچھ بھی اہمیت رکھ سکتے ہیں اب یورپینوں کے قبضہ میں ہیں جنکا پس انداز روپیہ خود ان کے ملک کو چلا جاتا ہے۔" (دت صفحہ ۲۶ جلد دوم)

(حکومت خود اختیاری صہ۱)

سرسید نے اسباب بغاوت ہند میں لکھا ہے۔

"بے عزتی ایسی بد چیز ہے کہ اس سے دل پر زخم ہو جاتا ہے جو اچھا نہیں ہوتا۔ گورنمنٹ نے ہندوستانیوں کو نہایت بے وقر کر دیا ہے۔ صاحب کا پیشکار صاحب کی بد مزاجی اور سخت کلامی بلکہ دشنام دہی سے دل میں روتا جاتا ہے اور کہتا جاتا ہے کہ اس نوکری سے تو گھاس کھودنی بہتر ہے۔ دراصل انگریز اور ہندوستانی مثل آگ اور سوکھی گھاس کے ہیں یا مثل پتھر کے دو ٹکڑوں کے ہیں سفید اور کالے جن میں فاصلہ دن بدن زیادہ ہوتا جاتا ہے اور یوں تصور کیا جاتا ہے کہ گویا ہندوستان میں کوئی جنٹلمین نہیں ہے۔" (روشن مستقبل صہ)

مسٹر ہولٹ کمنزی ۱۸۳۳ء میں لکھتا ہے۔ (مال اور دیوانی کی یادداشتیں ذکر کرتے ہوئے)

"یہ عمل نہایت حیرت انگیز ہے کہ ہندوستانیوں کے ساتھ ایسے نیک دل انگریزوں کا برتاؤ بھی حقارت آمیز رہا ہے جو فی الواقع نہایت نیک نیت سے تھے الخ" (حکومت خود اختیاری ص۱۵)

مسٹر لڈلو اپنی کتاب برٹش انڈیا میں لکھتا ہے۔

"انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان کے فتح ہونے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بجائے ابھرنے کے اس کے تمام باشندے ذلیل ترین ہو جائیں گے۔" (حکومت خود اختیاری ص۱۹)

خلاصہ کلام یہ کہ مندرجہ بالا شہادتیں اور ان کے علاوہ بے شمار ایسی شہادتیں موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انگریزوں نے ہندوستانیوں کی اس قدر تذلیل و توہین کی کہ جس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ انھوں نے عدالتوں اور کورٹوں میں توہین کی۔ انھوں نے فیصلوں میں توہین کی۔ آئے دن ایسے ایسے واقعات رونما ہوئے کہ فوجی اور سول گوروں سے ہندوستانی ذلیل ہوتے یا مارے جاتے رہے اور یہ کہکر یا فیصلہ کرکے ٹال دیا جاتا تھا کہ مقتول کی تلی بڑھ گئی یا خراب ہو گئی تھی۔ گوروں

کے مقدمات ہندوستانی ججوں کے یہاں فیصل نہ ہو سکتے تھے۔ ریل کے ڈبوں میں ہندوستانی اور یوروپین کا تمیز کیا گیا۔ شاہراہوں اور تفریح کے مقامات میں ان کا تمیز کیا گیا۔ شہروں اور عام گذر گاہوں پر ایسے ایسے کتبے اور سین بورڈ اور مجسمے نصب کئے گئے جنپر توہین آمیز عبارتیں لکھی گئیں۔ اجلاسوں میں نشستوں میں تمیز کیا گیا۔ جس کو گوارا نہ کرتے ہوئے سر سید آگرہ کے اجلاس سے واپس آ گئے تھے۔ عہدوں اور تنخواہوں کا انتہائی تمیز اور توہین کا معاملہ ہمیشہ جاری رہا۔ ۱۸۵۷ء میں وہ وہ مظالم ہندوستانیوں کے ساتھ عمل میں لائے گئے جنکو جانوروں کیساتھ بھی کوئی انسان گوارا نہیں کرتا۔ ہندوستانیوں کی توہین و تذلیل قتل و غارت۔ بربادی اور ہلاکت میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا گیا۔ بیرون ہند ہندوستانیوں کو وحشی، نیم تعلیم یافتہ، جاہل، غیر مہذب قلی وغیرہ مشہور کیا گیا۔ ان کو غیر قابل حکومت، نا سمجھ، نالائق بتلا کر نا قابل آزادی بتلایا گیا۔ ان کو مذہبی دیوانے، کنگال، لڑاکو دکھلایا گیا۔ ایک نا کتخدا امریکی عورت مس میو سے رسوائے عالم کتاب مدر انڈیا لکھوا کر تمام دنیا اور بالخصوص امریکہ میں بیحد شایع کیا گیا۔ ساوتھ افریقہ، امریکہ، کنیڈا، آسٹریلیا کینیا، ماریشس، نیوزیلینڈ۔ اور دیگر ممالک یوروپیہ و افریقہ وغیرہ میں ہندوستانیوں کو حقوق شہریت سے ممنوع کرایا گیا۔ اس قسم کی بیشمار توہین و تذلیل کی ایسی کارروائیاں ہمیشہ عمل میں لائی گئیں جنکو معمولی غیرت اور شرافت والا انسان بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا اور جن سے ہر شریف النفس انسان کے دل زخموں سے چور چور ہو گئے تھے۔

انگریزوں نے ہندوستانیوں کے اعلیٰ کیرکٹر اور بہترین اخلاق وعادات کو مٹا کر ذلیل ترین کیرکٹر اور اخلاق کو شائع کرایا اور پھیلایا

ہندوستان قدیم زمانہ سے روحانی پیشواؤں کا مرکز رہا ہے اور انھیں کا اثر تھا کہ انگریزی عروج تک یہاں کے عام باشندے اعلیٰ ترین کیرکٹر اور اخلاق کے عادی تھے۔ سر تھامس منرو جو کہ شہنشاہ جہانگیر کے زمانہ میں آیا تھا ہندوستانیوں کی تہذیب اور تمدن کو دیکھکر دنگ ہو گیا اسی بنا، پر وہ اپنے مقالہ میں جس کو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں ہندوستانیوں کے اوصاف ذکر کرنے کے بعد کہتا ہے۔ "ہر شخص میں مہمان نوازی اور خیرات کرنے کا مبارک جذبہ موجود ہو اور

سب سے زیادہ یہ کہ صنف نازک پر پورا اعتماد کیا جاتا ہو اس کی عزت، عصمت، عفت کا لحاظ
رکھا جاتا ہو۔ یہ ایسے اوصاف ہیں جن کے ہوتے ہوئے ہم اس قوم کو غیر مہذب اور غیر متمدن
نہیں کہہ سکتے۔ ایسی صفات کی موجودگی میں ہندوستان کو یوروپی اقوام سے کسی طرح کمتر قرار
نہیں دیا جا سکتا۔ اگر انگلستان و ہندوستان کے درمیان تہذیب و تمدن کی تجارت کیجائے۔
تو مجھے یقین کامل ہے کہ ہندوستان سے تمدن کی جو کچھ درآمد انگلستان میں ہوگی اس سے
انگریزوں کو بہت فائدہ پہونچے گا۔ یہ الفاظ صاف طور سے بتلا رہے ہیں کہ ہندوستانیوں میں
اس نے ایسے اخلاق جمیلہ اور اعمال حسنہ کا مشاہدہ کیا تھا جن کے حاصل کرنے کی وہ اہل انگلستان
کو ترغیب دیتا ہے اور ان کے حاصل ہونے سے انگریزوں کے لئے بہت فائدہ دیکھتا ہے
اس زمانہ میں عام طور سے ہندوستانیوں میں مہمان نوازی، انسانی ہمدردی، غربا اور مصیبت
زدوں پر شفقت اور رحم، عہد و پیمان کا تحفظ اور پابندی، خدا ترسی اور سچائی، امانت داری اور
سخاوت، وفاداری اور صداقت، دیانت داری اور عدالت، بلند حوصلگی اور شرافت، بیدار مغزی
جفاکشی، چستی اور بیداری، شجاعت اور مردانگی وغیرہ اصاف جمیلہ بڑے پیمانہ پر پائے جاتے
تھے۔ سچ بولنا تو اس قدر ضروری سمجھا جاتا تھا کہ جرائم پیشہ اشخاص بھی اس کے بہت زیادہ پابند
ہوتے تھے۔ کرنیل سلیمان جس نے ٹھگوں کی سرکوبی میں کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے کہتا ہے

" میرے تجربہ میں صدہا مثالیں ایسی آچکی ہیں کہ ایک آدمی کی دولت، آزادی، اور زندگی
جھوٹ سے بچ سکتی تھی مگر وہ جھوٹ ہی نہ بولا" (دادا بھائی حکومت خود اختیاری ص۴۰)

اور یہی وجہ تھی کہ تجارتی بہی کھاتے نہایت معتبر شمار کئے جاتے تھے اور ان کی شہادتیں عدالتوں
میں نہایت زیادہ قابل اعتبار سمجھی جاتی تھیں۔ سر ارسکن پیری (ایک سب کمیٹی کے سامنے بیان
دیتے ہوئے) کہتا ہے۔

" تجارتی کھاتوں کی وہ حرمت تھی کہ کسی متنازعہ لین دین کے بارہ میں ان کا پیش ہو جانا
عدالت کے نزدیک ناقابل تردید شہادت سمجھا جاتا تھا" (دادا بھائی ۱۹۲۳ حکومت خود اختیاری ص۴۰)

آج بھی ان مقاموں کے بسنے والے ہندوستانیوں میں جو موجودہ تمدن اور نظام سے بہت دور ہیں۔ پرانے اخلاق جمیلہ کی نیز جھلک دکھائی دیتی ہے۔ مصنف حکومت خود اختیاری لکھتا ہے

"جو لوگ پہاڑوں پر جاتے ہیں وہ روزانہ دیکھتے ہیں کہ پہاڑیوں میں جھوٹ بولنے اور چوری کرنے کی قابلیت ابتک پیدا نہیں ہوئی۔ جو مال ان کے سپرد کردیا جاتا ہے اُسے وہ راستہ میں ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ اور اگر صحیح مقام کا پتہ نہیں چلتا تو اُسے پولیس کی سپردگی میں دیدیتے ہیں جنکی دیانت داری خود مشتبہ ہوتی ہے۔ یہ عادات انکی اس وجہ سے قائم ہیں کہ ان کا اصلی وطن پہاڑوں میں موجودہ تمدن سے دور ہے" ص۵۳

مگر افسوس ہے کہ انگریزی راج نے ہندوستانیوں کی ان تمام خوبیوں کو تقریباً مٹا دیا۔ اور ان کے بجائے تمام بد اخلاقیاں اور برائیاں پیدا کردیں۔ لارڈ میکالے کہتا ہے۔

"زمانہ سابق میں جس طرح زوردار اور بااثر لوگوں کو افیون کے پوست پلا کر کاہل، پست ہمت اور بدعقل بنا دیا جاتا تھا۔ ہمارا نظام سلطنت اسی طرح اہل ہند کو بیکار کردیگا۔"

(حکومت خود اختیاری)

ان برائیوں اور کرکٹر کی کمزوریوں کے اسباب متعدد ہیں (اوّل) یہ کہ ابتدا میں جن انگریزوں کی آمدو شد اور جنکے ہاتھ میں اقتدار کی باگ کی مالکیت تھی وہ اصل سے ایسے ہی ذلیل و خوار اخلاق والے تھے۔ اور اکثر ایسے لوگ بھی تھے جو کہ یہاں پر آکے ایسے ہی بدترین اخلاق و اعمال قصداً اختیار کرلیتے تھے۔ کمپنی کے ذمہ دار لوگ ایسوں ہی کو اپنی اغراض کے لئے چنا کرتے تھے۔ چنانچہ مدراس کے بڑے پادری صاحب نے ۱۷۶۶ء میں کمپنی کے ڈائرکٹروں کو مندرجہ ذیل الفاظ لکھے تھے۔

"آپ کے ملازموں کی بداعمالیوں سے ہندوستانیوں کی نظروں میں آپ کے خدا کی جتنی بے عزتی ہوتی ہے اور آپ کا مذہب جتنا بدنام ہو رہا ہے اس کی کیفیت اگر آپ کو معلوم ہو جائے تو آپ کے آنسوؤں کی ندیاں بہ جائیں جو لوگ آتے ہیں

ان میں بعض تو قاتل ہیں، بعض آدمیوں کو بھگا لیجانے کا کام کرتے ہیں اور بعض انگلستان میں
بیویاں چھوڑ کر آتے ہیں اور یہاں پھر شادیاں کر لیتے ہیں۔"

(برٹش انڈیا کے قدیم کاغذات از ڈہیلرمنٹ) (روشن مستقبل ص۳۴)

۱۶۰۰ء میں جبکہ کمپنی نے ہندوستان میں تجارت کرنے کی اجازت حاصل کرنے کے لئے گورنمنٹ انگلستان کو درخواست دے رکھی تھی اور منظوری کا مسئلہ زیر غور تھا تب گورنمنٹ کی طرف سے کمپنی والوں کو لکھا گیا تھا کہ تم اپنی مہم میں سر ایڈورڈ مائیکل بوردن کو نوکر رکھ لو تو اس کے جواب میں کمپنی کا عجیب وغریب حسب ذیل رزولیوشن بھیجا گیا۔

"کسی ذمہ داری کے کام پر جنٹلمین کو نہ رکھا جائے اور گورنمنٹ سے درخواست کیجائے کہ ہمیں اپنے کاروبار کے لئے اپنے ہی قسم کے لوگوں کا انتخاب کرنے کی اجازت دیجائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شرفا کو نوکر رکھنے سے (کمپنی کے) عوام الناس (حصہ دار) شبہ میں پڑ کر روپیہ واپس لینے لگیں۔" (تاریخ برٹش انڈیا مصنفہ جیمس مل ص۲۳ روشن مستقبل ص۳۵)

مذکورہ بالا دونوں شہادتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انگلستان کے چھٹے ہوئے بدمعاش بدکار غنڈے اور لوفر جرائم پیشہ لوگ ہندوستان بھیجے جاتے تھے ایسے لوگوں کے اقتدار اور ان کی کثرت سے جو کچھ نتائج قبیحہ پیدا ہوں گے وہ ظاہر و باہر ہیں۔ علاوہ ازیں جو انگریز انگلستان میں جرائم پیشہ نہیں بھی تھے ان لوگوں کی صحبت اور مالدار بننے کی شدت حرص اور طمع اور سزا سے بے خوفی کی بناء پر یہاں بدترین جرائم پیشہ بنجاتے تھے۔ وارن ہسٹنگس (جو کہ ہندوستان کا مشہور گورنر اور ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی بنیاد رکھنے والوں میں سے نمبر اول شمار کیا جاتا ہے) کہتا ہے۔

"انگریز ہندوستان میں آکر بالکل نیا انسان بن جاتا ہے جن جرائم کی وہ اپنے ملک میں کبھی جرات کر ہی نہیں سکتا ہندوستان میں ان کے ارتکاب کے واسطے

انگریز کا نام جواز کا حکم رکھتا ہے اور اس کو سزا کا خیال تک نہیں ہو سکتا"۔

(علم المعیشہ برنی صـ۵۸۹)

یہ ہسٹنگس صاحب وہی ہیں جنھوں نے انتہائی وحشیت اور بربریت سے روہیلہ قوم اور ان کی حکومت کو محض تھوڑی سی لالچ میں نواب اودھ سے ساز باز کر کے برباد کر ڈالا۔ جن کی ملعون بداعمالیوں کا پول اس مقدمہ کی مسل سے کھلتا ہے جو انپر انگلستان میں قائم کیا گیا تھا مگر ایسے وحشی درندے بھی اس زمانہ کے انگریزوں کی بداعمالیوں کے شاکی ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ کیسے کیسے لوگ یہاں آئے اور انھوں نے کیسی کیسی زہریلی گیس ہندوستان میں پھیلائی۔ ٹامس سڈینہم کہتا ہے۔

"میں ہمیشہ سے دیکھتا ہوں کہ بمقابلہ اور قوموں کے انگریز ممالک غیر میں سب سے زیادہ چیرہ دستی کرتے ہیں اور ہندوستان میں بھی یہی واقعہ پیش آرہا ہے"۔

(علم المعیشہ برنی صـ۵۸۹)

ہسپانیوں وغیرہ کے شرمناک مظالم امریکہ وغیرہ میں تو مشہور ہیں ہی مگر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں نے جو مظالم اور ملعون بداعمالیاں ہندوستان میں کی ہیں وہ ڈچوں، پرتگیزوں، ہسپانیوں وغیرہ کے مظالم سے بدرجہا زاید اور ننگ انسانیت تھے اور ان کا کیرکٹر سب سے زیادہ گرا ہوا تھا۔ ایسے کیرکٹر والوں کی وجہ سے جو کچھ بربادی اخلاق اور اعمال کی اور جسقدر ان کی وجہ سے ملک کی ابتری پیدا ہو وہ ظاہر باہر ہے۔

ان بداعمال اور بداخلاق نجس کیرکٹر والے انگریزوں نے حسب طبع اپنے گرد اگر ایسے ہی جرائم پیشہ بداطوار لوگوں کو جمع کرلیا اور ان کے ذریعہ سے لوٹ مار غارتگری اور انسانیت سوز مظالم کا بازار گرم کر دیا۔

کند ہم جنس باہم جنس پرواز ❊ کبوتر با کبوتر باز با باز

مسٹر سی ہل کہتا ہے۔

جس زمانہ میں کمپنی کی ملازمت محض تجارتی تھی اور کمپنی کے ملازمان ملک کے حالات سے ناواقف تھے تو وہ اکثر چھوٹے ملازموں سے جو بنئے کہلاتے تھے کام لیا کرتے تھے" (روشن مستقبل ص۵۱)

مسٹر برک ان بنیوں کے متعلق مندرجہ ذیل کلمات لکھتا ہے۔

"بنیا یا دیوان انگریز کے گھر کا منتظم ہوتا ہے۔ وہ ان تمام چال بازیوں فریب اور عیاریوں سے واقف ہوتا ہے۔ جو مظالم کی سزا سے بچنے کے لئے ایک غلام استعمال کرتا ہے۔ بنیا لوٹتا ہے۔ استحصال بالجبر کرتا ہے۔ غارت گری کرتا ہے اور پھر اس میں سے جسقدر مناسب سمجھتا ہے اپنے صاحب کو بھی دیدیتا ہے۔ ان بنیوں نے بڑے بڑے گھر اولٹ دیئے ہیں۔ ملک کو برباد کر دیا ہے اور سرکاری مالگذاری کو سخت نقصان پہونچایا ہے"

خود حکام وقت (انگریز) ان کے ذریعہ سے ذاتی نفع حاصل کرتے تھے چنانچہ بہت سے علاقے بنیوں کے نام ٹھیکے پر دیئے جاتے تھے لیکن اصلی ٹھیکہ دار کوئی بااختیار انگریز ہوتا تھا جو خود پردہ میں رہتا تھا۔ چنانچہ انھیں انگریز ٹھیکہ داروں کی بدولت پرانے پرانے شریف اور خاندانی ہندو اور مسلمان اپنی اپنی زمینداریوں سے جبراً اور ملک کے دستور کے خلاف بے دخل اور محروم کر دیئے گئے۔

اس وقت کے قانون کی رو سے ایک شخص کو ایک لاکھ سے زیادہ مال گذاری کا ٹھیکہ دینا جائز نہ تھا مگر بڑے بڑے صاحب لوگوں کے بنئے قانون سے آزاد تھے۔ خود وارن ہسٹنگز گورنر جنرل کا بنیا کنتو بابو تیرہ لاکھ کا ٹھیکیدار تھا۔ (برک مقدمہ ہسٹنگز جلد اول ص۱۳۹)

ایک دوسرا بنیا گنگا گوبند بھی وارن ہسٹنگز کا آلہ کار تھا اور اس کی نسبت دارالعوام میں جولائی ۱۷۸۱ء میں ایک حساب دکھایا گیا تھا جس کی رو سے گنگا گوبند سنگھ کی

کمائی تین کروڑ بیس لاکھ روپے کے قریب پہونچتی تھی (برک مقدمہ ہسٹنگز جلد اول صـ۲۱۳)

اسی طرح گورنر کے دیوان راجمندر کی نسبت بیان کیا گیا تھا کہ وہ ساٹھ روپے ماہوار کا ملازم تھا مگر اس نے ساڑھے بارہ کروڑ کے قریب ترکہ چھوڑا۔ کمپنی کے ایجنٹ روپ کشن کے پاس اتنی دولت تھی کہ اس نے ماں کے مرنے پر نوے لاکھ روپیہ صرف کیا۔

یہی وہ بنئے تھے جنکو خاک سے اٹھا کر انگریزوں نے آسمان پر پہونچا دیا پہلے ٹھیکوں کے ذریعہ بڑی جائدادوں پر قابض ہوئے اور پھر دوامی بندوبست کے بعد مالک بن گئے۔ آگے چلکر سود غیر محدود کر دیا گیا۔ اور قرضوں میں اراضیاں اور جائدادیں نیلام ہونے کا قانون نافذ کیا گیا۔ ان قوانین سے قدیم شریفوں اور سیٹھوں کے گھرانے برباد ہو گئے اور بڑے بڑے علاقے ان نئے سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں پہونچ گئے

پرانے زمینداروں پر ان بنیوں نے جو جو ظلم کئے اور جن جن فریبوں کے ساتھ انھیں لوٹا اس کا اندازہ صرف دیبی سنگھ کی مثال سے ہو سکتا ہے۔ دیبی سنگھ بھی کلکتہ کی حکومت کے محبوب بنیوں میں سے تھا۔ چنانچہ بنگال کے بڑے بڑے علاقے اسی کو ٹھیکہ پر دیئے گئے تھے۔ دیبی سنگھ آبرودار لوگوں کو ہتھکڑیاں پہنا کر حوالات میں رکھتا اور اضافہ کا اقرار کراتا تھا۔ اس نے مالگذاری کے علاوہ نئے نئے محصول اور ابواب ایجاد کرلئے تھے۔ اور جب زمیندار پر بقایا ٹوٹتی تو اس کی زمینداری سستے داموں نیلام کرا کر خود مول لے لیتا اور یہ قیمت بھی اسی روپیہ سے ادا کرتا جو انھیں زمینداروں سے پیشگی وصول کر چکا ہوتا۔ اس بنئے نے اکثر معافیاں چار چار آنہ بیگہ کے حساب سے مول لیلی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علاقے کے علاقے ویران ہو گئے۔ اور بقول مسٹر برک زمیندار گھربار اور نوکر چاکر سب چھوڑ کر نکلے اور بھاگنے سے پہلے اپنی آنکھوں دیکھ لیا کہ وہ اوقاف نیلام ہو رہے ہیں جو انھوں نے یا ان کے بزرگوں نے خدا کی راہ میں اسلئے دے رکھے تھے کہ ان کی آمدنی سے بیواؤں، یتیموں، لنگڑے، لولوں اور اپاہجوں کی

امداد کیجائے۔ وہ جائدادیں بھی جو انھوں نے کفن دفن اور مرنے کی رسموں کے لئے علاحدہ کر رکھی تھیں فروخت کردی گئیں۔ افسوس کہ جان کنی کے وقت سکون اور اطمینان سے گذر جانے کا سہارا بھی اس ظالم ہاتھ نے قطع کر دیا۔ اُف کیسا ظالم ہاتھ تھا جس کا ظلم چتا کی آگ سے زیادہ جلانے والا، قبر سے زیادہ حریص اور موت سے زیادہ بے رحم تھا"

(روشن مستقبل ۵۲، ۵۳، ۵۴ از برک کی تقریر جلد اول ۲۱۹-۲۲۰)

سر ولیم وڈر برن لکھتا ہے "

"بالعموم ہمارے اعلیٰ عہدہ داروں کو اپنے خلاف مزاج سچی باتیں ناگوار معلوم ہوتی ہیں اور اس وجہ سے وہ لوگوں کے معتمد علیہ اشخاص کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتے اور اپنی مراعات و کرم ان لوگوں کے لئے مخصوص رکھتے ہیں جو ذلیل ترین، خوشامدی اور ہندوستانیوں کے مفاد کے لئے سخت خطرناک جماعت ہے۔

(حکومت خود اختیاری ۵ از تقاریر و تحاریر وڈر برن ۱۹۰۲)

پھر یہی نہیں ہوا کہ ایسے جرائم پیشہ بداخلاق اور بداعمال لوگ ایک مرتبہ آکر ملک میں بس گئے بلکہ ایسے لوگوں کی آمد کا دوامی طور پر تانتا باندھ دیا گیا۔ ہر سال ایک جماعت اپنی حرص و آز پوری کرکے اور چند سال یہاں لوٹ مار غارتگری وحشیانہ درندگی عمل میں لاکر لوٹتی تھی اور دوسری جماعت ویسی ہی آدھمکتی تھی۔ اس قسم کے لوگوں کی شکایت میں کرناٹک کے بدقسمت نواب نے ڈائرکٹران کمپنی کو حسب ذیل مضمون کا خط لکھا تھا۔

"آپ کے نوکروں کا اس ملک میں کوئی کاروبار تو ہے نہیں۔ نہ آپ انھیں معقول تنخواہیں دیتے ہیں پھر بھی چند ہی سال میں وہ کئی کئی لاکھ اشرفیاں کما کر واپس جاتے ہیں۔ اتنی قلیل مدت میں بغیر کسی ظاہری ذرایع کے یہ بے حساب کمائی کہاں سے آتی ہے ہم اور آپ دونوں سمجھتے ہیں"

(روشن مستقبل ۳۸ از تصانیف برک جلد ۳ ۱۹۵)

دوسری جگہ برک کہتا ہے۔

"تاتاریوں کی یورش سے بیشک ہندوستانیوں کو نقصان پہنچتا تھا مگر ہماری حفاظت ہندوستان کو تباہ کئے ڈالتی ہے۔ نوعمر لونڈے ملک پر حکومت کرتے ہیں۔ جہاں کے باشندوں سے نہ ان کا میل جول ہے اور نہ ان سے ہمدردی ہے دولت کی ہوس اور تیز مزاجی جتنی کہ کسی جوان میں ہو سکتی ہے وہ ان لوگوں میں بھری ہوتی ہے۔ اور ملک میں ان کی آمد کا تانتا لگا ہوا ہے۔ ایک کھیپ لوٹتی ہے تو دوسری پہونچ جاتی ہے۔ ہندوستانی رعایا کے سامنے مستقبل کی صرف ایک مایوس کن صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک غیر محدود زمانہ تک ان موسمی شکاری پرندوں کے نئے غول اسی طرح آتے جاتے رہیں گے جن کی بھوک ہر مرتبہ اور تیز ہوتی رہے گی۔ دراں حالیکہ جس چیز کے وہ بھوکے ہیں وہ کمیاب ہوتی جائیگی۔"

(روشن مستقبل ص ۹۶ از تصانیف برک جلد ۳ ص ۴۰۹)

خلاصہ یہ کہ ایسے بدکردار انگریزوں کے اقتدار، ان کے گوشہ گوشہ ملک میں پھیل جانے، اور آزادانہ طور پر ایسی بداعمالیاں کرنے سے ملک کی ثروت اور دولت تو برباد ہوئی ہی تھی۔ ان لوگوں کے اخلاق اور اعمال بھی بہت زیادہ بگڑ گئے جو انگریزوں کے حاشیہ نشین اور کارکن تھے۔ وہ انگریزوں کی حمایت حاصل کر کے ہر قسم کے خطروں سے اپنے آپ کو محفوظ پاتے تھے اور من مانی کارروائیاں کرتے تھے۔ نیز عام ہندوستانیوں پر یہ اثر پڑا کہ جو عادتیں اور اخلاق پہلے سے بری سمجھی جاتی تھیں ان کی برائی ان کے دلوں سے جاتی رہی۔ کیوں نہو۔ الناس علی دین ملوکھم۔ اس لئے عام طور پر جعل سازی، بداخلاقی، بدعہدی، ظلم و ستم پھیل گئے۔ فالی اللہ المشتکی۔

(دوم) یہ کہ انگریزوں کی بے آئینی اور یا آئینی (جنکے وہ ہی خود وضع کرنے والے تھے) لوٹ اور غارت گری، دولت اور ذرائع۔ دولت کی بربادگی کی بنا پر لاکھوں اور کروڑوں افراد اور

خاندان فاقہ مست اور کنگال ہو گئے۔ اس لئے جان بچانے اور دنیادی زندگی سنبھالنے کے لئے لوگ ہر قسم کے جرائم اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اور اُن اخلاق اور عادات میں مبتلا ہو گئے جو کہ شرافت انسانی کے لئے ننگ و عار ہیں اور جن کو وہ مذہبی یا اخلاقی حیثیت سے بُرا سمجھتے تھے ملعون غلامی اور ہلاک کر دینے والے فقر و فاقہ نے ان کو ایسی عادتوں کے اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ سر جان شور جس کا تعلق بنگال سول سروس سے تھا قانون اور نظام انگریزی پر بحث کرتے ہوئے ۱۸۳۳ء میں کہتا ہے۔

"لیکن ہندوستان کا عہد زرین گذر چکا ہے۔ جو دولت کبھی اس کے پاس تھی اسکا جزو اعظم (بڑا حصہ) ملک کے باہر کھینچکر بھیجدیا گیا ہے۔ اور اس کے قدرتی عمل اس بدعملی کے ناپاک نظام نے معطل کر دیئے ہیں۔ جس نے لاکھوں نفوس کی منفعت کو چند افراد کے فائدے کی خاطر قربان کر دیا ہے۔

برطانیہ نے جو طرز حکومت قائم کیا ہے اس کے تحت میں ملک اور باشندگان ملک رفتہ رفتہ محتاج ہوتے جاتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ ان پرانے تاجروں پر جلد تباہی آگئی۔ انگریزی حکومت کی پیس ڈالنے والی زیادہ ستانی نے ملک اور اہل ملک کو اتنا مفلس کر دیا ہے کہ اس کی نظیر ملنا مشکل ہے"۔ (حکومت خود اختیاری ص۲۶-۲۷)

مسٹر سیول میرٹ ممبر کونسل ۱۸۲۳ء میں لکھتا ہے۔

برطانیہ کا دورِ حکومت مہربان و مقبول بتایا جاتا ہے۔ مگر اس عہد میں ملک جس حالت کو پہونچ گیا ہے۔ اگر اس کا مقابلہ دیسی حکمرانوں کے عہد سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت لوگ خوش حال تھے۔ . . . . . یہ ملک فلاکت کی انتہائی پستی تک پہونچ گیا ہے"۔ (حکومت خود اختیاری ص۲۸)

افلاس اور غربت کے انتہائی درجہ پر پہونچ جانے کے بعد طبعی طور پر انسان ایسے اخلاق اور اعمال کا مرتکب ہو جاتا ہے جو کہ نہ صرف شرافت اور اعلیٰ معیار کے مخالف ہوں بلکہ وہ عموماً

انسانیت سے گذر کر درندگی اور وحشت اور بربریت کے بدترین مظاہروں پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے۔ وہ چوری کرنے، اوچھے پن کو عمل میں لانے، ڈاکے ڈالنے، لوگوں کو قتل کرنے ٹھگی اور دھوکا بازی کو اختیار کرنے۔ بے حیائی اور فواحش کے کرنے اور کرانے اور اس قسم کے دیگر نجس اور مکروہ اعمال کا بیشتر ارتکاب کرنے لگتا ہے۔ انگریزوں نے عموماً ہندوستانیوں کے ساتھ کسی ہمدردی کا کبھی خیال نہیں کیا۔ پردیسی اور غیر قوم تھے روپیہ کمانے اور ہندوستان کو لوٹ کر اپنا خزانہ بھرنیکا نصب العین دن و رات ان کے سامنے رہتا تھا اُن کو کوئی التفات ہندوستانیوں کی بہبودی کی طرف نہ تھا۔ ان کی بلا سے ہندوستانی جئیں یا مریں ان کا کیرکٹر بنے یا بگڑے ان کو تو اپنا اُلّو سیدھا کرنا تھا۔

سر جان سلیمان (اپنی شہادت میں) کہتا ہے۔

"ملک کے تمام ذمہ داری کے عہدوں سے ہندوستانیوں کے خارج ہونے کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ اعلیٰ انتظامی قابلیت کے نشو و نما کرنے کے مواقع جاتے رہے اور جو کچھ بھی ان کی قابلیت تھی وہ رفتہ رفتہ زائل ہو گئی اسی کے ساتھ ان کے مالی تنزل نے اُن کے کیرکٹر کو اُس درجہ تک گرا دیا جس پر مظلوم اور محکوم قومیں پہونچ جاتی ہیں۔"

(حکومت خود اختیاری ص ۱۵)

لارڈ منٹو وائسرائے ہند نے ۱۸۱۱ء میں ایک طویل یادداشت لکھکر کورٹ آف ڈائرکٹران کو بھیجی جس میں یہ دکھایا کہ علم کا زور بروز زوال ہو رہا ہے۔ ہندو مسلمانوں کو مذہبی تعلیم نہ ہونے سے دروغ حلفی اور جعل سازی کے جرائم بڑھ رہے ہیں اور سفارش کی کہ متعدد کالج قائم کئے جائیں اور تعلیم پر زیادہ روپیہ خرچ کیا جائے۔" (روشن مستقبل ص ۲۲)

(سوم) یہ کہ حکومت کے تمام ذمہ دار عہدوں سے ہندوستانیوں کو یکقلم خارج کر کے تمام بڑے عہدوں پر انگریزوں نے انگریزوں ہی کو مقرر کیا بلکہ حسب تصریح سر جان شور ادنی سے ادنے جس عہدے کو انگریز قبول کر سکتا تھا اس پر انگریزی کو مقرر کیا ہاں جو عہدے بہت

چھوٹے تھے ان کے مسلمان ملازمین کو نکالکر ہندوؤں کو مقرر کیا کیونکہ وہ انگریزوں کی پوری چاپلوسی کرتے تھے اور انگریزوں کی خواہشات کو پوری کرنے میں کسی بداخلاقی اور بدعملی سے دریغ نہیں کرتے تھے خواہ وہ کیسی ہی اور کتنی ہی ہندوستانی قوم کے لئے مضر کیوں نہ ہو۔ جن کے کچھ واقعات ہم نے پہلے اُن بنیوں کے جو کہ صاحب لوگوں کے مقرب ہوتے ہیں وجہ اول میں بطور نمونہ ذکر کر دیئے ہیں۔ حالانکہ شہنشاہ دہلی سے جو فرامین انگریزوں نے حاصل کئے تھے اور جن کے ذریعہ سے دیوانی کے اختیارات ان کو ملے تھے ان میں شرط تھی کہ وہ ان شاہی نظلات کی جوکہ پہلے سے چلے آتے تھے پوری طرح حفاظت کریں گے۔ مگر انگریزوں نے ان نظامات کی بہت تھوڑے دنوں تک مراعات کی اور پھر رفتہ رفتہ ان کو توڑنا شروع کر دیا کیونکہ ان کے باقی رکھنے میں انگریزوں کی وہ لالچ اور طمع پوری نہیں ہوتی تھی جس کو وہ اپنا نصب العین بنائے ہوئے تھے۔ اور جس کے لئے وہ تمام ہندوستان کو لوٹ کھسوٹ کر انگلستان کے خزانوں کو پُر کر سکتے اور اپنے افراد کی ملعون خواہشات کو پوری کر سکتی تھی"

ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر اپنی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" میں ص ۲۲۵ پر لکھتا ہے۔

"بنگال کو انگریزوں نے حاصل کیا تو شہنشاہ دہلی کے دیوان ہونے کی حیثیت سے پھر یہ عہدہ کسی بہت بڑی رشوت سے نہیں بلکہ تلوار کے زور سے۔ قانوناً ہم صرف شہنشاہ دہلی کے دیوان تھے یعنی چیف ریونیوافیسر (مسٹر ایچی سن کی دستاویزات میں ۱۲۔ اگست ۱۷۶۵ء کا فرمان یا ایسٹ انڈیا کمپنی کی سہ ماہی رپورٹ ۱۸۱۲ء رپورٹ ۱۴ سے لیکر ۲۰ تک)

اسی بنا پر مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ ہمکو اسی اسلامی طریقہ پر کاربند رہنا چاہئے جس کے انتظام کا ہم نے اس وقت ذمہ لیا تھا۔ جہاں تک میرا خیال ہے اس میں طرفین کا باہمی سمجھوتہ فی الواقع یہی تھا"

پھر صفحہ ۲۲۸ پر اسی کتاب میں لکھتا ہے۔

"سو سب سے بڑی ناانصافی وہ ہے جس کا مسلمان امرار انگریزی حکومت کو مجرم ٹھہراتے ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم نے مسلمان شہنشاہ سے بنگال کی دیوانی اس شرط پر لی تھی کہ ہم اسلامی نظام کو برقرار رکھیں گے۔ لیکن جوں ہی ہم نے اپنے آپ کو طاقتور پایا اس وعدے کو فراموش کر دیا۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ جب ہم نے بنگال میں مسلمانوں کے نظام دیوانی کا مطالعہ کیا تو اس قدر ایک طرفہ، اسقدر ناکارہ اور اصول انسانیت کے خلاف پایا کہ اگر ہم اس کو برقرار رکھتے تو تہذیب کے لئے باعث ننگ ہوتے۔"

بہر حال انگریز بحیثیت ملازمت شہنشاہی فرمانوں اور معاہدوں اور شروط کے ذریعہ مالیات کے ناظم بنائے گئے تھے جن میں اسلامی نظام کو برقرار رکھنا مشروط تھا۔ مگر انھوں نے رفتہ رفتہ سب کو توڑ ڈالا۔ اور تمام عہدوں سے ہندوستانیوں کو نکال کر انگریزوں اور خوشامدی ہندوؤں سے بھر دیا۔ اور نیا نظام ایسا بنایا جس کا خرچ بہت زیادہ تھا۔ اور انگریزوں کے لئے ہندوستانیوں کے خون چوسنے کا بہت زیادہ سامان ہاتھ آتا تھا۔ مگر انگریزی عیاری یہ تھی کہ خلاف واقعیت پورے نظام کو یکطرفہ، اصول انسانیت کے خلاف 'ناکارہ تہذیب' کے لئے باعث ننگ قرار دیا جا رہا ہے (جیسا کہ ڈاکٹر ہنٹر اور بہت سے دوسرے انگریز پروپیگنڈا کرتے رہے ہیں) حالانکہ یہ بات انگریزی نظام میں پائی جاتی ہے۔ پورانے نظام کو ایسا کہنا برعکس نہند نام زنگی کا فور کا مصداق ہے۔ پورانا نظام جبتک رہا ہندوستان باتفاق پھیلتا اور پھولتا اور ترقی پذیر رہا۔ اور جب سے یہ نیا نظام انگریزی قائم ہوا ہندوستان روز بروز بربادی کے بھینٹ چڑھتا رہا اور بالآخر ہلاکت کے انتہائی مرحلہ پر پہونچگیا۔ جیسا کہ سر جان شور، سیول میرٹ، ڈبلوجی پیڈر، وڈربرن وغیرہ کے اقوال بتلا رہے ہیں۔

مسٹر فلپ فرانسس جو کہ بنگال کونسل کا ممبر تھا لکھتا ہے۔

"ایک انگریز کو یہ معلوم ہو کر تکلیف ہونی چاہئے کہ جب سے کمپنی کو دیوانی ملی ہے اہل

ملک کی حالت پہلے سے بدتر ہوگئی ہے اور یہ کمپنی کی تجارت وغیرہ کا نتیجہ ہے۔ میرے خیال میں یہی اسباب ہیں جنکی وجہ سے یہ ملک ایک شخصی اور مطلق العنان حکومت کے زیر سایہ تو سرسبز ہوتا رہا مگر جب انگریزوں کے تصرف میں آیا تو تباہی کے کنارے پہونچ گیا۔"

(حکومت خود اختیاری ط۹ ازان ہیپلی انڈیا ط۳۳)

ڈبلو ڈبلو ہنٹر لکھتا ہے (ہمارے ہندوستانی مسلمان) صفحہ ۲۲۶

"انگریزوں نے چند ایک سال تو مسلمان عہدہ داروں کو بحال رکھا لیکن جب اصلاح کا وقت آیا تو اس قدر احتیاط سے قدم اٹھائے کہ اس پر بزدلی کا گمان ہونے لگتا ہے۔ بایں ہمہ سب سے کاری ضرب جو ہم نے پرانے طریق پر لگائی وہ اسقدر پر فریب تھی کہ اس کا اندازہ پیش از وقت نہ مسلمانوں کو ہوسکا نہ انگریزوں کو میرا مطلب ان تبدیلیوں سے ہے جو لارڈ کارنوالس نے رائج کیں اور جن سے ۱۷۹۳ء کا دوامی بندوبست مرتب ہوا۔ اس بندوبست سے ان مسلمان افسروں کا کاروبار زبردستی ہمارے ہاتھ میں آگیا جو حکومت اور ٹیکس جمع کرنے والوں کے درمیان واسطہ کا کام دیتے تھے اور جن کے سپاہیوں کو مالگذاری جمع کرنے کا جائز حق پہونچتا تھا۔"

بہرحال انگریزوں نے عروج اور قوت پاتے ہی تمام ہندوستانیوں کو ذمہ دار عہدوں سے خارج کردیا جیساکہ صاحب حکومت خود اختیاری لکھتا ہے "ہندوستان میں انگریزی عملداری کی ایک خصوصیت یہ رہی ہے کہ ہندوستانی ابتداء سے بڑے عہدوں سے قطعاً خارج کردیئے گئے قوانین بنانے میں اور ملک کے درمیان انصاف کرنے میں ان کا کوئی اختیار باقی نہیں ہے۔ عملداری کی اس خصوصیت کے مضر اثرات کا اندازہ منجملہ دیگر انگریزوں کے سرطامس منرو کو بخوبی ہوا جس کا اظہار انھوں نے اپنی رپورٹ میں حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے۔

ہے اور قوانین کے عملدرآمد میں ان کو بہت

کم دخل ہے۔ بہ استثنا، چند نہایت چھوٹے عہدوں کے کسی بڑے عہدہ تک خواہ وہ فوجی ہو یا سول .... نہیں پہونچتے وہ ہر جگہ ایک ادنیٰ قوم کے فرد سمجھے جاتے ہیں۔..... تمام فوجی اور دیوانی عہدے جو کچھ بھی اہمیت رکھ سکتے ہیں اب یوروپینوں کے قبضہ میں ہیں جن کا پس انداز روپیہ خود ان کے ملک کو چلا جاتا ہے"

اس طرح ذمہ دار عہدوں سے نکل جانے کی بنار پر ہندوستانیوں کے کیرکٹر اور اخلاق پر نہایت مضر اور ہلاکت آفریں اثر پڑا اور وہ بدترین اخلاق میں مبتلا ہو گئے۔ چنانچہ سر تھامس منرو ۱۸۲۳ء میں لکھتا ہے۔

"اگر برطانیہ کسی بیرونی سلطنت کا مفتوحہ ملک ہو جاتا اور اس کے باشندے اپنے ملک کے انتظامات سے خارج کردئے جاتے تو ان کے تمام علوم اور تمام علم ادب خواہ وہ مذہبی ہوں یا دنیوی انھیں ایک یا دو نسلوں کے بعد کمینہ، چالاک، دغاباز اور بے ایمان قوم ہو جانے سے نہ بچا سکتا تھا" (حکومت خود اختیاری ص۱۹)

لارڈ میکالے کہتا ہے۔

"زمانہ سابق میں جس طرح زور دار اور با اثر لوگوں کو افیون کے پوست پلا کر کاہل، پست ہمت اور بدعقل بنا دیا جاتا تھا۔ ہمارا نظام سلطنت اسی طرح اہل ہند کو بیکار کردے گا" (حکومت خود اختیاری ص ج)

مسٹر لڈلو اپنی کتاب برٹش انڈیا میں لکھتا ہے۔

"انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان کے فتح ہونے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بجائے ابھرنے کے اس کے تمام باشندے ذلیل ترین ہو جائیں گے" (حکومت خود اختیاری ص۱۹)

چنانچہ یہی نتیجہ ہوا کہ انگریزی حکومت کی صد سالہ حکومت نے ہندوستانیوں کو اخلاقی اور کیرکٹری حیثیت سے انتہائی پستی میں ڈالدیا۔ سر تھامس منرو کہتا ہے۔

"انگریزی صوبجات کے رہنے والے فی الواقع ہندوستان میں حد سے زیادہ

ذلیل اور کمینے ہیں۔" (حکومت خود اختیاری ص۱۹)

الحاصل سیکڑوں زمیندار، ہزاروں سپاہی اور بے شمار ملازم بے روزگار ہوگئے اور انھوں نے لوٹ مار کا پیشہ اختیار کرلیا۔ چنانچہ ناگپور سے لیکر خلیج بنگال تک تیئیس ہزار پنڈاری لوٹ مار کرتے پھرتے تھے جنھوں نے ۱۸۱۹ء کے موسم سرما میں صرف دس دن کے اندر (۱۸۲) آدمی قتل کئے (۵۰۰) زخمی کئے۔ تین ہزار کو طرح طرح کی ایذائیں دیں اور تقریباً ایک کروڑ کا مال لیگئے (روشن مستقبل ص۵۹-۶۰ از "اغیار کے گھر کے" از فیسٹنگ ص۲۵)

(چہارم) ہائی کورٹ، سپریم کورٹ، اور تمام ادنیٰ کورٹوں کے وہ قوانین اور کارنامے ہیں جنکا تعلق مالیات سے یا فوجداری یا انتظامی امور وغیرہ سے ہے۔ یہ سب قوانین عدل و انصاف اور ان کی عملی کارروائیاں زمانہ سابق میں نہایت سادہ اور بے خرچ تھے۔ ان میں فریقین کو نہ دور و دراز کے اسفار کی زحمتیں پیش آتی تھیں نہ مہینوں اور سالوں کے انتظار اور دوڑ دھوپ کی تکالیف ہوتی تھیں۔ نہ سرمایہ اور دولت کی بربادی کی مصیبتیں سامنے آتی تھیں۔ ان قوانین کی روسے عموماً حقیقی اہل حق اپنے حق کو پہونچ جاتے تھے۔ عیاری، مکاری، فریب و دھوکہ بازی رشوت اور جعلسازی وغیرہ پاس بھی نہیں پھٹکتی تھی۔ ان کے اجراء کے دو طریقے تھے ایک رعایا کی طرف سے دوسرا بادشاہوں کی طرف سے۔ ہر دو طریق میں رعایا پر ایک پیسہ کا بھی بار نہیں پڑتا تھا۔ اول الذکر کا یہ حال تھا کہ رعایا کی طرف سے گاؤں گاؤں میں پنچائتیں قائم تھیں جو کہ بمنزلہ حکومت خود اختیاری کے تھیں۔ گاؤں کے پنچ مدعی اور مدعا علیہ کے چال چلن، ان کی عادتوں اور اخلاق، مقامی رسوم اور حالات سے بخوبی واقف ہوتے تھے۔ گواہوں اور قسم کھانے والوں کو بخوبی پہچانتے تھے۔ فریقین کی زبانوں کو جانتے تھے اس لئے عموماً فیصلے صحیح اور حقانی یا قریب قریب صحیح کے ہوتے تھے۔ ہر گاؤں کے جھگڑوں کا فیصلہ وہیں یا وہیں کے قریبی مقام میں ہوجاتا تھا یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی بدچلن یا بدمعاش گاؤں میں رہ سکے کیونکہ گاؤں کی پنچایت کو اختیار تھا کہ وہ بدمعاش بدچلن اور چور کو سزا دے سکے۔

سر طامس منرو اسی پنچائتی نظام کے متعلق مندرجہ ذیل الفاظ لکھتا ہے۔

ہر موضع مع اپنے بارہ پورووں کے مثل ایک چھوٹی سی ریاست کے ہے جس میں اس کے مقدم پٹیل یا راڈی بطور اس کے سردار کے ہیں۔ اور ہندوستان اسی قسم کی ریاستوں کا ایک بڑا مجموعہ ہے۔ جنگ کے زمانہ میں باشندوں کی نظر اپنے گاؤں کے سردار کی طرف ہوتی ہے جبتک کہ ان کا موضع محفوظ اور سالم ہے گانوں کے باشندے سلطنتوں کے ٹوٹنے اور تقسیم ہونے کے بارہ میں اپنے آپ کو تکلیف نہیں دیتے وہ اس امر کی پرواہ نہیں کرتے کہ ملک کس کے ہاتھ میں منتقل ہوتا ہے۔ ہر صورت میں اندرونی نظام غیر مبدل رہتا ہے۔ ان تمام حالات میں گانوں کا سردار بدستور اپنے گانوں کا کلکٹر مجسٹریٹ اور کاشتکاروں کا سردار رہتا ہے۔" (حکومت خود اختیاری)

ثانی الذکر یعنی بادشاہوں کی طرف سے جو طریقہ انصاف کا جاری تھا اس کی کیفیت یہ تھی کہ بادشاہوں کی طرف سے ایسی عدالتیں قائم کی گئی تھیں جو کہ برائے نام شاہی تھیں مگر ان پر بادشاہ کا اثر نہیں تھا۔ ان میں مسلمانوں کے معاملات قرآن شریف اور فقہ (اسلامک لا) کی روسے اور ہندوؤں کے معاملات دہرم شاستر کی روسے طے ہوتے تھے اور ان کی طاقت کی یہ کیفیت تھی کہ ذاتی امور میں بادشاہ بھی مفتیوں کے فتووں اور شرعی فیصلوں کے تابع ہوتے تھے۔ اس مضمون کو انگلستان کے مشہور مقرر اڈمنڈ برک نے پارلیمنٹ کی ایک تقریر میں خوب واضح کیا تھا۔ جس کے چند الفاظ حسب ذیل ہیں۔

"جناب والا میں ایشیا کی حکومتوں کی نسبت جرات کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان میں سے کسی کو خودسری کے اختیارات حاصل نہ تھے اور اگر کسی کو تھے تو وہ انھیں کسی دوسرے کو سپرد نہ کر سکتا تھا۔ میں پرزور الفاظ میں کہہ سکتا ہوں کہ مشرقی ممالک کی حکومتیں خود مختارانہ اختیارات کا نام تک نہیں جانتیں۔ ایشیا کا بڑا حصہ مسلمان حکمرانوں کے تحت میں ہے۔ اور اسلامی حکومت کے معنے ہی قانونی حکومت کے ہیں۔ عیسائی بادشاہوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے قانون میں بدرجہا زیادہ مضبوطیاں ہیں۔

ان کا اپنے قانون کی نسبت یہ عقیدہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے ہے۔ اس لئے رعایا سے لیکر بادشاہ تک سب کے سب یکسانیت کے ساتھ قانون اور مذہب دونوں کے پابند ہیں۔ اگر کوئی شخص قرآن کی ایک آیت بھی اس مضمون کی دکھادے کہ اس کی رو سے کسی کو خود مختارانہ اختیارات حاصل ہیں تو میں تسلیم کروں گا کہ میں نے اس کا اور ایشیاء کی حالات کا بیکار مطالعہ کیا ہے۔ قرآن شریف میں ایک لفظ بھی اس بارہ میں نہیں ہے۔ برخلاف اس کے اس قانون کا ہر ہر حرف ظالموں کے خلاف گرج رہا ہے۔ اس قانون کی شرح کرنے والے علماء یا قاضیوں کا طبقہ موجود ہے۔ جو اس کا محافظ قرار دیا گیا ہے اور جو بادشاہ کی ناراضی سے محفوظ ہے اور جسے بادشاہ ہاتھ نہیں لگا سکتا اون کے بادشاہوں تک کو حقیقی اعلیٰ طاقت حاصل نہیں ہے۔ بلکہ وہاں کی حکومت ایک حد تک جمہوری ہے۔" (روشن مستقبل طبع ۱۹ء ۲۰ از تقاریر ایڈمنڈ برک جلد اول ص ۱۰۰ و ۱۰۱)

برخلاف اس کے اب بجائے مواضعات کے صدر مقامات میں جو گانوں سے تیس چالیس میل یا کم و بیش فاصلہ پر ہوتے ہیں جاکر انصاف ہوتا ہے۔ اور پھر انصاف ہونے کا انحصار اس امر پر ہوتا ہے کہ مدعی اور مدعی علیہ کے پاس کافی روپیہ اور اثر ہو۔ جو شخص جائز و ناجائز طریقوں سے روپیہ کما کر عدالتوں میں اور حکام کے یہاں حاضری دیتا رہتا ہے۔ وہ تمام گانوں پر غالب ہوتا ہے پھر متوسط لوگوں کی آمدنی چونکہ بہت زیادہ گھٹ گئی ہے اور گھٹتی جارہی ہے اسلئے وہ عدالتی کارروائیوں کے اخراجات نہیں اُٹھا سکتے۔ اب کلکٹر صاحب کے ہاتھ میں سب اختیارات ہیں۔ وہ گانوں سے فاصلہ پر بہت دور رہتے ہیں۔ ہندوستانیوں اور بالخصوص غیر انگریزی تعلیم یافتہ اور دیہاتیوں اور قصباتیوں سے خلط ملط اپنی کسرشان اور خودداری کے خلاف اور اپنی ہتک سمجھتے ہیں۔ کسی کالے اور نیٹو سے بات کرنا انگریزی عزت اور شان و جلال کے بالکل منافی جانتے ہیں۔ اس لئے وہ ہندوستانیوں کے چال و چلن سے واقف نہیں ہیں۔ گانوں کا بدترین شخص حکام رسی کرکے اپنا اثر اور رسوخ قائم کرلیتا ہے اور کلکٹر صاحب بے پروانہ تقرر وغیرہ

حاصل کرکے لوگوں کے حقوق پر دست درازی کرتا ہے۔ کاش یہ حالت حکام اور عدالتوں تک ہی محدود رہتی تب بھی ضرر اور نقصان برداشت کیا جا سکتا۔ مگر افسوس ہے کہ یہ عدالتیں تمام ملک کے لئے مرکز اور نمونہ بن گئیں ہیں۔ مثلاً ہر روز ملک کے بہترین دل و دماغ رکھنے والے اشخاص کسی نہ کسی حیثیت سے انھیں عدالتوں کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں۔ جو ممالک اس وقت برسرعروج ہیں وہاں کے لوگوں کے دماغ صنعت و حرفت، تجارت اور زراعت اور دولت کے ذریعہ سے دولت پیدا کرنیکے طریقوں میں مصروف رہتے ہیں۔ برخلاف اسکے ہندوستان کے لوگ جب صبح کو اٹھتے ہیں تو ان میں سے کچھ لوگ تو حاکم اور عمال، بیرسٹر اور وکیل، مدعی مدعا علیہ، عرضی نویس اور محرر، گواہ اور دلال کی شکل میں کچہریوں کا رُخ کرتے ہیں اور جو لوگ پیچھے رہ جاتے ہیں وہ تمام دن مقدمات کے نتیجوں کے انتظار میں رہتے ہیں اور راتکو بیٹھکوں اور چوپالوں میں بیٹھکر بقایا لگان اور اضافہ لگان، بٹوارہ اور داخل خارج کے چرچوں میں مصروف رہتے ہیں اور ان معاملات میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے سازشیں کرنے اور جھوٹی شہادتیں مرتب کرنے میں مصروف رہکر بدترین بداخلاقیوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔

لارڈ میکالے لکھتا ہے۔

بہت کم انگریز ایسے ہوں گے جو اس امر کو تسلیم نکریں گے کہ انگریزی قانون باوجود حال کی ترقیوں کے نہ تو سستا ہے اور نہ اس کی رو سے فیصلے جلد ہوتے ہیں۔ پھر بھی ہمارے ملک یعنی انگلستان میں اس کا نشو و نما ہو گیا۔ بعض امور میں وہ ہمارے محسوسات کے مطابق ڈھال دیا گیا اور بعض امور میں ہمارے محسوسات رفتہ رفتہ اس کے مطابق ڈھل گئے ہیں۔ ہمیں اس کے بدترین نقائص کو برداشت کرنیکی بھی عادت ہو گئی ہے اور اس لئے اگرچہ ہم اس کی شکایت کئے جاتے ہیں تاہم اسکی ہمپر ایسی ہیبت طاری نہیں ہوتی جیسی کہ ایک معمولی سی نئی تکلیف دہ چیز کی ہوتی ہے مگر ہندوستان میں بالکل مختلف حالت پیدا ہو گئی ہے۔ انگریزی قانون جو انگلستان

سے لایا گیا ہے اس میں وہ تمام برائیاں ہی موجود نہیں ہیں جن سے ہم انگلستان
میں تکلیف اٹھا رہے تھے بلکہ ان سے کہیں زیادہ ہیں۔ اور وہ ایسی برائیاں ہیں
جنکے مقابلہ میں انگلستان کی بدترین برائیاں ہیچ ہیں۔ وہ قانون جو کہ انگلستان
میں دیر طلب ہے اس ملک میں اس سے کہیں زیادہ دیر طلب ہے جہاں کہ ہر جج کو
اور ہر بیرسٹر کو ایک مترجم کی امداد درکار ہوتی ہے۔ اس ملک میں یہ قانون کہیں
زیادہ گراں ہے جس میں کہ مشیران قانونی ایک دور دراز ملک سے لائے جاتے ہیں۔
ہندوستان میں ہر انگریز کا معاوضہ گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف سے لیکر ایک
سائیس یا گھوڑی ساز تک کا انگلستان کی شرح سے کہیں زیادہ ادا کیا جاتا ہے۔
.... ان وجوہ سے کلکتہ میں وکلاء کی جو فیس ادا کی جاتی ہے وہ انگلستان
کی فیس سے سہ چند ہوتی ہے۔ ہندوستان کے لوگ انگریزوں کے مقابلہ میں
اگرچہ بہت غریب ہیں تاہم جو تکلیف وہ تاخیر اور خرچ انگریزی قانون کی وجہ سے
پیش آتا ہے وہ اس کو ان نقایص کے مقابلہ میں جو اس قانون کے غیر ملکی ہونیکی
وجہ سے موجود ہیں زیادہ اہم نہیں سمجھتے، ان کی فطرت، ان کی عزت، ان کی مذہب
ان کی عورتوں کی عفت کے قوی محسوسات کو اس بدعت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ مال کی
کارروائیوں میں پہلا قدم جو اٹھایا گیا وہ یہ تھا کہ مال گذاری کی بقایا میں لوگ گرفتار
کئے جانے لگے۔ دراں حالیکہ ایک معزز ہندوستانی کے لئے گرفتاری محض نظربندی
نہ تھی بلکہ بدترین ذاتی بے عزتی تھی۔ ہر مقدمہ کی ہر منزل پر حلف لئے جانے لگے
دراں حالیکہ معزز ہندوستانیوں کے نزدیک یورپ کے فرقہ کو یکرد
سے (جو قسم کو معیوب سمجھتا ہے) یہ طریقہ زیادہ تکلیف دہ تھا۔ مشرقی ممالک میں
معزز گھروں کے زنانخانہ میں غیر آدمی کا داخل ہونا یا عورتوں کے چہرہ کو دیکھ لینا
ایسی ناقابل برداشت زیادتی سمجھی جاتی ہے اور اس کو موت سے بھی زیادہ خوفناک

خیال کیا جاتا ہے اور جس کا انتقام صرف خونریزی سے لیا جا سکتا ہے۔ بنگال۔ بہار اور اڑیسہ کے نہایت معزز خاندانوں کو اس قسم کی بے عزتیوں کا سامنا ہوا۔ اگر ہمارے ملک میں دفعتاً ایک ایسا قانون نافذ کر دیا جائے جو ہمارے لئے ایسا ہی نیا ہو جیسا کہ ہمارا قانون ہماری ایشیائی رعایا کے لئے ہے تو یہ خیال کرنے کی بات ہے کہ ہمارے ملک کی اس وقت کیا حالت ہو جائے گی۔ اگر ہمارے ملک میں یہ قانون نافذ ہو کہ کسی کے قسم کھا لینے سے جس کا قرضہ ہم پر ہے اسے یہ حق ہو جائے گا کہ وہ معزز اور مقدس ترین اشخاص اور پردہ نشین خواتین کی ہتک کر سکے۔ ایک افسر کے بید لگائے جا سکیں۔ ایک پادری کو کٹہرے میں ٹھونکا جا سکے۔ شریف عورتوں کیساتھ اس طریقہ سے سلوک کیا جا سکے کہ جس کا نتیجہ واٹ ٹائلر جیسا بلوہ ہو (انگلستان میں رچرڈ کے عہد حکومت سے قبل کاشتکاروں پر بہت سختیاں ہوتی تھیں۔ ۱۳۸۱ء میں ہر بالغ مرد اور عورت پر ایک نیا ٹیکس لگایا گیا تھا جس کی مقدار ایک شلنگ فی کس تھی اس پر کاشتکاروں نے ایک عظیم الشان بلوہ کیا۔ اس بلوہ کا سردار واٹ ٹایلر تھا) تو اس وقت ملک کی جو حالت ہو جائیگی اسکا تصور کر کے بھی دل کانپتا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد حکومت میں سپریم کورٹ (عدالت عالیہ) نے جب اپنے قانون کو اپنے تمام مقبوضات ہند میں وسعت دینے کی کوشش کی تو قریب قریب اسی قسم کی کیفیت یہاں پیدا ہو گئی۔ اس سے ہراس و خوف کا عہد شروع ہو گیا۔ اور وہ خوف اس خیال سے کہ خدا جانے اس کی تہ میں اور کیا کیا مصائب پوشیدہ ہیں بہت زیادہ ہو جاتا تھا۔ یعنی جو مصیبتیں لوگوں پر پڑ رہی تھیں وہ آیندہ پیش آنے والی مصیبتوں کے خوف کے مقابلہ میں کم تھیں۔ کوئی شخص یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ عجیب و غریب عدالت آگے چلکر اور کیا رنگ لائے گی چونکہ ہندوستان کے لوگ سمندر کے نام سے ڈرتے تھے اس لئے وہ خوف زدہ

ہو کر کہتے تھے کہ یہ عدالت کالے پانی کے اُس پار سے آئی ہے۔ اس عدالت کے ججوں میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا کہ وہ ان کروڑوں اشخاص کے رسم ورواج سے جن پر وہ بے قید حکومت کرتے تھے واقفیت رکھتا ہو۔ مقدمات کی مسلیں اوس خط میں لکھی جاتی تھیں جس سے ہندوستانی قطعًا ناواقف تھے اور فیصلے اس زبان میں صادر کئے جاتے تھے جس سے لوگ بالکل ناآشنا تھے۔ ان عدالتوں کے گرد ہندوستانی آبادی کے بدترین لوگ جمع ہوگئے۔ یہ لوگ چغلخور جھوٹے گواہ مقدمہ ساز۔ دغاباز اور سب سے بڑھ کر ترقی کرنے والے لوگوں کا وہ گروہ تھا جس کے مقابلہ میں انگلستان کے بدترین بھی یا نہایت دیانتدار اور رقیق القلب معلوم ہوتے ہیں...... یہ انگریزی مشیران قانونی جس سرعت کے ساتھ تمام ملک میں پھیلے اس سرعت کے ساتھ حملہ آور بھی نہ پھیلے تھے۔ زمانہ سابق کے تمام ایشیائی اور یوروپین ظالموں کی غیر انصافیاں سپریم کورٹ (عدالت عالیہ) کے انصاف کے مقابلہ میں برکت معلوم ہوتی ہیں۔

(حکومت خود اختیاری صفحہ ۱۶۰، ۱۷۰ از مکالیز

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ان عدالتوں اور ان کے قوانین سے ہندوستانیوں کے اخلاق اور اعمال پر نہایت ہی زہریلا اثر پڑا اور ان کے اخلاق انتہائی درجہ میں گرتے چلے گئے اور ہر طرف بداخلاقیوں اور بداعمالیوں کا دور دورہ ہوگیا۔

انگریزوں نے ہندوستانیوں کو جاہل بنا دیا

یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہر حکومت کے اولین فرائض اور بنیادی اصولوں میں سے یہ امر ہے کہ وہ رعایا میں علم کی روشنی زیادہ سے زیادہ پھیلائے اور اس کے ذریعہ سے ان کے اخلاق انسانیہ اور اعمال معاشیہ میں ترقی دے ان کی جہالتوں اور بدکرداریوں کو دور کرے۔ ان کو مہذب اور شائستہ اور متمدن بنائے۔ رعایا کے ہر فرقہ اور ہر خاندان کے افراد کو یکساں طور پر

مواقع اور سہولتیں تعلیم پانے کی پیدا کرے۔ چنانچہ زمانہ سابق میں ہندوستان میں ابتدائی تعلیم سے اعلیٰ تعلیم تک اس کا انتظام بغیر کسی فیس اور معاوضہ کے کیا جاتا تھا۔ بادشاہوں، نوابوں امرا، اور اہل ثروت کی طرف سے جائدادیں تعلیمی مصارف کے لئے وقف کردی گئی تھیں۔ اسطرح صوبہ بنگال میں صوبہ کا چوتھائی حصہ اسی کے لئے وقف تھا۔ جیساکہ مسٹر جیمس گرانٹ کے تخمینہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ سرکاری خزانوں سے ان کی امداد ہوتی تھی۔ صاحب روشن مستقبل لکھتا ہے

اس زمانہ میں کیفیت یہ تھی کہ والیان ملک اور امرا تعلیم کی پوری سرپرستی کرتے تھے اس کے لئے جاگیریں دیتے اور جائیدادیں وقف کرتے تھے۔ دہلی کی مرکزی حکومت ٹوٹ جانے پر بھی صرف اضلاع روہیلکھنڈ میں جو دہلی سے قریب تر تھے پانچہزار علما، مختلف مدارس میں درس دیتے تھے۔ اور حافظ الملک (نواب روہیلکھنڈ حافظ رحمت خاں مرحوم) کی ریاست سے تنخواہیں پاتے تھے۔" (حیات حافظ رحمت خاں) ص ۲۷

ہر ہر قریہ اور دیہات میں ایسے مدارس موجود تھے جن میں لکھنے، پڑھنے، حساب وغیرہ کی تعلیم ہوتی تھی۔ جیساکہ سر تھامس منرو کا مقالہ ہم نقل کرچکے ہیں۔ کپتان الگزنڈر ہملٹن اپنے سفرنامہ میں شہنشاہ اورنگ زیب مرحوم کے زمانہ کی حالت بتلاتا ہوا لکھتا ہے۔ کہ صرف شہر ٹھٹہ سندھ میں چار سو کالج مختلف علوم وفنون کے تھے۔ وہ لفظ کالج کا لکھتا ہے۔ اسکول، پرائمری اسکول یا مکتب نہیں لکھتا ہے۔ جبکہ دارالسلطنت دہلی سے ایک ہزار میل سے زیادہ دوری پر بسنے والے شہر میں اسقدر کالج تھے تو پھر شہر دہلی، آگرہ اور دیگر شہر ہائے یو۔پی، بہار، بنگال، اڑیسہ، مدراس، بمبئی، سندھ، پنجاب وغیرہ کے بڑے شہروں کے متعلق قیاس کیا جاسکتا ہے۔ کہ وہاں تعلیمی حالت کیا ہوگی۔ مقریزی کتاب الخطط میں لکھتا ہے (بزمانہ محمد تغلق مرحوم) صرف شہر دہلی میں ایک ہزار مدرسے تھے۔ مسٹر کیر ہارڈی نے میکس مولر کے حوالہ سے لکھا ہے۔

"انگریزی عملداری سے قبل بنگال میں اسی ہزار مدرسے تھے۔ اس طرح چار سو آدمیوں کی آبادی کے لئے ایک مدرسہ کا اوسط ہوتا تھا۔ نیز لڈلو نے تاریخ ہند میں لکھا ہے

کہ ہندوؤں کے ہر موضع میں جو اپنی قدیم حالت پر رہے بچے بالعموم لکھ پڑھ سکتے ہیں مگر جس جگہ ہم نے مثل بنگال کے پرانا نظام توڑ دیا ہے وہاں سے گانوں کا اسکول غائب ہوگیا ہے۔" (تاریخ باسو جلد پنجم صفحہ ۱۱ روشن مستقبل صفحہ ۱۲۴)

اسی طرح انڈین ریفارم سوسائٹی نے جو کہ سنہ ۱۸۵۳ء میں انگلستان میں قائم تھی اپنے ایک رسالہ میں لکھا ہے۔

ہندوؤں کے زمانہ میں ہر موضع میں ایک مدرسہ ہوتا تھا۔ ہم نے چونکہ دیہاتی کمیٹیوں یا میونسپلٹیوں کو توڑ دیا اس سے ان کے باشندے مدارس سے بھی محروم ہو گئے۔ اور ہم نے ان کی جگہ کوئی چیز قائم نہیں کی۔" (روشن مستقبل صفحہ ۱۲)

الحاصل یہ امر مسلمات میں سے ہے کہ زمانہ سابق میں لکھے پڑھے لوگ زیادہ ہوتے تھے۔ اس کی تصدیق امور مذکورہ بالا کے علاوہ مشہور ماہر تعلیم ڈاکٹر لیٹنر کے قول سے بھی ہوتی ہے۔ لالہ لاجپت رائے نے اپنی کتاب ان ہیپی انڈیا میں انگریزی سررشتہ تعلیم کے افسروں کے حوالہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ زمانہ سابق میں ہندوستان میں خواندوں کی تعداد موجودہ زمانہ سے زیادہ تھی (حکومت خود اختیاری صفحہ ۱۶) مگر انگریزوں کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ تعلیم یافتہ لوگوں کی کثرت اگر ہندوستان میں رہی تو وہ ہماری حکومت کو فنا کردیں گے۔ اس لئے انھوں نے تعلیمگاہوں کو ملیامیٹ اور تعلیم کو نیست و نابود کردیا اور تعلیم کی تمام موقوفہ زمینوں کو سنہ ۱۸۳۶ء میں سرکاری قبضہ میں لے لیا۔ سر ولیم ڈگبی پرسپرس برٹش انڈیا میں لکھتا ہے

(ضمن سوال وجواب میجر جنرل سمتھ کے۔ سی۔ بی)

"سوال نمبر ۵۶۳ کیا آپ کسی طرح اس بات کی روک کرسکتے ہیں کہ دیسیوں کو اُن کی طاقت کا علم نہ ہو۔

جواب۔ میرے خیال میں انسانی تاریخ میں کوئی ایسی نظیر نہیں ملتی کہ معدودے چند اغیار چھ کروڑ آبادی کے ملک پر حکمرانی کرسکیں جسے آجکل رائے کی بادشاہت کہتے ہیں اس لئے جوں ہی وہ تعلیم یافتہ ہوجائیں گے تو تعلیم کی تاثیر سے اون کے قومی اور

مذہبی تفرقے دور ہو جائیں گے جس کے ذریعہ سے ہم نے ابتک اس ملک کو اپنے قبضہ میں رکھا ہوا ہے یعنی مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف کرنا اور علیٰ ہذا القیاس تعلیم کا یہ اثر ضرور ہوگا کہ ان کے دل بڑھ جائیں گے اور انھیں اپنی طاقت سے آگاہی ہو جائے گی۔" (خوشحال برطانوی ہند ترجمہ اسپرس برٹش انڈیا ص۱۰۹)

اسی بنا پر انگریزوں نے تعلیم اور تعلیمگاہوں کو برباد کیا۔ اور چونکہ انکا نصب العین زیادہ سے زیادہ مالی منافع کا حاصل کرنا تھا اس لئے بھی انھوں نے ہندوستانیوں کو تعلیم دینا اپنے مقاصد کے خلاف سمجھا۔ بہر حال تھوڑے ہی عرصہ میں جبکہ تعلیمگاہیں مٹ گئیں اور ان کی جگہ دوسرے اسکول اور کالج وغیرہ قائم نہ کئے گئے۔ اور پرانے تعلیمیافتہ لوگ آہستہ آہستہ وفات پا گئے تو چاروں طرف ہندوستان میں جہالت اور نادانی کا دور دورہ ہو گیا۔ چنانچہ ۱۸۲۳ء میں آنریبل الفنسٹن اور آنریبل ایف وارڈن نے ایک متفقہ یادداشت گورنمنٹ میں پیش کی جسکا اقتباس حسب ذیل ہے۔

"انصاف یہ ہے کہ ہم نے دیسیوں کی ذہانت کے چشمے خشک کر دیئے۔ ہماری فتوحات کی نوعیت ایسی ہے کہ اس نے نہ صرف ان کی علمی ترقی کی ہمت افزائی کے تمام ذرائع کو ہٹا لیا ہے بلکہ حالت یہ ہے کہ قوم کے اصلی علوم بھی گم ہو جانے اور پہلے لوگوں کی ذہانت کی پیداوار فراموش ہو جانے کا اندیشہ ہے اس الزام کو دور کرنے کے لئے کچھ کرنا چاہئے۔" (روشن مستقبل ص۱۲۵)

ہم اس سے پہلے لارڈ منٹو وایسرائے ہند کی ۱۸۱۱ء والی یادداشت کا اقتباس ذکر کر چکے ہیں جو کہ انھوں نے کورٹ آف ڈائرکٹران کو بھیجی تھی اور اس میں اقرار کیا تھا کہ علم کا روز بروز زوال ہو رہا ہے ہندو مسلمانوں کو مذہبی تعلیم نہ ہونے سے دروغ حلفی اور جعلسازی کے جرائم بڑھ رہے ہیں۔ اور سفارش کی تھی کہ متعدد کالج قائم کئے جائیں اور تعلیم پر زیادہ روپیہ خرچ کیا جائے۔

ہندوستان کو ہمیشہ غلام رکھنے کی ہوس اور اس کو ہمیشہ لوٹتے رہنے کی ملعون خواہش

کی وجہ سے انگریز ہمیشہ یہی پالیسی رکھتے رہے کہ ہندوستانیوں کی ذہانت بالکل برباد کردیجائے ان میں علمی بیداری پیدا نہ ہونے دیجائے۔ اُن کے ہر قسم کے کمالات فنا کردیئے جائیں اور ان کو غلامی کی بدترین خدمت گذاریوں، کاشتکاری وغیرہ ہی میں ہمیشہ مبتلا رکھا جائے تاکہ ہماری برتری ہمیشہ قائم رہے اور ہم ہندوستان کے اعلیٰ حاکم بنے رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۷۹۲ء میں جبکہ مسٹر ولبرفورس نے پارلیمنٹ میں اس مضمون کی تجویز پیش کی کہ ہندوستان میں پروٹسٹنٹ مذہب کے عقیدے کی عبادت اور تعلیم کے ذرائع مہیا کئے جائیں اور اس مقصد کے لئے وقتاً فوقتاً پادری بھیجے جائیں تو مالکان ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان تجاویز کی شدت سے مخالفت کی اور یہ کہا کہ

"ایک مذہب کے قائم ہوجانےسے انسانوں کے مقاصد متحد ہوجاتے ہیں اور اگر یہ ہوگیا تو ہندوستان میں انگریزوں کی برتری کا خاتمہ ہوجائے گا۔ لوگوں کو اپنے مذہب میں لانیکا اصول اس اٹھارہویں صدی میں خلاف مصلحت ہے۔ اگر چند لاکھ عیسائی بھی وہاں ہوگئے تو اس سے سخت مصیبت آجائے گی۔ امریکہ میں درسگاہیں اور کالج قائم ہونے کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ وہ ملک ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ اسیطرح جب نوجوان پادری اندرون ہند میں پھیلیں گے تو کمپنی کے فوائد کا خاتمہ ہوجائیگا۔ جس ہندوستانی کو تعلیم حاصل کرنی ہو وہ انگلستان چلا آئے۔"

(روشن مستقبل ص۱۲۵ از تاریخ تعلیم میجر باسو ص۳۰۳)

تعلیم گاہوں اور علم کا فنا کردینا اور فنا ہوجانا کوئی معمولی مسئلہ نہ تھا اس لئے مالکان ایسٹ انڈیا کمپنی اور عہدہ داران کمپنی کے ہر قسم کے خلاف کے باوجود بھی آوازیں اٹھتی رہیں اور چیخ پکار ہوتی رہی۔ بہت سے منصف مزاج انگریز ہندوستانیوں کی موافقت بھی کرتے رہے جس کے نتیجہ میں ۱۸۳۴ء میں تعلیمی ضروریات انجام دینے اور اس کے پروگرام وغیرہ کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی جس کا اجلاس ۷ مارچ ۱۸۳۵ء میں منعقد ہوا اور لارڈ میکالے اس کے صدر بنائے گئے

کمیٹی اور اس کے صدر نے ہندوستانیوں کے لئے تعلیم گاہیں بنانے اور تعلیم کو زیادہ سے زیادہ کرنے کی ضرورت کو تسلیم کیا۔ مگر ہر ہر قدم اور ہر ہر شعبہ میں ایسے امور کو لازم قرار دیا جس سے نہ تعلیم عام ہو سکے اور نہ ہندوستانیوں کو اعلیٰ علوم میں کامیابی ہو سکے اور نہ ان کا کیر کٹر اعلیٰ درجات حاصل کر سکے نہ ایسی چیزیں اور سہولتیں اس میں رکھی گئیں کہ وہ ایک آزاد قوم کے ممبر شمار کئے جا سکیں۔ تمام فنون و علوم کی تعلیم انگریزی زبان میں لازمی قرار دیگئی۔ ظاہر ہے کہ سات ہزار میل کی وہ زبان جس سے ہندوستانیوں کو کوئی مناسبت نہیں جبکہ فنون اور علوم کو حاوی ہو کر ہندوستانی بچوں کے لئے ذریعۂ تعلیم بنائی جائے گی تو ان کے اذہان پر ان فنون میں مہارت پیدا کرنے کے لئے کس قدر ثقیل بوجھ پڑے گا۔ اگر یہ فنون ان کی مادری زبان میں پڑھائے جاتے اور انگریزی زبان بحیثیت زبان ثانوی درجہ پر تسلیم کیجاتی تو ان کو ان فنون میں کس قدر زیادہ اور کس قدر جلد مہارت تامہ حاصل ہو جاتی۔ پھر جو فنون داخل درس کئے گئے وہ ایسے اور اتنے ہرگز نہ تھے جن سے وہ ماہر ہو کر صنایع اور ترقیات معاشیہ و حربیہ وغیرہ کے ایسے درجوں پر پہونچ سکیں جنپر یوروپین اقوام جرمنی، برطانیہ، روس، جاپان وغیرہ پہونچیں۔ فضول اور زائد از حاجت کتابیں اور فنون ایسے بھر دیئے گئے جنمیں دماغ کمزور اور بیکار ہو جاتا رہا اور کوئی معتد بہ کمال حاصل نہیں ہوتا تھا۔ نصاب میں وہ کتابیں سائنس اور طبعیات کی داخل کی گئیں جن کی خیالی اور موہوم مگر مزین باتیں نوعمر بچوں کو مذہب اور عقاید دینیہ سے یکقلم منحرف کر کے لامذہب اور بے دین بنا دیں۔ سب سے بڑا مقصد ان ممبران کمیٹی کا یہ رہا کہ انگریز حکام کو اپنے اپنے آفسوں میں کلرک اور ترجمان مہیا ہو جائیں اور انگریزی تہذیب اور انگریزوں کا کلچر ہندوستانیوں میں رائج ہو کر ان کو ہندوستانی اخلاق قدیمہ اور روحانیت و مذہبیت سے دور اور انگریزی اخلاق خبیثہ اور ان کی ڈپلومیسیوں سے نزدیک کر دے ان میں دنیا طلبی اور خود غرضی اور نفاق کی ایسی اسپرٹ آجائے جس کی علمبردار تمام یوروپین اقوام سے بڑھکر برطانیہ واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ لارڈ میکالے اور اس کی کمیٹی اپنی تعلیمی اغراض و مقاصد اور انکی

اسکیم کی رپورٹ میں مندرجہ ذیل کلمات تحریر کرتی ہے۔

"ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہئے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے الفاظ و سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو"

(روشن مستقبل ص۱۳۱ از تاریخ التعلیم میجر باسو ص۱۰۵)

اسی کے ساتھ ساتھ وہ رائے جو لارڈ میکالے کے قلب کے اندرونی پردوں کے اندر چھپی ہوئی تھی وہ وہ تھی جو کہ انہوں نے اپنے والد کو ایک چٹھی میں لکھکر بھیجی تھی اس کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

"اس تعلیم کا اثر ہندوؤں پر بہت زیادہ ہے۔ کوئی ہندو جو انگریزی داں ہے کبھی اپنے مذہب پر صداقت کے ساتھ قائم نہیں رہتا۔ بعض لوگ مصلحت کے طور پر ہندو رہتے ہیں مگر بہت سے یا تو موحد ہو جاتے ہیں یا مذہب عیسوی اختیار کر لیتے ہیں۔ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ اگر تعلیم کے متعلق ہماری تجاویز پر عملدرآمد ہوا تو تیس سال بعد بنگال میں ایک بت پرست بھی باقی نہ رہیگا" (روشن مستقبل ص۱۳۲ از تاریخ التعلیم میجر باسو ص۱۰۵)

چنانچہ ان مقاصد اور اغراض کا ظہور بہت تھوڑے عرصہ میں ہو گیا اور ان کالجوں اور اسکولوں اور یونیورسٹیوں سے جو لڑکے فارغ ہو کر نکلنے لگے وہ اپنے اسلاف کے مذہب اور ان کے طریقوں سے بیزار اور متنفر ہوتے تھے اور چونکہ موجودہ مذہب عیسوی میں ایسی معقولیت اور جاذبیت نہ تھی کہ وہ اپنی طرف انکو کھینچ سکے نیز خود انگریز بھی عموماً اس مذہب پر قائم نہیں ہیں ان کی عیسائیت صرف قومیت کے درجے تک ہے عمل اور عقیدہ میں کوئی تاثر نہیں ہے اس لئے وہ الحاد اور لادینیت کی دلدل میں پھنس کر اخلاق حسنہ اور خدا ترسی سے بالکل دور ہو جاتے رہے۔

ڈبلو ڈبلو ہنٹر کہتا ہے۔

"ہمارے انگلو انڈین اسکولوں سے کوئی نوجوان خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ایسا نہیں نکلتا جو اپنے آباو اجداد کے مذہب سے انکار کرتا نہ جانتا ہو۔ ایشیا کے پھلتے پھولتے

والے مذاہب جب مغربی سائنس بستہ حقایق کے مقابلہ میں آتے ہیں تو سوکھ کر لکڑی ہو جاتے ہیں۔" (ترجمہ رسالہ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۲۰۲)

الغرض باوجود اس شورا شوری اور اتنی تعلیمی جدوجہد کے مظاہروں اور کمیشنوں اور کمیٹیوں اور اسکیموں کے اعلانات، اور کالجوں اور یونیورسٹیوں اور اسکولوں کی بلند بانگی کے جب پینتیس ۳۵ برس کے بعد ۱۸۸۱ء میں پہلی مردم شماری ہوئی تو تمام ہندوستان میں خواندہ (یعنی پڑھے لکھے لوگوں کا خواہ اردو ہو یا انگریزی یا فارسی یا ناگری وغیرہ) انسانوں کا فیصدی اوسط (۲ ، ۳) پایا گیا۔ وہ انگریزی نظام جو کہ نہایت بلند بانگ دعاوے کے ساتھ ۱۷۶۳ء یا اس کے قریبی زمانہ سے شروع کیا گیا تھا اور اس کے محاسن اور خوبیوں اور انسانی خدمات کے ہمیشہ راگ گائے جاتے تھے۔ سو برس سے زائد مدت میں ہندوستان میں خواندہ لوگوں کی تعداد فیصدی (۲ ، ۳) پیدا کر سکا اس سے انگریزوں کی سچائی اور انسان دوستی کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ بقول مسٹر لڈلو اور ڈاکٹر لیٹنر وغیرہ دیگر ماہران تعلیم (حسب تصریحات ان بینی انڈیا) انگریزی حکومت سے پہلے عام طور پر بکثرت خواندہ تھے۔ پس کم از کم فیصدی آٹھ خواندوں کا اوسط ہونا چاہیے۔ پھر ۱۸۸۱ء میں اس اوسط کا پایا جانا کیا صریح طور پر دلالت نہیں کرتا کہ انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی مشئومہ اغراض کے لئے علم اور اس کی درسگاہوں کو دشمنی کی نظر سے دیکھکر ہمیشہ برباد ہی کرنیکا سلسلہ رکھا ہے اور جو کچھ کمیشن و کالج وغیرہ کی حکایات سامنے رکھی جاتی تھیں وہ محض دکھاوے اور طفل تسلی کے لئے تھیں۔ ۱۸۸۱ء سے ۱۹۲۱ء تک پچاس برس کے عرصہ میں خواندہ لوگوں کا اوسط جو کچھ بڑھا وہ صرف ۴ فیصدی ہے کیونکہ ۱۹۲۱ء میں خواندہ لوگوں کی تعداد (۳ ، ۷) فیصدی ہے۔ سوویٹ روس نے صرف پچیس برس کے اندر یعنی ۱۹۱۸ء سے لیکر ۱۹۴۲ء تک ۸۰ فیصدی تعلیم یافتوں سے اسی فیصدی یا اس سے زائد اپنے ملک روس میں تعلیم یافتہ بنا دئے۔ جاپان نے ایک صدی سے کم میں اپنے ملک میں (۹۵) فیصدی سے زیادہ تعلیم یافتہ بنا دیئے اور ایسی حیرت انگیز ترقی کی کہ یورپ کی حکومتیں اس سے لرزہ براندام ہو گئیں

گرانگریزی حکومت تقریباً پونے دو سو برس میں (یعنی سنہ ۱۷۶۵ء سے لیکر سنہ ۱۹۳۱ء تک میں) ا فیصدی دس تعلیم یافتہ نہ بنا سکی۔

حسب بیان مسز جان گنتھر سنہ ۱۹۴۳ء میں جبکہ امریکہ اور انگلستان میں فیصدی ایک بھی ناخواندہ اور جاہل نہ تھا تو ہندوستان میں فیصدی نوے ۹۰ جاہل محض اور ناخواندہ پائے جاتے ہیں۔

(مدینہ بجنور مورخہ ۹ جون سنہ ۱۹۴۳ء از کامن سنس امریکہ)

حالانکہ سوویٹ روس نے ایسے تعلیم یافتہ بنائے جنھوں نے جرمنی جیسی ترقی یافتہ اور سائنسداں قوم کو شکست دیکر نہ صرف اپنے ملک سے نکالکر باہر کردیا بلکہ اُن کے پایۂ تخت میں گھس گئے۔ برخلاف اس کے انگریزوں نے جو تعلیم یافتہ ہندوستان میں بنائے وہ معمولی سے معمولی صنائع پر قادر نہیں ہیں۔ سوائے اس کے کہ دفاتر میں کلرکی کی خدمتیں انجام دیں اور کسی قسم کی قابلیت اون میں نہیں پائی جاتی۔ اور کیوں نہ ہو سائمن رپورٹ کے موافق جبکہ انگلستان میں صرفہ تعلیم فی کس سالانہ ۲ پونڈ ۱۵ شلنگ یعنی لعہ اور امریکہ میں فی کس سالانہ صہ تھا تو ہندوستان میں صرفہ تعلیم فی کس سالانہ ۹ پنس یعنی ۹ر تھا۔ اور سنہ ۱۹۴۳ء میں حسب بیان مسز جان گنتھر جبکہ امریکہ فی کس سالانہ تعلیم پر چار سو ڈالر خرچ کررہا تھا اور انگلستان فی کس دوسو ڈالر خرچ کررہا تھا تو ہندوستان میں برطانیہ فی کس سالانہ صرف تین ۳ ڈالر خرچ کرتا تھا۔

(امریکی اخبار کامن سنس سنہ ۱۹۴۳ء)

جب اسقدر خودغرضی اور کوتہ اندیشی اور ہندوستان دشمنی سے کام لیا جائے تو بجز اسکے کیا نتیجہ ہوگا۔ انھیں ملعون اغراض کی بنا پر ہمیشہ انگریزوں نے ہندوستان میں تعلیم کی مد میں ایسی ایسی مشکلات اور پیچیدگیاں پیدا کیں جنکی بنا پر یہ ملک انتہائی جہالت میں پھنس کر رہ گیا سنہ ۲۶-۱۹۲۵ء میں ہندوستان کی آمدنی میں سے جبکہ ڈیفنس پر فیصدی (۳۹٫۵) اور انتظامات ملکی پر (۳۹٫۲) خرچ کیا جارہا تھا تو مد تعلیم پر صرف (۶٫۷) کیا جاتا تھا۔ مدت دراز سے ہندوستان میں جبریہ تعلیم کا مسئلہ چل رہا ہے مگر سب سے بڑی رکاوٹ اس کے راستہ میں یہی رہی کہ

کہ اس کام کے لئے کافی روپیہ نہیں ملا۔ جب بھی تعلیمات پر سوال اٹھایا گیا تو یہی جواب ہوتا تھا کہ بجٹ میں روپیہ نہیں ہے۔ حالانکہ ساٹھ کروڑ روپیہ سالانہ کے قریب فوج پر اور اسی طرح بڑی بڑی رقوم پولیس وغیرہ پر صرف کی جاتی رہیں جنکی غرض صرف اس قدر تھی کہ برطانوی حکومت کی سطوت اور جبروت قائم رہے۔ اور اس سے رعایا کا ایک ایک فرد حکام کے چنگل میں پھنسا رہے

سر جان سائمن اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے۔

ہندوستان کے مشکلات کی جڑ بالیقین فوج ہے۔ مرکزی حکومت ہند کے موجودہ اخراجات کا ساڑھے باسٹھ (۶۲½) فیصدی ڈیفنس پر صرف ہو جاتا ہے جو دنیا بھر سے زائد صرفہ ہے۔ تمام مملکت برطانیہ کی نسبت دو سے تین گنا تک ہندوستان ڈیفنس پر زائد صرف کرتا ہے۔ یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ ۱۹۱۳ء اور ۱۹۲۶ء میں برطانیہ عظمیٰ کے مصارف جنگ ۴۹ فیصدی بڑھے نو آبادیات کے ۳۳ فیصدی۔ مگر ہندوستان کے اعداد اس مدت میں دوگنے ہو گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ انگریزی افواج کے اخراجات ہندوستان میں ہیبتناک ہیں۔ ایک انگریز سپاہی کا صرفہ ہندوستانی سپاہی سے چوگنا پانچ گنا زیادہ ہوتا ہے۔ توپ خانہ اور ہوائی فوج میں ہندوستانی کو کمیشن ملنا ممنوع ہے۔" (ہندوستان ٹائمز مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۹۳۰ء)

برخلاف اس کے انگلستان میں جنگ عظیم کے دوران میں اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ثانوی تعلیم کو جبریہ کر دیا جائے۔ وہ وقت ایسا سخت تھا کہ سلطنت کو فوجی اخراجات کے لئے لاکھوں روپیہ روزانہ کی ضرورت ہوتی تھی۔ مگر عین جنگ کے زمانہ میں ۱۹۱۸ء میں ایک قانون پاس کیا گیا جس کی رو سے انگلستان کے ہر بچہ کے لئے ہائی اسکول تک کی تعلیم جبریہ اور مفت کر دی گئی اور جس طرح بن پڑا اس کے لئے روپیہ فراہم کیا گیا (حکومت خود اختیاری ص۵۰)

انہیں وجوہ سے سر ڈی ہملٹن نے کہا تھا کہ

"اگر کبھی انگریزوں کو ہندوستان اس طرح چھوڑنا پڑا جس طرح رومن نے انگلستان

چھوڑا تھا تو وہ ایک ایسا ملک چھوڑ جائیں گے جس میں نہ تعلیم ہوگی نہ حفظان صحت کا سامان ہوگا اور نہ ہی دولت ہوگی۔" (روزنامہ ملت دہلی مورخہ ۲۶ جولائی ۱۹۳۲ء)

انگریزوں نے ہندوستان کو لوٹ کھسوٹ کی شرمناک پالیسی سے انتہائی درجہ میں غریب اور مفلس بنا دیا

انگریزی عروج سے پہلے ہندوستان نہایت زیادہ دولتمند اور سرمایہ دار ملک تھا جس کی مثال دنیا میں کسی ملک میں نہیں ملتی تھی۔ اور یہ دولتمندی اس میں قرنہا قرن اور صدیوں سے چلی آتی تھی جس کا تمام عالم میں شہرہ تھا اور جس کی وجہ سے دنیا کی قوموں کی لالچی آنکھیں ہمیشہ اس کی طرف اٹھتی رہتی تھیں۔ اور کیوں نہ ہو قدرت کی فیاضیوں نے اس کی سرزمین میں ایسے اسباب اور سامان مہیا کر دیئے تھے جن سے دولتمندی سرمایہ داری، خوشحالی، فارغ البالی پھوٹ پھوٹ کر چاروں طرف پھیلتی تھی۔ یہاں کے راجاؤں اور بادشاہوں نے ہمیشہ ملک کی دولت اور ثروت میں اضافہ اور زیادتی کی پالیسی جاری رکھی۔ اگر کوئی راجہ یا بادشاہ ظالم بھی ہوتا تھا تو اس کا حاصل کیا ہوا مال ہیر پھیر کر یہاں ہی رہتا تھا۔ اگر کسی بیرونی حملہ آور نے یہاں سے کچھ مال لوٹ کر کسی دوسرے ملک کو کبھی منتقل بھی کیا تھا تو یہاں کے تاجر اور دستکار بہت تھوڑے عرصہ میں اس کو مصنوعات ہندیہ کے عوض میں مع المضاعف کے واپس لے آتے تھے۔ ڈاکٹر واکز کہتا ہے۔

"ہندوستان کی دولت، تجارت اور خوش حالی نے سکندر اعظم کے دل پر گہرا اثر کیا اور جب وہ ایران سے ہندوستان کی طرف روانہ ہوا تو اس نے اپنی فوج کو کہا کہ اب تم اس سنہرے ہندوستان کی طرف کوچ کر رہے ہو جہاں نہ ختم ہونے والے خزانے ہیں۔ اور جو کچھ انھوں نے ایران میں دیکھا ہے اس کا ہندوستان کی دولت کے ساتھ کوئی مقابلہ ہی نہیں کر سکتا۔" (رسالہ تلک جلد اول ص ۶)

پروفیسر ہیرین "ہسٹاریکل اسیرچ" صفحہ (۲۶۸) میں کہتا ہے۔

"ہندوستان پرانے زمانہ میں دولت کے لئے مشہور تھا۔" (رسالہ تلک جلد اول ص ۶)

چیمبرس انسائیکلو پیڈیا میں ہے۔

"صدیوں تک ہندوستان اپنی دولتمندی کے واسطے مشہور رہا۔" (رسالہ ملک ج۱ م۲)

تھارنٹن اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے۔

"یورپ کو تہذیب سکھانے والے یونان اور اٹلی جب بالکل جنگلی حالت میں تھے ہندوستان اس زمانہ میں درجہ کمال کو پہونچا ہوا تھا اور دولت کا مرکز تھا۔ یہاں چاروں طرف بڑے بڑے صنعت و حرفت کے کاروبار جاری تھے۔ یہاں کے باشندے دن ورات اپنے اپنے کاروبار میں مشغول رہتے تھے۔ یہاں کی زمین نہایت زرخیز تھی جس سے فصل خوب پیدا ہوتی تھی۔ یہاں بڑے بڑے لایق اور کاریگر صناع موجود تھے جو یہاں کی خام پیداوار سے اتنا نفیس اور عمدہ مال تیار کرتے تھے جسکی دنیا بھر میں مانگ ہوتی تھی۔ مغرب اور مشرق کے تمام ممالک ان اشیا کو بڑے شوق سے خریدتے تھے۔ یہاں سوت اور کپڑے اس قدر عمدہ اور باریک نفیس خوبصورت بنتے تھے کہ دنیا میں کوئی ملک بھی انکی برابری نہ کر سکتا تھا۔" (رسالہ مظلوم کسان ص۱۳)

فرانس کے مشہور سیاح برنیر نے اپنی چھٹی میں مسٹر کالبرٹ کو ہندوستان کی نسبت لکھا تھا کہ۔

"وہ ایسی بے تھاہ خلیج ہے جس میں دنیا بھر کے سونے اور چاندی کا بڑا حصہ ہر طرف سے آکر جمع ہو جاتا ہے اور بمشکل ایک طرف سے باہر کو نکلتا ہے۔ (روشن مستقبل ص۱۵ از رسالہ ہندوستان نے اپنی آزادی کے لئے کس طرح جدو جہد کی مصنفہ مسز اینی بسنت)

عبداللہ وصاف مورخ لکھتا ہے۔

"حضرت آدم (علیہ السلام) کے زمانہ سے اس وقت تک شرق سے لیکر غرب تک اور جنوب سے لیکر شمال تک کوئی ملک ایسا نہیں ہے جس میں باہر کے ملکوں سے سونا اور چاندی اور قیمتی سامان اور جنس آتی ہو اور اس کے بدلے میں کانٹے، جڑی بوٹی، مٹی، سنگریزے اور مختلف قسم کی جڑیں باہر جاتی ہوں اور جہاں سے سامان کی خریداری کے لئے کسی ملک کو کبھی روپیہ نہ گیا ہو۔" (روشن مستقبل ص۱۶)

لارڈ میکالے لکھتا ہے۔

"باوجود مسلمان ظالموں اور مرہٹہ لٹیروں کی موجودگی کے مشرقی ممالک میں صوبہ بنگال باغ ارم سمجھا جاتا تھا۔ اس کی آبادی بیحد و غایت بڑھتی تھی غلّہ کی افراط سے دور دراز کے صوبہ جات پرورش پاتے تھے اور لندن اور پیرس کے اعلیٰ خاندانوں کی بی بیاں یہاں کے کرگھوں کے نازک ترین کپڑے زیب تن کرتی تھیں۔" (روشن مستقبل ص۱۷)

میجر باسو لکھتا ہے۔

"رعایا کی خوشحالی اور سرمایہ داری کے اعتبار سے بھی مسلمانوں کا دورِ حکومت سونے کے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ دولتمندی اور آرام وچین کا جو نقشہ شاہجہاں کے وقت میں دیکھنے میں آتا تھا بلاشبہ بے مثل و بے نظیر تھا۔" (روشن مستقبل ص۱۶)

بنگال کے جگت سیٹھوں کا کاروبار بینک آف انگلینڈ کے برابر پھیلا ہوا تھا جو کہ انگلستان کا سب سے بڑا بنک ہے۔ اور بقول کپتان الگزنڈر ہملٹن سورت کے ایک تاجر مسمی عبدالغفور کا سرمایہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سرمایہ کے برابر تھا۔ انہیں وجوہ سے ہندوستان کی دولت کو لارڈ کلایو نے لازوال دولت کہا تھا (روشن مستقبل ص۱۷)

فاہین چینی اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے۔

"یہاں کی رعایا نہایت خوش حال اور فارغ البال ہے۔ کسی قسم کا مالیہ یا محصول ادا کرنا نہیں پڑتا اور نہ افسروں کی ڈالی ہوئی رکاوٹیں ہی ان لوگوں کے کاروبار میں حائل ہیں جو سرکاری زمین جوتتے ہیں وہ پیداوار کا بہت تھوڑا حصہ بطور لگان ادا کرتے ہیں راجہ کسی کو بدنی سزا نہیں دیتے۔" (رسالہ مظلوم کسان ص۱۳)

نکو موڈی کانتی (مشہور انگریز) اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے

"گنگا کے کنارے بڑے بڑے اور نہایت خوبصورت شہر آباد ہیں جنکے ارد گرد دل خوش کرنے والے باغیچے لگے ہوئے ہیں شہروں کے باہر نہایت خوبصورت کھیت

لہرا رہے ہیں۔ یہاں گویا سونے کے دریا بہ رہے ہیں موتی اور جواہرات کی بھی کوئی انتہا نہیں۔" (رسالہ مظلوم کسان ص۱۴)

مسٹر ڈو ۱۸۰۱ء میں لکھتا ہے۔

"سراج الدولہ کے انتقال کے بعد جن لوگوں نے بنگال میں ہو کر کوچ کیا ہے ان سے اس بات کی تصدیق کرانا چاہتے ہیں کہ اس وقت یہ سلطنت دنیا میں سب سے زیادہ دولتمند، آباد اور کاشت کے اعتبار سے بہترین تھی۔ یہاں کے شرفاء اور تاجر دولت اور عیش میں لوٹ لگاتے تھے اور ادنیٰ درجہ کے کسانوں اور کاریگروں پر خوش حالی اور آسائش کی برکتیں نازل ہوتی تھیں۔" (روشن مستقبل ص۴۴)

"۱۷۷۳ء میں تقریباً ایک ہزار قسم کے سکے کم و بیش تمام ملک میں جا بجا رائج پائے گئے خاصکر (۱۳۹) قسم کی طلائی مہریں (اشرفیاں) (۶۱) قسم کے طلائی ہُن جو گوڈا بھی کہلاتے تھے (۵۵۶) قسم کے نقرئی روپے اور (۲۱۴) قسم کے دوسرے ممالک کے سکے۔ صرف احاطۂ بمبئی کو لیجیے کہ عدالتہائے دیوانی کی ہدایت کے واسطے جو مروجہ سکوں کی فہرست بنائی گئی تھی اس میں (۳۸) طلائی سکوں اور (۱۲۷) نقرئی سکوں کے نام درج ہیں تاکہ ان سکوں کی قدر و قیمت معلوم رہے اور انگریزی روپئے سے مبادلہ کرنے میں سہولت ہو گویا (۱۶۵) قسم کے طلائی اور نقرئی سکے بخوبی رائج تھے اور تانبے کے سکے الگ تھے۔" (معاشیات ہند ص۳۱۷)

شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں سونے کے سکے مندرجہ ذیل وزن کے تھے۔

مہر شاہی جس کی قیمت ایک ہزار روپیہ تھی	دوسری اشرفی	تیسری اشرفی
۱۰۲ تولہ سونا	۹۰ تولہ	۵۰ تولہ

چوتھی اشرفی	پانچویں اشرفی	چھٹی اشرفی	ساتویں اشرفی	آٹھویں اشرفی
۲۵ تولہ	۲۰ تولہ	۳ تولہ	۲ تولہ	۱ تولہ

نویں اشرفی - ۱۷ گرین یعنی ۱۱ ماشہ (معیشت الہند صفحہ ۳۱۴)

شہنشاہ جہانگیر کے زمانہ میں حسب ذیل سکے تھے -

مہر شاہی جس کا نام نورشاہی تھا - دوسری اشرفی جس کا نام نورسلطانی تھا -

۱۰۰ تولہ ۵۰ تولہ

تیسری اشرفی جس کا نام نوردولت تھا - چوتھی اشرفی نورکرم - پانچویں اشرفی نورمہر

۲۰ تولہ ۱۰ تولہ ۵ تولہ

چھٹی اشرفی نورجہانی - ساتویں اشرفی نورانی - آٹھویں اشرفی رواجی

۱ تولہ ۶ ماشہ ۳ ماشہ

مندرجہ بالا تفصیل سونے کے سکوں کی تھی چاندی کے سکے بھی جہانگیر کے زمانہ میں انھیں اوزان کے تھے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے -

کوکب سعد - کوکب اقبال - کوکب مراد - کوکب بخت - کوکب سعد

۱۰۰ تولہ چاندی ۵۰ تولہ ۲۰ تولہ ۱۰ تولہ ۵ تولہ

جہانگیری - سلطانی - نشاری - خیر قبول (ترجمہ تزک جہانگیری صفحہ ۱۰)

۱ تولہ ۶ ماشہ ۳ ماشہ ½ تولہ

صاحب علم المعیشۃ لکھتا ہے -

"ایک زمانہ تھا جب ہندوستان کی دولت کے افسانے اقالیم دنیا میں مشہور تھے اور کہتے ہیں کہ یہی جنس تھی جس نے ایشیا اور یورپ کی جنگجو اور عالی ہمت اقوام کو اس سرزمین کی طرف کشاں کشاں کھینچا تھا - یونانی، عرب، ترک، تاتار آئے اور بے شمار زر و جواہر اور دیگر بیش بہا سامان لیگئے اکبر اعظم نے ہندوستان کو اپنا گھر قرار دیا اور پھر ہندوستان کی دولت ہندوستان ہی میں رہی - اورنگ زیب سریر آرائی سلطنت ہوا تو اس نے آگرہ اور دہلی کے خزانوں کی پڑتال کرنے کا حکم دیا - چنانچہ چھ ماہ تک کئی ہزار نفوس چاندی کے سکے تولنے میں مصروف رہے اور

معلوم ہوا کہ خزانہ شاہی کا صرف ایک کونہ تولا جا سکا ہے۔ اشرفیوں اور جواہرات کی نوبت نہیں آئی۔ اورنگ زیب فوراً اس مہم کو بند کرا کے دکن کی مہم پر چلا گیا۔" (علم المعیشت[۲۵])

مذکورہ بالا شہادتیں اور ان کی جیسی بہت سی شہادتیں تاریخ میں موجود ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان قدیمی زمانہ سے بہت زیادہ دولتمند اور سرمایہ دار ملک تھا۔ روئے زمین پر اس جیسا دولتمند ملک کوئی نہ تھا۔ سونا اور چاندی اور جواہرات اور سچے موتی جس قدر اس ملک میں بکثرت لوگوں کے پاس پائے جاتے تھے۔ دوسرے ملک اس سے تقریباً خالی تھے بعض تاریخیں بتلاتی ہیں کہ ۱۸۰۲ء میں صرافوں کی دوکانوں پر شہروں میں اشرفیوں اور روپیوں کے ڈھیر ایسے لگے ہوتے تھے جیسے منڈیوں میں اناج کے ڈھیر ہوتے ہیں اور یہی وجہ تھی کہ ہمیشہ دوسری قومیں ہندوستان کا قصد کر کے یہاں آتی رہیں۔ یورپین اقوام پرتگیز، ڈچ، فرنچ، انگریز وغیرہ بھی اسی بنا پر سمندری راستوں سے یہاں بار بار آتے رہے۔ اور سبھوں نے یہاں سے بہت زیادہ مال و متاع حاصل کیا۔ یہی وجہ تھی کہ پیٹر اعظم (پہلا زار روس) نے اپنی وصیتوں میں حکومت روس کو وصیت کی تھی کہ وہ ہندوستان کو اپنے قبضہ میں لا کر وہاں سے سونا اور چاندی حاصل کرے۔ اور پھر تمام دنیا پر اس کے سرمایہ کے ذریعہ سے حکومت کرے یہاں کی بسنے والی رعایا نہایت خوش حال اور فارغ البال تھی۔ نہایت آرام اور چین سے زندگی بسر کرتی تھی۔ یہاں کا بادشاہ جشن کے دن سال بھر میں دو دفعہ سونے اور چاندی اور قیمتی فلزات میں تولا جاتا تھا اور جو کچھ وزن میں چڑھتا تھا غریب رعایا میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔

جہانگیر اپنی کتاب (تزک جہانگیری) میں لکھتا ہے۔

"اول میں سونے سے تلا تین من دس سیر چڑھا ہندوستانی حساب سے پھر باقی فلزات اور اقسام خوشبوئیں اور کیفیات میں بارہ دفعہ تلا۔ اور اسی طرح سال میں دو بار میں اپنا وزن کرتا ہوں کہ ہر بار سونا چاندی اور باقی فلزات (دھاتیں) اور ریشم اور عمدہ کپڑوں میں اور اقسام غلہ سے وزن کرتا ہوں۔ اول شروع سال شمسی میں۔

دو بارہ ماہ قمری میں۔ اور نقد اور سامان اپنے تلنے کا الگ تحویلداروں کو دیتا ہوں کہ فقرا اور حاجتمندوں کو تقسیم کر دیں۔"

(دیکھو ترجمہ تزک جہانگیری صفحہ ۴۱، ۴۲، ۹۱، ۹۸، ۱۲۶)

کتاب مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح شہنشاہ جہانگیر مرحوم سال میں دو مرتبہ ان اشیائے بارہ بارہ مرتبہ تلتا تھا اور جو کچھ وزن میں چڑھتا تھا فقرا اور محتاجوں میں تقسیم کرتا تھا۔ اسیطرح اس کا باپ شہنشاہ اکبر بھی کرتا تھا اور جہانگیر کے بعد بھی شاہان مغلیہ اسپر عامل رہے۔

روزانہ شام کو جب بادشاہ کی سواری سیر کے لئے ہاتھی پر نکلتی تھی تو دو توڑے ہزار ہزار روپے کے ہاتھی پر بادشاہ کے دائیں اور بائیں رکھے جاتے تھے اور وہ راستہ میں بادشاہ پر نچھاور کئے جاتے تھے۔ ہر شب میں بادشاہ کے سرہانے ایک توڑا (۱۰۰۰) ہزار روپیہ کا رکھا جاتا تھا اور صبحکو رعایا میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی خیرات اور رعایا پروری بغیر بے شمار دولت کے نہیں ہو سکتی۔ مقریزی کتاب الخطط جلد ثانی صفحہ ۴۰ پر لکھتا ہے کہ

شہنشاہ محمد تغلق مرحوم سالانہ دو لاکھ جوڑے کپڑوں کے رعایا میں تقسیم کرتا تھا دس ہزار گھوڑے علاوہ فوجیوں کے ہر سال رعایا میں تقسیم کیا کرتا تھا۔ روزانہ دو وقتہ بڑے بڑے حکام میں سے بیس ہزار آدمی شاہی مہمان خانہ میں کھایا کرتے تھے شاہی باورچیخانہ میں روزانہ ڈھائی ہزار گائیں اور دو ہزار بکریاں مہمانوں کے لئے ذبح ہوتی تھیں۔ دو سو علماء ہر روز بادشاہ کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ شہر دہلی میں ستر شفاخانے عام رعایا کے واسطے جاری تھے۔ دو ہزار مسافرخانے اور رباطین مسافروں اور غریب الوطنوں کے لئے بنے ہوئے تھے۔ ایک ہزار مدرسے تھے۔"

انکٹیل ڈیو میران ۱۷۶۰ء میں لکھتا ہے۔

"جب میں مرہٹوں کے ملک میں داخل ہوا تو میں نے خیال کیا کہ میں سادگی اور

مسرت کے زمانہ میں ہوں جہاں فطرت ابتک غیر مبدل تھی اور جنگ اور مصیبت سے کوئی آشنا نہ تھا۔ باشندے خوش، قوی اور بہت زیادہ تندرست تھے مہمان نوازی کے جذبات عام تھے دوستوں، ہمسایوں اور اجنبیوں کے استقبال کے لئے ہر چیز بطریق مساوات تیار تھی"۔

(مدینہ بجنور جلد ۲۱ ۵۲ مورخہ ۲۵ جولائی سنہ ۱۹۳۲ء)

مذکورہ بالا جیسی تصریحات سے ہر صوبہ کے متعلق تاریخی کتابیں یوروپین اور غیر یوروپین مصنفوں کی بھری ہوئی ہیں (طوالت کے خوف سے ہم نقل نہیں کر سکتے) یہی وجہ تھی کہ ہندوستان کو پرانے زمانہ میں جنت نشان کے لقب سے ملقب کیا جاتا تھا۔ مگر خدا جانے اس بے شمار دولت اور بے نظیر سرمایہ کو زمین کھاگئی یا آسمان اچک لیگیا یا آندھی اڑا لیگئی۔ اب ماہرین اقتصادیات جو اعداد و شمار پیش کرتے ہیں ان میں ہندوستان دنیا کے ادنیٰ سے ادنی سلطنت سے گرا ہوا ہے۔ مگر افسوس کہ ہندوستان اور ہندوستانیوں کی بدنصیبی اور بدقسمتی نے وہ دن دکھایا کہ وہ جنت نشان ملک یوروپین اقوام اور بالخصوص برطانی قوم کے ہاتھوں جہنم نشان اور تمام دنیا سے زیادہ مفلوک، فاقہ مست اور محتاج ہو کر رہ گیا جس کا مختصر واقعہ یہ ہے کہ "اولوالعزمی اور جہاز رانی میں پرتگال والے یوروپ بھر میں سب سے بڑھے ہوئے تھے اور کوئی دوسری قوم ان سے ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی تھی چنانچہ ہندوستان اور یوروپ کے درمیان بحری راستہ سب سے پہلے انہیں پرتگیزوں نے دریافت کیا۔ انھوں نے سمندر میں جہاز چھوڑ کر افریقہ کے ساحل کے برابر چلنا شروع کیا حتی کہ جنوب میں پہنچکر جو مڑے تو بحر ہند میں آنکلے۔ ہوتے ہوتے ایک مشہور پرتگیز کپتان "واسکوڈے گاما" چند جہاز لیکر سنہ ۱۴۹۸ء میں ہند کے مغربی ساحل پر آیا اور شہر کالیکٹ میں وارد ہوا۔ وہاں کا راجہ زمورن کہلاتا تھا اس نے واسکوڈے گاما کو شاہ پرتگال کے نام ایک خط دیا جس میں تحریر تھا کہ میرے ملک میں دار چینی، لونگ، کالی مرچ اور ادرک کثرت سے ہوتے ہیں۔ میں تمہارے ملک سے سونا چاندی، مونگا اور قرمزی مخمل چاہتا ہوں۔ اس وقت سے سو برس بعد یعنی سنہ ۱۵۰۰ء سے سنہ ۱۶۰۰ء تک ہند کی بحری

تجارت بالکل پرتگیزوں کے ہاتھ میں رہی۔ انھوں نے مقام گوا میں ایک مضبوط قلعہ بنا لیا تھا۔ آج تک یہ مقام پرتگیزوں کے قبضہ میں چلا آتا ہے۔ یورپ کی باقی قوموں نے جو دیکھا کہ ہندوستان کی تجارت سے پرتگال والے مالا مال ہو گئے ہیں اور انھوں نے اپنے ملک اور شہروں کو رشک جنت بنا لیا ہے تو ان کے منہ میں پانی بھر آیا اور شوق ہوا کہ کسی نہ کسی طرح اس تجارت میں شریک ہونا چاہیے۔ پس ہالینڈ، انگلستان، فرانس ڈنمارک، جرمنی، سویڈن کے تاجروں نے اپنے اپنے جہاز بھیجنے شروع کیے۔ مگر کچھ کامیابی ہوئی تو صرف ہالینڈ۔ انگلستان اور فرانس والوں کو باقی کو کچھ نفع نہ ہوا۔" (علم المعیشۃ ص۲۶۳)

چنانچہ ۱۵۹۹ء میں انگریز ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آئے یہاں کی پبلک اور حکام ہمیشہ سے مہمان نواز واقع ہوئے تھے انھوں نے انگریزوں کے ساتھ ہمدردانہ طریقہ پر مراعاتیں ہر قسم کی کیں صاحب معیشۃ الہند لکھتا ہے۔ صفحہ (۳۱۸) "برطانوی عہد کی ابتدا بھی کیا ہی عجیب ہوئی جو قوم آج اس طرح ہند پر مسلط اور حکمران ہے وہ آج سے سوا تین سو سال پہلے محض تجارت کے خیال سے یہاں پہونچی تھی ؎

خدا کے دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

۲۴ ستمبر ۱۵۹۹ء انگلستان کے حق میں کیسا مبارک دن تھا جبکہ لندن کے چند تاجروں نے آپس میں ملکر تہیہ کیا کہ مشرقی ممالک سے تجارت شروع کرنی چاہیے۔ چنانچہ اس غرض سے باقاعدہ ایک کمپنی قائم ہوئی۔ جس میں لندن کے دو سو سے زیادہ تاجر اور امرا شریک تھے۔ ۲۱ دسمبر ۱۶۰۰ء کو ملکہ الزبتھ نے اس کمپنی کو شاہی منشور کے ذریعہ سے بلا شرکت غیرے ممالک مشرق سے تجارت کرنیکے پورے حقوق عطا فرمائے گویا کمپنی کو مشرقی تجارت کا باضابطہ اجارہ مل گیا کوئی اور انگریزی کمپنی اس میں دخل نہیں پا سکتی تھی۔ سترھویں صدی کے شروع میں کمپنی کی طرف سے کچھ انگریز تاجر ہندوستان پہونچے۔ چنانچہ ۱۶۱۲ء میں اول خرنبی

ساحل پر بمقام سورت انھوں نے کاروبار شروع کیا۔ شہنشاہ جہانگیر کا زمانہ تھا نو واردوں نے جن جن رعایات کی بارگاہ سلطانی میں استدعا کی وہ بخوشی عطا ہوئیں ۱۶۱۴ء میں کمپنی نے مشرقی ساحل پر بمقام سولی پٹم کارخانہ کھولا۔ ۱۶۳۹ء میں مقامی راجہ سے مدراس کی زمین لگان پر حاصل کی اور اس کا کچھ حصہ خرید کر وہاں قلعہ تعمیر کیا۔ بنگال میں تجارت کرنے کی اجازت کمپنی نے شہنشاہ شاہجہاں سے ۱۶۳۴ء میں حاصل کی ۱۶۴۰ء میں بمقام ہگلی ایک کارخانہ قائم ہوا جو ۱۶۹۰ء میں بعض مصلحتوں کی وجہ سے کلکتہ کو منتقل ہو گیا اور اسی کے طفیل سے موجودہ شہر کی بنا پڑی جہاں آج بمبئی آباد ہے یہ جزیرہ کبھی پرتگال والوں کے قبضہ میں تھا۔ چارلس دوم نے جب ایک پرتگال شہزادی سے شادی کی تو پرتگال کی طرف سے ۱۶۶۲ء میں یہ جزیرہ دلہن کے جہیز میں ملا۔ چنانچہ چارلس نے آمدنی کے خیال سے ۱۶۶۸ء میں یہ اراضی ایسٹ انڈیا کمپنی کو ۱۰ پونڈ سالانہ لگان پر اٹھادی۔ (آج وہاں دس پونڈ سالانہ کرائے پر ایک جھونپڑی ملنی مشکل ہے) اس طرح ہندوستان کے تینوں باموقع بندرگاہ کلکتہ، بمبئی، مدراس ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ آگئے اور پھر ملک میں کمپنی جس طرح پھیلی اظہر من الشمس ہے۔

حکومت اور صولت کے نشہ میں یہ بات یاد رکھنی یا تسلیم کرنی دشوار ہے کہ کسی زمانہ میں یورپ بالخصوص انگلستان کے نو وارد تاجروں پر ہندوستان کے فرمانرواؤں نے اپنی بے تعصبی اور دریا دلی سے کیا کیا احسان کئے، اور کیسی کیسی رعایات و مراعات روا رکھیں جو بعد کو فریق ثانی کی چالاکی اور احسان فراموشی سے خود ان کے حق میں وبال جان بن گئے اور دوسروں کے واسطے خیر اندیشی اپنے حق میں سخت ناعاقبت اندیشی ثابت ہوئی۔ اگرچہ تاریخ ہند کے اس پہلو پر بہت اہتمام اور احتیاط سے پردہ ڈالا گیا ہے۔ مگر گذشتہ تین صدی کی تاریخ ہند کا یہ سب سے بڑا سبق ہے کہ ہندوستانی فرمانرواؤں کے بیجا رعایات اور بے محل اعتماد نے ہندوستان کو آنکھوں دیکھتے ہاتھوں سے نکال دیا۔" (معیشۃ الہند ص۳۱۶)

غرضکہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور انگریزوں کو ہندوستان کے پادشاہوں اور فرماں رواؤں نے وہ وہ رعایتیں اپنی بے تعصبی اور دریا دلی سے عطا کیں کہ آج یورپ کی تمدن کی مدعی قومیں تو اور انسانیت کی خدمتگذاری کی بلند بانگ دعاوی کرنے والی پادشاہتیں کسی دوسری قوم اور نووارد مسافروں کے ساتھ روا نہیں رکھتیں۔ یہ اور ایسی مراعات تو درکنار حقوق شہریت تک بھی دوسروں کو نہیں دیتیں۔ لارڈ کلایو لکھتا ہے۔

"شہر مرشد آباد مثل لندن کے وسیع، آباد اور خوش حال ہے مگر فرق یہ ہے کہ مرشد آباد میں ایسے ایسے افراد ہیں جو جائداد کے مالک ہونے میں انگلستان کے لوگوں سے بدرجہا بڑھے ہوئے ہیں۔ مرشد آباد میں لاکھوں آدمی رہتے ہیں اور اگر وہ یورپینوں کو تباہ کرنا چاہتے تو محض لاٹھیوں اور پتھروں سے کر دیتے۔"

(روشن مستقبل ص۴۴)

چاہئے تو یہ تھا کہ اگر انگریزوں میں تہذیب اور انسانیت و شرافت، عدل و انصاف، مروت اور اخلاق ہوتے تو ہمیشہ ممنون احسان رہکر دائرہ قانون اور انصاف کے ماتحت شکر گذاری کے ساتھ اپنی جائز تجارت میں مشغول رہتے مگر انھوں نے ابتدا ہی سے ان مراعاتوں سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور اپنی بربریت اور جعلسازیوں اور چالاکیوں اور غداریوں کو ہمیشہ کام میں لاکر ہر طرح ہندوستان میں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم رکھا۔ اور لوٹ کھسوٹ کو اس قدر دن و رات مختلف پیرایوں سے کام میں لاتے رہے کہ ہندوستان کی دولت مندی ایک کہانی بنکر رہ گئی اور ہندوستان تمام دنیا میں سب سے زیادہ غریب فاقہ زدہ کنگال ملک ہو گیا۔ یہاں کی آبادی کروڑوں کی مقدار میں بھوک کی وجہ سے ایڑیاں رگڑتی ہوئی موت کے گھاٹ اتر گئی یہ سلسلہ ابتدائی تجارت سے لیکر آخری ایام حکومت تک تین سو برس سے زاید عرصہ میں برابر جاری رہا مگر ان کے دلوں میں ذرا بھی رحمدلی پیدا نہ ہوئی اور ہندوستانیوں کی لاچارگی اور مصیبتوں کا خیال بھی نہیں آیا۔ بے شک سنگدل حملہ آوروں کی عادت رہی ہے کہ وہ فتحیابی پر

اپنی مفتوح قوموں اور ملکوں کو لوٹا کرتے تھے مگر امن قائم ہو جانے اور اطاعت کا دم بھر لینے کے بعد سخت سے سخت سنگدل اور وحشی حملے آور لوٹ کھسوٹ کا خیال بھی اپنے ذہن میں نہیں لاتے تھے مگر انگریز قوم اطاعت اور فرمانبرداری کا دم بھرنے والی ہندوستانی رعایا کے متعلق بھی اسی لوٹ کھسوٹ کی تگ و دو اور فکر اور کوششوں میں مشغول رہی اور نئے نئے انسانیت سوز طریقوں اور قوانین سے ہندوستانی پبلک اور امرار کو برباد کرتی رہی۔ اس کی تفصیل تو بہت طویل ہے مگر ہم معتمد انگریزوں کی شہادتوں سے مختصر طور پر کچھ شہادتیں نقل کرتے ہیں۔ سر ولیم ڈگبی ممبر پارلیمنٹ اپنی کتاب پراسپرس برٹش انڈیا میں انگریزی ادوار کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتا ہے۔

"جو کچھ سنہ ۱۹۰۱ء میں (جبکہ ہندوستان میں نہایت مہلک قحط پڑا ہوا تھا اور روزانہ لاکھوں آدمی بھوک اور فاقوں سے مرتے تھے) ہمارے طریقہ حکومت ہند میں دکھائی دے رہی ہے جہاں تک کہ ہندوستانیوں کا تعلق ہے اور جو کہ غیر معمولی غربت ہندوستانی براعظم میں پھیل رہی ہے وہ ہماری اس طرز حکومت کا نتیجہ ہے جو نیک نیتی سے مگر غلطی سے پہلے سے شروع کی گئی اور ابتک بحال رکھی گئی وہ اصول حکومت تین قسم کے ہیں۔

اول تسلط بذریعہ تجارت۔ ہندوستان کی دولت علانیہ سمیٹنا ننگے طور سے سنہ ۱۷۵۷ء سے سنہ ۱۸۳۴ء تک۔

دوم تسلط بذریعہ اطاعت بالجبر۔ ہندوستان انگلینڈ کے لئے ہے آغاز سے انجام تک سنہ ۱۷۵۷ء سے سنہ ۱۸۳۲ء تک

سوم تسلط بذریعہ پوست۔ خوش معاملگی کا دکھاوا اور زور کے ساتھ ہندوستانی قوم کو ادنیٰ حالت میں لازمی طور پر قائم رکھنا۔ سنہ ۱۸۳۳ء سے سنہ ۱۹۰۱ء تک"۔

(خوشحال برطانوی ہند ترجمہ پراسپرس برٹش انڈیا صفحہ ۱۴۱)

اب ہم ان تینوں اصول حکومت اور تینوں ادوار کے حالات تفصیلیہ مختصر طور پر بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں ان تینوں دوروں اور اصول حکومت میں یہ امر مشترک رہا ہے کہ ہندوستان کی دولت اور سرمایہ کو زیادہ سے زیادہ حاصل کیا جائے اور انگلستان کو پہونچایا جائے۔ اگرچہ طریقہ حصول میں اختلاف نظر آتا ہے۔ پہلے دور کے متعلق سر ولیم ڈگبی لکھتا ہے۔

کمپنی کا پہلا دور جو کہ تجارت کا کہلاتا ہے | کہ ننگے طور سے علانیہ ہندوستان کی دولت ابتدا سے ۱۷۵۷ء تک (یعنی جنگ پلاسی کے زمانہ تک) سمیٹ کر انگلستان کو پہونچائی گئی۔ اسکی کیفیت خود کمپنی کے ڈائرکٹروں کی مندرجہ ذیل یادداشت سے معلوم ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں

"ہمارے خیال میں یہ بڑی دولت جو ہم نے ہندوستانی تجارت سے حاصل کی ہے ظالمانہ اور جابرانہ دستور العمل سے مہیا ہوتی ہے۔ ایسا دستور العمل جسکی نظیر نہ کسی ملک میں ملتی ہے نہ کسی زمانہ میں ملے گی"۔ (تنظیم امرتسر جلد ۱۵/۱ ، ۲۰ اگست ۱۹۲۶ء)

یادداشت مذکورہ بالا میں لفظ بڑی دولت کا جو ذکر کیا گیا ہے اس کی مختصر کیفیت اس سے معلوم ہوتی ہے کہ مصنف رسالہ "ایسٹ انڈیا ٹریڈ" صفحہ ۳۰ و ۱۶ پر لکھتا ہے۔

"سب سے پہلے ۱۶۰۱ء میں ہندوستان کو جہاز روانہ کئے اور کچھ ایسی مبارک گھڑی سے تجارت شروع کی کہ ہر سفر میں منافع بڑھتا ہی رہا۔ یہاں تک کہ بارہویں سفر میں ہر حصہ دار کو (۳۳۴) فیصدی نفع ہوا۔ انگلستان کی آمدنی میں بھی دن دونی رات چوگنی زیادتی ہو گئی۔ ۱۶۱۳ء میں برطانیہ کی سرکار کو کمپنی نے (۱۳۰۰۰) تیرہ ہزار پونڈ محصول ادا کیا۔ اور ۱۶۶۲ء میں یہ رقم چالیس ہزار تک پہونچی۔ ہندوستان میں پہلے بیس سال کے اندر یہ لوگ تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ پونڈ کا سونا چاندی لائے جس کے بدلے ہندوستان کی مصنوعات خرید کرلے گئے۔ ان اعداد سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انکا کاروبار شروع ہی میں کس پیمانہ پر پہونچ گیا تھا (حالانکہ کمپنی کا مشترک سرمایہ ابتدا میں کل تیس ہزار پونڈ تھا جس کو لندن کے ایک

سوا ایک تاجروں نے ملک ہندوستانی تجارت کے لئے جمع کرکے ملکہ الزبتھ کے دربار میں محضر پیش کرتے ہوئے اجازت کا معیار بنایا تھا جو ۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ء میں شاہی منشور کیا گیا تھا۔ معیشۃ الہند ص۶۶۳)

لیکن یہ بڑے بڑے منافع اوٹھانا ناممکن تھا اگر ہندوستانی تاجروں اور ہندوستانی حکومتوں نے ان کو محبت کے ساتھ اپنے دامن میں جگہ نہ دی ہوتی" (روشن مستقبل ص۳۲)

بادشاہ انگلستان چارلس اول (جنکا زمانہ حکومت ۱۶۲۵ء لغایت ۱۶۴۹ء ہے) کمپنی سے دس ہزار پونڈ بطور نذرانہ بنام قرض حسنہ طلب کیا تو کمپنی یہ مقدار پیش نہ کرسکی جس سے چارلس اول خوش نہوا اور کمپنی کی حسب خواہش امداد میں اس نے کوتاہی کی۔ پھر کرام ول بادشاہ انگلستان (جس کا عہد حکومت ۱۶۵۰ء سے ۱۶۶۰ء تک رہا اور اسی کے عہد میں انگلستان میں جمہوری طریقہ قائم ہوا) اس کو ساٹھ ہزار پونڈ بطور نذرانہ بنام قرض حسنہ پیش کیا۔ کیونکہ اس نے کمپنی کی دل کھول کر امداد کی تھی۔

صاحب معیشت الہند لکھتا ہے۔

"غرضکہ کرام ول کی حمایت نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو آخری وقت میں تباہی سے بچالیا اور مردہ تن میں روح پھونک دی۔ کمپنی کا سرمایہ ضرورت اور توقع سے بڑھ گیا کاروبار کی گرم بازاری شروع ہو گئی کمپنی نے اپنی حیثیت کے موافق کرام ول کا بہت شکریہ ادا کیا۔ تقریباً ساٹھ ہزار پونڈ قرض حسنہ کے نام سے بطور نذرانہ پیش کئے تاہم کمپنی کرام ول کی بہت شکر گذار تھی۔" (معیشت الہند ص۶۶۵)

پھر چارلس دوم ۱۶۶۰ء سے فرمانروائے انگلستان ہوا اس نے کمپنی کی امداد میں بہ نسبت سابق بادشاہوں کے بہت زیادہ حصہ لیا۔ صاحب معاشیات ہند ص۶۶۲ پر لکھتا ہے۔

"کرام ول نے آخری زمانہ میں کمپنی کی مردہ تن میں جان ڈالی تو چارلس دوم نے اسکو جوان رعنا بنادیا۔ بادشاہ کی موافقت اور حمایت سے کمپنی کے کاروبار کو خوب

فروغ ہوا۔ چنانچہ چارلس دوم کا عہد کمپنی کی تاریخ میں ایک مستقل دور شمار ہوتا ہے۔
کمپنی نے بھی احسان شناسی اور شکر گذاری میں کوئی کمی نہیں کی۔ دل کھولکر نذرانے
پیش کئے اور مختلف مواقع پر قرض حسنہ کے نام سے معقول رقمیں داخل کیں۔
چنانچہ تخمینہ کیا جاتا ہے کہ تین چار لاکھ پونڈ چارلس کو کمپنی سے وصول ہوئے"۔

مذکورہ بالا شہادتوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ کمپنی جس کا سرمایہ ابتدائی سنہ ۱۶۰۰ء میں کل تیس ہزار پونڈ تھا تقریباً ساٹھ برس تجارت کرنے کے بعد اس قدر دولتمند ہوجاتی ہے کہ بادشاہ انگلستان کو بطور نذرانہ تین چار لاکھ پونڈ پیش کرتی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے اس مدت میں ہندوستان کی اس عجیب وغریب تجارت سے خدا جانے کتنے کروڑ پونڈ حاصل کرلئے ہوں گے۔ جب لاکھوں پونڈ بطور نذرانہ پیش کرتی ہے۔ حالانکہ اس زمانہ میں کمپنی کو پرتگیزوں ہالینڈی ڈچوں، فرانسیسیوں، جرمنوں وغیرہ سے مقابلہ کرنا پڑا اور ایسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کہ بارہا اپنے کاروبار تجارت بلکہ اپنے وجود کو بھی فنا کے گھاٹ اتر جانے کا خطرہ نظر آنے لگا اگر چارلس اول اور کرام دل اور چارلس دوم اپنے اپنے زمانہ میں کمپنی کے سنبھالنے میں حصہ نہ لیتے تو وہ یقیناً صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی۔

اس زمانہ میں کمپنی کے علاوہ دوسری جماعتیں انگریزوں کی بھی انفراداً یا اجتماعاً ہندوستان میں تجارت کرتی تھیں اس لئے کمپنی کو خوب کھل کرکے لوٹ کھسوٹ اور من مانی کارروائیوں میں پوری آزادی نہ تھی، آپس میں مخالفتیں اور روک ٹوک رہا کرتی تھی۔ بالآخر سنہ ۱۷۰۸ء میں ان سبھوں کی ایک ہی جماعت بنادی گئی۔ جو کہ زیر سرپرستی حکومت انگلستان تجارت میں پیش قدمی اور انہماک کرتی رہی اور حکم ہوگیا کہ کوئی انگریز انفراداً یا اجتماعاً علاوہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی کاروبار ہندوستان میں نہ کرے۔

چنانچہ سنہ ۱۷۰۸ء سے کمپنی نے نیا مگر زوردار قدم اٹھایا۔ اسی لئے سر ولیم ڈگبی سنہ ۱۷۰ ہی سے پہلا دور بتلاتا ہے۔ حالانکہ اس وقت تک کروڑوں

اشرفیاں یہاں سے انگلستان کو لیجا چکی تھی مگر ۱۷۶۰ء سے تجارتی لوٹ کھسوٹ نئے اور پر زور طریقہ پر جاری ہوئی اور ۱۸۵۷ء تک خالص تجارتی طور پر جاری رہی۔ اس وقت پرتگیز بالکل اور ڈچ تقریباً ختم ہو چکے تھے۔ اب کمپنی بالکل کھل کھیلی اور اس قدر نفع کمایا کہ اس کی کوئی حد اور نہایت ہی باقی نہ رہی۔

ڈائرکٹروں کی یادداشت میں جو ظالمانہ اور جابرانہ دستور العمل سے اس تجارت کے مہیا ہونے اور اس کی کسی ملک اور کسی زمانہ میں نظیر نہ ملنے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس کی حقیقت مندرجہ ذیل شہادتوں سے معلوم ہوتی ہے۔ ہم پہلے ایسی شہادتیں پیش کر چکے ہیں کہ کمپنی کے کارکن ہمیشہ یہی کوشش کرتے تھے کہ کوئی جنٹلمین اور شریف آدمی ہندوستان میں کمپنی کا ملازم ہو کر نہ آئے کیونکہ وہ شریفانہ طریقہ تمام لین دین اور معاملات میں اختیار کرے گا تو وہ جابرانہ لوٹ کھسوٹ جو کہ بے اندازہ منافع حاصل کرنے کے لئے ہم عمل میں لاتے اور سرکار کمپنی کو سالانہ پہونچاتے رہتے ہیں وہ بند ہو جائے گی تو خطرہ ہے کہ وہ اپنے اپنے سرمایہ کو واپس لیلیں اور کمپنی ٹوٹ جائے اس لئے تمام کارکنان کمپنی جرائم پیشہ ڈاکو، قاتل، چور، جعلساز، بدمعاش غیر شریف لوگوں کو جمع کرتے تھے اور ایسے ہی لوگوں کو وہاں سے بلاتے تھے اور انتہائی بربریت اور جبر و ظلم عمل میں لاتے تھے۔ چنانچہ ہم مسٹر جیمس مل کا مقالہ تاریخ برٹش انڈیا صفحہ ۲۳ سے نقل کر چکے ہیں کہ ۱۶۰۰ء جبکہ کمپنی نے ہندوستان میں تجارت کرنے کی اجازت حاصل کرنے کیلئے درخواست دے رکھی تھی اور منظوری کا مسئلہ زیر غور تھا تو گورنمنٹ انگلستان کی طرف سے کمپنی والوں کو لکھا گیا کہ تم اپنی مہم میں سر ایڈورڈ مائیکل بوردن کو نوکر رکھ لو تو اس کے جواب میں ایک عجیب و غریب رزولیوشن کی نقل بھیجی گئی جس کا مطلب حسب ذیل تھا۔

"کسی ذمہ داری کے کام پر جنٹلمین کو نہ رکھا جائے اور گورنمنٹ سے درخواست کیجائے کہ ہمیں اپنے کاروبار کے لئے اپنے ہی قسم کے لوگوں کا انتخاب کرنیکی اجازت دی جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شرفا کو نوکر رکھنے سے کمپنی کے عوام الناس

حصہ دار شبہ میں پڑکر روپیہ واپس لینے لگیں"۔

الغرض کمپنی کی بناوٹ ایسے ہی لوگوں سے تھی اور چونکہ اس وقت کمپنی کا مقصد اصلی اور نصب العین تجارتی منافع تھا۔ اس کے حصہ داروں کی مجلس منتظمہ (کورٹ آف ڈائرکٹرس) سب سے پہلے اپنے سالانہ منافع پر نظر رکھتی تھی۔ لہذا کمپنی کے وہ ملازم جو ہندوستان میں خرید و فروخت پر مقرر تھے چھوٹی چھوٹی تنخواہیں پاتے تھے۔ فیکٹری کے صدر کو تین سو پونڈ سالانہ ملتے تھے۔ جو کہ سب سے اونچی تنخواہ تھی۔ محرروں اور دوسرے ملازمین کو دس سے لیکر چالیس پونڈ سالانہ تک دیے جاتے تھے اور قیام و طعام کمپنی کے ذمہ ہوتا تھا۔ چونکہ اس زمانہ میں پونڈ دس روپیہ کو چلتا تھا اس لئے کمپنی کے عام ملازمین کو آٹھ روپیہ ماہوار اور کھانے سے لیکر تینتیس (۳۳) روپے ماہوار اور کھانا تک ملتا تھا۔ اور ملازمت کے ساتھ تجارت کا نفع ایک غیر معین چیز تھی۔ اس کے لئے وہ لوگ چھ ماہ کا سفر کرکے یہاں آتے تھے۔ ان تنخواہوں پر بھلے مانس اور شریف لوگ تو کاہے کو اپنے گھر بار چھوڑ کر آتے۔ چنانچہ ملک کے نکمے اور شریر جرائم پیشہ لوگ جنکو وہاں روٹی ملنی مشکل تھی بالخصوص اس وجہ سے کہ اس زمانہ میں انگلستان میں قحط بہت زیادہ پڑتا تھا اور ہندوستان میں بہت زیادہ ارزانی تھی ہندوستان کیلئے ٹوٹ پڑے۔ جنکی وجہ سے کمپنی کی فیکٹریاں بداعمالیوں کے اڈے بن گئیں۔ ان لوگوں نے ہر قسم کے مظالم اور وحشیانہ کارروائیاں بے تحاشا جاری کیں۔ اور ہر طریقہ پر روپیہ پیدا کرنے میں جد و جہد عمل میں لاتے رہے۔ چنانچہ نواب کرناٹک کا مندرجہ ذیل مقالہ ہم پہلے نقل کر آئے ہیں۔ جو کہ انھوں نے کمپنی کے ڈائرکٹروں کو لکھا تھا۔

"آپ کے نوکروں کا اس ملک میں کوئی کاروبار تو ہے نہیں۔ نہ آپ انھیں معقول تنخواہیں دیتے ہیں۔ پھر بھی چند ہی سال میں وہ کئی کئی لاکھ اشرفیاں کما کر واپس جاتے ہیں۔ اتنی قلیل مدت میں بغیر کسی ظاہری ذرائع کے بے حساب کمائی کہاں سے آتی ہے ہم اور آپ دونوں سمجھ سکتے ہیں"

انھیں جیسے لوگوں کے متعلق وارن ہیٹنگس نے مندرجہ ذیل مقالہ لکھا تھا جس کو ہم پہلے نقل کر آئے ہیں۔

"انگریز ہندوستان میں آکر بالکل نیا انسان بن جاتا ہے۔ جن جرائم کی وہ اپنے ملک میں کبھی جرأت کر ہی نہیں سکتا۔ ہندوستان میں ان کے ارتکاب کے لئے انگریز کا نام جواز کا حکم رکھتا ہے اور اس کو سزا کا خیال تک نہیں ہو سکتا۔

سر ٹامس سڈ ہنسہم کہتا ہے۔

"میں ہمیشہ سے دیکھتا ہوں کہ بمقابلہ اور قوموں کے انگریز ممالک غیر میں سب سے زیادہ چیرہ دستی کرتے ہیں۔ اور ہندوستان میں بھی یہی واقعہ پیش آرہا ہے۔"

مدراس کے بڑے پادری صاحب کی اس تحریر کو جو انھوں نے ان انگریز جرائم پیشہ رذیل اور شریر لوگوں سے تنگ آکر کمپنی کے ڈائرکٹروں کو ۱۶۷۶ء میں لکھی تھی ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں جو کہ حسب ذیل تھی۔

"آپ کے ملازموں کی بداعمالیوں سے ہندوستانیوں کی نظر میں آپ کے خدا کی جتنی بے عزتی ہوتی ہے اور آپ کا مذہب جتنا بدنام ہو رہا ہے اس کی کیفیت اگر آپ کو معلوم ہو جائے تو آپ کے آنسوؤں کی ندیاں بہ جائیں۔ جو لوگ آتے ہیں ان میں بعض تو قاتل ہوتے ہیں۔ بعض آدمیوں کو بھگا لیجانے کا کام کرنے والے اور بعض انگلستان میں بیویاں چھوڑ کر آتے ہیں اور یہاں پھر شادیاں کر لیتے ہیں"

غرضکہ کمپنی نے تمام کارکن ایسے ہی دنی الطبع اور غیر شریف قصداً جمع کئے تھے جنکو کسی شرمناک اور انسانیت سوز کارروائی سے رکاوٹ نہ تھی اور اپنے مقاصد ملعونہ لوٹ کھسوٹ اور زرکشی میں نہایت آزادی سے بلاخوف وخطر ہر قسم کی کارروائی کرتے تھے۔ مشتے نمونہ از خروارے کرناٹک کا ایک تاریخی واقعہ ملاحظہ ہو۔

ان کے روپیہ کمانے کے مختلف قسم کے طریقے تھے ان میں سے ایک قرضہ دینا بھی تھا

مگر جس نوعیت کے یہ قرضے ہوتے تھے ان کی نظیر دنیا میں ملنی مشکل ہے۔ چنانچہ مسٹر برک نے ایک قرضہ کی نسبت لکھا ہے۔

"نواب کرناٹک کو روپیہ کی ضرورت ہوئی۔ کیونکہ فوج کی تنخواہ تقسیم نہ ہوتی تھی جس سے وہ فساد برپا کرتی رہتی تھی۔ مدراس کونسل نے دوستانہ طور پر سمجھایا کہ ان شوریدہ سر فوجیوں کو دبایئے۔ نواب نے جواب دیا کہ روپیہ سے مجبور ہوں کیا کروں۔ اس پر انگریزی حکومت نے چند ساہوکاروں کو آمادہ کر دیا کہ نواب کو چار لاکھ اشرفی (پیگوڈا) قرض دیدیں۔ یہ ساہوکار مسٹر ٹیلر، مسٹر میجنڈی، مسٹر کال تھے۔ یہ راضی تو ہو گئے۔ مگر اس شرط پر کہ مدراس کی انگریزی حکومت نواب کی ضمانت کرے چنانچہ ضمانت کر لی گئی اور طے پایا کہ چند اضلاع قرض خواہوں کو سپرد کر دیئے جائیں جن کی مالگذاری سے وہ اپنا سود وصول کرتے رہیں۔ اس کے مطابق نواب سے معاہدہ ہو گیا اور اس نے فوراً ان سپاہیوں کو علاحدہ کر کے اعلان کر دیا کہ ان کی چڑھاؤ تنخواہیں ادا کر دی جائیں مگر ان انگریز ساہوکاروں کے پاس سے قرضہ کا روپیہ نہ آیا۔ بڑے تقاضوں کے بعد جواب آیا تو یہ تھا کہ نقد روپیہ اس وقت نہیں ہے۔ چار ماہ کے اندر ادا کر دیا جائیگا۔ سردست ہم آپ کو رقعہ لکھے دیتے ہیں کہ اس میعاد کے اندر روپیہ دیدیں گے۔ نواب نے افسروں کو بلا کر حال بتایا اور کہا کہ فوجیوں کو سمجھا بجھا کر مطمئن کر دو کہ چار مہینہ بعد تنخواہ مل جائے گی۔ مگر چار مہینے کی جگہ پورے دو سال گذر گئے اور فوجیوں کی بقایا پوری ادا نہ ہوئی۔ جس کی وجہ سے نواب کو مزید دو سال کی تنخواہیں دینا پڑیں۔ مگر ساہوکاروں کی اسقدر نا دہندی کے باوجود نواب کی ریاست کی مالگذاری قرضہ کے سود میں اسی دن سے جس دن سے کہ رقعہ لکھا گیا تھا جانے لگی۔ گویا انھیں اضلاع کی مالگذاری سے موعودہ رقم بانٹ دی گئی۔ غالباً دنیا میں یہ ایک ہی مثال ہوگی کہ روپیہ کی ادائیگی سے قبل قرض خواہوں کو

جائداد پر قبضہ مل جائے۔ اور اس سے وہ اپنے سود کا روپیہ وصول کرنا شروع کر دیں اور پھر الٹا قرضداروں کے نام غیر اداشدہ رقم کا رقعہ لکھیں اور مرہونہ جایداد سے وصول کر کے دو سال بعد قرضداروں کو روپیہ دیں۔

(روشن مستقبل صہ ۳۹ از تصانیف برک جلد ۲ صہ ۲۰۹ تا ۲۱۰)

یہی وہ کیمیا بنانے کے نسخے تھے جن سے تھوڑے ہی دنوں میں انگریز ساہوکار اور تاجر اور ان کا ملک مالا مال ہونے لگا۔ ابھی کرناٹک کی مرہونہ جائیداد سے کمائی کرنے کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ بنگال کے خزانوں کے دروازے ان پر کھل گئے۔ بھر حال ۱۷۵۷ء تک کمپنی کا یہ شرافت اور انسانیت سوز طریقہ تجارت جابرانہ اور ظالمانہ طور کا جاری رہا۔ جس سے نہایت عظیم الشان دولت ہندوستان سے چوس لی گئی۔

اس کے بعد دوسرا دور شروع ہوتا ہے جس کی ابتدا جنگ بنگال یعنی نواب سراج الدولہ کی پلاسی کی لڑائی سے ہوتی ہے۔ سر ولیم ڈگبی اس کے متعلق مندرجہ ذیل الفاظ لکھتا ہے کمپنی کا دوسرا دور جو کہ جبر کا کہلاتا ہے دوم تسلط بذریعہ اطاعت بالجبر۔ ہندوستان انگلینڈ کے لئے ہے آغاز سے انجام تک ۱۷۵۷ء سے ۱۸۳۲ء تک۔ اس کی تفصیل نہایت ہی درد انگیز اور وحشتناک ہے اور اس قدر طویل ہے کہ اس کے لئے دفتروں کی ضرورت ہے۔ ہم اس مقام پر نمونہ کے طور پر چند شہادتیں پیش کریں گے جن سے حقیقت ظاہر ہو جائیگی مگر ان شہادتوں سے پہلے واقعہ کی تفصیل پر مختصر روشنی ڈالنی ضروری معلوم ہوتی ہے۔

"کلکتہ میں بیٹھکر انگریزوں نے ایک سازش کا سلسلہ شروع کیا جس میں میر جعفر اور امی چند شریک تھے۔ انگریز مورخ واقعات لکھتے نہیں بلکہ تصنیف کرتے ہیں۔ اس سازش کو اس بددلی کا نتیجہ بتلاتے ہیں جو بنگال کے ہندو محکوم کو مسلمان حاکم سے پیدا ہوگئی تھی۔ اس الزام کی تردید ہمارے مبحث سے خارج ہے۔ بہر کیف سازش مکمل ہوتے ہی جنگ چھیڑ دی گئی اور پلاسی کے میدان میں دونوں لشکر بالمقابل آگئے۔ سراج الدولہ کے

چالیس ہزار پیادے اور پندرہ ہزار سوار انگریزوں کے صرف تین ہزار سپاہ کے مقابلہ میں تھے۔ لیکن انگریزوں کی قوت کا مدار تعداد پر نہیں بلکہ نظم اور دوسری چیزوں پر تھا۔ یہ دوسری چیزیں کیا تھیں۔ یہ فریب اور نمک حرامی دغا اور سازش تھیں جن میں سراج الدولہ گھرا ہوا تھا اور باوجود نام نہاد کثیر جمعیت کے درحقیقت اکیلا اور بے یار و مددگار تھا چنانچہ صبح کے آٹھ بجے سے دن کے بارہ بجے تک کل چار گھنٹہ میں اس تاریخی جنگ کا فیصلہ سراج الدولہ کے خلاف ہو گیا۔

انگریزوں کی طرف سے سراج الدولہ کے وزیر میر جعفر کو نمک حرامی کے صلہ میں مرشد آباد کی مسند دی گئی۔ اس جنگ کی اہمیت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انگریزی فوج میں سے صرف بتیس سپاہی اور نواب کی فوج میں پانچ سو آدمی کام آئے۔ یہ تعداد جلیانوالہ باغ اور بلوہ کانپور کے مقتولین سے زیادہ نہ تھی لیکن اس جنگ نے ایک وسیع اور شاداب ملک کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ فورٹ ولیم میں سونے کا مینہ برسنے لگا۔ میر جعفر کی طرف سے تین لاکھ پونڈ یعنی تیس لاکھ روپیہ کلائیو کو نذر دیا گیا اور کلکتہ کا جنوبی علاقہ اسے جاگیر میں دیا گیا جس کی آمدنی دس لاکھ روپیہ سالانہ تھی۔ اسی طرح ساٹھ ہزار پونڈ یعنی چھ لاکھ روپیہ کونسل کے ممبروں کو پیش کیا گیا۔ یہ تو ذاتی انعامات تھے۔ کمپنی کے ہرجے خرچے اور تاوان کے مطالبات ان سے الگ تھے جن کو اس وقت پورا کرنے کی گنجائش خزانہ میں نہ رہی تھی اس لئے صرف نصف کی ادائیگی ہو سکی۔ چوبیس پرگنہ کا علاقہ کمپنی کی جاگیر ٹھہرا بقول میکالے۔

"کمپنی اور اس کے نوکروں پر موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ اسی لاکھ روپیہ دریا کے راستہ مرشد آباد سے کلکتہ روانہ کر دیا گیا۔ سو سے زیادہ کشتیاں تھیں۔ جھنڈیاں اڑ رہی تھیں۔ اور باجا بجتا جاتا تھا۔ چند ماہ پہلے جو کلکتہ ویران تھا آج ایسا خوش حال ہو گیا کہ کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ تجارت چمک اٹھی۔ ہر

انگریزوں کے گھر میں دولت کے آثار دکھائی دینے لگے"۔ (سوانح کلایو مصنفہ میکالے ص۵۴)

اس جنگ کی کامیابی سے جو ۱۷۵۷ء میں ہوئی کمپنی کے خالص تجارتی دور کا خاتمہ ہو گیا جو ۱۶۰۰ء سے شروع ہو کر پورے ڈیڑھ سو سال تک رہا اور اب ایک وسیع ملک ہاتھ میں آجانے سے تجارت کے ساتھ حکومت کا دور شروع ہوا۔ (روشن مستقبل ص۲۲،۴۱) علاوہ اس مقدار کے جو میر جعفر سے حاصل کی گئی عام لوٹ کا بازار بھی گرم کیا گیا۔ چنانچہ لارڈ کلایو کہتا ہے (درباره لوٹ بنگال)

"تین کروڑ انسانوں کو لوٹ کر کلکتہ میں عظیم الشان دولت بہت جلد جمع کر لی گئی تھی ہندوستانی قدیم زمانوں میں معمولی معمولی نظام کی خرابی پر اپنے حاکموں کو برطرف کر دیا کرتے تھے مگر انگریزی حکومت سنگدل سے سنگدل وحشی اور مستبد حکومتوں کی طرح ظالم اور سخت تھی۔ مزید براں تمام تمدنی طاقتور ہتھیاروں سے مسلح تھی"۔ (تنظیم امرتسر مورخہ ۲۸ اگست ۱۹۲۷ء)

یہی لارڈ کلایو دوسری جگہ کمپنی کے کارکنوں کے متعلق لکھتا ہے۔

"میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس قدر بد عملی، رشوت خواری اور زیادہ ستانی کا منظر بجز بنگال کے کسی ملک میں دیکھا یا سنا نہیں گیا"۔

(حکومت خود اختیاری ص۱۰ از سوانح عمری لارڈ کلایو مصنفہ میلکم)

بروکس ایڈسن کہتا ہے (کتاب قانون تمدن و تنزل)

"یہ مالا مال خزانے کروڑوں آدمیوں کی کمائی انگریزوں نے ہتھیا کر لندن اسی طرح بھیجدی جس طرح رومن نے یونان اور پونٹس کے خزانے اٹلی بھیجدیئے تھے۔ ہندوستانی خزانے کتنے قیمتی تھے کوئی انسان بھی اس کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ لیکن وہ کروڑوں اشرفیاں ہوں گی۔ اتنی دولت اس وقت کی مجموعی یورپین دولت سے بہت زیادہ تھی جب میں ۱۸۷۰ء میں انگلستان آیا تو یہاں بڑے

بڑے شہر تھے جہاں کوئی بینک نہ تھا۔ بنگال کی چاندی نے انگلستان پہونچکر نہ صرف دولت میں بیشمار اضافہ کیا بلکہ اس کی رفتار بھی بہت تیز کردی"۔

(تنظیم امرتسر مورخہ ۲۰ اگست ۳۸ء ص ۹ حکومت خود اختیاری ازان ہیپی انڈیا ص ۲۲۵)

سر ولیم ڈگبی لکھتا ہے۔ از کتاب "قانون تہذیب و تنزل" مصنفہ بروک ایڈمسن۔

"معرکہ پلاسی کے بعد ہی بنگالہ کی دولت لُٹ لُٹ کر لندن پہونچنے لگی اور اس کا اثر فوراً ہی ظاہر ہوگیا۔ کیونکہ ماہران فن سب اس امر پر متفق ہیں کہ صنعت و حرفت کا انقلاب ۱۷۶۰ء سے شروع ہوا۔ بقول بنیر کے ۱۷۶۰ء سے پہلے لنکاشایر میں سوت کاتنے کے جو چرخے رائج تھے وہ ایسے ہی سیدھے سادے ہوتے تھے جیسے ہندوستانی چرخے۔ ایجاد بجائے خود ایک بے جان چیز ہے۔ بہت سی ایجادات صدیوں تک دبی پڑی رہیں اور جبتک اُنھیں حرکت دینے والی قوت پیدا نہ ہوگئی وہ دنیا کے سامنے نہ آسکیں۔ یہ قوت ہمیشہ روپیہ سے فراہم ہوتی ہے۔ صنعت و حرفت میں انگلستان کی برتری کرناٹک اور بنگالہ کے خزانوں کا فیض ہے جو اس وقت انگریزوں کے فائدے کیلئے حاضر تھے پلاسی کی جنگ فتح ہونے سے پہلے جبکہ سونے کا دریا انگلستان کی طرف بہنا شروع نہوا تھا ہماری صنعت و حرفت کا بازار ٹھنڈا تھا۔ چرخوں کے لحاظ سے سوت کاتنے اور کپڑا بننے میں لنکاشایر کو ہندوستان پر کوئی فوقیت حاصل نہ تھی البتہ وہ دستکاری جس نے ہندوستانی کپڑے کو صناعی کا عجوبہ بنا رکھا تھا لنکاشایر کیا مغرب میں کہیں بھی موجود نہ تھی۔ جو حال روئی کا تھا وہی حال لوہے کا بھی تھا کان کنی اور آہن گری دونوں کام انگلستان میں بہت معمولی رفتار سے چل رہے تھے"۔

(انڈسٹریل رپورٹ مالوی ص ۳۰۶)

میجر وینگیٹ کہتا ہے۔

"ایسٹ انڈیا کے ڈائرکٹروں کے سرسری اندازہ کے ساتھ بڑی آسانی سے دعوے کیا جا سکتا ہے کہ جنگ پلاسی اور جنگ واٹرلو کے درمیانی زمانہ میں ہندوستان سے انگلستان کو پندرہ ارب روپیہ جا چکا تھا"۔

لارڈ میکالے دربارہ لوٹ بنگال لکھتا ہے۔

"اس طریقہ سے بے شمار دولت بہت جلد کلکتہ میں جمع ہوگئی دراں حالیکہ تین کروڑ انسان حد درجہ برباد کردیئے گئے۔ بیشک ان لوگوں کو مظالم میں رہنے کی عادت تھی مگر وہ مظالم اس قسم کے نہ تھے۔ کمپنی کے لوگوں کی چھوٹی انگلی انھیں سراج الدولہ کے پٹھے سے زیادہ موٹی معلوم ہوتی تھی۔ پرانے زمانہ کے حکام کے زمانہ میں انکے ہاتھ میں ایک علاج تھا وہ یہ کہ جب ظلم ناقابل برداشت ہوجاتا تو وہ بغاوت کرکے حکومت توڑ دیتے تھے مگر انگریزی حکومت ہلائے نہیں ہل سکتی تھی۔ یہ حکومت وحشیوں کی سی حد درجہ ظالمانہ حکومت ہونے کے ساتھ جدید تہذیب کے آلات کی طاقت سے مضبوط تھی"۔ (حکومت خود اختیاری از مضامین میکالے نسبت لارڈ کلایو ص۹)

سر ولیم ڈگبی کہتا ہے۔

قبل اس کے کہ جنگ پلاسی فتح ہوئی اور ہندوستان کے خزانے بہہ بہہ کر انگلستان میں آنے شروع ہوئے ہمارے ملک انگلستان کا جوار بھاٹا نہایت نیچا تھا۔ خود انگلستان کی صنعتی ترقی بنگال کے بیشمار دولت کے ذخیروں اور کرناٹک کے خزانوں کی بدولت ہوئی"۔ (روشن مستقبل ص۲۴)

لارڈ میکالے لکھتا ہے۔

"دولت کے دریا یہاں سے انگلستان کو بہتے چلے جاتے تھے"۔

(روشن مستقبل ص۲۵)

سر جان شور (جس کا تعلق بنگال سول سروس سے تھا) قانون ۱۸۳۳ پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"لیکن ہندوستان کا عہد زریں (سنہرا زمانہ) گذر چکا ہے۔ جو دولت کبھی اس کے پاس تھی اس کا جزو اعظم ملک کے باہر کھینچ کر بھیج دیا گیا ہے" (حکومت خود اختیاری ص ۲۷)

اس زمانہ میں کمپنی نے ایک اور عجیب و غریب نئی تجارت کی بنا ڈالی اور وہ گدیوں کی تجارت تھی محمد علی کو کرناٹک میں اور میر جعفر کو بنگال میں تخت دلانے سے یہ تجربہ ہوا تھا کہ سلطنت کے ہر انتقال سے انگریزی خزانہ مالا مال ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میر جعفر کو ہٹا کر میر قاسم کو مسند پر بٹھایا گیا۔ میر قاسم نے بغاوت کی تو پھر میر جعفر سے سودا کر لیا گیا۔ اس کے بعد نجم الدولہ سے سودا کیا گیا۔ اس سوداگری سے انگریزوں نے جو نفع حاصل کیا اس کی مقدار پانچ کروڑ کے قریب ہوتی ہے تفصیل حسب ذیل ہے۔

سنہ ۱۷۵۷ء میں میر جعفر کی تخت نشینی پر ۳۰۲۱۰۷۵۰ کروڑ
سنہ ۱۷۶۰ء میں میر قاسم کی تخت نشینی پر ۳۲۳۷۶۹۰ لاکھ
سنہ ۱۷۶۳ء میں میر جعفر کی دوسری تخت نشینی پر ۱۴۱۸۴۹۹۰ کروڑ
سنہ ۱۷۶۵ء میں نجم الدولہ کی تخت نشینی پر ۱۹۷۶۹۰۰ لاکھ

۴۹۴۰۰۳۳۰ کروڑ

اسی قسم کے طریقوں سے سنہ ۱۷۷۰ء تک جو رقم کمپنی اور اس کے ملازمین کے پاس پہونچی اس کی میزان ساڑھے اونتیس کروڑ روپیہ کے قریب ہوتی ہے جس میں فوجی اخراجات، تاوان نذرانے اور مالگذاری کی بچت بھی شامل ہے" (روشن مستقبل ص ۱۴۴)

"کمپنی کی لوٹ کھسوٹ اور زر کشی کا سلسلہ اسی طرح برابر جاری رہا اور تقریباً بیس برس کے بعد مسٹر برک نے ہسٹنگز کے مقدمہ کے دوران میں اس کل رقم کا جو اس وقت تک یہاں سے انگلستان پہونچ چکی تھی چالیس کروڑ کے قریب اندازہ کیا تھا" (روشن مستقبل ص ۴۸ از تقاریر برک مقدمہ ہسٹنگز جلد ۱ ص ۱۷)

حکومت اور اس نئے اور عجیب طریقہ کی لوٹ کھسوٹ کی تجارت کے ساتھ ایک اور عجیب طریقہ

حاصل کیا گیا کہ فرخ سیر بادشاہ دہلی کی لڑکی جل گئی اس کا علاج دہلی کے اطبا کے قابو میں نہیں آیا تو ڈاکٹر ہملٹن کو کمپنی نے پیش کیا اتفاق ایسا پیش آیا کہ ڈاکٹر ہملٹن مذکور کا علاج کامیاب رہا اور لڑکی تندرست ہوگئی۔ فرخ سیر بہت خوش ہوا اس نے حسب عادت پادشاہان ہند اس کو زر و جواہر سے مالا مال کرنا چاہا۔ ڈاکٹر ہملٹن نے اس کے لینے سے انکار کر دیا اور اس کے عیوض میں یہ استدعا کی کہ کمپنی کو اس ٹیکس سے جو تجارت پر لیا جاتا ہے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ اہل دربار شاہی اسکے زہریلے نتائج تک نہ پہنچ سکے۔ اور پادشاہ سے فرمان اس قسم کا جاری کرا دیا کہ کمپنی کے تمام کارکن تجارتی ٹیکس سے مستثنیٰ رکھے جائیں۔ یہ حکم جاری ہوتا تھا کہ انگریزوں نے تمام ملک میں اودھم مچا دی اور ہر قسم کی تجارت میں گرم بازاری شروع کر دی اور کروڑوں کا سوداگری کرنے لگے۔ ہندوستانی تاجروں کے تمام کاروبار بند ہوگئے اور طرح طرح سے انگریزوں نے ہر قسم کی تجارت پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت کی کیفیت کا نقشہ مندرجہ ذیل تاریخی تحریر سے معلوم ہوگا۔

”پلاسی کی لڑائی کے بعد بنگال کی حکومت اب برائے نام میر جعفر کی رہ گئی اور سلطنت پر در و بست قبضہ کمپنی کا ہو گیا۔ اس طرح ذمہ داری نواب کی رہی اور اختیارات کمپنی کے ہاتھ میں چلے گئے۔ اس صورت حال میں کمپنی کو ناجائز مالی فائدے اٹھانے کا خوب موقعہ ملا جو اس کا اصلی مقصد تھا اور اس نادر موقعہ کے ملجانے سے کمپنی کے سینوں میں حرص و آز کے جذبات بہت مشتعل ہو گئے۔ زرکشی اور اخاذی (لوٹ) کی لگن بے لگام ہو گئی۔ اس سے قبل ڈاکٹر ہملٹن فرخ سیر کا معالج رہ کر انگریزی مال کو تمام محصولوں سے مستثنیٰ کرا چکا تھا۔ حالات سب سازگار جمع ہو گئے تھے۔ اس لئے کمپنی کے ملازموں نے نجی تجارت شروع کر دی۔ اور ایسی شروع کی کہ بنگال میں شاید ہی کوئی بڑی منڈی ہو جہاں گھی، پان، بانس، چانول، بھس وغیرہ کی خرید و فروخت انگریز نہ کرتے ہوں۔ دیسی سوداگر جنھیں سرکاری محصول

بھی دینا پڑتے تھے کمپنی کے مال کا کیا مقابلہ کر سکتے تھے انگریز تاجروں سے خود نواب ڈرتا تھا۔ اس لئے اس کی پولیس اور اس کی کچہریاں ان کو سزا نہ دے سکتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تجارت کے نام سے لوٹ شروع ہو گئی۔ انگریز سوداگر جس مال پر ہاتھ رکھ دیتے اس کو خریدار آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکتا تھا۔ اس لئے یہ لوگ اس مال کو من مانی قیمت پر خرید لیتے تھے اور اپنا مال نکالنا ہوتا تو جب تک کہ اس کی نکاسی نہ ہو جاتی دوسرے سوداگر دوکان بند رکھنے پر مجبور ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ جس ہندوستانی تاجر کو محصول سے بچنا ہوتا تو وہ کسی انگریزی گماشتہ کی مٹھی گرم کر کے اس سے ایک دستک حاصل کر لیتا جس سے کسی محصل کی مجال نہ تھی کہ مال پر محصول مانگ سکتا۔ اس کی وجہ سے کمپنی کے ادنیٰ ادنیٰ محرر دیسی سوداگروں کے ہاتھ دستکیں بیچ بیچ کر دو دو تین تین ہزار روپیہ ماہوار پیدا کر لیتے تھے۔ خود نواب بے دست و پا تھے۔ زیادہ سے زیادہ کر سکتے تھے تو یہ کہ ظالم ملازموں کی شکایت انھیں کے بے رحم افسروں سے کرتے چنانچہ میر قاسم نے حکام کمپنی سے حسب ذیل فریاد کی۔

"ہر پرگنہ، گاؤں اور منڈی میں انگریزی گماشتے نمک، چھالی، گھی، چانول بھس، بانس، مچھلی، تمباکو وغیرہ کی خرید و فروخت کرتے ہیں۔ رعایا کا مال زبردستی اٹھا لیجاتے ہیں اور چوتھائی قیمت بھی نہیں دیتے اور ان کے ظلم و جبر کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اپنے مال کے بدلے ایک کی جگہ پانچ زبردستی لے لیتے ہیں۔ ان بے عنوانیوں کی بدولت اور نیز محصولوں کی معافی کے سبب مجھے پچیس لاکھ روپے سالانہ کا نقصان ہو رہا ہے۔" (روشن مستقبل طبع ۶ از تاریخ دت صفحہ ۲۳)

مگر ایسی شکایتوں کا اثر ہی کیا ہوتا دولت کی چاٹ نے کمپنی کے لوگوں کو رحم و انصاف کے جذبات سے خالی کر دیا تھا بالآخر مجبور ہو کر میر قاسم نے دیسی سوداگروں

بھی محصول سے معاف کردیا۔ اس پر انگریز بگڑ گئے اور ایسے بگڑے کہ میر قاسم کو
بنگال چھوڑ کر شمالی ہند کی طرف جانا پڑا اور پھر وہاں سے شجاع الدولہ والی اودھ
اور شاہ عالم کی مدد لیکر بنگال کا رُخ کیا تو انگریزوں سے ۱۷۶۴ء میں بکسر کے
مقام پر شکست کھائی اس سے اگلے سال ۱۷۶۵ء میں الہ آباد کا مشہور صلحنامہ ہوا
جس کی روسے کمپنی کو بادشاہ دہلی کی طرف سے بنگالہ کا دیوان یعنی مالگذاری وصول
کرنے والا افسر مقرر کردیا گیا اور اس کے بدلے میں بادشاہ کا نذرانہ مقرر ہو گیا
نواب بنگال کے ذاتی مصاریف اور انتظامی محکموں کے اخراجات کے لئے ایک
رقم معین کردی گئی۔ اور قرار پایا کہ ان دو مصارف کی منہائی کے بعد جو بچے وہ
کمپنی کا ہو۔ اس معاہدہ کے وقت تک تو انگریزی عمل دخل بے ضابطہ طور پہ
تھا۔ اب شاہی فرمان کی روسے انگریزی قبضہ کے جواز کی سند مل گئی"۔

(روشن مستقبل ص ۴۶-۴۷)

اس کے بعد کمپنی کے لئے ایک اور نیا طریقہ لوٹ کھسوٹ کا ہاتھ آگیا۔ کہ زمین کا بندوبست
اور اس کا لگان، اس کا ٹھیکہ اور نیلام اس کی مالگذاری کا اضافہ یہ سب نئے نئے ذرائع پیدا
ہو گئے۔ دیوانی ملنے کے بعد ہی اضافہ مالگذاری کیا گیا۔ اور پہلے لگان پر فیصدی نوے
یا اس سے زائد اضافہ کیا گیا۔ جس سے کاشتکار بالکل تباہ ہو گئے۔ اور کمپنی کے یہاں
سونے کی بارش ہونے لگی۔ الحاصل اس تمام دور میں جس کی ابتدا جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء سے
ہوتی ہے جابرانہ طور پر طرح طرح سے دولت اور سرمایہ کی لوٹ جاری ہوئی اور بیشمار
خزانے ہر طرف سے لٹ لٹ کر لندن میں پہونچنے لگے کمپنی ایک طرف تو قسم قسم کی تجارت
سے خوب ہاتھ پاؤں پھیلا کر لوٹتی تھی دوسری طرف حکومت کے ذریعہ سے خوب من مانی لوٹ
کھسوٹ کرتی تھی۔ بکسر کی فتح کے بعد لارڈ ویلزلی کے عہد میں ایسٹ انڈیا کمپنی گورکھپور، روہیلکھنڈ
جنوبی دوآبہ کے علاقوں پر قابض ہو گئی۔ اور اسی عہد میں کرناٹک کے نواب کو معزول اور

ٹیپو سلطان کو شہید کر دینے کے بعد وہ تمام علاقے حاصل کر لئے گئے جو اب مدراس کے احاطہ میں شامل ہیں اور وہاں کے تمام خزانے لوٹ کر انگلستان میں پہونچا دیئے گئے (ان علاقوں کے حاصل کرنے میں جو بدنیتی اور بدعہدی کمپنی کی طرف سے عمل میں لائی گئی اس کی تفصیل اس جگہ خارج از بحث ہے) یہ جابرانہ اور غیر آئینی طریقہ ۱۸۳۲ء تک برابر جاری رہا۔ اس کے

کمپنی کا اور انگریزوں کا تیسرا دور | بعد تیسرا دور شروع ہوتا ہے جس کو سر ولیم ڈگبی

تسلط بذریعہ پوست یعنی خوش معاملگی کا دکھاوا اور زور کے ساتھ ہندوستانی قوم کو ادنیٰ حالت میں لازمی طور پر قائم رکھنا بتلاتا ہے یہ دور ۱۸۳۳ء سے آخر تک قائم رہا یہ دور آئینی دور کہلاتا ہے۔ اس دور میں مطیع اور فرمانبردار رعایا کے لوٹنے اور زائد سے زائد کھسوٹنے کے نئے نئے قوانین طرح طرح کے بنائے گئے جنمیں کوئی دخل ہندوستانیوں کو نہیں ہوتا تھا اور انگریز اپنے مقاصد و اغراض کے ماتحت اپنی آہنی قوت اور مضبوط شکنجہ کے بل بوتے پر گھمنڈ کر کے بغیر رحمت اور عدل و انصاف کے جو قانون چاہتے تھے بناتے تھے اور خوشنما الفاظ میں شائع کرتے رہتے تھے۔ محکوم رعایا ہند کی خواہشوں اور ضرورتوں کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا تھا بلکہ ان سے زیادہ سے زیادہ دولت چوستے رہنا اور ان کو دائمی غلامی میں جکڑ بند رکھنا انگریز کا مطمح نظر ہوتا تھا۔ چونکہ تاج برطانیہ پر کمپنی کی دورخی پالیسی تاجرانہ اور ملوکانہ کی شکایتیں بہت زیادہ ظاہر کی گئیں تھیں اور کہا گیا تھا کہ تاجرانہ ہوس اور طمع زر کشی میں کمپنی کے ارکان اس قدر بدمست ہیں کہ ان کو ذرہ برابر بھی رعایا کی بہبودی اور زندگی کی پرواہ نہیں ہے۔ تاجرانہ ہوس حصول منفعت کیلئے انھوں نے حکومت کو ذریعہ بنالیا ہے جس کی وجہ سے تمام ملک برباد ہوتے ہوتے آخری رمق پر پہونچ گیا ہے پادشاہت کے جذبہ رعایا پروری کا ان میں ذرا بھی وجود نہیں ہے اس وجہ سے تاج برطانیہ نے کمپنی کو ۱۸۳۲ء سے تجارتی حیثیت سے نکالدیا اور حکم کر دیا کہ وہ صرف ملک گیری اور حکومت کے فرائض انجام دے۔ اور علاوہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دوسرے انگریز اور

ان کی کمپنیاں آزادی سے تجارتی خواہشات پوری کریں۔ اس میں اگرچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اراکین کی چیرہ دستی ہندوستانیوں پر کچھ کم ہو گئی مگر اس کے ملازموں کی بجائے دوسرے انگریز تاجروں اور ان کی کمپنی کی چیرہ دستی پہلے سے زیادہ قائم ہو گئی۔ ادھر ایسٹ انڈیا کمپنی کی چونکہ تجارتی آمدنی کم ہو گئی اس لئے اس کے کارکنوں نے نئے نئے طریقے لوٹ کھسوٹ کے برتنے شروع کر دیئے اور ہوس ملک گیری کی سازشیں روزافزوں ہونے لگیں۔ ہندوستانی راجاؤں کا ہمیشہ سے دستور تھا کہ اگر کوئی راجہ لاولد ہوتا تھا تو وہ اپنے خاندانی یا غیر خاندانی بچے کو اپنا متبنیٰ قرار دیتا تھا اور وہ ریاست کا بعد میں حقیقی بیٹے کی طرح مالک قرار دیا جاتا تھا۔ اس طرح کی متعدد ریاستیں ہندوستان میں موجود تھیں۔ ہندوستانی بادشاہ اور رجواڑے اور خود کمپنی کے افیسر ہمیشہ سے اس کو تسلیم کرتے چلے آتے تھے مگر ہوس ملک میں کمپنی نے یکبارگی اس طریقہ کو ناجائز قرار دیکر غیر معتبر ہونیکا اعلان کر دیا اور تقریباً پندرہ ریاستیں اپنے قبضہ میں کریں۔ اسی طرح بلاوجہ صوبہ سندھ صوبہ اودھ، صوبہ پنجاب وغیرہ کو یکے بعد دیگرے اپنے قبضہ میں لے آئے۔ الحاصل اس زمانہ میں ایسے ایسے طریقے عمل میں لائے جانے لگے کہ جنپر ملمع تو بہت خوبصورت ہوتا تھا اور لوٹ کھسوٹ پہلے سے زیادہ ہوتی تھی اور ساتھ ساتھ بسا اوقات بغیر ملمع کے بھی دوسرے دور کی یادگاریں قائم کی جاتی تھیں۔

اسی دور کے متعلق سر ولیم ڈگبی پراسپرس برٹش انڈیا میں لکھتا ہے۔

"مگر اس میں شبہ نہیں کہ آج ہندوستان اس سے زیادہ شرمناک طور پر لوٹا جا رہا ہے جتنا کہ اس سے پہلے کبھی لوٹا گیا تھا۔ ہماری ابتدائی حکومت کی باریک چابک اب آہنی زنجیر بن گئی ہے۔ کلایو اور ہسٹنگس کی لوٹ اس نکاس کے مقابلہ میں ہیچ ہے جو روزافزوں ترقی کے ساتھ ایک ملک دوسرے ملک کا خون جان بہا کر مالا مال کر رہا ہے۔" (خوشحال برطانوی ہند ترجمہ پراسپرس برٹش انڈیا صفحہ ۲۳)

منٹگمری مارٹن ۱۸۳۸ء میں لکھتا ہے۔

"اگر دولت کا ایسا مسلسل اور روز افزوں سیلان انگلستان سے ہونے لگے تو ایک دن وہ بھی محتاج ہو جائے۔ پھر خیال فرمائیے کہ ہندوستان پر کتنا سخت اثر ہونا چاہیئے جہاں معمولی مزدور کو دو یا تین پیس روزانہ اجرت ملتی ہے۔" (حکومت خود اختیاری ص۲۰)

سر جان سلیور نے جو کہ مدراس کے بورڈ آف ریونیو کا صدر رہا تھا لکھا ہے۔

"ہمارا طرزِ حکومت اسپنج سے بہت مشابہت رکھتا ہے۔ وہ گنگا کے دہانے سے تمام نعمتیں چوس لیتا ہے اور ٹیمز کے کنارے نچوڑ دیتا ہے۔"

(حکومت خود اختیاری ص۲۶)

سر جان شور (جس کا تعلق بنگال سروس سے تھا اور بعد میں وائسرائے بھی ہو گیا تھا۔ ۱۸۳۳ء کے قانون کے متعلق ۱۸۳۷ء میں بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"برطانیہ نے جو طرزِ حکومت قائم کیا ہے اس کے تحت میں ملک اور باشندگان ملک رفتہ رفتہ محتاج ہوتے جاتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ ان پرانے تاجروں پر جلد تباہی آ گئی۔ انگریزی حکومت کی بیس ڈالنے والی زیادہ ستانی نے ملک اور اہل ملک کو اتنا مفلس کر دیا ہے کہ اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ انگریزوں کا بنیادی اصول یہ رہا ہے کہ ہر صورت سے تمام ہندوستانی قوم کو اپنی اغراض کا غلام بنا لیا جائے۔ انپر محصولات اتنے لگا دیئے ہیں کہ انپر اضافہ کی گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔ یکے بعد دیگرے جو صوبہ ہمارے تصرف میں آیا ہے اسکو مزید وصولیابی کا میدان بنا لیا گیا ہے۔ اور ہمنے اس بات پر ہمیشہ فخر کیا ہے کہ دیسی والیان ملک جتنا وصول کرتے تھے اس سے ہماری آمدنی کس قدر زیادہ ہے۔ ہر وہ عہدہ، عزت اور منصب جس کو قبول کرنے کے لئے ادنیٰ سی ادنیٰ انگریز کو آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستانیوں کے لئے بند کر دیا گیا ہے

مختصر یہ ہے کہ ہندوستان میں جتنی انتہائی سخت اور جابر حکومتیں گذری ہیں ان میں ایک برطانوی حکومت ہے جس کے دور میں حکومت اور ذی ثروت افراد بشرطیکہ وہ بے اندازہ دولت رکھتے ہوں - دونوں انصاف کا خون کر سکتے ہیں اور کر چکے ہیں جس کے عہد میں ظلم کی دادرسی تقریباً ایک ناممکن چیز ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ رعایا ہم سے نفرت کرتی ہے اور ہر طاقت کا خیر مقدم کرنے اور اس کے پرچم کے نیچے جمع ہونے کے لئے تیار ہے بشرطیکہ اس میں اتنی قدرت ہو کہ ہمیں تباہ کر سکے"

(حکومت خود اختیاری ص۲۷)

مسٹر اے جی ولسن اپنے ایک آرٹیکل میں جو کہ ۱۸۸۲ء میں فورٹ نائٹ لی ریویو میں شائع ہوا تھا لکھتے ہیں -

"اس بد قسمت ملک ہندوستان سے ہر سال پورے تین کروڑ پونڈ (پینتالیس کروڑ روپیہ) ہم مختلف طریقوں سے کھینچ لیتے ہیں - وہاں کے باشندے کی اوسط کمائی پانچ پونڈ سالانہ ہے بلکہ بعض جگہ اس سے بھی کم ہے مگر زیادہ کہیں نہ ہوگی - اس حساب سے ساٹھ لاکھ سے زیادہ کمانے والوں کی آمدنی ہمارے خراج میں چلی آتی ہے - گویا متعلقین کو شامل کرنے کے بعد تین کروڑ انسانوں کی وجہ کفاف ہم لیلیتے ہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ ہندوستان کے کل سرمایۂ معاش کا دسواں حصہ ہر سال ہمارے پاس کھنچ آتا ہے" (حکومت خود اختیاری از ان ہیپی انڈیا ص۳۴)

مذکورہ بالا اندازہ اس دولت کا جو کہ ہر سال ہندوستان سے کھنچکر انگلستان کو پہنچتی رہتی تھی - ۱۸۸۲ء کا ہے مگر اس میں ہر سال اضافہ ہی ہوتا رہتا تھا - اگرچہ ہندوستان کی حالت روز بروز گرتی جاتی تھی مگر بے رحم اور سنگدل برطانیہ کی وحشیانہ بھوک روپیوں کی ہمیشہ بڑھتی رہی اس لئے ہندوستانی خراج بھی ہمیشہ بڑھتا رہتا - مسٹر ہنڈ ومن (مشہور حسابدان انگلستان کا) ۱۹۰۶ء میں تخمینہ اس مقدار کا چالیس ملین پونڈ سالانہ کرتا ہے -

یعنی ساٹھ کروڑ روپیہ سالانہ۔ (ان ہیپی انڈیا۔ حکومت خود اختیاری ص۱۸)

سر ولیم ڈگبی نے پراسپرس برٹش انڈیا میں آئینی طریقہ پر ہندوستان سے جانے والی دولت کی تخمینی مقدار ۱۹۰۰ء تک کی چھ ہزار اسی ملین پونڈ لکھی ہے (دیکھو حکومت خود اختیاری ص۸۱) چونکہ ایک ملین دس لاکھ کا ہوتا ہے اس لئے یہ مقدار چھ ارب آٹھ کروڑ پونڈ ہوگی چونکہ اس زمانہ میں پونڈ کا بھاؤ پندرہ روپیہ تھا اس لئے ۱۹۰۰ء تک آئینی طریقہ پر ہندوستان سے نکلنے والی دولت کی مقدار اکانوے ارب بیس کروڑ روپیہ ہوئی۔ یعنی

۹۱۲۰۰۰۰۰۰۰۰ ارب روپے۔

اور ابتدائی ۱۹۰۱ء سے ۱۹۳۲ء تک مسٹر ہنڈومن کے تخمینہ کے مطابق ایک ارب چوراسی کروڑ پونڈ ہوتی ہے جس کے روپے

ستائیس ارب ساٹھ کروڑ ہوتے ہیں۔ ۲۷,۶۰,۰۰,۰۰,۰۰۰ ارب روپے۔

لہذا ۱۸۳۲ء سے ۱۹۴۵ء تک آئینی طریقہ پر

نکلنے والی دولت کا اندازہ (۱۱۸۸۰,۰۰,۰۰,۰۰۰) ایک کھرب

اٹھارہ ارب اسی کروڑ روپیہ۔

مگر امریکہ میں تقریر کرتے ہوئے ۱۹۳۳ء میں مسٹر وٹھل بھائی پٹیل سابق پریسیڈنٹ آل انڈیا اسمبلی نے بتلایا تھا کہ "بنک آف انگلینڈ میں ہندوستان کا تیس ارب پونڈ جا چکا ہے (یہ مطالبہ معہ اس کے سود کے برطانیہ کو ادا کرنا چاہیئے) ہندوستان انگلستان کے ذمہ واجب الادا قرضہ پر چار کروڑ پونڈ سالانہ سود کا مطالبہ کرتا ہے۔"

(اخبار ملت دہلی مورخہ ۱۸ جنوری ۱۹۳۳ء جلد نمبر ۱۲)

وٹھل بھائی پٹیل کے ذکر کردہ عدد کے حساب سے انگلستان پہونچنے والے روپیوں کی مقدار چار سو پچاس ارب روپیہ ہوتی ہے۔ جو کہ بنک آف انگلینڈ میں ۱۹۳۳ء تک پہونچے۔ یعنی چار کھرب پچاس ارب روپیہ۔

یہ مقدار اس سرسری اندازہ کے روپیوں کی ہے جو انگلستانی بنکوں میں آئینی اور غیر آئینی طریقوں سے ۱۹۳۳ء تک پہونچے تھے اور مذکورہ بالا مقدار یعنی ایک سو اٹھارہ ارب اسی کروڑ کی مقدار اس آئینی طریقوں سے پہونچنے والے روپیوں کی ہے جس کو سر ویلیم ڈگبی اور مسٹر ہنڈوسن نے ۱۸۳۲ء سے لیکر ۱۹۰۵ء تک کی ذکر کی ہے۔ مگر وہ مقدار جو کہ غیر آئینی طریقہ پر مختلف طریقوں سے لوٹ کھسوٹ کر کے دور ثانی یعنی ۱۸۰۰ء سے ۱۸۳۲ء تک اور تجارتی طریقوں سے ۱۶۰۰ء سے ۱۷۵۷ء تک دور اول میں گئی ہے اس سے خارج ہے جس کا اندازہ کرنا سخت مشکل ہے۔ البتہ مسٹر بروکس ایڈمسن نے اس کے اس حصہ کی مقدار جو کہ وائرلوا ور پلاسی کی جنگ وغیرہ کے زمانہ میں حاصل کی گئی تھی مجمل طریقہ پر یہ بتلائی تھی کہ دہ کروڑوں اشرفیاں ہوں گی۔ اور کہا تھا کہ اس عہد میں یورپ والوں کے پاس سونے چاندی کی مقدار جتنی تھی نسبتاً ہندوستان سے جانے والی دولت کی مقدار زیادہ تھی۔ اس سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح انگریزوں نے ہندوستان کے سونے اور چاندی کے سمندر کو خشک کیا ہے۔

مذکورہ بالا طریقوں میں ایک عجیب وغریب طریقہ زرکشی اور لوٹ کا یہ جاری کیا گیا کہ ۱۷۹۲ء سے ہندوستان کے قومی قرضہ کی مد قائم کی گئی۔ ابتداء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجارت کے لئے اپنی قوم سے کچھ قرضہ لیا تھا (جس کی مقدار آئندہ اعداد وشمار میں آئے گی) اور جو برابر بڑھتا گیا۔ بقول لالہ لاجپت رائے کے انگریزوں نے ہندوستان کو قبضہ میں کیا ہے تو اس میں لطف یہ ہے کہ روز اول سے آخر دم تک برطانیہ کی گرہ سے ایک کوڑی بھی خرچ نہیں ہوئی اور ہندوستانیوں ہی کے مال اور انھیں کے خون سے ملک قبضہ میں لیلیا گیا۔ اسی پر بس نہیں کی گئی۔ ملک گیری، تجارت کی توسیع، علمی تحقیقات غرضکہ ہر قسم کے مصارف جو انگریزوں کو ایشیا بھر میں کہیں اُٹھانا پڑے ہندوستان کے خزانے سے ہی پورے کئے گئے۔ ان کے منافع ہمیشہ انگریزوں کی جیب میں جاتے رہے اور خرچ

یا خسارہ ہوتا تھا تو ہندوستان کے سر مڑھا جاتا تھا۔ مسٹر آر سی دت کہتے ہیں۔

"ہندوستان کا سارا قومی قرضہ جو کمپنی کے صد سالہ عہد میں بڑھا وہ صرف اس وجہ سے کہ جو مصارف انگلستان میں ہوتے تھے ان کا بار ہندوستان پر ڈالا جاتا تھا"

ہندوستان کے قومی قرضہ کی یہ نوعیت معلوم کرنے کے بعد دیکھنا چاہئے کہ اس میں سال بسال کیا اضافہ ہوتا رہا ہے۔ ذیل کے اعداد ان ہیپی انڈیا سے ماخوذ ہیں۔

سنہ ۱۷۹۲	۷۰ لاکھ پونڈ	سنہ ۴۶-۱۸۴۵	۴ کروڑ ۳۵ لاکھ
سنہ ۱۷۹۹	ایک کروڑ پونڈ	سنہ ۵۱-۱۸۵۰	۵ کروڑ ۵۰ لاکھ
سنہ ۱۸۰۵	دو کروڑ دس لاکھ	سنہ ۱۸۵۷	۶ کروڑ ۵۰ لاکھ
سنہ ۱۸۲۹ء	۳ کروڑ	سنہ ۱۸۵۹	۶ کروڑ ۹۵ لاکھ
سنہ ۱۸۳۶ء	۳ کروڑ ۳۰ لاکھ	سنہ ۱۸۶۰	۱۰ کروڑ
		سنہ ۱۴-۱۹۱۳ء	تیس۳ کروڑ ستر لاکھ

ذیل کے اعداد انڈین ایر بک سے لئے گئے۔

سنہ ۱۹۲۴ء اڑتالیس کروڑ اٹھاون لاکھ چالیس ہزار

سنہ ۱۹۲۵ء اکیاون کروڑ سترہ لاکھ اسی ہزار (حکومت خود اختیاری صہ ۸۱)

سنہ ۱۹۲۶ء میں ہندوستان کا غیر ملکی قرضہ ایک ارب پونڈ ہو گیا۔ یعنی پندرہ ارب روپیہ (مدینہ بجنور ۲۵ فروری سنہ ۳۰ء)

اس قرضہ پر ہندوستان کو ہر سال (۸۰) کروڑ روپیہ سود کے طور پر ادا کرنا پڑتا ہے اس کے ساتھ ہی (۴۰) کروڑ روپیہ وہ ہے جو ہندوستان کو وزیر ہند کی وساطت سے ادا کرنا پڑتا ہے۔ اگر اس میں سے سترہ کروڑ نکال دئے جائیں جو سرکاری قرضوں کے سود کے طور پر دئے جاتے ہیں اس لئے کہ یہ رقم بھی ایک ارب پونڈ میں شمار ہو چکی ہے تو بقیہ (۲۳) کروڑ

روپیہ باقی رہ جاتا ہے۔ اس طرح کل سالانہ واجب الادا رقم ایک سو کروڑ روپیہ یا ایک ارب روپیہ بنتی ہے (بیان ایسوسی ایٹڈ چیمبر آف کامرس یعنی جمعیۃ ایوانہائے تجارت نزد سائمن کمیشن از مدینہ بجنور مورخہ ۲۵ فروری سنہ ۱۹۳۰ء)

اس قرضہ کی ایک دوسری نوعیت نہایت پرلطف اور عجیب ہے وہ یہ کہ اپنے مقاصد ملعونہ کے لئے جو جنگ بھی ایشیا یا افریقہ وغیرہ میں کیجاتی ہے یا توسیع مملکت کی غرض سے ہندوستانی ریاستوں اور صوبوں کو اپنے قبضہ میں لایا جاتا ہے ان میں ہندوستانی سپاہی اور رسد اور اسلحہ استعمال کئے جاتے ہیں ہندوستانیوں کی جانیں ضائع ہوتی ہیں مال غنیمت یعنی لوٹ اپنے قبضہ میں لائی جاتی ہے اور مصارف جنگ ہندوستان کے ذمہ رکھکر انڈین نیشنل ڈیٹس کی مقدار میں شامل کرلیا جاتا ہے اور سب سے عجیب تر یہ ہے کہ سنہ ۱۸۵۷ء میں تاج برطانیہ ہندوستان کو کمپنی سے چار کروڑ ساٹھ لاکھ پونڈ پر خرید تا ہے اور وہ مقدار بھی ہندوستان ہی کے ذمہ اسی مقدار میں شامل کی جاتی ہے اور اس کا سود اور سود در سود ہندوستان سے ہی دلوایا جاتا ہے گویا کہ بکری خریدی گئی اور اس سے کہا گیا کہ تو ہی اپنی قیمت ادا کر۔ اسی میں مصارف جنگ نوابان بنگال و مرہٹہ و نیپال و افغانستان و جنگ ثانی کابل و سوڈان و مصر و تبت و چین و جنوبی افریقہ ٹرانسوال وغیرہ سب داخل ہیں۔

سنہ ۱۸۳۳ء سے امید افزا شاہی اعلانات اور فصیح و بلیغ تقریروں کے ساتھ کمپنی کا خالص انتظامی دور شروع ہوا۔ مگر اسی کے ساتھ شجر ہند کے تنہ میں کمپنی کے قرضہ کا گھن مستقل طور پر لگا دیا گیا۔ اور عملاً یہ قرار دیا گیا کہ یہ قرضہ کبھی ادا نہ ہوگا۔ واضح ہو کہ سنہ ۱۸۳۳ء میں انگلستان کے قانون کی رو سے انتہائی شرح سود پانچ فیصدی تھی اور ہندوستان میں دام دوپٹ کا قانون رائج تھا جس کی رو سے دائن کو خواہ قرضہ پر سو برس کیوں نہ گذر جائیں اصل رقم قرضہ سے زیادہ سود نہ مل سکتا تھا۔ مگر سلطنت برطانیہ نے کمپنی کے تمام تجارتی سرمایہ کی کثیر رقم پر برخلاف انگلستان اور ہندوستان کے رواج کے ساڑھے دس فیصدی سود قرار

دیا اور یہ طے کیا کہ چالیس سال یعنی ۱۸۹۰ء تک قرضہ ادا نہ کیا جائے بلکہ صرف سالانہ سود دیا جائے اور باوجود سال بسال سود دیتے رہنے کے ۱۸۹۰ء کے بعد سو فیصدی زاید رقم دیکر قرضہ سے سبکدوشی حاصل کی جاسکے۔" (حکومت خود اختیاری ص۲)

ظاہر ہے کہ ہر شخص، ہر ریاست، ہر سلطنت کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ قرضہ سے سبکدوشی حاصل کیجائے مگر کمپنی کا قرضہ وہ ہے جس کی ادائگی عملاً نا ممکنات سے ہے کتنے نیک خیال وائسرائے ایسے آئے جنھوں نے ملک کے اخراجات میں تخفیف کر کے بجٹ بڑھائی چنانچہ نیکدل وائسرائے سر ولیم بنٹنگ نے جنکے زمانہ میں کمپنی سے تجارتی حق لیلیا گیا تھا ملک میں بے شمار اصلاحات اور تخفیفات کیں جو کہ سب ہوم چارجز کے نذر ہوئیں مگر جس نسبت سے صاحب موصوف ہندوستان میں ہردل عزیز بنے اُسی نسبت سے انگلستان میں مطعون ہوئے" (حکومت خود اختیاری ص۲)

ہندوستان میں ۱۸۵۸ء سے ۱۸۷۵ء تک مسلسل ایسے حکمران رہے جو ہر طرح ملک کی ترقی میں ساعی رہے اور انھوں نے اپنے زمانہ میں کوئی ایسی لڑائی نہ لڑنے دی جس سے ہندوستان پر خرچہ کا بار پڑتا اوسی کے ساتھ زرعی صنعتی اور تجارتی ترقی کے لئے انھوں نے دوامی بندوبست کئے اور ہندوستان کے مال پر محصول میں کمی اور انگلستان کے مال پر بیشی کرنے کی کوشش کی لیکن ایک بھی پیش نہ چلی اور باوجود ایسی صلح کے اور مصالحانہ پالیسی کے ان اٹھارہ سال میں ہندوستان کے قرضہ کا بار آٹھ کروڑ پونڈ سے بڑھکر ۱۳ اکروڑ پونڈ تک پہونچ گیا۔" (حکومت خود اختیاری ص۲)

اسی زمانہ میں انگریزوں کو توسیع مملکت کا دلولہ کوئن وکٹوریہ کے اعلان ۱۸۵۸ء کے خلاف پیدا ہوا اور فارورڈ پالیسی (پیش قدمی) کی جدوجہد شروع ہوئی۔ لارڈ نارتھ بروک پر (جو کہ اس زمانہ میں وائسرائے ہند تھے) زور ڈالا گیا کہ وہ اس پالیسی پر عمل کریں۔ وہ اس کو ہندوستان کے لئے مضر سمجھتے تھے بالآخر ان کو مجبور ہوکر ۱۸۷۶ء میں استعفا دیکر انگلستان

واپس ہونا پڑا۔ ان کی جگہ پر لارڈ لٹن کو مقرر کیا گیا۔ انھوں نے پیش قدمی کی تعمیل میں کابل کو مشن بھیجا اور کوئن وکٹوریہ کے اعلان مشہور کے توڑتے اور بدعہدی کے معاملہ کو عملدرآمد کرتے ہوئے کابل کی لڑائی عمل میں لائی گئی۔ جسپر دو کروڑ پونڈ صرف ہوا۔ اس میں انگلستان نے صرف پچاس لاکھ پونڈ دیا اور باقی ڈیڑھ کروڑ پونڈ کا بار ہندوستان پر رکھا گیا جو کہ اس کے قومی قرضہ میں شمار کیا گیا۔"

لارڈ سالسبری ۱۸۷۵ء میں جبکہ وہ وزیر ہند تھا لکھتا ہے۔

"ہندوستان سے اتنی کثیر رقم بھیجدی جاتی ہے اور اس کا نعم البدل کچھ نہیں دیا جاتا۔ یہ زخم بجائے خود کیا کم ہے لیکن ہندوستان کے بدن پر لگتا ہے تو اور زیادہ گہرا لگتا ہے۔ اگر خون ہی بہانا ہے تو چھری اس حصہ جسم میں بھونکنا چاہیے جہاں لہو بہت سا یا کافی جمع ہو۔ نہ کہ دیہاتی رقبوں میں جو پہلے سے ہی خون کی قلت کیوجہ سے نحیف وناتواں ہو رہے ہیں۔ اب وقت ہے کہ ہندوستان کے بدن سے یہ لہو بہنا رک جانا چاہیے"۔ (حکومت خود اختیاری ص۴۵)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہندوستان کے قرضہ اور سود اور سرمایہ کے سیلاب بجانب انگلستان کے اعداد وشمار اور اس کی تاریخ سے ظاہر ہے کہ وہ کسقدر خوفناک ہے۔ ان حالات میں تعجب ہے کہ ہندوستان کے لوگ زندہ کس طرح ہیں۔ یقیناً ان احوال میں خوشحالی اور فارغ البالی جو کہ زمانہ قدیم میں اہل ہندوستان کی امتیازی شان تھی بالکل معدوم ہوگئی۔ اور ان کی زندگی نہایت گری ہوئی اور کشاکش بلکہ مردگی کی زندگی رہ گئی۔

سر چارلس ایلیٹ چیف کمشنر آسام ۱۸۸۸ء میں لکھتا ہے۔

"میں بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ کاشتکاروں کی نصف تعداد ایسی ہے جو سال بھر تک نہیں جانتی کہ ایک وقت پیٹ بھر کر کھانا کسے کہتے ہیں"۔ (حکومت خود اختیاری ص۶۲)

مسٹر اروِن ڈپٹی کمشنر رائے بریلی کہتے ہیں۔

"کوئی شک نہیں کہ یہ لوگ (شہروں کے باشندے) خوراک کی قلت سے جو تکلیف اُٹھاتے ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو کسانوں کو برداشت کرنا پڑتی ہے بالخصوص پردہ نشین مسلمان عورتوں اور مفلس شرفا کو جنکا وقت بگڑ گیا ہے جو شرم سے بھیک تک نہیں مانگ سکتے اور جن کو بچی کھچی جائداد پر گزر کرنا پڑتی ہے۔ نرخ کی گرانی بری طرح ستاتی ہے" (حکومت خود اختیاری صـ۸۳)

مسٹر اے برسل ممبر پارلیمنٹ ہندوستان کے سفر سے واپس ہو کر ہندوستان کے مزدور پیشہ لوگوں کے متعلق لکھتا ہے۔

"یہ لوگ مکھیوں کی طرح مر رہے ہیں" (حکومت خود اختیاری صـ۸۳)

ایک امریکن مشنری کا مقالہ لالہ لاجپت رائے نقل کرتے ہیں۔

"جنوبی ہندوستان کے لوگ زندگی بسر نہیں کرتے بلکہ زندگی کے دن پورے کرتے ہیں۔ میں نے ایسے گھر دیکھے ہیں جہاں لوگ مردار گوشت کھا کھا کر رہتے ہیں۔ اور اس زمانہ میں کوئی عام قحط بھی نہیں بتایا جاتا تھا" (حکومت خود اختیاری صـ۸۳)

مسٹر ڈبلیو ایس بلنٹ کہتا ہے۔

"میں ہندوستانی مالیہ کے اسرار بہترین استادوں سے حاصل کر رہا ہوں اور یہ معلم گورنمنٹ کے سکرٹری اور کمشنر وغیرہ ہیں۔ اس مطالعہ سے میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر ہم اسی طرح ملک کو ترقی دیتے رہے تو ایک دن وہ آئیگا کہ ہندوستانی مجبور ہو کر ایک دوسرے کو کھانے لگیں گے۔ کیونکہ اپنے ہم جنسوں کے سوا دوسری چیز ہی نہ مل سکے گی"۔ (حکومت خود اختیاری صـ۸۳)

مسٹر سیول میریٹ ممبر کونسل نے ۱۹۳۶ء میں لکھا تھا۔

"برطانیہ کا دور حکومت مہربان اور مقبول بتایا جاتا ہے مگر اس عہد میں ملک جس حالت کو پہنچ گیا ہے اگر اس کا مقابلہ دیسی حکمرانوں کے عہد سے کیا جائے تو معلوم

ہوگا کہ اس وقت لوگ خوشحال تھے۔ یہ ملک فلاکت کی انتہائی پستی تک پہونچ گیا ہے۔" (حکومت خود اختیاری صفحہ ۲۷-۲۸)

مسٹر اے۔ اے۔ پرسل ممبر پارلیمنٹ ۱۹۲۶ء میں لکھتا ہے۔

(ہندوستان میں دورہ کرنے اور کئی مہینہ یہاں کی حالت اپنی آنکھ سے دیکھنے کے بعد) ہندوستان کی آبادی کا بہت بڑا حصہ ایسا ہے جسے اپنی پیدائش سے لیکر اپنی وفات تک کبھی پیٹ بھر کھانے کو نہیں ملتا۔ درانحالیکہ برطانیہ کو حکومت کرتے ہوئے سو برس سے زائد ہو چکے ہیں لیکن جن علاقوں میں برطانوی تعلق بہت زیادہ اور گہرا رہا ہے مثلاً صوبہ جات بمبئی و بنگال میں وہاں صفائی وحفظان صحت کا کوئی قابل ذکر انتظام موجود نہیں۔ چھپی ہوئی بغاوت سارے ملک میں موجود ہے۔ ۲۵ کروڑ سے زائد تعداد اس آبادی کی ہے جسے ساری عمر پیٹ بھر کر چاول بھی نہیں نصیب ہوتے۔" (اخبار سچ لکھنؤ مورخہ ۱۳ جولائی ۱۹۲۶ء از ڈیلی ہیرلڈ لندن مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۲۶ء)

مسٹر سائمن اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے۔

(الف) عام آبادی انتہائی افلاس میں ہے۔

(ب) سوشل خدمات مثلاً تعلیم، حفظان صحت، صفائی وغیرہ کا صرفہ مغربی معیار سے نہایت گرا ہوا ہے اور بعض شعبوں میں تو بالکل صفر ہے۔"

(ہندوستان ٹائمز مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۹۳۰ء از رپورٹ سائمن کمیشن)

ایچ۔ ایم۔ ہنڈمن (مشہور ماہر اقتصادیات)

"ہندوستان روز بروز کمزور و ناتوان ہوتا جا رہا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ عوام کی زندگی کا خون آہستہ آہستہ مگر دن بدن تیز روی کے ساتھ نکلا جا رہا ہے۔"

(ایچ ہنڈ مینس بینک کراپٹ سی آف انڈیا از مالیات عامہ)

ڈاکٹر روڈ رفورڈ (سنہ ۱۹۲۷ء کے متعلق)

"ہر جگہ زندگی کی کشمکش اندوہ ناک ہے"۔

(وی۔ ایچ۔ رت فورٹس ماڈرن انڈیا صفحہ ۱۰۲ از مالیات عامہ)

یہی ڈاکٹر روڈ فورڈ (دیہاتیوں کی تکالیف بیان کرتا ہوا) لکھتا ہے۔

"میرے غم و افسوس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ میں برطانوی باشندہ ہونے کی حیثیت سے ان کی اس جسمانی حالت کا ذمہ دار ہوں جس نے ان کو دھیمے مگر تکلیف دہ طریقہ پر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہم برطانوی باشندے ان کی اس حالت کے ذمہ دار ہیں جس نے تخفیف مالیہ اور اجرار نہر کی کوئی اسکیم جاری نہیں کی جس سے قحط کا سدباب ہوتا" (ماڈرن انڈیا از مالیات عامہ)

مسٹر پیٹر فریمین (ممبر پارلیمنٹ و صدر کامن ویلتھ آف انڈیا لیگ) سنہ ۱۹۳۶ء میں۔

"برطانیہ عہد و پیمان کے ذریعہ ہندوستان کے بھلے کے لئے حکومت کرنیکا پابند ہے لیکن کیا ہم نے اس عہد کی پابندی کی ہے۔ میں نے اوپر جو واقعات وحقائق بیان کئے ہیں وہ اس سوال کا جواب دیں گے۔ بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ اگر ہندوستان کو ہوم رول ملگیا تو عوام جمہور پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑیگا ایک سو برس کے برطانی راج سے جو مصیبت ہندوستان پر نازل ہوئی ہے اس سے زیادہ مصیبت ناممکن ہے۔ جو قانون ساز مجلسیں ہم نے قائم کی ہیں ان میں عوام کی نمایندگی نہیں ہوتی اور ہم نے محصول کا بوجھ سب سے زیادہ غریبوں ہی کے دوش بیکسی پر رکھا ہے۔ سرکاری رپورٹ میں ہندوستان کے متعلق یہ الفاظ ہیں۔

"قحط ہندوستان کی فاقہ کشی کی منہ بولتی تصویر ہے" "مسلسل فاقہ کرنیوالوں کی تعداد چار کروڑ سے لیکر سات کروڑ تک ہے الخ (مدینہ بجنور مورخہ ۲۵ مارچ سنہ ۳۶ء از انڈین نیوز لندن)

مسٹر ڈبلوجی پیڈر سنہ ۱۸۷۳ء میں کہتا ہے (موصوف صوبہ جات متوسط میں ملازم تھا)

"ایک ایسی رائے جسپر ہر شخص متفق ہے اگر قابل اعتماد ہوسکتی ہے تو یہ صحیح ہے کہ اہل ہند ہماری زیر حکومت بد سے بد تر حالت کو پہونچتے جاتے ہیں۔ یہ اہم مسئلہ ہے جسپر حکومت کو توجہ کرنا ضروری ہے"

(حکومت خود اختیاری ص۳۸ از دادابھائی ص[illegible])

افسوس کہ ہندوستان کی انتہائی بربادی اور فاقہ کشی اس قدر بدحالی پر پہونچ جانے کے بعد بھی برطانیہ کو رحم نہ آیا بلکہ اس کی درندگی اور لوٹ کھسوٹ کی گرم بازاری بڑھتی ہی رہی بمندرجہ ذیل اعداد سے معلوم ہوگا کہ کس طرح ٹیکس کی زیادتی ہندوستانی عوام کے ضعیف و ناتواں کندھوں پر جاری رہی۔ ٹیکسوں کی تفصیل بحساب فی کس۔

سنہ		روپے	آنے	پائی
سنہ ۱۸۷۱	میں فی کس	۱	۱۳	۹
سنہ ۱۸۸۱	〃 〃	۲	۲	۱۱
سنہ ۱۸۹۱	〃 〃	۲	۳	۱۱
سنہ ۱۹۰۱	〃 〃	۲	۱۰	۲
سنہ ۱۹۱۱	〃 〃	۲	۱۳	۱۱
سنہ ۱۹۱۳	〃 〃	۳	۱	۹
سنہ ۱۹۲۰	〃 〃	۵	۱۱	۰
سنہ ۱۹۲۲	〃 〃	۶	۷	۰
بالفعل نومبر سنہ ۱۹۲۳	〃 〃	۷	۰	۰

(اخبار وکیل امرتسر جلد ۲۹ ص۶۳ ۲۴ نومبر سنہ ۱۹۲۳ء وغیرہ)

باوجودیکہ ہندوستان سنہ ۱۸۷۱ سے پہلے ہی فلاکت کی انتہائی پستی کو بقول سول ایبرٹ اور سرجان شور وغیرہ پہونچ چکا تھا مگر انگریز سنگدلوں کی لالچ کی آگ بھڑکتی ہی رہی اور دولت

حاصل کرنے کی بھوک ہمیشہ روزافزوں ہوتی رہی حتیٰ کہ پہلی جنگ عمومی کے بعد تو تحصیل دولت کی جد وجہد بہت ہی زیادہ بڑھ گئی جس سے ہندوستانیوں کی بربادی اور مذلت بیحد اور بے نہایت ہوگئی - انا للہ وانا الیہ راجعون -

ہندوستان نہایت زیادہ پیداوار والا اور سستا ملک تھا انگریزوں نے اسکو قحط اور کال کا مرکز اور نہایت گراں ملک بنا دیا پیداوار بھی بہت کم کردی جسکی وجہ سے بہت زیادہ آبادی مر گئی -

ہندوستان کو قدرت نے نہایت زیادہ زرخیز ملک بنایا ہے - اس میں ہر قسم کے اناجوں کی کاشت اور پیداوار کے طرح طرح کے ذرائع مہیا کر دیئے ہیں جنکی وجہ سے زمانہ قدیم سے یہاں بافراط غلّہ پیدا ہوتا رہتا تھا اور یہاں کے باشندے ہمیشہ خوش حال فارغ البال رہتے تھے - قحط اور کال کا نام تک ملک کے عام باشندے تقریباً نہیں جانتے تھے - اس قدر پیداوار ہوتی تھی کہ اس زمانہ کی ارزانی سنکر نہ صرف تعجب ہوتا ہے بلکہ بسا اوقات گذشتہ تاریخی تصریحات کو اس زمانہ کے لوگ محال اور جھوٹ سمجھنے لگتے ہیں - ہم پہلے مسٹر تھارنٹن کا قول نقل کر آئے ہیں کہ وہ کہتا ہے کہ "یہاں کی زمین نہایت زرخیز تھی جس سے فصل خوب پیدا ہوتی تھی" اسی طرح سر تھامس منرو کی ہندوستانیوں کے طریقہ کاشتکاری اور ان کی اعلیٰ استعداد کی پرزور تعریف اور ثنا وصفت مذکور ہو چکی ہے - ہم اس سے پہلے لارڈ میکالے کا بہ نسبت صوبہ بنگال یہ مقالہ بھی ہدیہ ناظرین کر چکے ہیں کہ

"باوجود مسلمان ظالموں اور مرہٹہ لٹیروں کے مشرقی ممالک میں بنگال باغ ارم یا نہایت دولتمند ملک سمجھا جاتا تھا اس کی آبادی بے حد اور بہت زیادہ بڑھتی تھی غلہ کی افراط سے دور دراز کے صوبہ جات پرورش پاتے تھے - اور لندن اور پیرس کے اعلیٰ خاندانوں کی بی بیاں یہاں کے کرگھوں کے نازک کپڑوں میں ملبوس ہوتی تھیں "

بہرحال انگریزی اقتدار سے پہلے یہاں کی پیداوار غلہ جات کی بہت زیادہ تھی اور نہایت زیادہ ارزانی اور سستے بھاؤ سے تمام اناجوں کے اقسام اور ضروریات زندگی فروخت ہوتی تھیں جس کی وجہ سے تمام باشندگان ہند نہایت خوشحال اور فارغ البال راحت اور آرام کی زندگی بسر کرتے تھے۔ عموماً ان کو اناج اور خور و نوش کی کمی ستاتی نہ تھی

(۱) چنانچہ سر ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن تاریخ ہند جلد ۳ میں شہنشاہ علاؤالدین خلجی مرحوم کے زمانہ کا بھاؤ مندرجہ ذیل الفاظ میں لکھتا ہے۔

(نوٹ) یہ بھاؤ اس زمانہ کے اوزان اور سکوں کو موجودہ زمانہ کے اوزان اور سکوں کے حساب سے برابر کر کے لکھا گیا ہے۔ (اخبار ہمدرد دہلی جلد ۵ ۳۶)

گیہوں	۱۱۹ سیر	یعنی ۲ دو من ۳۹ سیر	بورا کھانڈ	۱۵	سیر
چانول	۱۷۹ سیر	" ۴ من ۱۹ سیر	گھی	۳۳	"
چنا	۱۷۹ "	" ۴ من ۱۹ سیر	لال کھانڈ	۲۴	"
اڑد	۱۷۹ "	" ۴ " ۱۹ سیر	سرسوں کا تیل	۲۷	"
جو	۲۲۴ "	" ۵ " ۲۴ "			

(اخبار انتخاب لاجواب لاہور میں تاریخ فرشتہ سے ۶۷ سیر ہے اور یہی صحیح ہے)

(۲) شہنشاہ محمد تغلق مرحوم کے زمانہ کا بھاؤ حسب ذیل تھا۔

گیہوں فی من پختہ ۔ شالی دہان فی من پختہ ۔ چانول فی من پختہ چنا فی من پختہ شکر سفید فی من پختہ ۔ مصری فی من پختہ ۔ بیل فربہ فی راس ۔ بکری فربہ فی راس ۔ بھینس فربہ فی راس مرغ ۔ بکری کا گوشت ۔ (اخبار خلافت روزانہ بمبئی مورخہ ۲ نومبر ۱۹۲۳ء)

(نوٹ) اسی زمانہ میں ابن بطوطہ ہندوستان میں آیا ہوا تھا وہ اپنے سفرنامہ میں بنگال کی سیاحت کے متعلق لکھتا ہے کہ بنگال میں گرانی کے زمانہ میں ایک روپیہ کا تین من چانول فروخت ہوتا تھا۔ اور ارزانی کے زمانہ میں ایک روپیہ کا ۱۶ من تک چانول فروخت ہوتا تھا۔ روئی کا کپڑا ایک روپیہ میں ۳۰ گز تک تھا۔

(۳) شہنشاہ فیروز تغلق کے زمانہ کا بھاؤ حسب ذیل تھا

گیہوں فی من پختہ	جو فی من پختہ	چنائی من پختہ	گھی فی سیر پختہ	شکر فی سیر پختہ
۵؍	۳؍	۳؍	۲½ پیسہ	۳½ پیسہ

(خلافت ۲؍ نومبر ۱۹۲۳ء)

(۴) شہنشاہ ابراہیم لودی مرحوم کا زمانہ

غلہ فی روپیہ	گھی فی روپیہ	کپڑا فی روپیہ
۱۰ من	۵ سیر	۱۰ گز

ایک خاندان عزت کے ساتھ ۵؍ روپیہ ماہوار میں بسر کر سکتا تھا۔ ایک سوار معہ گھوڑا اور سائیس اور سپاہیوں کے آگرہ سے دہلی تک عسہ میں سفر کر سکتا تھا۔

(خلافت ۲؍ نومبر ۱۹۲۳ء)

(۵) شہنشاہ اکبر مرحوم کے زمانہ کا بھاؤ۔

گیہوں فی من	جو فی من	شالی دھان فی من	چنا فی من	مونگ فی من
۸؍	۵؍	۱۲؍	۵؍	۱۱؍
ماش فی من	موٹھ فی من	شکر سفید فی من	شکر سرخ فی من	گھی فی من
۱۰؍	۷؍	۱۲؍	۱۴؍	۲؍
تیل فی من	نمک فی من	بکری فربہ	چانول خوشبودار فی من	
۱۱؍	۶؍	۸؍	عہ	
جوار فی من	باجرہ فی من	دال فی من	میدہ فی من	دودھ فی من
۶؍	۵؍	۶؍	۱۳؍	۱۵؍
گڑ فی من				
۲؍				

(خلافت ۲ نومبر ۱۹۲۳ء)

اکبر کے دوسرے زمانہ کا بھاؤ

گیہوں فی روپیہ	مونگ فی روپیہ	تیل فی روپیہ	نمک فی روپیہ
۴ من	۷ ۳/۴ من	ایک من ۲۴ سیر	۲ من ۳۰ سیر
کھانڈ فی روپیہ	باجرہ فی روپیہ	گھی فی روپیہ	
۱۸ سیر	۳ من	۱۵ سیر	(انتخاب لاجواب ہوا ۲۱ اگست ۲۸ء)

(۶) شہنشاہ جہانگیر کا زمانہ

ٹامس کوریائٹ جو کہ ۱۶۱۲ء میں آیا تھا کہتا ہے کہ ایک آنہ روز میں ایک آدمی نہایت آرام سے بسر کر سکتا تھا۔ (خلافت ۲ نومبر ۱۹۲۳ء)

(۷) شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر مرحوم کے زمانہ کا بھاؤ

شہر ڈھاکہ میں چاول فی روپیہ (۵۸۰) پونڈ (۷ من ۱۰ سیر) بکتا تھا (سفرنامہ کپتان الگزنڈر ہملٹن جلد ۲ صفحہ ۲۵)

ڈھاکہ میں تمام ضروریات زندگی اسقدر ارزاں دستیاب ہوتی تھیں کہ یقین کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے ملک بیحد آباد تھا۔ (سفرنامہ کپتان الگزنڈر ہملٹن جلد ۲ صفحہ ۲۳)

کارومنڈل کے ساحل پر مچھلی ۳ر کی ۲۰ پونڈ آتی تھی۔ " جلد ۱ صفحہ ۳۷۵)

کٹنگ میں مکھن ۱ر کا آدھ سیر آتا تھا اور ۲ر میں ایک سو مچھلیاں اتنی بڑی بڑی فروخت ہوتی تھیں کہ ان میں سے صرف دو مچھلیاں ایک آدمی کا پیٹ بھرنے کو کافی ہوں۔
(سفرنامہ کپتان الگزنڈر ہملٹن جلد ۱ صفحہ ۳۹۲)

نمک ایک کراؤن یعنی ۴ر کو ایک ٹن یعنی ۲۸ من آتا تھا (" " " صفحہ ۴۵۵)

گائے کا گوشت تین فاردنگ (کچھ کوڑیوں) میں نصف سیر بکتا تھا (" " صفحہ ۱۶۱)

آئین اکبری میں جو قیمتوں کے متعلق اعداد و شمار درج ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ سولھویں صدی کے آخر میں شمالی ہندوستان میں بالخصوص دارالسلطنت کے آس پاس ۱۲-۱۹۱۰ء کے نرخوں کے حساب سے سامان خورد و نوش کم از کم ۷، ۸ گنا (دغنیات

کم از کم ۱۰ - ۱۲ گنا، اور کپڑا کم از کم ۵ - ۶ گنا ارزاں تھا۔ البتہ دھات کا سامان کچھ ایسا ارزاں نہ تھا۔ اور ولائتی چیزیں جنھیں آج بازار پٹے پڑے ہیں مقابلۃً کہیں گراں تھیں عام قیمتوں کا لحاظ کرتے ہوئے اس میں کوئی شک نہیں کہ سنہ ۱۶ء کے روپے کی قدر و قیمت سنہ ۱۹۱۲ء کے روپئے سے کم از کم ۶ - ۷ گنا زیادہ تھی اور سنہ ۱۹۲۰ء کے روپئے سے کم از کم ۱۰ - ۱۲ گنا زیادہ۔ گویا اکبر کے عہد میں ۵ روپئے ماہانہ آمدنی کا غریب خاندان اس خوش حالی سے بسر کرتا تھا کہ آج پچاس روپئے آمدنی والے کو وہ بات نصیب نہیں: جو دس روپئے کا ملازم تھا وہ آجکل کے سو روپئے والے سے کم نہ تھا اور جس کو سو ملتے تھے وہ آجکل کے ہزار روپئے والے سے زیادہ آرام اوٹھاتا تھا۔ حالانکہ روپئے کی نوعیت میں شکل و صورت کے سوا فرق نہیں آیا۔ وہی چاندی کا روپیہ جو جب تھا سو اب ہے۔ لیکن قدر و قیمت میں زمین آسمان کا فرق آگیا اور یہ فرق بھی سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے جبکہ سرکار انگریزی کا باقاعدہ دور دورہ شروع ہوا بہت زیادہ بڑھ گیا۔ اس سے قبل بھی فرق تھا مگر کم۔ قدر زر کی یہ تخفیف ملک کے حق میں بحیثیت مجموعی مضر ہے یا مفید یہ ایک جداگانہ بحث ہے جس کا بیان صرف دولت میں زیادہ برمحل ہوگا۔ یہاں صرف جتانا مقصود تھا کہ اگرچہ بظاہر روپیہ وہی کا وہی رہا لیکن گذشتہ تین صدی اور بالخصوص گذشتہ چھ سال میں یعنی جنگ کے زمانہ سے اس کی قدر و قیمت میں بہت کمی ہوگئی۔ اس تبدیلی کے اسباب اور ان کی تشریح و توجیہہ مسئلہ گرانی اور قدر زر سے متعلق ہے۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں۔

(معیشت الہند صفحہ ۳۱۵)

یہ مذکورہ بالا حساب صاحب معیشت الہند نے سنہ ۱۹۲۰ء کی قیمتوں سے کیا ہے جبکہ تمام سامان خورونوش وغیرہ بہ نسبت موجودہ زمانہ (سنہ ۱۹۳۰ء سے لیکر سنہ ۱۹۳۷ء تک کے) چوگنا یا اس سے زائد ارزاں تھا۔ اگر آج کے مقابلہ پر حساب کیا جائے تو یقیناً ۵ ماہوار آمدنی والا اکبر کے زمانہ میں آجکل کے دو سو روپیہ پانے والے سے اور دس روپیہ ماہوار آمدنی

والا اُس زمانہ میں آج کل کے چار سو روپیہ حاصل کرنے والے سے اور سو روپیہ آمدنی والا آج کل کے چار ہزار کی آمدنی والے سے زیادہ آرام اُٹھاتا تھا۔ سونے اور چاندی کا فرق بھی نہایت ممتاز نظر آتا ہے۔ اکبر کے زمانہ میں مُہر شاہی جس کا وزن ۱۰۲ تولہ ہوتا تھا ایک ہزار روپیہ کی ہوتی تھی یعنی سونا اُس وقت میں دس روپیہ تولہ تھا مگر آج، سو روپیہ تولہ سونا نہیں ملتا۔ بہر حال ہندوستان انگریزی عروج اور اقتدار سے پہلے نہایت ارزاں اور سستائی والا ملک تھا اس میں اناج اور تمام ضروریات زندگی بالخصوص خورد و نوش کے اشیاء کی نہایت زیادہ کثرت اور ارزانی تھی۔ یہاں کے باشندے نہایت چین اور آرام کی زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر بقول شاعر ؎

چلی سمت غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں وہ ہری رہی

انگریزوں کا ملعون اقتدار اور منحوس زمانہ آیا اور حالت پلٹنی شروع ہوئی اور بجائے ارزانی گرانی اور بجائے کثرت قلت اور بجائے آسودگی فرسودگی ظاہر ہونے لگی۔ انگریزی اقتدار سے پہلے اناج منوں کے حساب سے فروخت ہوتا تھا مگر اس کے بعد کم ہوتے ہوتے سیروں اور چھٹانکوں تک نوبت پہنچ گئی۔ عام آبادی قحط اور گرانی کی وجہ سے لاکھوں بلکہ کروڑوں کی مقدار میں موت کے گھاٹ اترنے لگی۔۔۔۔ چنانچہ خاص کلکتہ میں جو کہ انگریزی اقتدار کا مرکز بن گیا تھا حسب تفصیل ذیل مہنگائی بڑھتی رہی۔

سنہ	فی روپیہ	چانول	گیہوں	سرسوں کا تیل
سنہ ۱۷۳۹ء میں	”	۲ من ۳۰ سیر	۲ من ۲۰ سیر	۱۲ سیر
سنہ ۱۷۵۰ء ”	”	۲ من ۱۰ سیر	۲ من ۱۰ سیر	۱۰ سیر
سنہ ۱۷۵۸ء ”	”	۱ من ۳۰ سیر	۱ من ۳۵ سیر	۸½ سیر
سنہ ۱۷۸۲ء ”	”	۱ من ۵ سیر	۱ من ۵ سیر	۷ سیر

سنہ	فی روپیہ	چانول	گیہوں	سرسوں کا تیل
سنہ ۱۸۲۵ء میں	"	۳۰ سیر	۳۲ سیر	۶ سیر
سنہ ۱۸۵۵ء	"	۱۵ سیر	۱۸ سیر	۵ سیر
سنہ ۱۸۸۰ء	"	۱۲ سیر	۱۱ سیر	۴½ سیر

(ایسٹ انڈیا کمپنی کا غیر مطبوعہ ریکارڈ برٹش میوزیم میں)

جس طرح کلکتہ میں گرانی بڑھتی رہی اسی طرح جہاں جہاں بھی انگریزی اقتدار پہنچتا رہا گرانی تیز ہوتی رہی چنانچہ کمپنی کے آخری زمانہ میں یعنی سنہ ۱۸۵۷ء میں خورد و نوش کی اشیاء کا بھاؤ حسب ذیل تھا۔

گیہوں فی روپیہ	چانول فی روپیہ	چنا فی روپیہ
۳۶ سیر پختہ	۱۸½ سیر پختہ	۵۱½ سیر پختہ یعنی ایک من ۱۱½ سیر

گھی فی روپیہ ۴ سیر (انتخاب لاجواب لاہور مورخہ ۲۱ اگست سنہ ۱۹۲۸ء)

ملکہ وکٹوریہ کا عہد حکومت سنہ ۱۸۹۰ء میں

گیہوں فی روپیہ	چانول فی روپیہ	چنا فی روپیہ	گھی فی روپیہ	دودھ فی روپیہ
۲۵ سیر	۱۲ سیر	۲۸ سیر	۲ سیر	۹ سیر

(اخبار انتخاب لاجواب لاہور مورخہ ۲۱ اگست سنہ ۱۹۲۸ء)

جارج پنجم کا عہد حکومت

گیہوں فی روپیہ	چانول فی روپیہ	گھی فی روپیہ	چنا فی روپیہ	دال فی روپیہ
۸ سیر	۴ سیر	۸ چھٹانک	۹ سیر	۴ سیر

دودھ فی روپیہ ۴ سیر (اخبار انتخاب لاجواب لاہور مورخہ ۲۱ اگست سنہ ۱۹۲۸ء)

جارج پنجم کے بعد کا زمانہ اُس سے بھی زیادہ منحوس اور تاریک آیا جس میں سنہ ۱۹۴۰ء سے لے کر آج تک چار سیر فی روپیہ بھی گیہوں نہیں مل سکتا بلکہ عموماً فی روپیہ دو سیر پختہ بھی ملنا

مشکل ہوتا ہے۔ یوپی میں گیہوں چھبیس ۲۶ روپیہ من اور چاول چالیس ۴۰ روپیہ من اور بنگال میں ساٹھ روپیہ من چاول فروخت ہو رہا ہے۔ چور بازار (بلیک مارکیٹ) کھلا ہوا ہے لاقانونی کا زور ہے۔ کنٹرول کا بھاؤ بھی چار سیرفی روپیہ نہیں ہے اسی طرح تمام ضروریات زندگی، نہایت زیادہ مہنگی ہوگئی ہیں۔ جس کی نظیر کبھی بھی اس ملک ہندوستان میں پائی نہیں گئی۔ سابقہ زمانہ میں قحط کے زمانہ میں بھی اس قدر گرانی نہیں ہوتی تھی انگریزی عہد حکومت میں اس طرح گرانی کے اسباب مختلفہ ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر مؤثر مندرجہ ذیل امور ہیں۔

(الف) یہاں کے نقود اور سونے چاندی سے جن کو لوٹ کھسوٹ کر انگریزوں نے انگلستان پہنچایا۔ وہاں پر اُن سے بڑے بڑے بینک کھولے گئے تجارت کی انتہائی گرم بازاری کی گئی۔ ملیں اور مشینیں قائم کی گئیں اور ہندوستان سے خام اشیاء کو کھینچ کر انگلستان پہنچایا گیا۔

(ب) جب تک ہندوستان کی صنعت اور تجارت زندہ تھی مامون تجارت کے اصول کو جاری کر کے انگلستان میں ہندوستانی مال پر زیادہ سے زیادہ ٹیکس اور قانونی پابندیاں قائم کی گئیں اور ہندوستانی مال کو انگلستان سے نکال باہر کیا گیا۔ (ج) ہندوستان کی صنعت اور تجارت کو مٹایا گیا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ (د) ہندوستان کی صنعت اور تجارت کے بند اور قریب المرگ ہوجاتے ہی فری ٹریڈ (آزاد تجارت) کی پالیسی کا اعلان کیا گیا اور ہر قسم کے مصنوعات اور تجارتی اشیاء کو نہایت معمولی اور کم سے کم ٹیکس کے ساتھ ہندوستان میں داخل کر کے ہندوستان کو یوروپین بالخصوص انگریزی مال کی منڈی بنا دیا گیا۔ ہر ہر شہر میں ہر ہر منڈی میں ولایتی مال بے شمار ٹھونسا گیا اور ان کی قیمتوں کے اکثر حصوں سے غلہ اور خام اشیاء خرید کر... انگلستان اور دوسرے ملکوں کو بھیجا گیا۔ جس کی بنا پر جوں جوں بدیسی مال ہندوستان میں زیادہ داخل ہوا اسی مقدار پر اناج اور خام اشیاء یہاں سے نکلتی رہیں اور اناج کی مہنگائی بڑھتی رہی۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار کلکتہ کے ملاحظہ ہوں۔

سنہ	انگریزی کپڑا	کلکتہ میں چاول	سوت فی روپیہ	آٹا گیہوں کا فی روپیہ	تیل فی روپیہ
سنہ ۱۸۰۰ء	بالکل نہیں آیا۔	۵ سیر	۱ من	۵ سیر ۱ من	۶½ سیر
سنہ ۱۸۱۴ء	۸ لاکھ گز کپڑا آیا	۳۷ سیر		۳۷ سیر	۵½ سیر
سنہ ۱۸۲۱ء	۲ کروڑ گز ”	۳۰ سیر		۳۳ سیر	۵ سیر
سنہ ۱۸۳۵ء	۵ کروڑ گز ”	۲۴ سیر		۲۲ سیر	۴½ سیر
سنہ ۱۸۷۵ء	۶۱ کروڑ گز ”	۱۷ سیر		۱۴ سیر	۱ سیر
سنہ ۱۹۲۵ء	ایک ارب ۵۶ کروڑ گز	۴½ سیر		۴½ سیر	۱¼ سیر

(۵) ہندوستان سے غلہ نہایت فراوانی اور کثرت سے جہازوں میں بھر بھر کر انگلستان اور دیگر... ممالک میں بھیجا گیا چنانچہ اخبار ملت دہلی مورخہ ۱۶ر جولائی سنہ ۱۹۳۲ء لکھتا ہے کہ رائل اگریکلچر سوسائٹی کی سنہ ۱۸۸۳ء کی رپورٹ میں درج ہے کہ سنہ ۱۸۸۲ء میں ۱۱ کروڑ ۸۶ لاکھ ۸۳ ہزار ۷ سو ۱۰ من گیہوں ہندوستان سے باہر گیا یعنی فی منٹ دو سو اُنتیس من اوسطاً ہندوستان سے گیہوں نکالا گیا۔۔۔
سرکاری اعداد و شمار کی چوتھی اشاعت میں مندرجہ ذیل اعداد و شمار اوسطاً ہر منٹ میں اناج کے نکلنے کے درج کئے گئے ہیں۔

چاول ہر منٹ میں	گیہوں ہر منٹ میں	ارھر کی دال ہر منٹ میں	مسور کی دال ہر منٹ میں
۱۱۸ من	۶۵ من	۵۰ من	۵۵ من

مونگ پھلی ہر منٹ میں.... ۵۵ من

سنہ ۱۹۱۳ء میں غلہ وغیرہ کی برآمد کے مندرجہ ذیل اعداد شائع کئے گئے

چاول	گیہوں	کپاس	جوٹ	چاء
چھ کروڑ پچھتر لاکھ من	تین کروڑ پچاس لاکھ من	ڈیڑھ کروڑ من سے کچھ کم	سوا دو کروڑ من	چھتیس لاکھ من سے زیادہ

(معیشت الہند صفحہ ۹۵)

پنڈت دیا شنکر دوبے نے رسالہ مظلوم کسان صفحہ ۸۲ میں گیہوں کی بیرونی

برآمد سال وار حسب ذیل دکھلائی ہے۔

سنہ ۱۵-۱۹۱۶ء تیئیس لاکھ اسی ہزار ٹن گیہوں۔

سنہ ۱۵-۱۹۱۷ء انتیس لاکھ دس ہزار ٹن گیہوں۔

سنہ ۱۹۱۷-۱۸ء پینتالیس لاکھ دس ہزار ٹن گیہوں۔ اور چانول کی برآمد سنہ ۱۹-۱۹۱۸ء میں چھپن کروڑ پچاس لاکھ من دکھلائی ہے۔

یہ وہ اعداد و شمار ہیں جو ہندوستان سے غلّہ کی برآمد کے گورنمنٹی محکموں نے شائع کئے ہیں ہم برابر دیکھتے ہیں کہ اس قسم کے امور میں بہت زیادہ رازداری اور پردہ پوشی سے کام لیا جاتا ہے۔ تاکہ تنقید کرنے والے لوگوں کو زیادہ موقعہ اعتراض کرنیکا ہاتھ نہ آئے۔ بہرحال یہ اعداد و شمار بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ اس قدر اناج کے نکل جانے سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ باشندگان ہند کے لئے کس طرح زندگانی کے لالے پڑجائیں گے بالخصوص غربا۔ ہندوستان جو کہ تمام دنیا کی قوموں میں سب سے زیادہ مفلس اور کم آمدنی والے بنادیئے گئے ہیں۔ (و) آئین اکبری اور دوسری قدیمی تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ انگریزی عروج سے پہلے ہندوستان کی پیداوار کسی زرخیز سے زرخیز ملک سے کم نہ تھی بلکہ دنیا میں کوئی ملک غذائیات کی پیداواری میں ہندوستان کی برابری نہیں کرسکتا تھا۔ مگر انگریزی عہد حکومت میں پیداوار نہایت زیادہ گھٹ گئی ہے اور بتدریج گھٹتی چلی جاتی ہے۔ جس کی معنوی وجہ بادشاہ کی بدنیتی اور خودغرضی ہے جو کہ رعایا کی بہبودی کا ارادہ نہیں کرتا بلکہ ہر امر میں اس کا مطمح نظر ہندوستانیوں کو لوٹنا اور اپنی قوم اور ملک کو پرورش کرنا اور نفع پہنچانا رہتا ہے روحانی پیشواؤں کی واضح تصریحات پائی جاتی ہیں کہ بادشاہ کی نیک نیتی اور بدنیتی کا اثر رعایا کی خوشحالی اور بدحالی پر نہایت زیادہ پڑتا ہے اور ظاہری وجہ کاشتکاری اور زیادتی پیداوار کے ذرائع اور وسائل میں کمی اور ناپیدگی ہے کاشتکار اور زمیندار پر مختلف قسم کی مالیات کا اتنا بوجھ ڈالدیا گیا ہے کہ وہ کھاد، آلات کشاورزی، بیل، جانوروں کا چارہ زمین چھوڑے رکھنا، مزدوروں کو زیادہ سے زیادہ لگانا آب پاشی حاصل کرنا اور اس قسم کی دوسری

سہولتوں کو پوری طرح مہیا نہیں کرسکتا۔ خصوصاً حیوانات زراعت کی انتہائی گرانی اور ان کے چارہ کی کمی اور مہنگائی کاشتکاروں کے لئے ہر ہر قدم پر سخت رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ جو بیل فیروز تغلق کے زمانہ میں ۲ دو روپیہ کو آتا تھا وہ آج دو سو روپیہ میں حاصل نہیں ہوتا۔ مندرجہ ذیل۔۔ اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ہندوستان جو کہ زراعتی صلاحیت کی حیثیت سے تمام دنیا میں امتیازی شان والا شمار کیا جاتا تھا آج کس قدر پستی پر آگیا ہے:۔

۱۹۰۷ء کی پیداوار کی اوسط گیہوں کی فی ایکڑ بہ نسبت دیگر ممالک حسب ذیل ہے

سلطنت متحدہ انگلستان و آئرلینڈ فی ایکڑ	جرمنی فی ایکڑ	فرانس فی ایکڑ۔۔
۲۵ من کے قریب	۲۴ من سے کچھ کم	۱۶ من کے قریب
ریاستہائے متحدہ امریکہ فی ایکڑ۔		ہندوستان فی ایکڑ۔۔۔۔۔۔
۱۱ من سے کم		۹ من سے کچھ زیادہ

(معیشت الہند صفحہ ۹۷)

چاول کی پیداوار فی ایکڑ حسب ذیل ہے۔

ہسپانیہ	اٹالیہ	ہندوستان
۶۲٫۹	۴۳٫۰	۱۴٫۹

جبکہ دنیا کی تمام مملکتیں اپنی اپنی سلطنتوں اور حکومتوں سے زراعت کی "ترقی" کے لئے بے شمار امدادیں حاصل کررہی ہیں ہندوستان زراعتی "ترقی" کے ذرائع میں مثل دیگر تعمیری امور کے نہایت بے بس اور کمزور دکھائی دیتا ہے بقول مسٹر پیٹر فریمین (ممبر پارلیمنٹ و صدر کامن ویلتھ آف انڈیا لیگ) ہندوستانی گورنمنٹ زراعت پر ہندوستان کی آمدنی سے فی صدی صرف ایک خرچ کرتی ہے۔ (دیکھو مدینہ بجنور مورخہ ۲۵ مارچ ۱۹۳۰ء از انڈین نیوز لندن) ظاہر ہے کہ ایسی بے توجہی میں زراعت ترقی کس طرح کرسکتی ہے حالانکہ تنزلِ زراعت کے بے شمار اسباب چاروں طرف سے بڑھتے چلے جاتے رہے جنمیں سے عام ہندوستانیوں کا روز افزوں افلاس اور اس پر روز افزوں ٹیکس و مال گزاری سب سے بڑا سبب ہے۔ اور یہی وجہ اس کے باعث ہوتے

کہ وہ انگلستان جس میں زمانہائے سابق میں یعنی برطانیہ کے ہندوستان پر قبضہ کرنے سے پہلے بہت زیادہ قحط پڑتا رہتا تھا۔ قحط سے تقریباً محفوظ ہوگیا کیونکہ اس میں بے شمار دولت اور اناج ہندوستان سے کھنچ کھنچ کر پہنچنے لگا۔ اور وہ ہندوستان جس میں ہمیشہ غلہ کی افراط اور انتہائی ارزانی رہا کرتی تھی۔ قحط اور کال کا گھر بن کر رہ گیا۔ سنہ ۱۰۰۰ء یعنی گیارہویں صدی عیسوی سے لے کر سنہ ۱۷۰۰ء یعنی سترہویں صدی کے ختم تک سات سو برس کے قحط کے دونوں ملکوں کے مقابلۃً اعداد و شمار حسب تصریح سر ولیم ڈگبی صدی وار حسب ذیل ہیں۔

سنہ ایک ایک صدی	انگلستان	ہندوستان	وسعت قحط
گیارھویں صدی سنہ ۱۰۰۰ء سے سنہ ۱۱۰۰ء تک	۲۰ قحط	۲ قحط	ہر دو مقامی
بارھویں صدی سنہ ۱۱۰۰ء سے سنہ ۱۲۰۰ء تک	۱۵ قحط	۱ قحط	دہلی کے گرد و نواح میں
تیرھویں صدی سنہ ۱۲۰۰ء سے سنہ ۱۳۰۰ء تک	۱۹ قحط	۳ قحط	مقامی
چودھویں صدی سنہ ۱۳۰۰ء سے سنہ ۱۴۰۰ء تک	۱۶ قحط	۳ قحط	مقامی
پندرھویں صدی سنہ ۱۴۰۰ء سے سنہ ۱۵۰۰ء تک	۹ قحط	۲ قحط	مقامی
سولہویں صدی سنہ ۱۵۰۰ء سے سنہ ۱۶۰۰ء تک	۱۵ قحط	۳ قحط	مقامی
سترھویں صدی سنہ ۱۶۰۰ء سے سنہ ۱۷۰۰ء تک	۶ قحط	۳ قحط	غیر معیّن

سترھویں صدی تک انگلستان کے کُل قحط ۱۰۰ اور ہندوستان کے ۱۷ قحط ہوتے ہیں

مگر ہندوستان میں برطانیہ کے آنے اور اقتدار حاصل کرنے کے بعد دونوں ملکوں کی حالت میں نمایاں انقلاب ہوگیا۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار ملاحظہ ہوں۔

اٹھارویں صدی (از سنہ ۱۷۰۰ء تا سنہ ۱۸۰۰ء) انگلستان میں ۶ قحط۔ اور ہندوستان میں سنہ ۱۷۰۰ء سے سنہ ۱۷۴۵ء تک ۴ قحط اور سنہ ۱۷۶۹ء سے سنہ ۱۸۰۰ء تک ۷ قحط (کل ۱۱ قحط) {صوبجات شمالی مغربی۔ دہلی و سندھ (مقامی)

{انیسویں صدی۔ (از سنہ ۱۸۰۰ء تا سنہ ۱۹۰۰ء) انگلستان میں صرف ایک قحط اور ہندوستان میں ۳۱ قحط۔

(جن کی وسعت تمام ہندوستان پر حاوی تھی اور جو اپنی نوعیت میں شدید تھے)

ہندوستان میں انیسویں صدی کے اکتیس قحطوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔ جس میں سر ولیم ڈگبی نے ہر چوتھائی صدی کا حساب علیحدہ علیحدہ دکھایا ہے۔

مدت	تعداد	کیفیت
سنہ ۱۸۰۰ء سے سنہ ۱۸۲۵ء تک	۵ قحط	اس چوتھائی صدی میں قحط سے پچاس لاکھ آدمی مرگئے
سنہ ۱۸۲۶ء سے سنہ ۱۸۵۰ء تک	۲ قحط	اس چوتھائی صدی میں قحط سے دس لاکھ آدمی مرگئے
سنہ ۱۸۵۱ء سے سنہ ۱۸۷۵ء تک	۶ قحط	اس چوتھائی صدی میں قحط سے پچاس لاکھ آدمی مرگئے اور دوسرے مورخ ایک کروڑ لکھتے ہیں۔
سنہ ۱۸۷۶ء سے سنہ ۱۹۰۰ء تک	۱۸ قحط	اس چوتھائی صدی میں دو کروڑ ساٹھ لاکھ آدمی صرف قحط سے مرگئے۔

{اخبار انیس لودھیانہ مورخہ ۲۷ رجون سنہ ۱۹۲۵ء۔ مقابلہ در قحط درمیان ہندوستان وانگلستان۔ ویراسپرس برٹش .... انڈیا}

الغرض انگریزی حکومت سے پہلے ہندوستان میں قحط عموماً مقامی ہوتے تھے اور نہایت کم ہوتے تھے اور جلدی جلدی نہیں پڑتے تھے چھ سو برس میں کل قحطوں کی تعداد ہندوستان میں سترہ اٹھارہ سے زائد نہیں ہے۔ مگر انگریزی عہد حکومت میں نہایت وسیع اور بہت زیادہ اور جلد جلد ایک ہی صدی میں اکتیس قحط ایسے ایسے واقع ہوئے جن سے ملک نہایت زیادہ برباد ہوگیا اور یورپ کے بہت سے ملکوں کی آبادی سے زیادہ آدمی بھوک سے مرگئے۔

مسٹر جے۔ کیرہارڈی۔ (موسس لیبر پارٹی آف انگلینڈ) اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ:-

"سنہ ۱۸۶۰ء سے سنہ ۱۹۱۰ء تک یعنی پچاس برس کے عرصہ میں بھوک اور فاقہ سے مرنے والوں کی تعداد ہندوستان میں تین کروڑ نفوس کی تھی..."

سر ولیم ڈگبی پراسپرس برٹش انڈیا میں لکھتا ہے کہ:-

"ساری دنیا میں جنگوں کی وجہ سے ایک سو سات برس میں یعنی سنہ ۱۷۹۳ء سے سنہ ۱۹۰۰ء تک پچاس لاکھ کے قریب نقصان جان ہوا ہے، مگر ہندوستان

میں قحطوں سے صرف ۱۸۹۱ء سے ۱۹۰۰ء تک ایک کروڑ نوے لاکھ
سے زیادہ جانیں ضائع ہوئیں"۔

پہلے زمانہ کے قحطوں میں وسعت نہیں ہوتی تھی اور نہ جلدی جلدی پڑتے تھے اور جہاں پڑتے بھی تھے وہاں جانیں ضائع نہیں ہوتی تھیں لوگوں کے پاس سرمایہ وافر تھا اناج کتنا بھی مہنگا ہو جاتا تھا خرید کر جان بچا لیتے تھے مگر انگریزی زمانہ میں سرمایہ لُٹ کر باہر چلا گیا تھا۔ گراں اناج کے خریدنے کی قوت لوگوں میں باقی نہیں رہی تھی اس لئے موت کے گھاٹ عام لوگوں کو اُترنا پڑتا تھا۔ سر ولیم ڈگبی لکھتا ہے کہ:۔

"ان قحطوں اور اموات کا سبب انگریزی مورخ آسمانی اسباب یعنی بارش کو قرار دیتے ہیں مگر یہ عذر نہایت لنگ ہے۔ بارش کا نہ ہونا قلت فصل اور غلّہ کی کمی کا باعث ہو سکتا ہے مگر اصلی سبب اس ہلاکت کا افلاس ہے کہ لوگ ناداری کی وجہ سے غلّہ اپنے گردو نواح کے ان صوبوں سے خرید نہیں سکے جن میں غلّہ بکثرت پیدا ہوا تھا۔ سخت افلاس کے باعث لوگ ذرا سا بھی بار اٹھا نہیں سکتے"۔ (خوشحال برطانوی ہند ترجمہ پراسپرس)

مگر حقیقت میں اس صدی یعنی ۱۸۰۰ء سے ۱۹۰۰ء تک میں بارش کی قلّت بھی نہیں ہوئی سر ولیم ڈگبی نے قحط کے سالوں کے متعلق اعداد و شمار اور متعدد انگریز ماہرین کی شہادتیں پیش کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ ان ایام میں بارش کی کبھی بھی ایسی کمی نہیں ہوئی جس سے قحط پڑتا اور ایسی ہولناک بربادیاں ہوتیں۔ ماہرین اقتصادیات کا اندازہ ہے کہ ملک کے ہر حصّہ میں اگر اکیس اِنچ بارش ہو جائے تو فصلیں بغیر آب پاشی کے تیار ہو سکتی ہیں مگر قحط کے سالوں میں بارش کا اوسط ہر جگہ ہمیشہ بیس انچ سے زائد ہی رہا کیا۔ ۱۸۶۶ء میں اڑیسہ میں قحط پڑا حالانکہ اُس سال بارش وہاں پر چھیاسٹھ انچ ہوئی۔ ۱۸۶۷ء میں بمبئی میں قحط پڑا حالانکہ وہاں پر بارش پچاس انچ ہوئی ۱۸۷۷ء میں مدراس میں قحط پڑا حالانکہ وہاں پر بارش چھیاسٹھ انچ ہوئی۔ اور یہ بھی ثابت کیا ہے کہ اناج بازاروں میں بکثرت موجود بھی رہتا رہا مگر صرف افلاس اور انتہائی غربت

ہی باعث ہلاکت ہوئی قحط کے کمیشن کی رپورٹ ہے کہ موافق موسموں میں چودہ کروڑ ٹن غلہ ہندوستان میں سال بھر خرچ کرنیکے بعد بچ رہتا تھا۔ بعض انگریز مورخین نے یہ بھی ناکام کوشش کی ہے کہ آبادی کی زیادتی کو باعث قحط و ہلاکت قرار دیں مگر یہ بھی غلط ہے نہ ہندوستان کی آبادی فی مربع میل یورپ کے بہت سے ممالک سے اوسطاً زیادہ تھی اور نہ اسمیں آبادی کی افزائش زراعتی زمینوں کی افزائش سے زیادہ ہوئی۔ مندرجہ ذیل نقشہ سے معلوم ہوجائے گا کہ ہندوستان، آبادی کی حیثیت سے کیا درجہ رکھتا ہے۔

سنہ ۱۹۱۱ء میں	سنہ ۱۹۲۱ء میں	سنہ ۱۹۲۱ء میں
بلجیم فی مربع میل	ہالینڈ	انگلستان و ویلز
۵۸۹ نفوس	۴۵۴ نفوس	۴۰۵ نفوس
سنہ ۱۹۲۱ء میں	سنہ ۱۹۲۱ء میں	سنہ ۱۹۲۱ء میں
جاپان فی مربع میل	اٹالیہ	جرمنی
۳۱۷ نفوس	۲۹۳ نفوس	۲۹۰ نفوس
سنہ ۱۹۲۱ء میں	سنہ ۱۹۲۱ء میں	سنہ ۱۹۲۱ء میں
چین	اسٹریا	ہندوستان فی مربع میل
۲۶۶ نفوس	۳۶۶ نفوس	۲۱۱ نفوس

(نوٹ) اگرچہ بعض خاص خاص حصوں میں ہندوستان میں آبادی فی مربع میل تمام ملکوں سے بہت زیادہ ہے مگر مجموعہ ہندوستان کی آبادی کا اوسط دوسو گیارہ ہی ہے۔

الغرض ہندوستان باعتبار اوسط آبادی ان تمام ملکوں سے بہت کم ہے مگر افلاس اور قحط کی حیثیت سے سب سے زیادہ بڑھا ہوا کردیا گیا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ہندوستان میں اضافہ آبادی فی صدی سات ہوا ہے مگر اضافہ کاشت فیصدی آٹھ یا اس سے بھی زاید ہولہے۔ مندرجہ بالا حقایق کے پیش نظر اس پروپگنڈے کی حقیقت بھی کھل جاتی ہے جو کہ بہت سے

انگریز اور ان کے ایجنٹ انگریزی حکومت کی برتری کے حق میں کیا کرتے ہیں کہ انگریزی حکومت سے پہلے ہندوستان میں امن وامان کسی طرف بھی اطراف ہند میں نہ تھا۔ عموماً لڑائیاں ہوا کرتی تھیں جن سے مخلوق تباہ وبرباد ہوا کرتی تھی مگر انگریزی حکومت نے تمام ملک میں ہر طرف امن وامان ایسا قائم کر دیا جس کی نظیر زمانہائے گذشتہ میں نہیں ملتی"۔ کیونکہ اولاً یہ کہنا ہی غلط ہے کہ انگریزی حکومت کے زمانہ میں ہمیشہ اطرافِ ملک میں امن وامان رہا۔ ۱۷۵۷ء یعنی جنگ پلاسی سے لے کر ۱۸۵۷ء تک کا ایک صدی کا زمانہ داخلی ہندوستان میں تمام لڑائیوں اور جنگ سے بھرا ہوا ہے جن میں عموماً ہندوستانی زیادہ تر ہلاک ہوتے رہے اور ہندوستانی ہی سرمایہ لوٹا جاتا رہا اسی صدی میں نواب سراج الدولہ والی مرشد آباد بنگال کی لڑائی۔ میر قاسم نواب اودھ وغیرہ کی پٹنہ اور بکسر کی لڑائی روہیلکھنڈ کی طویل وعریض۔ کرناٹک اور دکن کی لڑائیاں۔ سلطان ٹیپو مرحوم کی لڑائیاں۔ مرہٹوں سے لڑائیاں۔ نیپال اور بھوٹان کی لڑائیاں۔ پنجاب اور اودھ اور سندھ بمبئی وغیرہ کی لڑائیاں ہیں۔ جن میں بے شمار جانیں ضائع ہوئیں۔ اور آخر ۱۸۵۷ء کی مشہور انقلابی لڑائی ہے جس سے تمام ہندوستان انتہائی بربادی کے گھاٹ پر اتار دیا گیا تھا۔ اس کے بعد بیرون ہند کی لڑائیوں کا سلسلہ جاری ہوا جس میں افغانستان پر چار مرتبہ حملوں میں لاکھوں ہندوستانی مارے گئے مغربی اور شمالی سرحد کے آزاد قبائل سے صوات، بنیر، چترال، بنوں کھوای آفریدیوں، سعودیوں، مہندیوں، وزیریوں وغیرہ سے یکے بعد دیگرے مختلف اوقات میں بار بار لڑائیاں ہوئیں اور لاکھوں نفوس کام آئے۔ نیز بلوچستان کی لڑائیاں، برہما جنوبی اور شمالی، تبت وغیرہ اطراف ہند کی لڑائیاں، پھر بیرون ہند، چین، سمالی لینڈ، سوڈان مشرقی افریقہ، جنوبی افریقہ، مصر وغیرہ کی لڑائیاں، اور آخر میں ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم اول جس میں ہندوستانی جانیں بے حد وبے نہایت ضائع ہوئیں۔ یعنی عراق (ماسوپوٹامیہ) عدن، فلسطین، شام (سوریہ) چناق قلعہ، سمرنا، ایشیائے کوچک، بلجیم، فرانس وغیرہ کی لڑائیاں ہیں۔ جو کہ جرمنوں اور ترکوں اور ان کے حلفاء سے واقع ہوئیں اور ان میں۔۔

ہندوستانی جانیں پانی کی طرح ضائع ہوئیں اور کروڑوں اشرفیاں اور روپیہ اور کروڑوں ... ٹن رسد وغیرہ برباد ہوئی۔ کیا یہ چیزیں ہندوستان کی بربادی میں کچھ کم اثر انداز ہوئیں تھیں؟ حالانکہ ان لڑائیوں کی بنیاد محض انگریزی شہنشاہیت و اقتدار اور برطانوی تجارت کی برتری تھی۔ ہندوستان کا کوئی مفاد پیش نظر نہ تھا۔ پھر اس کے بعد جنگ عظیم ثانی جو کہ ۱۹۳۹ء سے شروع ہو کر ۱۹۴۳ء کے آخر تک جاری رہی اور برطانوی مفاد کی خاطر ہندوستان کی ہر چیز کو یورپین قربان گاہ پر چڑھا دیا گیا۔ ان لڑائیوں میں جس قدر ہندوستان کا دو سو برس کے اندر نقصان ہوا ہے، انگریزی اقتدار سے پہلے زمانہ میں ہزاروں برس میں بھی نہیں ہوا تھا۔

ہم اگر ان لڑائیوں سے قطع نظر کرلیں تو ان قحطوں کی وجہ سے باوجود امن وامان جس قدر جانی نقصان تمام ہندوستان کو صرف ڈیڑھ صدی میں برداشت کرنا پڑا ہے تمام دنیا کو ایک ہزار برس کی جنگوں سے برداشت کرنا نہیں پڑا۔ فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَارِ۔

ہندوستان ذرائع دولت ومعیشت میں صنعتی اور تجارتی حیثیت سے تمام دنیا سے فائق تر تھا۔ انگریزوں نے اپنی خود غرضی کی وجہ سے اس کی صنعت اور تجارت دونوں کو تباہ وبرباد کردیا۔

ہندوستان زمانہائے قدیمہ سے صنعتی اور تجارتی ملک تھا۔ اس میں بکثرت ہر جگہ صنعتی کارخانے قائم تھے۔ اور ہر صنعت کے اعلیٰ درجہ کے ماہر دستکار پائے جاتے تھے۔ جو کہ یہاں کی خام پیداوار سے نہایت نفیس ایسی عمدہ اشیاء تیار کرتے تھے۔ جن کی اطراف عالم میں نہایت زیادہ مانگ اور مقبولیت ہوتی تھی۔ خشکی اور تری کے راستوں سے ان کی تجارت ایشیاء، یورپ، افریقہ، اور مشرق بعید میں ہوتی تھی اور ہر سال کروڑوں اشرفیاں ان کی قیمت میں ہندوستان میں آتی تھیں۔ جن کی وجہ سے کاروباری لوگ نہایت آرام اور چین کی زندگی بسر کرتے تھے۔ یہاں بیکاری کا نام ونشان تک نہ تھا۔ فاقہ مستی اور غربت وافلاس کا یہاں کے باشندوں پر سایہ بھی نہیں پڑتا تھا۔ ہر طرف آرام

اور چین کا غلغلہ تھا۔ یہاں کے لوگ فارغ البالی اور خوشحالی میں کروٹیں لیتے تھے چنانچہ ہم مسٹر تھارنٹن کا قول مندرجہ ذیل اس کے سفرنامہ سے نقل کر چکے ہیں۔ وہ کہتا ہے:۔

"یورپ کو تہذیب سکھانے والے یونان اور اٹلی جبکہ بالکل جنگلی حالت میں تھے ہندوستان اُس زمانہ میں درجۂ کمال کو پہنچا ہوا تھا اور دولت کا مرکز تھا۔ یہاں چاروں طرف بڑے بڑے صنعت اور حرفت کے کاروبار جاری تھے۔ یہاں کے باشندے دن رات اپنے کاروبار میں مشغول رہتے تھے یہاں کی زمین نہایت زرخیز تھی جس سے فصل خوب پیدا ہوتی تھی۔ یہاں بڑے بڑے لایق اور کاریگر صناع موجود تھے جو یہاں کی خام پیداوار سے اتنا نفیس اور عمدہ مال تیار کرتے تھے کہ جس کی دنیا بھر میں مانگ ہوتی تھی۔ مغرب اور مشرق کے تمام ممالک ان اشیاء کو بڑے شوق سے خریدتے تھے۔ یہاں سوت اور کپڑے اس قدر عمدہ اور باریک نفیس و خوبصورت بنتے تھے کہ دنیا میں کوئی ملک بھی ان کی برابری نہ کر سکتا تھا۔" (رسالہ مظلوم کسان صہ ۱۳)

نیز ہم پہلے کتاب علم المعیشتہ سے حرفتی کمیشن کی ... رپورٹ کا مندرجہ ذیل اقتباس نقل کر چکے ہیں

"ایسے زمانہ میں جبکہ مغربی یورپ میں جو کہ موجودہ طریق حرفت کا مولد و منتہا ہے غیر مہذب قبائل آباد تھے۔ ہندوستان اپنے حکمرانوں کی دولت اور اپنے کاریگروں کی اعلیٰ صنعت کے لئے ... مشہور تھا اور بہت بعد کے وقت میں جبکہ مغرب کے حوصلہ مند تاجر پہلے پہل ہندوستان میں نمودار ہونے لگے یہ ملک زیادہ ترقی یافتہ یوروپین اقوام سے کس طرح گھٹا ہوا نہیں تھا۔"

مسٹر مریڈیتھ ٹاونشنڈ اپنی کتاب ایشیاء اور یورپ میں لکھتا ہے:۔

"ہندوستان کے معمولی کاروباری لوگوں کے واسطے ہماری حکومت کسی طرح مبرا از خطا نہیں ہو سکتی اور ہماری حکومت سے یہ خرابی کبھی دور نہیں ہو سکتی۔ بڑی خرابی یہ ہے کہ ہماری حکومت نے ہندوستانیوں کی زندگی بالکل بے لطف بنا دی ہے۔ عام انگریزوں کو یہ سمجھانا مشکل ہے کہ ہماری حکومت سے پہلے ہندوستانی زندگی کیسی پر لطف تھی اور کاروباری اور باہمت لوگوں کے واسطے ہر ایک کاروبار میں کیسی آسانیاں میسر تھیں۔ مجھے پختہ یقین ہے کہ انگریزوں کے آنے سے پہلے کاروباری

ہندوستانی نہایت آرام کی زندگی بسر کرتے تھے۔"

(رسالہ تلک صفحہ ۱۱)

انگریز مصنفین اپنی اغراض ملعونہ کے ماتحت ہمیشہ یہ پروپگنڈہ کرتے رہے کہ زمانہ قدیم سے ہندوستان صرف زراعتی ملک رہا ہے مگر ڈاکٹر فرانسس بکانن (فرانسس بوجانن) جنکو لارڈ ویلزلی نے ۱۸۰۰ء میں جنوبی ہند کی معاشیات کی تحقیقات کے لئے مقرر کیا تھا تمام ملک میں دورہ کرکے بچشم خود معائنہ کرتے ہیں اور تین ضخیم جلدوں میں رپورٹ مکمل تیار کرکے لندن میں شائع کرتے ہیں جس پر عام طور پر انگریز مطلع ہوکر اس قدر پسند کرتے ہیں کہ کمپنی ان کو شمالی ہند کے دورہ کرنے اور وہاں کے حالات بچشم خود دیکھ کر قلمبند کرنے پر پھر مقرر کرتی ہے، چنانچہ اس کی تکمیل بھی تین ضخیم جلدوں میں ہوکر لندن میں شائع کی گئی۔ اس کتاب میں اٹھارھویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے ابتدائی زمانہ کا ہندوستان کا معاشی حال نہایت تفصیل سے مذکور ہے اُس سے نتیجہ ذیل اخذ کرکے صاحب علم المعیشۃ ص۲۰۵ میں لکھتا ہے۔

"یہ خیال غلط ہے کہ سدا سے ہندوستان کا عام پیشہ زراعت ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہندوستان کی زمین اور آب وہوا کاشت کے واسطے بیحد موزوں ہے اور ہمیشہ سے ہندوستان میں کاشتکاروں کی ایک بڑی جماعت چلی آتی ہے لیکن جیسا کہ یقین دلایا جاتا ہے، یہ بیان خلاف واقعہ ہے کہ ...... من حیث القوم ہندوستانیوں کا ذریعہ معاش زراعت ہی زراعت رہا ہے بلکہ جو جماعت طرح طرح کی صنعت وحرفت سے اپنی روزی کماتی تھی وہ اگر کاشتکاروں سے زیادہ نہ تھی تو بہت کم بھی نہ تھی۔ ڈاکٹر بوجانن کا قول ہے کہ جامہ بافی کی صنعت وحرفت کا ہندوستان میں اس قدر رواج اور عروج تھا کہ زراعت کے مانند اس کو بھی عام ملکی پیشہ قرار دینا بیجا نہ ہوگا۔ کروڑہا بندگانِ خدا اسی پیشہ پر بسر اوقات کرتے تھے۔ ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ سے اعلیٰ قسم تک روئی اور ریشم کا کپڑا یہاں پر بکثرت تیار ہوتا اور مقامی صرف کے علاوہ دور و دراز ممالک تک جاتا تھا۔ روپہلی کلابتون بٹ کر صدہا قسم کے زربفت تیار کرتے تھے۔ جس سے بادشاہوں کے جسم و محلات کی زینت و

آرایش ہوتی تھی اون سے غریبوں کے واسطے کمبل اور امراء کے واسطے شال تیار ہوتے تھے جواب تک عجائبات مصنوعات میں نمبر اوّل شمار ہوتے ہیں۔ ہندوستانی ململ۔ اطلس۔ کمخواب۔ جامہ وار۔ چکن۔ چھینٹ نفاست و خوبی میں ابتک بطور ضرب المثل زبان زد ہیں۔ ان کی پائداری ہر کسی کو مسلّم ہے۔ کپڑوں پر اس غضب کی سوزن کاری ہوتی تھی کہ پرانے کشیدے دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ فرش و فروش کا کل سامان۔ چادریں۔ شطرنجیاں۔ دریاں بکثرت تیار ہوتی تھیں تانبے۔ پیتل کے خوشنما ظروف۔ سونے چاندی کے نظر فریب زیورات۔ گوناگوں رنگ۔ اعلیٰ درجے کے تیل و عطر ہر قسم کا چرمی سامان۔ طرح طرح کے ہتھیار۔ لکڑی پر نقاشی اور ہاتھی دانت۔ کا عجیب و غریب کام اور نہایت پائدار کاغذ۔ غرضیکہ ناگزیر ضروریات کی کل چیزیں اور اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کی بہت سی تعیشات ایک صدی کی بات ہے۔ ہندوستان میں اس کثرت سے تیار ہوتی تھیں کہ دیگر ممالک یہاں سے مال منگا منگا کر استعمال کرتے تھے۔ صنعت و حرفت کا ہر طرف چرچا تھا۔ مصنوعات کی دور و پاس شہرت تھی۔ باوجودیکہ کافی امن میسّر نہ تھا۔ لوگوں کو کس قدر ذرائع معاش حاصل تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ پیدائش کے دونوں اہم صیغے یعنی زراعت اور صنعت و حرفت اپنے ہی ہاتھ میں تھے۔ اور اگر حالات مساعدت کرتے اور مزاحمتیں سدّراہ نہوتیں تو جس قوم نے آج سے ایک صدی پہلے مصنوعات میں اس قدر ترقی کر لی تھی معاشی ترقیات میں آج اس کا کیا درجہ ہوتا۔ لیکن ہندوستان کچھ ایسے جال میں پھنسا کہ اس کی صنعت و حرفت تھوڑے ہی عرصہ میں دم توڑنے لگی۔ اور اب تک حالت نزع میں گرفتار ہے۔ ۵۰ فیصدی آبادی کی وجہ معاش کا بار زراعت پر آپڑا۔ باقی ماندہ لوگ ملازمت، معمولی صنعت و حرفت اور بیکاری میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ زراعت ہندوستان کے سر منڈھی گئی۔ اور اکثر صنعت و حرفت ممالک یورپ نے سنگوائی۔ اس تقسیم عمل سے ہندوستان کا جو نفع نقصان ہو رہا ہے اس سے قبل تجارت بین الاقوام میں واضح کیا جا چکا ہے۔

(علم المعیشۃ صفحہ ۵۸۰-۵۸۱-۵۸۲)

مذکورہ بالا صنایع اور دستکاریوں کے علاوہ جہاز بنانے میں ہندوستانیوں کی مہارت نہایت بے نظیر اور کامل تھی۔ اور اسی طرح جہازرانی اور سمندروں کی واقفیت میں بھی وہ نہایت اعلیٰ پایہ رکھتے تھے۔ صاحب معیشتہ الہند لکھتا ہے :-

"پارچہ بافی اور دیگر صنعتوں کی ترقی یافتہ حالت تو بخوبی مسلّم ہے لیکن یہ سن کر شاید تعجب ہو کہ اس زمانہ کے لحاظ سے ہندوستان کے لوگ جہاز کے کام میں بھی خوب ہشیار اور ماہر تھے۔ یوں تو جہاز سازی اور جہازرانی ہندوستان کی بہت قدیم صنعت اور بہت قدیم پیشہ ہے۔ لیکن یہ ایک وسیع تاریخی بحث ہے جس کے واسطے یہاں کوئی گنجائش نہیں۔ تاہم اٹھارھویں صدی کے آخر تک بھی یہ حالت تھی کہ لارڈ ویلزلی گورنر جنرل اپنے ایک مراسلہ میں کمپنی کے ڈائرکٹروں کو حسب ذیل تحریر فرماتے ہیں:"

کلکتہ کے بندرگاہ میں دس ہزار ٹن کے قریب جہاز موجود ہیں۔ جو ہندوستان ہی میں تیار ہوئے ہیں اور اس قسم کے ہیں کہ ان میں انگلستان کو مال جاسکتا ہے۔ خانگی جہازوں کی جو تعداد کلکتہ کے بندرگاہ میں موجود ہے۔ بنگال میں جہاز سازی کی صنعت نے جو کمال حاصل کرلیا ہے اور عمدہ چوبینہ کی کثرت کی بدولت یہ صنعت جس سرعت سے ترقی کرسکتی ہے۔ ان تمام باتوں کے مدنظر یہ امر یقینی ہے کہ بنگال کے انگریزی تاجر جس قدر بھی مال انگلستان لیجانا چاہیں کلکتہ کے بندرگاہ میں لندن جانیکے واسطے کافی جہاز دستیاب ہوسکتے ہیں۔ لیکن مشہور مؤرخ ٹیلر صاحب کا بیان ہے کہ ہندوستان کا مال لیکر ہندوستانی جہاز جب لندن کے بندرگاہ میں پہنچے تو وہاں ان جہازوں کو دیکھ کر سنسنی پیدا ہوگئی۔ گویا کہ خدانخواستہ دریائے ٹیمس میں کسی غنیم کا جنگی بیڑہ گھس آیا۔۔۔ لندن کے جہاز سازوں نے شور برپا کردیا کہ ان کا کاروبار تباہ ہوا چاہتا ہے اور انگلستان میں تمام جہاز سازوں کے خاندان بھوکوں مرجائیں گے۔ کمپنی بھی اس مخالفت سے مرعوب ہوگئی۔ اور بالآخر حکم دیدیا کہ ہندوستانی جہازوں سے کام نہ لیا جائے اور وہ لندن کے بندرگاہ میں نہ آئیں۔ بلکہ ہندوستان کے جہازران بھی ملازم نہ رکھے جائیں۔ کیونکہ جب وہ لندن پہنچکر وہاں کے حالات

دیکھتے ہیں تو ان کے دل میں ہماری وہ وقعت باقی نہیں رہتی جو بالعموم ہندوستان میں پیدا ہو گئی ہے اور جو حکمرانی کے واسطے لازم ہے اور واپس جا کر وہ لوگ اپنے ملک میں ہمارے قصے سناتے ہیں۔ اس سے بڑی خرابی پیدا ہونیکا اندیشہ ہے۔ لہذا مادی۔ اخلاقی۔ کاروباری اور سیاسی ہر لحاظ سے ہندوستانی جہاز یا ہندوستانی جہاز رانوں کا لندن آنا مناسب نہیں۔ اسی طرح اُنیسویں صدی کے شروع سے ہندوستان کی یہ صنعت بھی کس مپرسی کے ہاتھوں تباہ ہو گئی۔ ورنہ خدا جانے اب تک کس درجہ ترقی حاصل کر لیتی"۔

(معیشت الہند صفحہ ۶۹۸-۶۹۹-۷۰۰)

مسٹر مکرجی اپنی کتاب تاریخ ہندوستان میں لکھتا ہے۔ صفحہ ۲۳۳

"ایک انگریز مقیم بالاسور اپنے خط مورخہ ۱۶ دسمبر ۱۶۷۰ء میں ڈائرکٹران کمپنی آف لندن کو لکھتا ہے"بہت سے انگریز جہاز ران تاجروں کے جہاز و بادبان ہر سال یہاں تیار ہوتے ہیں۔ پرانے اور بہترین قسم کے ساگوان یہاں بکثرت موجود ہیں۔ اور بہترین لوہا بھی بافراط دستیاب ہوتا ہے۔ اور ہر قسم کی کاریگری کے کام مثلاً بولٹ، میخ، کیل، لنگر وغیرہ یہاں کے لوہار نہایت ہوشیاری سے انجام دیتے ہیں۔ مضبوط جہاز تیار کرتے ہیں اور صحت و درستگی کے ساتھ جہازوں کو پانی میں اُتار دیتے ہیں۔ یہاں کے کاریگر ہر ہوشیار کاریگر سے مقابلہ کر سکتے ہیں"۔

(مالیات عامہ صفحہ ۱۵)

نیز بھی مسٹر مکرجی اسی اپنی کتاب تاریخ ہندوستان صفحہ ۲۴۴ میں لکھتا ہے:-

"۱۸۰۲ء کے بعد کے زمانہ میں بھی ہندوستان سے جنگی اور تجارتی جہاز بن کر انگلستان جایا کرتے تھے"۔

(مالیات عامہ صفحہ ۱۶ از رادھا کمار مکرجیس
اے ہسٹری آف انڈیا شپنگ)

نیز یہی مسٹر مکرجی اسی اپنی کتاب تاریخ ہندوستان صفحہ ۲۵ میں لکھتا ہے :-

"انگلستان والے یہاں کے مشاق کاریگروں سے نقشہ بنوالیا کرتے تھے"

(مالیات عامہ صفحہ ۱۶)

سر ولیم ڈگبی پراسپرس برٹش انڈیا صفحہ ۹۰۸ میں لکھتا ہے :-

"۱۸۰۰ء میں گورنر جنرل نے اپنے آقاؤں کو لندن لیڈن ہال میں رپورٹ کی کہ کلکتہ کے بندرگاہ میں دس ہزار نئے جہاز موجود ہیں جو اسی جگہ بنائے گئے ہیں اور ہندوستان سے انگلینڈ کو مال تجارت پہنچانے کے لئے کارآمد ہیں۔ کلکتہ کے بندرگاہ میں جسقدر جہاز موجود ہیں اور جس کمال کو جہاز بنانے کا کام بنگال میں پہنچ چکا ہے۔ اور لکڑی کی بہتات کی وجہ سے اس میں بہت جلد ترقی ہونیکی امید ہے اُس کے لحاظ سے یہ یقینی امر ہے کہ اس بندرگاہ میں اس قدر جہاز برابر تیار ہو سکیں گے جس قدر پرائیویٹ انگریز سوداگروں کو مال تجارت پہنچانیکے لئے درکار ہونگے"

نیز سر ولیم ڈگبی اسی کتاب پراسپرس برٹش انڈیا میں بمبئی کے متعلق ایک انگریز لفٹنٹ کرنل لمے (واگز) کی رپورٹ ۱۸۱۱ء اور اسکا مشورہ نقل کرتا ہے جو درج ذیل ہے :-

"صرف بمبئی میں سوداگری کے دو جہاز یا ایک جہاز اور دو جنگی جہاز انگریزی بحری فوج کے لئے اٹھارہ مہینوں میں تیار ہو سکتے ہیں۔ اور بمبئی کے ڈاک (جہاز بنانے کی جگہ) اس قابل ہیں کہ بڑی سے بڑی طاقت کا جہاز بھی ان میں تیار ہو سکتا ہے (اولاً) گجرات اور ملابار کے جنگلوں کے درمیان میں واقع ہونیکی وجہ سے لکڑی کا بکثرت پہنچنا۔ (ثانیاً) سن اچھی قسم کی ہندوستان میں بکثرت پیدا ہونا۔ (ثالثاً) انگریزی بحری فوج کا یورپ کا تیار شدہ جہاز ہر بارہ سال کے بعد از سر نو تیار کیا جاتا ہے۔ (رابعاً) بمبئی کا ساگوان کا بنا ہوا جہاز پچاس سال سے بھی زیادہ چل سکتا ہے۔ (خامساً) بمبئی کے بہت سے جہاز چودہ پندرہ سال کے بعد بحری فوج

کے لئے خریدے گئے تو نہایت مضبوط پائے گئے۔ جہاز موسوم بہ سر ایڈورڈ ہیوز آٹھ سفر سوداگری کے کر چکا تھا کہ بحری فوج کے لئے خریدا گیا۔ حالانکہ یورپ کا کوئی جہاز چھہ سفر بھی سلامتی کے ساتھ طے نہیں کر سکتا۔ (ساوشا) بمبئی میں جو جہاز بنتے ہیں اُن پر انگلینڈ کی بہ نسبت پچیس فیصدی کم لاگت لگتی ہے"۔

مندرجہ بالا حساب سے سر ولیم ڈگبی نے ایک بیڑہ بحری جہاز کی تیاری کا موازنہ باعتبار مُدت اور باعتبار مصارف وغیرہ حسب ذیل درج کیا ہے۔

	۱۸ ماہ یعنی ڈیڑھ برس میں	تین برس میں	پندرہ برس میں۔
بمبئی میں بحری جہاز	۲ عدد فوجی بحری جہاز	۴ عدد فوجی بحری جہاز	۲۰ عدد فوجی بحری جہاز (یعنی ایک بیڑہ)

	صرفہ تعمیر	صرفہ ترمیم و تجدید ۵۰ سال	کل صرفہ پچاس برس میں۔	
انگلینڈ کا جہاز	۱۰۰ پونڈ	۳۰۰ پونڈ	۴۰۰ پونڈ	
	صرفہ تعمیر	صرفہ تعمیر و ترمیم ۵۰ سال	کل صرفہ پچاس سال میں	بچت فیصدی
بمبئی کا جہاز	۵۰ پونڈ	۰	۷۵	۳۲۵ پونڈ

صاحب حکومت خود اختیاری صفحہ ۶۶ میں لکھتا ہے :-

"بعض اصحاب یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان ہمیشہ سے محض ایک زرعی ملک رہا ہے حالانکہ گذشتہ صفحات میں بکثرت انگریزوں کے اقتباسات دیئے گئے ہیں جن سے واضح ہے کہ ہندوستان کی صنعت کس درجہ پر رہی ہے اور کس طرح وہ توڑی گئی۔

تاہم اُن تحریرات پر میں چند امور اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ نواب مرزا یار جنگ صاحب چیف جسٹس حیدر آباد دکن نے کپتان الگزنڈر ہملٹن کے حوالہ سے تحریر فرمایا ہے کہ یہاں صرف ایک شہر کے مختلف کارخانوں میں پچاس ہزار پارچہ باف کام کرتے تھے اور جو سامان تیار ہوتا تھا اُس کا جزو اعظم بیرونی ممالک کو بلکہ خاص کر

یورپ کو جاتا تھا۔ برخلاف اس کے یورپ سے جو مال آتا تھا وہ نہایت کم تھا۔ مثلاً ۱۷۹۴ء کی نسبت معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان میں انگلستان سے صرف (۱۵۶) پونڈ کپڑا آیا۔ پروفیسر ولسن نے لکھاہے کہ "لوہا" ڈھالنے کی صنعت اس ملک (انگلستان) میں صرف چند سال سے ہے۔ ہندی لوہا ڈھالنے اور اسپات بنانے کا کام نامعلوم زمانہ سے جانتے ہیں"۔

مسٹر راناڈے نے ۱۸۹۲ء میں لکھا تھا کہ "دہلی کی مشہور لوہے کی لاٹھ جو پندرہ سو سال کی پرانی ہے اُس سے لوہا ڈھالنے کی صنعت کا اندازہ ہوتا ہے"۔

مسٹر بال کو جو ہندوستان کے محکمہ پیمائش کے افسر رہے ہیں اُنھیں تسلیم ہے کہ "چند سال پہلے تک دنیا کے سب سے بڑے کارخانوں میں اتنی بڑی لاٹھ کا ڈھالنا ناممکنات سے تھا اور اب بھی بہت کم کارخانے ایسے ہیں جو اتنی کثیر مقدار دھات کو ڈھال سکتے ہیں"۔

ایک اور مصنف کا بیان ہے کہ لندن میں فولاد ہندوستان کے نام سے فروخت کیا جاتا تھا۔ مسٹر ڈگبی نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں جہاز سازی نہایت اعلیٰ درجہ کی حالت میں تھی مگر انگریز اُسے گوارا نہ کرسکے۔ مسٹر ٹیلر نے لکھاہے کہ لندن کی بندرگاہ میں جب ہندوستان کا مال ہندوستان کے بنے ہوئے جہازوں میں پہنچا تو اُس سے وہاں کے بااختیار لوگوں میں اس قدر سخت پریشانی پھیلی کہ کسی دشمن کے بیڑے سے بھی نہ پھیلتی۔ لندن کے جہاز سازوں نے اس شور و غوغا کرنے میں، نمایاں حصہ لیا اور کہا کہ ہمارا کاروبار بربادی کے کنارے آلگا ہے اور ہمارے بال بچے یقیناً فاقہ کشی میں مبتلا ہو جائیں گے، (ماخوذ از رپورٹ صنعتی کمیشن صفحہ ۲۹۹)

اس چیخ و پکار سے ڈائرکٹران کمپنی پر اثر پڑا اور اُنھوں نے جہاز سازی کی صنعت ہندوستان کی بندرگاہوں سے توڑ کر انگلستان کی فاقہ کشی کے خطرہ کو ہندوستان

کی طرف روانہ کر دیا۔"

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہندوستان قدیم زمانہ سے صنعتی اور تجارتی ملک تھا۔ یہاں ہر قسم کی اعلیٰ اور ادنیٰ صنعتوں کے بے شمار کارخانے قایم تھے۔ جن سے ملکی ضروریات اور ذرایع ترقیات پوری ہوتی تھیں اور تمام دنیا کے ممالک نفع حاصل کرتے تھے۔ بیرونی ملکوں سے ہر سال کروڑوں اشرفیاں انھیں مصنوعات کی قیمت میں ہندوستانی تاجر حاصل کرتے تھے اور ہندوستانی باشندے کروڑوں آدمیوں کی مقدار میں یہاں کی صنایع اور تجارتوں کے ذریعہ سے آرام اور عیش کی زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر برطانیہ کو ہندوستانیوں کا یہ عیش و آرام نہ بھایا اور ان کی آنکھوں میں کھٹکنے اور چبھنے والا کانٹا بن کر دن ورات بے چین کرنے لگا۔ مدبرین برطانیہ نے سوچنا شروع کیا کہ کس طرح.... ہندوستان کی صنعت اور تجارت پر چھاپہ مارا جائے اور اس کی تمام صنعتوں اور تجارتوں پر اپنا قبضہ جمایا جائے۔ تنہائیوں میں، مجمعوں میں، حکومت کے ایوانوں میں اس کے لئے تذکرے جاری ہوئے۔ اسکیمیں بنائی گئیں، رزولیوشنس پاس ہوئے اور نت نئے طریقے مظالم کے ایسے ایسے جاری کئے گئے جنکی انسانی دنیا میں مثال نہیں ملتی۔ تہذیب کی دعویٰ کرنے والی قوم اور انسانیت کی خدمت کا ڈھونگ رچانے والی ملّت نے وُہ وُہ انسان کُش طریقے بنائے اور ہندوستان میں جاری کئے جن کے سامنے قدیم زمانہ کے ظالم سے ظالم اور جابر سے جابر بادشاہوں اور قوموں کے کان بالکل ناآشنا تھے اور جن کو فراعنہ مصر اور برابرہ افریقہ اور وحشی تاتاری بھی انتہائی نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

صاحب علم المعیشۃ صفحہ ۵۹۲ میں ہندوستانی تجارت کی خارجہ سرگذشت لکھتے ہوئے کہتا ہے:-

(۸) "اٹھارھویں صدی کے نصف تک ہندوستانی مصنوعات بلا تکلف انگلستان جاتی رہیں۔ لیکن انگریز جیسی معاملہ فہم اور وقت شناس قوم فوراً تاڑ گئی کہ اگر۔۔ یہی لیل و نہار ہیں اور ہندوستانی مصنوعات یونہی بلا روک ٹوک بکثرت ملک

میں آتے رہے تو ملکی صنعت کا پنپنا محال ہے بلکہ رہی سہی جو کچھ ہے وہ بھی خاک میں مل جائے گی اور ہمیشہ کے واسطے ہندوستان کا دست نگر بننا پڑے گا عام مرفہ الحالی اور ملکی ترقی پر صنعت وحرفت کے زوال کا جو تباہ کن اثر پڑتا وہ اس بیدار مغز اور مآل اندیش قوم سے مخفی نہ تھا۔ چنانچہ جوں ہی دیکھا کہ ہندوستانی مصنوعات کا ملک پر تسلط ہوتا جاتا ہے فوراً چونک اٹھی اور ہر قسم کی پیش بندی شروع کردی۔ جیسا کہ قبل بتایا جا چکا ہے۔ سوتی، اونی، ریشمی، زرین غرض کہ ہر قسم کے کپڑے تیار کرنے میں ہندوستان نے وہ کمال حاصل کیا تھا کہ اگر صریح ثبوت موجود نہ ہوتے تو اس کا یقین کرنا دشوار ہوتا اور جامہ بافی کا ملک بھر میں اس قدر کاروبار پھیلا ہوا تھا کہ زراعت کے مانند وہ بھی قومی صنعت کہلاتا تھا۔ نہ صرف غربا اور متوسط الحال لوگوں کی مستورات بوقت فرصت سوت کات کر نفع اٹھاتی تھیں بلکہ اچھے اچھے گھر کی بہو بیٹیاں چکن اور کشیدے کاڑھنا اور طرح طرح کی سوزن کاری باعث فخر و امتیاز خیال کرتی تھیں۔ کروڑہا بندگان خدا کی روزی اسی صنعت وحرفت سے وابستہ تھی۔ دیگر ممالک کو کپڑا بھی بکثرت بھیجا جاتا تھا۔ چنانچہ ہندوستان میں پارچہ بافی کی صنعت کا عروج دیکھ کر انگلستان والوں کے منہ میں پانی بھر آیا اور بنظر دور اندیشی رقابت کے جوش میں انھوں نے سب سے اول ہندوستان کی اسی صنعت پر وار کیا اور وہ ایسا کاری پڑا کہ کچھ ہی عرصہ میں ہندوستانی پارچہ بافی کا حال زار و نزار ہوگیا۔

اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ ولایت کے کپڑا بننے والوں نے محسوس کیا کہ وہ نہ کپڑے کی عمدگی میں ہندوستان والوں کا مقابلہ کرسکتے ہیں اور نہ اس کی ارزانی میں۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہندوستانی کپڑا انگلستان میں خود وہاں کے کپڑے پر غلبہ پا رہا تھا اور اندیشہ تھا کہ انگلستان کی یہ صنعت کسی روز بالکل بیجان ہو جائیگی

تو انھوں نے شور مچانا شروع کیا۔ حکومت قوم کے ہاتھ میں تھی۔ حکمران طبقہ مستعد
اور بیدار مغز تھا۔ صناعوں کی معروضات پر فوراً توجہ کی اُن کی شکایات کو
معقول اور بجا پاکر اختیارات حکومت سے کام لیا اور نہ صرف ملک کو تباہی سے
بچالیا بلکہ اُس کی مستقل عظمت وطاقت کی بھی بنیاد قایم کردی یعنی جامہ بافی کی
صنعت کو بذریعہ قانون مامون کردیا اور کون نہیں جانتا کہ انگلستان کی مرفہ الحالی
واقتدار کو لنکا شایر، مانچسٹر، اور لورپول کی کپڑے کی ملوں نے شروع سے آج
تک کسقدر سیراب وشاداب بنا رکھا ہے۔

۱۷ر مارچ ۱۷۶۹ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں نے ولایت سے اپنے اعلیٰ
عہدہ داروں کے نام بنگال کو ایک عام خط بھیجا جس میں بتاکید تحریر تھا کہ ہر طرح
سے بنگال میں ریشم خام کی پیداوار بڑھانیکی کوشش کرنی چاہیئے۔ اور ساتھ ہی
ساتھ ریشمی کپڑوں کی تیاری گھٹانی بلکہ روکنی چاہیئے۔ تاکہ ریشم خام ہندوستان
سے ولایت آئے اور ریشمی کپڑا یہاں سے تیار ہوکر ہندوستان جائے۔ اس غرض
کو پورا کرنے کا ایک یہ طریق بھی بتایا گیا تھا۔ کہ کپڑا بُننے والوں کو کسی نہ کسی طرح
خود کمپنی کے کارخانوں میں کام کرنے پر مجبور کیا جائے اور بطور خود کام کرنے سے اُن
کو روکا جائے تاکہ کل کاروبار کمپنی کے ہاتھ میں آجائے۔ اور وہ اس میں جیسی
ردوبدل مناسب سمجھے باآسانی کرسکے۔

انگلستان کے دارالعوام کی طرف سے جو ایک منتخب کمیٹی ہندوستان کے حالات
پر غور کرنے کے واسطے مقرر کی گئی تھی اس نے اپنی رپورٹ میں جو ۱۷۸۳ء
میں شائع ہوئی ڈائرکٹران کمپنی کے مذکورہ بالا خط کی تعریف اور تائید کی ہے۔
چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ اس خط میں ہندوستانی پیداوار خام کی ترقی اور مصنوعات
کی مزاحمت کے بارہ میں جو پالیسی صاف صاف بیان کی گئی ہے اس سے بنگال

کی صنعت و حرفت کو ضرور صدمہ پہنچیگا ۔ اگر اس خط کی ہدایات پر عمل ہوسکا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان جیسے صنعت و حرفت والے ملک میں ایسا انقلاب نمودار ہوگا کہ اس میں نری پیداوار خام پیدا ہونے لگے گی ۔ جو انگلستان کے مصنوعات میں کام آئے گی ۔ سب سے عمدہ اثر جو ظاہر ہوچکا وہ یہ ہے کہ ریشم بننے والے اب کمپنی کے کارخانوں میں کام کرنے لگے ۔ اگر اب وہ لوگ بطور خود کام کرنا.. چاہیں تو بھی ان کو روکنا چاہیئے ۔ اور اگر نہ مانیں تو سرکار اُن کو سخت سزا دے اور بطور خود کام کرنے کی قطعاً ممانعت کردے ۔

(علم المعیشۃ صفحہ ۵۸۴)

خلاصہ کلام یہ کہ ہندوستان کی صنعت اور تجارت مٹانے کے لئے تین طریقے اختیار کئے گئے اوّل یہ کہ ہندوستانی کاریگروں کو صنعت سے روکا جائے ۔ دوّم یہ کہ ہندوستان کے مال کو... انگلستان میں داخل نہونے دیا جائے اور تجارت مامون کے فلسفہ کو اس قدر خوشنما اور ضروری بتایا جائے کہ لوگ چاروں طرف اُس کے گرویدہ ہوکر اسی کو حق اور صحیح ماننے لگیں اور کہنے لگیں کہ ہر ملک کا فرض ہے کہ دوسرے ملکوں کی ارزانی پیداوار کی درآمد ٹیکس وغیرہ کے ذریعہ سے روک کر اپنے یہاں کی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کی کوشش کرے تاکہ کچھ عرصہ میں ملکی پیداوار بھی اسی قدر ارزاں ہوجائے ۔ اور خارجی پیداوار کی ضرورت ہی نہ رہے ۔ سوم یہ کہ.. اپنی مصنوعات کو ہندوستان میں ٹھونسا جائے اور اس کو اس قدر ارزاں کردیا جائے کہ ہندوستانی صنعت گھٹتے گھٹتے ٹیک کر فنا ہوجائے اور اس امر کے لئے آزاد تجارت کا فلسفہ بروئے کار لایا جائے اور تمام دنیا کو سمجھایا جائے کہ حق یہی ہے کہ اپنے ملک اور غیر ممالک کی پیداوار میں کوئی امتیاز نہونا چاہیئے ۔ اگر کوئی چیز دوسرے ملک سے ارزاں دستیاب ہوسکے تو بلا تکلف اس کو منگالیا جائے اور ٹیکس قایم کرکے اس کی درآمد روکی نہ جائے ۔ اور اگر کوئی چیز اپنے یہاں پیدا نہ ہوسکے تو سرکاری امداد سے اس کو ترقی دینے اور اس کی برآمد کا راستہ نکالنے کی کوشش نکی جائے ۔

انگریز ڈپلومیٹروں نے ہندوستان کے ساتھ تینوں طریقے نہایت معصومانہ انداز میں اختیار کئے۔ جنکی کچھ تفصیل ہم ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ اوّل الذکر یعنی ہندوستانیوں کو صنعت اور دستکاری سے جابرانہ طریق پر روکنا) اس کی ابتدا ۱۷۶۹ء، ۱۷ مارچ سے ہوئی اور پھر اس کے قوانین اور جابرانہ اعمال ایسے ایسے اختیار کئے گئے کہ جن کے سننے سے انسانی جگر اور قلب تھرا اُٹھتا ہے۔ اور درندگی کی انتہائی وحشیانہ مثالیں سامنے آجاتی ہیں۔ ۱۷۶۹ء کے خط میں ہدایت کی گئی تھی کہ بنگال کے کاریگروں کو کمپنی کے کارخانوں میں کام کرنے پر مجبور کیا جائے اور اگر وہ نہ مانیں اور بطور خود کام کرنا چاہیں تو ان کو روکا جائے۔ چنانچہ ۱۷۸۳ء کی مذکورہ بالا رپورٹ میں اس کے نتائج ذکر کرتے ہوئے منتخب کمیٹی کہتی ہے:۔

"سب سے عمدہ اثر جو ظاہر ہو چکا وہ یہ ہے کہ ریشم بننے والے اب کمپنی کے کارخانوں میں کام کرنے لگے۔ اگر اب وہ لوگ بطور خود کام کرنا چاہیں بھی تو اُن کو روکنا چاہیئے اور اگر نہ مانیں تو سرکار اُن کو سخت سزا دے اور بطور خود کام کرنے کی قطعاً ممانعت کردے"۔

اس بندش کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ اولاً ریشمی کپڑے کی پیداوار اپنے قابو میں کرکے حسب ہدایات ڈائرکٹران اس کی مقدار گھٹائی جائے۔ ثانیاً جس قدر کپڑا بھی تیار کرایا جائے من مانی اجرت دیکر ارزاں تیار کرایا جائے۔ ریشمی کپڑوں کی خوبی اور نفاست نے دنیا کو گرویدہ بنا رکھا تھا وہ یا تو تیار ہی نہوں یا اگر ہوں تو ہندوستانیوں کو نفع واجبی حاصل نہو۔ اس طرح مجبور کرنے کے لئے کاریگروں کے ساتھ جو معاملے کئے گئے اُن پر مندرجہ ذیل اقتباسات سے روشنی پڑتی ہے۔

سر تھامس منرو ۱۸۱۳ء میں پارلیمنٹ کی منتخبہ کمیٹی کے سامنے کہتا ہے

ملازمان کمپنی نے خاص خاص نوربافوں کو ایک عمارت بارہ محل میں جمع کرکے اُن پر پہرہ بٹھا دیا اور اس وقت تک رہا نہ کیا جب تک کہ انھوں نے معاہدہ نہ کیا کہ وہ سوائے کمپنی کے اپنا مال کسی اور کے ہاتھ فروخت نہ کریں گے جب کبھی

نرخ پر نور بافوں کی طرف سے اعتراض ہوتا تو کمپنی کی ایک کمیٹی اپنی رائے کے موافق نرخ قرار دیتی اور نور بافوں کو قبول کرنا پڑتا۔ ان کو کچھ رقم پیشگی دیدی جاتی ہے جس کی ادائیگی سے اُن کو عمر بھر سبکدوش ہونا محال ہے۔ اگر کوئی نورباف معاہدہ کی پوری پابندی نہ کرتا تو اس کی نگرانی کے واسطے ایک شحنہ تعینات کر دیا جاتا تھا جس کا طلبانہ ایک آنہ روز اُسی نورباف سے وصول کیا جاتا تھا۔ شحنہ کے پاس ایک سونٹا بھی ہوتا تھا۔ جس سے وہ بلا تکلف تنبیہہ الغافلین کا کام لے سکتا تھا اور لیتا تھا۔ مزید برآں نوربافوں پر جرمانہ کیا جاتا تھا جو کہ ان کے تانبے پیتل کے برتن نیلام کرنے سے وصول ہوتا تھا۔ اس طرح سے کپڑا بننے والی جماعت بالکل کمپنی کے پنجے میں دبی رہتی تھی۔"

(علم المعیشۃ صفحہ ۵۸۸)

مسٹر کاکس بیان کرتے ہیں :-

"صرف اُس ایک کارخانہ میں جس کے وہ نگراں تھے ڈیڑھ ہزار نورباف کام کیا کرتے تھے۔ نوربافوں کے ساتھ جو کچھ برتاوا کیا جاتا تھا وہ کوئی بے ضابطہ کارروائی نہ تھی۔ بلکہ قوانین کی رُو سے اس کو جایز قرار دیدیا گیا تھا۔ چنانچہ ۱۷۹۲ء کے ریگولیشن ۳۱ میں یہ سب حالات مذکور ہیں اور نیز ہندوستانی زمینداروں کو تنبیہہ ہے کہ کمپنی کے تجارتی افسروں کو نوربافوں سے معاملہ کرنے میں وہ کبھی نہ روکیں۔ نہ اور کسی طرح کی مزاحمت کریں۔ اور ہمیشہ ادب سے پیش آئیں۔ جبکہ ہندوستان کے سرمایۂ ناز صناعوں کے ساتھ میں من حیث الجماعت ایسا برتاؤ کیا جائے جیسے کہ کوئی صیاد پرندوں کو پنجرے میں بند کر کے کرے تو صنعت و حرفت کا جو کچھ حشر ہوگا اور ہوا محتاج بیان نہیں۔ یہ چمن تو آزادی کی آب و ہوا میں لہلہاتا ہے غلامی اس کے حق میں خزاں کا حکم رکھتی ہے۔"

(علم المعیشۃ صفحہ ۵۸۸ و ۵۸۹ ہندوستانی تجارت خارجہ کی سرگذشت)

فرانسس براؤن پارلیمنٹ کی منتخبہ کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے کہتا ہے :-

"آگے چل کر ہندوستانی کپڑے کی تجارت کو تباہ کرنے کے لئے کمپنی نے جولاہوں کے چرخوں، کپڑا بنانے کے اوزاروں اور کرگھوں تک پر بھاری ٹیکس لگا دیا۔"

انگریزی سوداگر سر ولیم بولٹس کا بیان حسب ذیل ہے (از پارلیمنٹی رپورٹ)

"کمپنی کے گماشتے بازار کے بھاؤ سے چالیس فیصدی کم قیمت پر جولاہوں سے زبردستی کپڑا لیتے تھے۔ اگر وہ مچلکہ کے مطابق کپڑا نہیں دے سکتے تھے تو ان کا سامان اسی وقت فروخت کر کے کمی پوری کیجاتی تھی۔ اور کچا ریشم نکالنے والے ناگوروں کے ساتھ اتنا ظلم کیا جاتا تھا کہ ایسی مثالیں پائی گئی ہیں کہ ریشم نکالنے کے لئے انھوں نے اپنے انگوٹھے کاٹ ڈالے ہیں۔"

سر ولیم بولٹس ۱۷۷۲ء میں کہتا ہے :-

"اصل یہ ہے کہ تمام اندرون ملک کی تجارت اور ایک خاص طریقہ سے کمپنی کا کوٹھی میں روپیہ لگانا یہ سب مسلسل مظالم کا ایک منظر رہا ہے جس کے مضر اثرات شدت کے ساتھ ہر نوربافی اور ہر کاریگر محسوس کر رہا ہے۔ ہر سامان جو تیار کیا جاتا ہے وہ کمپنی کی مخصوص ملکیت ہو جاتا ہے اور انگریز اپنے بنیوں اور کالے رنگ کے گماشتوں کی مدد سے خود راستے کے طریقہ سے طے کرتے ہیں کہ ہر کاریگر کتنا مال اور کس قیمت پر دے گا۔ اور ان امور میں بالعموم غریب جولاہے کی رضامندی ضروری نہیں سمجھی جاتی تھی۔ کیونکہ گماشتے جو کہ کمپنی کے ملازم ہوتے ہیں اُن لوگوں سے جس چیز پر چاہیں دستخط کرا لیتے ہیں۔ اور اگر جولاہے وہ روپیہ لینے سے انکار کرتے ہیں تو وہ روپیہ زبردستی اُن کی کمر میں بندھوا دیا جاتا ہے اور پھر ان کو کوڑے مارے جاتے ہیں۔ اس محکمہ میں جو جو بدمعاشیاں کی جاتی ہیں وہ وہم و قیاس میں بھی نہیں آسکتیں۔ ہر چیز کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غریب جولاہے کو خوب ٹھگا جاتا ہے کیونکہ

کمپنی کے گماشتے جو قیمت مقرر کرتے ہیں وہ بالعموم بازار کی قیمت سے (۱۵) فیصدی سے لے کر (۴۰) فیصدی تک کم ہوتی ہے۔ اسی قسم کا غیر منصفانہ برتاؤ خام ریشم بننے والوں کے ساتھ بھی کیا جاتا ہے اور اس امر کی مثالیں موجود ہیں کہ ان لوگوں نے ریشم کاتنے کی تکلیف سے تنگ آ کر خود اپنے انگوٹھے کٹوا ڈالے تاکہ وہ اس جبر و تعدی سے محفوظ رہیں"۔

(حکومت خود اختیاری صنا)

۲۸ر فروری ۱۹۲۲ء کو روزنامہ خلافت جلد ۷ نمبر ۴۸ میں ولیم بولٹس وغیرہ سے نقل کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

(۱) جو کپڑا بننے والے کمپنی کے ایجنٹوں کے بنائے ہوئے راضی نامے جنھیں مچلکہ کہا جاتا تھا اس پر عمل کرنے سے قاصر رہتے تھے ان کا مال ضبط کرکے کھڑے کھڑے نیلام کر دیا جاتا تھا۔ کچا ریشم نکالنے والوں کے ساتھ طرح طرح کی زیادتیاں کی جاتی تھیں۔ حتیٰ کہ اُن کے انگوٹھے کاٹ لیئے جاتے تھے۔ تاکہ وہ اپنا کام نہ کر سکیں

(۲) کپڑا بننے والوں کو مجبور کیا جاتا تھا کہ اپنے مفاد کے خلاف کمپنی کا کام کریں۔ چنانچہ ان پر بڑے بڑے جرمانے کئے جاتے تھے۔ تاکہ وہ کمپنی کا کام کریں۔ کپڑا بننے والوں کو سخت سے سخت سزائیں دیجاتی تھیں اور اس طرح انھیں مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ کپڑا بننے کا کام چھوڑ دیں۔

(۳) تجارتی بورڈ کی ڈائری بابت ۱۷۹۶ء اور ۱۸۱۱ء "ان غریب کپڑا بننے والوں اور ملک کے کاریگروں کو جو غلاموں کی طرح کمپنی کا کام کرتے تھے سخت سے سخت سزائیں دیجاتی تھیں اُن پر جرمانے ہوتے تھے۔ قید دیجاتی تھی۔ کوڑے پڑتے تھے۔ اور ان پر ایسی پابندیاں لگائی جاتی تھیں جن کے باعث کپڑا بننے والوں کی تعداد بہت کم ہوتی جاتی تھی۔

مریڈیتھ ٹاولشنڈ اپنی کتاب ایشیاء اور یورپ میں لکھتا ہے :-

"ہندوستان کے معمولی کاروباری لوگوں کے واسطے ہماری حکومت کسی طرح بھی مبرا از خطا نہیں ہو سکتی اور ہماری حکومت سے یہ خرابی کبھی دور نہیں ہو سکتی۔ سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ہماری حکومت نے ہندوستانیوں کی زندگی بالکل بے لطف بنا دی ہے عام انگریزوں کو یہ سمجھانا مشکل ہے کہ ہماری حکومت سے پہلے ہندوستانی زندگی کیسی پر لطف تھی اور کاروباری اور باہمت لوگوں کے واسطے ہر ایک کاروبار میں کیسی آسانیاں میسر تھیں۔ مجھے پختہ یقین ہے کہ انگریزوں کے آنے سے پہلے کاروباری ہندوستانی نہایت آرام کی زندگی بسر کرتے تھے"

(رسالہ تلک صلا)

صاحب روشن مستقبل صفحہ (۶۱) میں رومیش چندر دت کی کتاب ہندوستان کی اقتصادی تاریخ سے نقل کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

"کمپنی کی پالیسی یہ تھی کہ ہندوستان کی صنعت کو برباد کر دیا جائے۔ چنانچہ کھلے ہوئے احکام صادر کئے گئے کہ بنگال میں ریشم پیدا کرنے کی کوشش کی جائے لیکن ریشم کے کپڑے تیار کرنے کو روکا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ریشم بافوں کو جبریہ کمپنی کے کارخانوں میں ملازم رکھ لیا گیا۔ اور دوسرے کسی گاہک کی فرمائش پر کپڑا بننے کی ممانعت کر دی گئی۔

(رومیش چندر دت صفحہ ۲۴۸)

اسی طرح جنوبی دکن کی چھینٹوں اور سوتی کپڑوں کی صنعت برباد کر دی گئی۔ جولاہوں کو زبردستی گھیر کر لایا جاتا۔ اُن پر سپاہی مسلط کر دئے جاتے اور جب تک وہ یہ معاہدہ نہ کر لیتے کہ اور کسی کے لئے کپڑا نہ بنیں گے انھیں نکلنے نہ دیا جاتا اگر وہ کمپنی کا کپڑا پہنچانے میں دیر کرتے تو سزا کے مستوجب ہوتے۔ (رومیش چندر دت صفحہ ۲۶۴ و ۲۶۵)

ہندوستان کی ان صنعتوں کو تباہ کرنے کے لئے کمپنی اور برطانوی حکومت دونوں یکساں آرزومند تھے۔ اس کا اندازہ اُس شرح محصول سے کیا جاسکتا ہے جو برطانیہ کے ساحل پر ہندوستانی مال کے لئے مقرر کی گئی تھی۔ ۱۸۱۳ء میں اکثر کپڑوں پر ۶۸، اور ۸۰ فیصدی لیا جاتا تھا"

(رویش چندر دت صفحہ ۲۶۱)

صاحب معیشت الہند صفحہ (۲۹۶) میں لکھتا ہے:۔

"سترھویں صدی میں انگریزی صناع اور دستکاروں پر جو وقت گزرا اس سے کہیں زیادہ مصیبت ہندوستانی صناع اور دستکاروں کے سر پر اٹھارھویں صدی میں آپڑی ان کا روزگار بھی مارا گیا۔ اور کوئی پرسان حال بھی نہ تھا۔ اول تو خانہ جنگیوں کی بدولت ملک خود پامال دوسرے صنعت و حرفت کا گلا گھونٹا گیا لوگوں پر مصیبت کا آسمان ٹوٹ پڑا۔ ہندوستانی تاریخ میں اٹھارھویں صدی بہت خوفناک اور افسوسناک ہے۔ اچھے اچھے صنعتی شہر ویران ہو گئے۔۔۔ صنعتیں برباد ہو گئیں۔ صناع تباہ ہو گئے۔ اور بحالت مجبوری زراعت عام لوگوں کا پیشہ بن گئی"

آگے چل کر صفحہ (۲۹۷) میں لکھتا ہے:۔

"بہر حال اٹھارھویں صدی سے ہندوستانی تجارت کا نقشہ بدل گیا۔ چنانچہ۔۔ کمپنی کے خطوط جو ولایت سے آتے تھے ان میں صاف ہدایات درج ہیں کہ جہاں تک ہو سکے سامان خام کی پیداوار بڑھانی چاہیئے اور مصنوعات روکنی چاہئیں۔ اور اس کام میں قانون سے مدد لینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھا گیا۔ مثلاً بنگال کے ریشم بننے والوں کو قانوناً ممنوع تھا کہ کمپنی کے کارخانہ کے سوا گھر پر کام کریں اور اس کی خلاف ورزی تعزیری جرم تصور کیجاتی تھی۔ جس کی سخت سزا

ملتی تھی علاوہ بریں ہندوستانی مصنوعات کی درآمد پر انگلستان میں کروڑگیری
ازحد بڑھادی گئی اوراس کے برعکس ولایتی مصنوعات کی درآمد پر ہندوستان میں
کوئی کروڑگیری نہ تھی اور تھی تو برائے نام مقرر تھی۔ چنانچہ پارلیمنٹ میں بھی تسلیم ہوگیا
کہ بیشک ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایسا انتظام کردیا ہے کہ ہندوستان میں مصنوعات
گھٹیں اور سامان خام بڑھے اور اگر یہ انتظام رہیگا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان
کا نقشہ بدل جائیگا۔ صنعتیں غائب ہوجائیں گی اور برطانیہ عظمیٰ کی صنعتوں کے واسطے
وہاں صرف سامان خام پیدا ہونے لگے گا۔ فہوالمراد۔"

مذکورہ بالا شہادتوں اور اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان کی صنعت وحرفت مٹانے کے لئے نہایت وحشیانہ مظالم اور بربرانہ تعدیاں کی ہیں۔ جن کی بنا پر صناعوں اور کاریگروں نے مجبور ہوکر صنعت وحرفت چھوڑدی۔ ممکن ہے کہ ناظرین کو تعجب پیدا ہو کہ انگریزوں نے اپنی ہندوستانی رعایا پر اس قدر بے دردی اور جفاکاری کے مظاہرے کس طرح روا رکھے جو کہ بالکل خلاف انسانیت ہیں۔ اور پھر اُس زمانہ میں ہندوستانی حکومتوں -- اور غیر تمندر عایا نے ان مظالم کو کس طرح برداشت کیا اسی شبہہ کے جواب میں صاحب علم المعیشۃ صفحہ (۵۸۹) میں لکھتا ہے:۔

تعجب ہوگا کہ آخر انگریزوں نے ایسی چیرہ دستی ہندوستانی صناعوں پر کیوں کی
اور کس طرح کی۔ کاروباری لوگوں کی منفعت طلبی اور خودغرضی ضرب المثل ہے
انگریز اُس وقت آج کل کی طرح تو حکمران تھے نہیں۔ گو بعض حصے ان کے قبضہ میں
آنے شروع ہوگئے تھے لیکن اب تک وہ اپنا خاص کام تجارت سمجھتے تھے نہ کہ حکومت
پس ان کو تو اپنے نفع سے غرض تھی۔ رعایا کی آسایش اور بہبودی سے ان کو کیا
سروکار۔ رہی حکومت مغلیہ اُس میں ہاتھ پیر ہلانے تک کی سکت باقی نہ تھی۔ اور وہ
صرف برائے نام جاری تھی۔ پھر کون تھا جو غریب اطاعت شعار ہندوستانی صناعوں

کو من چلے انگریزی تاجروں کی دست برد سے بچاتا۔ خود وارن ہسٹنگس جو کمپنی کی طرف سے ہندوستان میں گورنر رہ چکا ہے اور جو سلطنت ہند کے بانیوں میں نمبر اول شمار ہوتا ہے کہتا ہے کہ انگریز ہندوستان میں آکر بالکل نیا انسان بنجاتا ہے۔ جن جرائم کی وہ اپنے ملک میں کبھی جرأت کر ہی نہیں سکتا۔ ہندوستان میں ان کے ارتکاب کے واسطے انگریز کا نام جواز کا حکم رکھتا ہے۔ اور اس کو سزا کا خیال تک نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح پر ایک دوسرے صاحب ٹامس سڈینہم فرماتے ہیں کہ "میں ہمیشہ سے دیکھتا ہوں کہ بمقابلہ اور قوموں کے انگریز ممالک غیر میں سب سے زیادہ چیرہ دستی کرتے ہیں۔ اور ہندوستان میں بھی یہی واقعہ پیش آرہا ہے"۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اُس زمانہ میں انگریز اپنے کو محض تاجر خیال کرتے تھے اور آزاد ملک کے باشندہ ہونیکی وجہ سے نڈر اور من چلے تھے۔ صدیوں کی اطاعت و فرماں برداری کرتے کرتے ہندوستان کے لوگ پست ہمت اور دبیل ہو چکے تھے۔ ملک میں کوئی ایسی حکومت قایم نہ تھی جو حقوق و انصاف کی نگہداشت کر سکتی۔ پس انگریزوں کا جو کچھ بھی طرز عمل تھا وہ کچھ عجیب نہ تھا۔

دوسرا طریقہ ہندوستان کی صنعت و حرفت کے برباد کرنے کا تجارت مامون کے فلسفہ کو پھیلا کر ہندوستانی مال کو انگلستان میں داخل ہونے سے روکنے کا ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔ ۱۶۰۰ء کی ابتدا میں انگریز ہندوستان میں مثل دیگر اہل یورپ، جرمنی، ہالینڈ، فرانس، ڈنمارک، وغیرہ یہاں کی تجارت سے دولت کمانے کے لالچ میں آئے۔ کیونکہ ایک صدی کی تجارت ہند سے پرتگیزوں نے اپنے ملک کو رشک جناں بنوا لیا تھا۔ اُس زمانہ میں ہندوستان اپنی بے شمار دولت، اعلیٰ صنعت، ارزانی تجارت وغیرہ کی وجہ سے جنت نشان بنا ہوا تھا۔ یہاں کے بادشاہوں، اور باشندوں نے اس ملک کو جنت نشان بنا دیا تھا۔ لوگوں کی زبان حال چلا چلا کر کہہ رہی تھی ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است　　ہمین است وہمین است وہمین است۔

(دیکھو تصریحات پروفیسر مکس ملر، تھامس منرو، ابن بطوطہ وغیرہ)

انگریزوں نے یہاں کی نفیس اور سستی چیزیں بالخصوص ریشمی، اونی، سوتی کپڑے انگلینڈ پہنچائے۔ وہاں کے باشندوں نے ایسی چیزیں کبھی دیکھی بھی نہ تھیں۔ وہ نہایت زیادہ پسند کی گئیں۔ اور ہاتھوں ہاتھ بڑی بڑی قیمتوں پر فروخت ہونے لگیں۔ اس سے انگریزوں کو تجارت میں نہایت زیادہ نفع ہوا۔ اور دن دُگنی رات چوگنی دولت بڑھنے لگی۔ صاحب معیشتہ الہند صفحہ (۶۸۱) میں لکھتا ہے:۔

"عہد قدیم سے لے کر قرون وسطیٰ تک جو اہل ہنود اور مسلمانوں کا دور ہے اس میں زمانہ کے لحاظ سے ہندوستان کی گوناگوں صنعتیں بہت اعلیٰ پیمانہ پر ترقی یافتہ نظر آتی ہیں۔ دور دراز ممالک تک جاتی ہیں اور بےنظیر شمار ہوتی ہیں۔ انھیں مصنوعات کی خاطر اہل یورپ بھی ہندوستانی تجارت کے شیدائی تھے اور اس راہ میں جان و مال لٹاتے تھے۔ اس زمانہ میں ہندوستان کے سوتی، اونی، ریشمی، کپڑے اور قالین، موتی، جواہر اور زیورات، مرصع طلائی، اور نقرئی سامان، خوشبوئیں، رنگ اور مصالے، چوبینہ کا کام، لوہے کا سامان، فولاد کے آلات، اور ہتھیار، غرضکہ تمدّن اور تمول کی اعلیٰ ضروریات، دُور دُور کے ممالک یہاں سے منگاتے تھے چونکہ اُن کے مصنوعات کو یہاں کوئی پوچھتا بھی نہ تھا اور ہر قسم کا سامان خام یہاں بافراط پیدا ہوتا تھا بالعموم برآمد کی قیمت بشکل نقرہ وطلا وصول ہوتی تھی۔ جہاز سازی اور جہاز رانی کے فن میں بھی ہندوستان نے اس درجہ ترقی کرلی تھی کہ اس کے بادبانی جہازوں میں دُور دُور تک مال آتا جاتا تھا ممکن ہے کہ ہندوستان کی معاشی درماندگی میں یہ باتیں عجیب سنائی دیں۔ لیکن یہ سب اُمور کچھ تخیلات اور قیاسیات نہیں بلکہ واقعات ہیں اور توقع سے بڑھکر تاریخی شہادتیں موجود ہیں۔ جن کی تفصیلات کے واسطے جداگانہ تصانیف درکار ہیں۔" اس لئے انگلینڈ کی مصنوعات ماند پڑ گئیں، اور انتہائی کس مپرسی میں مبتلا ہوگئیں۔ ہندوستان میں وہاں سے سونا اور

چاندی بکثرت ان اشیاء کی قیمت میں کھنچکر آنے لگا۔ وہاں کے صنّاعوں اور کاریگروں کو چاروں طرف سے بیکاری نے آگھیرا۔ اس لئے چاروں طرف سے شور وغوغا شروع ہوا کہ اگر اسی طرح ہندوستان کا مال ہمارے ملک میں آتا رہا تو ہمارے تمام کاریگر اور اُن کے بچے بھوکوں مرجائیں گے اور ملک کی دولت نکل کر باہر چلی جائے گی ملک برباد ہوجائے گا۔

صاحب معیشت الہند صفحہ (۶۹۱) میں لکھتاہے :۔

"ہندوستانی مصنوعات خاصکر۔۔۔ کپڑے کو جب انگلستان میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور ان کا رواج بڑھا تو وہاں ہر طرف بیکاری پھیل گئی اور سخت برہمی پیدا ہوئی۔ حتیٰ کہ سودیشی کی تحریک جس کا اب مضحکہ اڑایا جاتاہے بڑے زور شور سے انگلستان میں نمودار ہوئی۔ سرکار نے بھی اس کی پوری تائید کی۔ نتیجہ یہ کہ تھوڑے ہی عرصہ میں حالت کچھ سے کچھ ہوگئی۔ انگلستان بڑی بڑی صنعتوں کا مرکز بن گیا اور ہندوستان میں زراعت کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔ ذیل میں ہمعصر بیانات اور تحریرات کے چند مستند اقتباسات درج ہیں جن سے اُس زمانہ کے کاروباری حالات اور انقلابات کا کچھ اندازہ ہوسکتاہے۔ سترھویں صدی کے آخر زمانہ میں صنعت وحرفت کی مختلف جماعتوں کی طرف سے پارلیمنٹ میں بے شمار محضر اور درخواستیں پیش ہوئیں ان میں سے چند بطور مشتے نمونہ از خروارے ملاحظہ ہوں۔

(۱) درخواست گذار پھولدار، دھاریدار اور ریشمی کپڑا تیار کرتے ہیں اور اُون اور ریشم ملاکر بھی کپڑے بنتے ہیں اور یہی ذریعہ معاش ہے لیکن جب سے ہندوستان کا ریشمی اور سوتی کپڑا آیا اور اس کا رواج بڑھا یہاں کا کاروبار بالکل مارا گیا۔ اگر ہندوستانی کپڑا نہ روکا گیا تو یہ صنعت یہاں بالکل تباہ ہوجائے گی۔

(۲) اس نواح میں ریشمی اور اونی ریشم ملا ہوا کپڑا بنا جاتاہے، اور لوگوں کا یہی عام

پیشہ ہے کچھ دنوں قبل تک خوب فراغت سے بسر ہو رہی تھی۔ لیکن چند روز سے کاروبار بہت گھٹ گیا اور لوگ بیکاری سے پریشان ہیں۔ استدعا یہ ہے کہ ہندوستانی کپڑے کی تجارت روک کر ملکی صنعت کو پناہ دیجائے۔

(۳) پارچہ بافی اور اس سے متعلق دوسری صنعتیں ہم لوگوں کا خاص پیشہ تھا اور انھیں پر معاش کا مدار تھا۔ لیکن اب وہ سب صنعتیں غائب ہو رہی ہیں اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہندوستان سے ریشمی اور سوتی کپڑا آرہا ہے نتیجہ یہ کہ جو لوگ پہلے دوسروں کی امداد کرتے تھے آج وہ خود بیکار اور محتاج ہیں۔ لہذا عرضی گذاروں کی استدعا ہے کہ ہندوستانی کپڑا روکا جائے۔

(۴) عرضی گذار ایک بڑی جماعت ہیں اور قدیم سے ان کو قانونی طور پر خاص حقوق حاصل ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے حال میں ہندوستان سے بہت سی باناتی ٹوپیاں (ہیٹ) بنواکر منگائی ہیں۔ اگر ان کی درآمد نہ روکی گئی تو یہ صنعت یہاں تباہ ہو جائے گی۔ وجہ یہ کہ ہندوستان میں ہر قسم کی ارزانی ہے اور مال بہت سستا تیار ہوتا ہے۔

(۵) ہندوستانی لوگ ہماری ریشمی کپڑے کی صنعت پہلے ہی ہضم کر چکے ہیں۔ پنکھوں کی صنعت بھی اُنھوں نے قبضہ میں کر لی ہے اور ہمارے چوبینہ کے کام کو بھی دبا لیا ہے اسی طرح یکے بعد دیگرے وہ یہاں کی تمام صنعتوں کو برباد کر دیں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دن میں ہندوستان پیرس کا جانشین بنکر ہم پر فیشن نافذ کرے گا۔ ہم کو تو فرانس ہی کے وضعدار کپڑوں کا آنا سخت ناگوار تھا اب ہندوستان سے خوب وضعدار لباس تیار ہو کر بکثرت آرہا ہے اور ہمارے درزیوں کا روزگار تباہ ہو رہا ہے۔

غرضکہ اس زمانہ کی بیشمار شکایتی درخواستیں اور محضر سرکاری محافظ خانوں اور کتب خانوں

میں اب بھی موجود ہیں۔ لوگوں نے سودیشی کی تائید میں نظمیں لکھیں۔ رسالے شائع کئے۔ چونکہ مستورات فطرتاً فیشن کی بہت دلدادہ ہوتی ہیں وہی ہندوستانی کپڑوں کی سب سے زیادہ شایق تھیں۔ ایک دلچسپ رسالہ بھی اُن کو جوش اور غیرت دلانے کیواسطے شائع کیا گیا۔ اُس میں تحریر ہے کہ یہ امر بخوبی ثابت ہوچکا ہے کہ بہت سے غریب صنّاع اور دستکار بے روزگار ہیں۔ معاش کو محتاج ہیں اور بھوکوں مر رہے ہیں۔ اُن کی ایک کثیر جماعت سخت افلاس اور مصیبت میں گرفتار ہے خیراتی امداد دوچند بلکہ سہ چند ہوگئی ہے۔

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ہندوستانی مصنوعات کی درآمد اور مقبولیت سے انگلستان کی صنعتوں کو بہت زک پہنچی تھی۔ اور روک تھام نہ ہوتی تو وہاں کے صنّاع اور دستکار تباہ ہوجاتے حامیان سودیشی کی طرف سے جو معروضات پارلیمنٹ میں پیش ہوئے ان میں سے ایک میں لکھتے ہیں "ذرا انگریزی قوم کی حالت پر نظر توڈالئے اور خاصکر ان لوگوں کی حالت قابل ملاحظہ ہے جن کی صنعتیں ہندوستان کے مقابل ہیں۔ اتنی انگریزی صنعتیں جو سراسر تباہ ہوگئیں۔ اس نقصان پر غور فرمائیے۔ غریب لوگ جو ان مقامات میں روزگار اور روزی کے واسطے فریاد کر رہے ہیں اس پر توجہ فرمائیے۔ بالآخر یہی تحقیق ہوگا کہ ہندوستانی تجارت ان تمام مصائب کی اصلی باعث ہے"

انگریزی صنعتوں کی تباہی کے علاوہ ایک بڑا اعتراض اور بڑا غم یہ بھی تھا کہ ہندوستانی مال کے معاوضہ میں زیادہ تر انگلستان سے چاندی سونا ہندوستان بھیجا جاتا تھا اس بارہ میں بھی بہت سخت بحث چلتی رہی جس کا مختصر ذکر جابجا اوپر بھی آچکا ہے۔ چنانچہ ایک معزز مخالف لکھتے ہیں۔ "کہ یہ تجارت تا حد امکان بدترین قسم کی تجارت ہے۔ چاندی سونا جو ہم کو کسی طرح علیحدہ نہ کرنا چاہیئے۔ ہمارے ہاتھ سے نکل رہا ہے اور اس کے معاوضہ میں ہمارے یہاں مصنوعات اور کھیل کھلونے آرہے ہیں۔ جن کی ہم کو کچھ بھی ضرورت نہیں ہے"

جب اس درجے نوبت پہنچ گئی تو لامحالہ پارلیمنٹ میں بھی یہ بحث چھڑی۔ وہاں بھی تقریروں کا وہی رنگ نظر آتا ہے۔ کرنل بریرج اپنی ایک تقریر میں فرماتے ہیں کہ:-

"ہندوستان کی جس چیز نے ہم کو سب سے زیادہ تباہ کیا وہ کالیکو یعنی سوتی کپڑا ہے کہ اس نے ہمارے اُونی کپڑے کو بالکل نکما کر دیا۔ کیا افسوس ہے ہندو تو دولت لوٹ رہے ہیں۔ اور عیسائی تباہ ہو رہے ہیں"

ایک اور صاحب فرماتے ہیں کہ :۔

"انگلستان کے پارچہ بافوں کو ہندوستانی پارچہ بافوں سے مقابلہ کرنا محال ہے اس لئے کہ اول تو ہندوستان میں مال بہت ارزاں ہے۔ دوسرے وہاں کے پارچہ باف ایک آنہ روز پر گذر کر سکتے ہیں۔ اگر یہی لیل و نہار ہیں تو یہ خیال کرتے ہوئے دل دھڑکتا ہے کہ آخر اس تجارت کا کیا انجام ہوگا۔ یقیناً ہندوستان کے لوگ مالا مال ہو جائیں گے۔ اور ہم افلاس میں گرفتار ہوں گے"

ایک اور صاحب اصرار کرتے ہیں کہ :۔

"ہندوستانی تجارت کی روک تھام ضروری ہے کیونکہ نہ صرف پارچہ بافی بلکہ انگلستان کی بہت سی صنعتیں ہندوستانی مصنوعات کی درآمد سے معرض خطر میں پڑ گئی ہیں۔ ہندوستانی مصنوعات نہ صرف انگلستان میں انگریزی مصنوعات کی جگہ استعمال ہوتی ہیں بلکہ دوسرے ممالک میں بھی جہاں جہاں ہماری مصنوعات جاتی تھیں وہ ان کی جانشین بن گئی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کچھ بندوبست نہ کیا گیا تو ہماری صنعتوں کا خاتمہ ہو جائیگا۔ انگریزی مصنوعات کو نہ کوئی گھر ہاتھ لگائیگا نہ باہر"

علیٰ ہذا مسٹر پالکسفن نے بھی اپنی تقریر میں اس پہلو پر زور دیا اور فرمایا کہ :۔

"ہندوستان سے جو کپڑا آتا ہے وہ نہ صرف ہمارے یہاں اونی کپڑے کے بجائے استعمال ہوتا ہے بلکہ وہ دیگر ممالک میں پہنچکر وہاں بھی ہمارے اونی کپڑے کی مزاحمت کرتا ہے اور اُن ممالک کے کپڑے کو بھی ہمارے یہاں آنے سے روکتا ہے جو ہم پہلے اپنی

مصنوعات کے معاوضہ میں منگایا کرتے تھے۔ غرضکہ ہندوستانی کپڑے نے ہمارے اونی کپڑے کا کام تمام کر دیا۔ اور اپنے مقابل دیگر ممالک کے کپڑے کی درآمد بھی انگلستان میں روک دی۔"

مسٹر شیلڈن نے پارلیمنٹ میں اپنا یہ بیان دیا کہ:-

"پہلے انگلستان میں جو کپڑا ریشمی فرانس اور اٹلی سے درآمد ہوتا تھا وہ بالکل بند ہو گیا اس لئے کہ بنگال کا ریشمی کپڑا اُس سے نصف قیمت پر آتا ہے اور اس سے بہتر ہوتا ہے۔"

حاصل کلام یہ کہ ہندوستانی مصنوعات اور خاصکر پارچہ جات کی خوبی اور ارزانی نے اکثر ممالک یورپ اور خاصکر انگلستان کے بازار پر پورا قبضہ کر لیا اور مقابلہ کی تاب نہ لا کر مقامی صنعتیں دم توڑنے لگیں تو جان بچانے کی خاطر سودیشی کی تحریک پھیلائی گئی۔ اور ہندوستانی مصنوعات کی درآمد روکنی پڑی۔ چنانچہ عام حالات اور خیالات کو پیش نظر رکھ کر مجلس تجارت و آبادیات کے کمشنروں نے پارلیمنٹ سے یہ سفارش کی کہ ہندوستانی تجارت سے جو بے چینی پھیل رہی ہے، اس کو رفع کرنے کے لئے مناسب ہے کہ ہندوستانی کپڑے اور مصنوعات کی درآمد اور ان کا استعمال اپنی سلطنت اور آبادیات میں روکا جائے چنانچہ اسی اصول پر قانون بننا تجویز ہوا۔

جوش کی کیفیت یہ تھی کہ قانون پیش ہونے میں کچھ تعویق نظر آئی تو پارچہ بافوں نے ایک روز ایسٹ انڈیا کمپنی کے دفاتر پر حملہ بول دیا اور قریب تھا کہ غصہ میں اُس کا خزانہ لوٹ لیں۔

اس شبہہ پر کہ شاید یہ قانون نامنظور ہو جائے پارچہ بافوں کی بیویوں نے پارلیمنٹ کی عمارت پر حملہ کیا تاکہ اگر کچھ لوگ قانون کی مخالفت کریں تو اُن کی وہ اچھی طرح مرمت کریں غرضکہ ۱۷۰۰ء میں قانون پاس ہو گیا جس کی رُو سے ہندوستانی کپڑے کی درآمد

اور اس کا استعمال ممنوع قرار پایا اور پارچہ بافوں کی محنت ٹھکانے لگی۔ اس کے بعد ہندوستان کی دیگر مصنوعات پر بھی محصول کروڑ گیری اس درجہ بڑھا دیا گیا کہ ان کی درآمد بہت دشوار ہو گئی۔"

ظاہر ہے کہ ایسے قوانین سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو سخت خطرہ اپنی اُس تجارت اور نفع اندوزی میں پیش آیا جس کی وجہ سے دولت کے دریا اُس کے ممبروں کے گھروں میں بہتے تھے۔ اس لئے اُس نے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگایا کہ کوئی ایسا قانون نہ بننے پائے۔ اس کے ممبروں اور طرفداروں نے آزاد تجارت کے متعلق نہایت زوردار تقریریں کیں اور فلسفی طریقہ پر آزاد تجارت کے وہ اصول اور فوائد دکھلائے جن پر انسانی زندگی کی ترقی کا مدار ہے اور بین الاقوامی اور انصاف اور عدالت کے لئے مرکز بننے کے جو مستحق ہو سکتے تھے مگر ایک بھی نہ چلے۔ مخالف فریق نے بالمقابل مامون تجارت کی شدید ضرورت پر دھواں دھار تقریریں کیں۔ تصانیف اور مضامین کے دروازے کھل گئے۔ مامون تجارت کی بھلائی میں بیانات اور پمفلٹ شائع کئے گئے اور پریس میں زوردار پروپگنڈوں کے ذریعہ سے عوام کو ہم خیال بنایا۔ ہوٹلوں، تفریح گاہوں، جلسوں وغیرہ میں یہی چرچا پھیلایا گیا کوئی آزاد تجارت پر تقریر کرتا تھا تو کوئی مامون تجارت پر زوردار لکچر دیتا تھا۔ مگر آزاد تجارت کے حامی اگر دو چار ہوتے تھے تو مامون تجارت کے شیدائی سیکڑوں اس کے مقابلہ میں آجاتے تھے۔ کوئی انگلستانی صناعوں کی بربادی کا فوٹو کھینچتا تھا کوئی ہندوستانی کاریگروں کی لوٹ کا داستان گو بنجاتا تھا کوئی انگریزی خزانوں کے باہر نکل جانے کا رونا روتا تھا۔ خلاصہ یہ کہ مامون تجارت کا تفوق اور آزاد تجارت کا ملک کے لئے سم قاتل اور زہر ہلاہل ہونا بہت بڑے پیمانہ پر پھیلایا گیا اور چونکہ قوت اور اقتدار مامون تجارت والوں کے ہاتھ میں تھا اس لئے آزاد تجارت کے قائلین کو شکست کھانی پڑی۔

صاحب معاشیات ہند لکھتا ہے:-

"ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے طرفداروں نے بہت کچھ آزاد تجارت کے فوائد سمجھائے لیکن ان کی کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ البتہ آزاد تجارت اور نامین تجارت کے آئندہ علمی

مباحث کے واسطے اچھا خاکہ تیار ہو گیا۔ یہ بھی اچھا لطیفہ رہا کہ اول تو خود کمپنی نے بامید اعانت سرکار کو اپنے معاملات میں ہاتھ بٹانے کی دعوت دی لیکن بعد کو وہ خود ہی۔۔ سرکاری مداخلت سے تنگ آنے لگی۔ سرکار کو اول مروتاً اور پھر ضرورتاً کاروباری معاملات میں دخل دینا پڑا انھی حالات کی بدولت تجارت کے اصول بنے اور تجارت کا مسلک رائج ہوا صنعت اور تجارت کے علمی مباحث کی بنیاد پڑی۔" صفحہ ۶۹۵

الحاصل مدعیان خدمت انسانی اور دعویداران تمدن وتہذیب نے مامون تجارت کی آڑ میں ایسے ایسے جابرانہ اور ظالمانہ قوانین ہندوستانی تجارت اور مصنوعات کے روکنے کے لئے بنائے کہ دنیاوی تجارت نے نہ کبھی دیکھے نہ سنے تھے۔ ہندوستانی مصنوعات پر حکومت کی طرف سے نہایت ہی بوجھل محصول لگائے گئے۔ حالانکہ ہندوستان برطانوی مقبوضات اور نوآبادیات برطانیہ میں سے قرار پاچکا تھا۔ ایسے ٹیکسز کی بنا پر ضروری اور لازم تھا کہ ہندوستانی مال انگلستان سے یک قلم بند ہو جاتا اور ہندوستانی کاریگروں کی زندگی موت کے گھاٹ اتر جاتی چنانچہ مسٹر مانٹ گومری مارٹن مؤلف تاریخ نوآبادی ہائے برطانیہ لکھتا ہے:۔

"ہم نے ربع صدی کے دوران میں ہندوستانی علاقوں کو اپنی مصنوعات کے خریدنے پر مجبور کیا اس طریقہ پر کہ ہمارے اونی مال پر ہندوستان میں کوئی محصول نہیں لیا جاتا تھا۔ سوتی مال پر ۳½ فیصدی محصول تھا اور اسی نسبت سے دیگر اشیاء پر محصول لگایا گیا تھا۔ درآں حالیکہ اسی زمانہ میں ہندوستان کے بنے ہوئے مال پر ہم انگلستان میں ایسے سخت محصول لگاتے رہے کہ ہندوستانی مال کی درآمد بند ہو جائے۔ بالفاظ دیگر اس محصول کی مختلف شرح ۱۰ - ۲۰ - ۳۰ - ۵۰ - ۱۰۰ - ۵۰۰ اور ۱۰۰۰ فیصدی تک ان اشیاء پر لگائی گئی تھیں جو ہمارے ہندوستانی مقبوضات کی بنی ہوئی ہوں۔ اس لئے ہندوستان کے ساتھ آزاد تجارت کی چیخ پکار جو ہو رہی تھی وہ دراصل انگلستان کے مال کی آزاد تجارت تھی۔

نہ کہ ہندوستان کے اُس مال کی جو انگلستان بھیجا جائے۔ سورت۔ ڈھاکہ مرشد آباد و دیگر مقامات کی جہاں دیسی صنعتیں عروج پر تھیں بربادی کی داستان کا بیان کرنا حد درجہ دل خراش ہے۔ میری رائے میں یہ بربادی ایمانداری کے ساتھ تجارت کو ترقی دینے کی وجہ پر مبنی نہ تھی بلکہ میرا خیال یہ ہے کہ وہ ایک زبردست طاقت تھی جس کے ذریعہ سے کمزور کو دبایا جا رہا تھا۔"

(حکومت خود اختیاری صہ ۲۳ از دت جلد دویم نمبر ۱۱۲)

ہنری سنٹ جارج ٹکر (جنھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ ہندوستان میں بسر کیا تھا اور جو بعد واپسی انگلستان میں کمپنی کے ڈائرکٹروں میں داخل کرئے گئے تھے ۱۸۲۳ء میں مختصراً یوں بیان فرماتے ہیں

"ہم نے ہندوستان کے ساتھ کیسے تعلقات قائم کر رکھے ہیں اُس کے ریشمی کپڑے اور نیز وہ کپڑے جو سوت اور ریشم سے ملکر بنے جاتے ہیں کچھ روز سے ہمارے بازاروں سے خارج کردئے گئے ہیں۔ اور حال میں کچھ تو ۶۷ فیصدی محصول درآمد کی بدولت اور کچھ کلوں کی ایجاد کی بدولت سوتی کپڑے جو کہ ہندوستان میں بکثرت تیار ہوتے تھے نہ صرف اس ملک میں آنے بند ہو گئے بلکہ ہم اُلٹے انگلستان سے سوتی کپڑے اپنے ایشیائی مقبوضات میں بھیجنے لگے ہیں۔ اور اس طرح پر ہندوستان تجارتی ملک سے تنزل کر کے اب محض زراعتی ملک رہ گیا!"

(علم المعیشۃ صہ ۵۹)

نقشہ ذیل ملاحظہ ہو جو کہ ہندوستانی مال پر محصولات کی بھاری مقدار اور اس کی بندش پر روشنی ڈالتا ہے۔

نقشہ صہ ۲۸۲ پر دیکھو

ہندوستانی مصنوعات	فیصدی محصول		
	سنہ ۱۸۱۲ع	سنہ ۱۸۲۴ع	سنہ ۱۸۳۲ع
ریشمی کپڑے	قطعی ممانعت	قطعی ممانعت	۲۰ فیصدی
زربفت	〃	〃	۳۰ 〃
شالی چادر	۷۱ فیصدی	۶۷ ½ فیصدی	۳۰ 〃
چھینٹ	۷۱ ⅔ 〃	۶۷ ½ 〃	۱۰ 〃
قالین	۶۸ ⅓ 〃	۵۰ 〃	۲۰ 〃
بنت کا آرائشی سامان	۷۱ 〃	۵۰ 〃	۳۰ 〃
سوتی کپڑا	۲۷ ⅓ 〃	۵۰ 〃	۲۰ 〃

(علم المعیشۃ صفحہ ۵۹۲)

(نوٹ) سنہ ۱۸۳۲ع میں جو محصولوں کی تخفیف نظر آرہی ہے وہ کسی انسانی ہمدردی یا انصاف و عدل گستری کی بناء پر نہیں ہے بلکہ اس بناء پر ہے کہ پہلے سالوں کے ظالمانہ اور وحشیانہ ٹیکسوں اور قطعی ممانعت وغیرہ کی کارروائیوں سے ہندوستانی مال انگلستان سے بالکل خارج ہوچکا تھا اور اس کا وہاں آنا بھی بند ہوچکا تھا نیز اس کے کاریگر اور اُن کی صنعتیں تقریباً دم توڑ رہی تھیں اس لئے اُس وقت اتنے بڑے محصولوں کی ضرورت ہی نہیں رہتی تھی۔ اُدھر انگلستان کی صنعت اور تجارت اتنی قوت پکڑ چکی تھی کہ وہ ہندوستانی صنعت کا مقابلہ بخوبی کرسکتی تھی۔ اس وقت میں بڑی بڑی کلیں اور دخانی کارخانے بھی قائم ہوچکے تھے اس لئے اب وہ خطرہ اپنے ملک کی بیکاری وغیرہ کا اُٹھ گیا تھا۔ کیونکہ ان کلوں کا مال اب بہ نسبت سابق ارزاں ہونے لگا تھا تاہم یہ محصول بھی اُن محصولوں سے جو کہ انگلستانی مال پر ہندوستان میں لگایا گیا تھا اور جابرانہ طریقہ پر اخیر تک باقی رکھا گیا نہایت ہی زیادہ ہے۔ انگریزی مال پر محصول ۳ ½ فیصدی اور ۲ ½ فیصدی تک ہی رکھا گیا تھا اور جب کبھی اس سے زائد کی تجویز ہوئی تو انگلستان

...ں ہلائی ویلاپ مچ گئی ۔ کاغذات انڈیا آفس میں ہے ۔

"۱۸۵ء میں ناٹنگھم کارخانہ ولایت میں کھولا گیا ڈھاکہ کی ململ کی نقل پر پانچ لاکھ تہان موٹے اور کھردرے دو سال بعد تیار کئے گئے ۔ ولایت میں شور مچایا گیا کہ ڈھاکہ کے کاریگروں سے ولایتی کاریگروں کی حفاظت چاہیئے ۔ چنانچہ گورنمنٹ انگلستان نے ہندوستان سے آنیوالے سوتی مال پر پچھتر فیصدی محصول لگا دیا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۷۸۷ء میں ڈھاکہ سے انگلینڈ میں تیس لاکھ روپئے کی ململ گئی تھی ۔ محصول لگا دینے کے بعد ۱۸۰۷ء میں ۸½ لاکھ روپیہ کی گئی اور ۱۸۱۳ء میں ۲½ روپیہ کی اور ۱۸۱۷ء میں اُس کا جانا بالکل بند ہو گیا"

(اخبار پرتاب لاہور مورخہ ۱۴ اگست ۱۹۲۱ء)

سر جان اسٹوارٹ مل اپنی کتاب سلطنت برطانیہ کی تاریخ میں لکھتا ہے ۔

"۱۸۱۳ء تک ہندوستان کا سوتی اور ریشمی مال انگلینڈ میں وہاں کے مال کی نسبت ۵۰ ۔ ۶۰ فیصدی کم قیمت پر بکتا تھا ۔ اس لئے انگلینڈ کے مال کی حفاظت کے لئے ولایت میں آنیوالے مال پر قیمت کے حساب سے ۷۰ ۔ ۸۰ فیصدی محصول لگایا گیا اور اس کا آنا بالکل بند کر دیا گیا ۔ ایسا نہ کیا جاتا تو پیزلی اور مانچسٹر کے لئے شروع کئے گئے کپڑے کے کارخانے ہندوستانی مال کے مقابلہ میں بھاپ کے زور سے بھی نہیں چلائے جا سکتے تھے"

مگر افسوس کہ اس پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا کہ بھاری بھاری محصولات لگائے جائیں بلکہ قانونی طریقہ پر ہندوستانی مال کی قطعی ممانعت بھی قانوناً پاس کی گئی اور اس کا لانا، اور اس کا فروخت کرنا، اس کا خریدنا بھی جرم قرار دیدیا گیا اور خلاف کرنے والوں پر مالی اور بدنی سزائیں جاری کی گئیں ۔ چنانچہ یوزپل آرٹ مینوفکچر آف گریٹ برٹن (کتاب) میں ہے ۔

"صوبہ ملابار کی چھینٹ کو ولایت میں روکنے کے لئے انگریز جولاہوں کی استدعا پر

پارلیمنٹ نے اُس چھینٹ پر ڈیڑھ آنہ فی گز ٹیکس لگایا۔ دو سال بعد وہ ٹیکس ۳ ر فی گز کر دیا گیا اور ۱۸۲۰ء میں قانون بنا دیا کہ جو لوگ ولایت میں ہندوستانی چھینٹ فروخت کریں گے اُن پر دو سو روپیہ جرمانہ اور جو خریدیں گے اُن پر پچاس روپیہ جرمانہ ہوگا۔ ہندوستان کے ریشمی کپڑے اور چھینٹوں کو روکنے کے لئے ۱۸۰۰ء میں قانون پاس کیا گیا کہ بنگال، چین، فارس یا ایسٹ انڈیا میں بنا ہوا ریشم اور وہاں پر رنگی ہوئی اور چھپی ہوئی چھینٹ وغیرہ ۱۸۰۱ء کے بعد ولایت میں نہ منگائی جائے اور نہ بیچی جائے۔ اس تاریخ کے بعد جو مال منگایا جائے گا وہ گوداموں میں بند کر دیا جائے گا۔ اور پھر غیر ممالک میں بھیج دیا جائے گا۔"

۱۸۱۲ء میں محصولات کو بڑھاتے بڑھاتے مندرجہ ذیل مقدار پر کر دیا گیا کپاس کا کپڑا فی صدی ۸۱ روپیہ کپاس فی من ۱۵ روپیہ چھینٹ فی صدی ۸۱ روپیہ تنذیب فی صدی ۳۲ روپیہ چٹائی فی صدی ۶۱ بکرے کے اون کی اشیاء ۴۱

صاحب علم المعیشۃ ۳۱-۱۹۳۰ء کی منتخبہ کمیٹی کی رپورٹ کے متعلق لکھتا ہے:۔

"اس تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ کمپنی کی تدابیر کارگر ہو چلی تھیں۔ پارچہ بافی کی صنعت کو گھن لگنا شروع ہو گیا تھا۔ ہندوستان کے سوتی کپڑے کی درآمد انگلستان میں بہت گھٹ گئی۔ ریشمی کپڑا ہندوستان میں بننا کم ہو گیا حتیٰ کہ اٹلی انگلستان سے اُس کی درآمد جاری ہو گئی۔ چنانچہ مذکورہ بالا تحقیقات سے واقعات ذیل کا پتہ چلتا ہے۔

کلکتہ میں انگریزی مصنوعات کی درآمد پر ۲½ فی صدی محصول لیا جاتا تھا۔ بمقابلہ اس کے ہندوستانی مصنوعات کی درآمد پر لندن میں محصول بشرح ذیل وصول کیا جاتا تھا۔

نقشہ صفحہ ۲۸۵ پر دیکھو۔

ہندوستانی مصنوعات	فیصدی قیمت		
	۱۸۱۲ء	۱۸۲۴ء	۱۸۳۲ء
ریشمی کپڑے	قطعی ممانعت	قطعی ممانعت	۲۰ فیصدی
زربفت	قطعی ممانعت	قطعی ممانعت	۳۰ فیصدی
شالی چادر	۷۱ فیصدی	۶۷ ۱/۲ فیصدی	۳۰ فیصدی
چھینٹ	۷۱ ۱/۳ فیصدی	۶۷ ۱/۲ فیصدی	۱۰ فیصدی
قالین	۶۸ ۱/۳ فیصدی	۵۰ فی صدی	۲۰ فیصدی
بنت کا آرائشی سامان	۷۱ فیصدی	۵۰ فیصدی	۳۰ فیصدی
سوتی کپڑا	۲۷ ۱/۳ فیصدی	۵۰ فیصدی	۲۰ فیصدی

مگر ریشم خام کی حالت بالکل برعکس تھی ۱۸۱۲ء میں اس کی درآمد پر محصول ۳ فیصدی قیمت و ۳ روپیہ فی پونڈ کی مجموعی شرح سے وصول کیا جاتا تھا ۱۸۲۴ء میں وہ صرف ۳ روپیہ فی پونڈ ہو گیا اور انگریزی مصنوعات کو مزید ترقی دینے کی خاطر ۱۸۳۲ء میں محصول درآمد برائے نام ایک آنہ فی پونڈ رہ گیا"

(علم المعیشۃ صفحہ ۵۹۳)

مصنف کتاب حکومت خود اختیاری صفحہ ۶۸ پر لکھتا ہے:-

"ان واقعات سے عیاں ہے کہ انگلستان میں پہلے نہ صنعت تھی اور نہ مشینیں تھیں اور نہ کاریگر ہوشیار تھے۔ جب ہندوستان سے مال غنیمت افراط سے گیا تب مشینیں تیار کی گئیں اور کارخانے کھڑے کئے گئے۔ مگر باوجود بہت کثیر سرمایہ اور عظیم الشان کارخانوں کے باوجود بھی ہندوستان کا مال انگلستان جا کر سستا بکتا رہا اور انگلستان کے تیار کردہ مال کو شکست دیتا رہا۔ حتیٰ کہ گورنمنٹ برطانیہ مجبور ہوئی کہ ہندوستان کے مال کو روکنے کے لئے انگلستان

میں سخت محصول لگائے جیسا کہ حسب ذیل تحریر سے ظاہر ہو گا۔ ایچ ایچ ولسن لکھتا ہے کہ "ایک شہادت کے دوران میں ۱۸۱۳ء میں یہ بیان کیا گیا تھا۔ ہندوستان کے بنے ہوئے سوتی اور ریشمی کپڑے اُس وقت تک برطانیہ کے بازاروں میں ولایتی کپڑے سے ارزاں بکتے تھے ہندوستانی مال کی قیمت ولایتی مال سے پچاس سے لے کر ساٹھ فیصدی تک کم ہوتی تھی مگر اس پر بھی ... ہندوستانی کپڑے کی تجارت میں فائدہ رہتا تھا چنانچہ ضرورت ہوئی کہ انگریزی صنعت کو برباد ہونے سے بچایا جائے اور ہندوستانی کپڑے کی قیمت پر جبکہ وہ انگلستان میں داخل ہو ستّر اور اسّی فیصدی محصول لگا دیا جائے یا اُس کی درآمد قطعی بند کر دی جائے۔ یہ ہمت شکن محصول نہ لگتے اور سخت قانون نہ بنتے تو پیزلی اور مانچسٹر کے پتلی گھر شروع ہی میں بند ہو جاتے اور پھر دخانی انجنوں کی قوت سے بھی نہ چل سکتے۔ مگر ہندوستانی صنعت کو بھینٹ چڑھا کر انھیں زندہ رکھا گیا اگر ہندوستان آزاد ہوتا تو اس کا جواب دیتا اور برطانوی مال پر ایسے محصول لگاتا کہ پھر وہ مال نہ آسکتا اور اس طرح اُس کی صنعت تباہی سے بچ جاتی۔ لیکن اُس کو اپنے تحفظ کی اجازت نہ دی گئی۔ وہ اغیار کے سامنے بے بس تھا۔ بغیر کسی محصول کے برطانوی مال اُس کی بندرگاہوں پر زبردستی اتار دیا گیا۔ اور آخرکار جس حریف سے برابر کا مقابلہ کرنے کی مجال نہ تھی اُس کو برطانوی کارخانہ دار نے ایک نامنصف حکومت کے ہاتھ سے حلال کرا دیا۔"

(دت صفحہ ۲۶۲ - ۲۶۳)

صاحب معیشتہ الہند صفحہ ۲۰۰ میں لکھتا ہے۔

"اُس سے قبل جا بجا ذکر آچکا ہے کہ ہندوستان کا سوتی کپڑا قدیم زمانہ سے بہت مشہور اور بہت مقبول تھا اور دور و دراز ممالک تک اس کی برآمد جاری تھی۔

قدیم تواریخ سے پتہ چلتا ہے کہ عیسٰی علیہ السلام سے دو تین ہزار سال قبل بھی یہی کیفیت تھی کہ ہندوستان کا کپڑا بابل و مصر اور بعد کو یونان و روم تک جاتا تھا۔ چنانچہ سرکار ہند اپنے گزیٹیر جلد سوم میں رقمطراز ہے کہ ڈھاکہ کی ململ یونان میں مشہور تھی اور آج سے دو ہزار سال قبل بھی سوتی پارچہ بافی کی صنعت ہندوستان میں خوب درجہ کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ قرون وسطیٰ میں اس صنعت کو اور بھی ترقی ہوئی اور اس کی تجارت انگلستان بلکہ تمام یورپ پر جس طرح چھا گئی اس کی مختصر کیفیت اوپر بیان ہو چکی ہے۔ جب انگلستان کا اونی اور ریشمی کپڑا بھی ہندوستانی سوتی کپڑے کے سامنے گرد ہو گیا اور انگلستان کے پارچہ باف ہندوستانی پارچہ بافوں کے مقابلہ کی تاب نہ لا سکے اور عاجز ہو گئے تو سترھویں صدی کے ختم پر قانون کے زور سے ہندوستانی سوتی کپڑا انگلستان میں روکا گیا۔ حتیٰ کہ اس کی خرید و فروخت اور اُس کا استعمال جرم قرار دیا گیا۔ یہ کیفیت اوپر درج ہو چکی ہے۔ چنانچہ پروفیسر لیکی اپنی مشہور تاریخ انگلستان میں لکھتے ہیں کہ سترھویں صدی کے آخر میں ہندوستان کے سستے اور خوش وضع سوتی کپڑے جو کالیکو کہلاتے تھے خاصکر ململیں اور چھینٹیں بمقدار کثیر انگلستان میں درآمد ہوتی تھیں اور ان کو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ اونی اور ریشمی پارچہ بافی کی صنعتیں بیکار ہو گئیں۔ بنابراں پارلیمنٹ نے ۱۷۰۰ء اور ۱۷۲۱ء میں ایسے قانون نافذ کئے جن کی رو سے ہندوستان کے رنگین اور پھولدار اور سوتی کپڑے یا اسی قسم کے دوسرے کپڑے جن میں اُن کا کوئی جزو شامل ہو انگلستان میں ان کا استعمال خواہ لباس خواہ آرائشی سامان میں قطعاً ممنوع قرار دیا گیا۔ علیٰ ہذا مستند تواریخ سے واضح ہوتا ہے کہ اسی زمانہ میں سوتی کپڑے کی صنعت شروع کی گئی۔ چنانچہ سرکار ہند نے بھی اپنے گزیٹیر جلد سوم میں تسلیم کیا ہے کہ سوتی پارچہ بافی کی صنعت انگلستان میں صرف سترھویں صدی سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد اٹھارھویں صدی میں کلیں ایجاد ہوئیں۔

دخانی انجن تیار ہوئے۔ کارخانے قائم ہوئے۔ صنعتی ترقی کا دور شروع ہوا، اور ساتھ ہی ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں ایسا بندوبست کر دیا کہ یہاں سے صرف سامان خام انگلستان کو برآمد ہو جو وہاں کی صنعتوں میں کام آئے اور وہاں کے مصنوعات یہاں درآمد ہو کر خوب کثرت سے فروخت ہوں۔ چنانچہ صنعت پارچہ بافی کا بھی یہی حشر ہوا کہ ہندوستان میں اس کا خاتمہ ہو گیا صرف روئی برآمد ہونے لگی۔ حتیٰ کہ مدت سے تمام ملک ولایتی کپڑے میں لپٹا نظر آتا ہے" صـ۔۔۔

یہی نہیں ہوا کہ ہندوستان کی مصنوعات انگلستان بکثرت جاتی تھیں اور ان کو بھاری بھاری ٹیکسز اور قانونی ممانعتوں کے ذریعہ سے روکا گیا بلکہ دنیا کے دوسرے ملکوں کے بازاروں میں بھی۔۔۔ یہ مصنوعات بڑی بڑی مقدار میں چھاپہ مارتی تھیں وہاں بھی انگریزوں کی دیکھا دیکھی اسی طرز عمل کو اختیار کیا گیا اور مامون تجارت کے حیلے سے رکاوٹیں پیدا کر کے ہندوستانی مصنوعات کا داخلہ آہستہ آہستہ بند کر دیا گیا۔ باوجودیکہ ۱۷۶۹ء سے ہندوستانی دستکاروں پر تشددات جاری کر دیئے گئے تھے اور جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر آئے اُن کو دستکاری چھوڑ دینے اور صرف، خام مال تیار کرنے پر مجبور کیا جانے لگا تھا مگر تاہم ۱۸۳۰ء تک ہندوستانی مصنوعات دوسرے ممالک میں بھی بڑی بڑی مقدار میں تجارت کے لئے جاتی رہتی تھیں جن کو اسی طرح کم کیا گیا۔

انگلستان میں ۱۸۰۳ء میں ۱۲۸۱۷ ہزار گٹھے کپڑوں کے گئے مگر........
کم ہوتے ہوتے ۱۸۲۹ء میں کل ۴۳۳ گٹھے گئے۔

امریکہ میں ۱۸۰۱ء میں ۱۳۶۳۳ ہزار گٹھے گئے اور پھر کم ہوتے ہوتے ۱۸۲۹ء میں ۲۵۸ گئے۔

ڈنمارک میں ۱۸۰۰ء میں ۱۴۵۷ گٹھے گئے۔ مگر کم ہوتے ہوتے ۱۸۲۰ء میں ۱۵۰ ہو گئے۔

پرتگال میں ۱۷۹۹ء میں ۱۴ ۹۷ ہزار گٹھے گئے مگر ۱۸۲۵ء میں ۱۰۰۰ گئے
عرب و فارس سنہ ۱۸۱۰ء میں ۶۰۰۰ ہزار گٹھے گئے مگر ۱۸۲۵ء میں ۲۰۰۰ گئے

(دیکھو علم المعیشہ صـ ۵۹۳)

ان دوسرے ممالک میں ہندوستانی مصنوعات کی درآمد کی کمی بڑھنے کے اسباب میں جس طرح ماموں تجارت کا ڈھونگ تھا اُسی طرح ہندوستان میں مصنوعات کی کمی اور انگلستان کی مصنوعات کا کثرت سے داخلہ بھی تھا۔ ہندوستان کے مصنوعات کی کمی کی دل ہلا دینے والی داستان ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔ جس نے دستکاروں کو کاروبار سے معطل بلکہ مفلوج بنا دیا تھا۔ اور اُن کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ دستکاری بالکل چھوڑ بیٹھیں یا ملک عدم کو سدھاریں۔ صاحب علم المعیشہ لکھتا ہے صـ ۵۹۳

" دوسرے ملک بھی ہندوستانی مصنوعات خصوصًا کپڑا بکثرت خرید تے تھے لیکن انگلستان کی طرح اُنھوں نے بھی اپنی اپنی صنعت وحرفت کو ترقی دینے کی خاطر بھاری بھاری محصول قائم کر کے درآمد روک دی یا اگر کچھ عرصہ کہیں درآمد جاری بھی رہی تو انگریزی تجار نے اپنی مصنوعات کو وہاں بھرنا شروع کر دیا۔

ہندوستان کی دستکاری اور تجارت

کے برباد کرنے کا تیسرا طریقہ

ہندوستان میں انگلستان کی مصنوعات کو جو کہ مشینوں اور کلوں کے ذریعہ سے تیار کی گئی تھیں نہایت کثرت سے ٹھونسا گیا اور ان کی درآمد پر کوئی ٹیکس نہیں لگایا گیا اور اگر لگایا بھی گیا تو اس قدر کم لگایا گیا کہ اُس سے دستکاروں کے ہاتھ سے بنائی ہوئی مصنوعات ارزاں نہیں ہو سکتی تھیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں دستکار بھوکھ اور مسلسل فاقہ کشی کی وجہ سے ملک عدم کو چل بسے اور لاکھوں بلکہ کروڑوں دستکار صناعی چھوڑ کر زراعت یا دوسرے پیشوں پر مجبور ہو گئے۔ اور بالجبر یہ صناعتی اور تجارتی ملک محض زراعتی بنا دیا گیا۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ ابتدا میں جبکہ ہندوستانی مصنوعات ہندوستان سے بکثرت انگلستان

ییں جانے لگیں تو وہ اپنی نفاست اور خوش نمائی اور مضبوطی اور ارزانی (سستے پن) کی وجہ سے عام پبلک میں اس قدر مقبول ہوئیں کہ لوگوں نے عموماً وہاں کی بھدی اور مہنگی مصنوعات کو خریدنا چھوڑ دیا اور ہندوستانی مصنوعات نے انگلستان کی تمام منڈیوں پر قبضہ کرلیا۔ خصوصاً سوتی اور ریشمی کپڑوں نے تو اس قدر قبولیت حاصل کی کہ وہاں کے اونی کپڑوں کو (جو کہ وہاں بکثرت بنائے اور استعمال کئے جاتے تھے) کوئی پوچھتا بھی نہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے دستکار بھوکے مرنے لگے۔ دیسی دستکاری دم توڑنے لگی۔ انھوں نے انگلستان میں چاروں طرف شور و غوغا مچایا حکومت کے مراکز پر اور کمپنی کے مخزنوں اور دفتروں پر بڑے بڑے ہجوم کئے گئے پروٹسٹ کرنے والوں نے دھاوے کئے مظاہرے عمل میں لائے گئے۔ سترھویں صدی کے آخر زمانہ میں صنعت و حرفت کی مختلف جماعتوں کی طرف سے پارلیمنٹ میں بے شمار محضر اور درخواستیں پیش ہوئیں۔ سودیشی تحریک بڑے زور سے چلائی گئی۔ چونکہ قومی حکومت تھی۔ آزاد ملک تھا۔ بہت قوی اثر ہوا اور چاروں طرف یہی چرچے ہونے لگے۔ کہ اپنے ملک اور اپنی قوم کی دستکاری اور تجارت کی حفاظت اور اُن کی معاشی ترقی کی کوشش اور تدبیر از بس ضروری ہے۔ اگر ہندوستان کی مصنوعات کو بند نہ کیا گیا تو ہماری قوم بھوکی مرجائے گی۔ اور ملک برباد ہوجائے گا۔ اور چونکہ ہندوستانی مصنوعات کے بدلہ میں انگلستان سے صرف سونا اور چاندی جاتا ہے اس لئے دستکاری کی بربادی کے ساتھ ساتھ ملک کی دولت اور سرمایہ بھی نکلکر۔۔ ملک کو انتہائی غربت اور افلاس میں مبتلا کردے گا۔ اس لئے مامون تجارت کا فلسفہ گھڑا گیا (یعنی دوسرے ملکوں کی ارزاں پیداوار کی درآمد ٹیکس وغیرہ کے ذریعہ سے روک کر اپنے یہاں کی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کی کوشش کرنا اور اگر کوئی چیز اپنے یہاں ارزاں پیدا نہ ہوسکے تو حکومت کی امداد سے اس کو ترقی دینا اور اس کی برآمد کا راستہ نکالنا۔ تاکہ کچھ عرصہ میں اپنے ملک کی پیداوار بھی اُسی قدر ارزاں ہوجائے اور خارجی پیداوار کے درآمد کی ضرورت نہ رہے یہی امر عین انصاف اور انسانیت کی خدمت ہے اور یہی ہر ملک اور قوم کا فریضہ ہے۔ اس پر بڑے بڑے لکچر دئے گئے۔ مضامین لکھے گئے۔ پمفلٹ شائع کئے گئے۔ اخباروں میں آرٹیکل لکھے گئے۔ اگرچہ بعض منصف مزاج اس کے مخالف بھی تھے اور

تمام قوموں اور ملکوں کے ساتھ مساویانہ معاملہ کرنا اور بین الاقوام تجارتی آزادی کا جاری ہونا عین انصاف قرار دیتے تھے۔ فری ٹریڈ اُن کا اصول تھا مگر وہ بہت ہی تھوڑے تھے۔ مگر مامون تجارت کے پروپگنڈا، کرنے والے بہت زیادہ تھے۔ بالآخر حکومت کے تمام ایوانوں میں یہی اثر غالب آیا اور قانوناً ایسی تمام کوششیں جاری ہوئیں۔ جن سے ہندوستان میں مصنوعات کم پڑجائیں، دستکار اپنی دستکاری چھوڑ دیں۔ ہندوستان کا بنا ہوا مال انگلستان آنا بند ہوجائے۔ انگلستان والے ہندوستان کے بنے ہوئے مال کو خریدنا اور استعمال کرنا چھوڑ دیں وغیرہ وغیرہ چنانچہ یہ سب امور عمل میں لائے گئے۔ جیسا کہ ہم نے اس کی متعدد معتبر شہادتیں پیش کردی ہیں۔ جب یہ امور قوت کے ساتھ انگلستان والوں نے اختیار کر کے اپنی مصنوعات بڑھالیں تو رفتہ رفتہ دوسرے ممالک نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا اور تمام ترقی یافتہ ممالک میں مامون تجارت کا عمل جاری ہوگیا اور سبھوں نے نہ صرف ہندوستان ہی کی بلکہ تمام خارجہ ممالک کی مصنوعات کو اپنے اپنے یہاں قانونی رکاوٹیں پیدا کر کے روک دیا۔ انگریز تاجروں کی تجارت پر بہت بڑا اثر پڑا۔ اُدھر چونکہ ہندوستان کی لوٹ سے سرمایہ یعنی سونا اور چاندی، اشرفیاں اور روپئے لاتعداد مقدار میں انگلستان پہنچ چکا تھا اس لئے بہت سرعت کے ساتھ دُخانی اور مشینی کارخانے جا بجا انگلستان میں بنائے گئے مصنوعات نہایت افراط کے ساتھ تیار ہونے لگیں کارخانوں اور مخزنوں میں مصنوعات کے ایسے انبار لگ گئے جن کی کھپت انگلستان میں ممکن نہ تھی۔ اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ مصنوعات کے لئے منڈیاں حاصل کی جائیں۔ یہ امر مامون تجارت کے فلسفہ کی موجودگی میں نہیں ہوسکتا تھا اس لئے اب وہ فلسفہ بدلا گیا اور جگہ جگہ فری ٹریڈ (آزاد تجارت) کا گیت گایا جانے لگا آرٹیکل آزاد تجارت کے بکثرت لکھے گئے۔ بڑی بڑی اور ضخیم کتابیں اور چھوٹے چھوٹے پمفلٹ اس کی خوبیوں اور محاسن کے تمام دنیا میں شائع ہونے لگے۔ جگہ جگہ فری ٹریڈ (آزاد تجارت) ہی کا لکچر دیا جانے لگا اور یہ کہا جانے لگا کہ ہر ملک اور ہر قوم پر لازم ہے کہ اپنی اور غیر ممالک کی پیداوار میں کوئی فرق اور امتیاز نہ کرے۔ اگر کوئی چیز دوسرے ملک سے ارزاں دستیاب ہوسکے تو بلا تکلف اس کو منگائے ٹیکس قائم کر کے اُس کی درآمد کو نہ روکے اور اگر کوئی چیز اپنے یہاں ارزاں

پیدا نہ ہو سکے تو سرکاری امداد سے اس کو ترقی دینے اور اس کی برآمد کا راستہ نکالنے کی کوشش نہ کرے۔ حاصل یہ کہ کسی خاص اہتمام سے خارجی پیداوار کی درآمد بند نہ کرے اور نہ ملکی پیداوار کی برآمد بڑھائے۔ مگر ترقی یافتہ اور آزاد ممالک انگلستان کے فریب میں نہیں آئے اور مامون تجارت ہی کے فلسفہ کو حرز جان بنائے رہے مگر انگریزی ماتحت ممالک خصوصاً ہندوستان بے دست وپا تھے ان کو ہاتھ پیر ہلانا اپنے آقاؤں کے خلاف ممکن ہی نہ تھا۔ ان پر خوب مشق کی گئی۔ ہر ہر منڈی میں.. انگریزی مال ٹھونسا گیا اور مصنوعات انگلیشیہ کے انبار لگا دئے گئے۔ ریلوے کے جاری کرنے اور ہر ہر منڈی تک پہنچانے کی انتہائی کوششیں جاری کی گئیں۔ اور ایسے ٹیکسز جن سے ہندوستان کی صنعت اور تجارت کا تحفظ اور تا این ہو سکے یکقلم روک دئے گئے۔

(صاحب علم المعیشۃ صفحہ ۵۸۴) میں لکھتا ہے:۔

"۱۸۱۳ء میں پارلیمنٹ نے پھر ہندوستان کے حالات کے متعلق تحقیقات جاری کی اور جو انگریز ہندوستان رہ چکے تھے اُن سے سوالات کرکے مفید معلومات حاصل کیں۔ یہ وہ نازک وقت تھا جب کہ نپولین نے انگلستان کی مصنوعات کی درآمد تمام یوروپ کے ممالک میں بند کر رکھی تھی۔ اور سامان فروخت نہ ہو سکنے کی حالت میں انگلستان کے صناع اور کارخانہ داروں کو برباد ہو جانے کا خطرہ لاحق تھا۔ انگریزی مصنوعات کی فروخت کی کوئی نہ کوئی سبیل نکالنی اشد ضروری تھی چنانچہ یہ خدمت ہندوستان کے سپرد ہوئی کہ وہ انگریزی سامان بکثرت خریدے چونکہ یوروپ کے ممالک میں جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں انگریزی مصنوعات کی درآمد بند تھی انگریزی کارخانہ دار مال نہ بکنے سے بدحواس ہو رہے تھے۔ بالآخر ان کی نظر بھی ہندوستان ہی پر پڑی۔ اور انھوں نے بہت شور واویلا مچا کر کمپنی کا ہندوستان سے تجارت کرنے کا جو اجارہ تھا اُس کو توڑوا دیا اور اب ہندوستان سے تجارت کرنے کی اجازت عام ہو گئی"۔

صفحہ (۵۸۵) میں لکھتا ہے :-

"ایک طرف تو نمائشیں قائم کرکے اور ہندوستانی میلوں ٹھیلوں میں جاجاکر بڑے بڑے انگریز ولایتی چیزیں دکھاتے پھرتے تھے کہ لوگ ان کی خریداری پر مائل ہوں"

مسٹر وِلسن ہندوستان کی تاریخ میں انگلستان اور ہندوستان کے تجارتی تعلقات پر لکھتا ہے :-

"موجودہ طریق تجارت اُس بے التفاتی کی افسوسناک مثال ہے جو ہندوستان کے ساتھ وہ ملک برت رہا ہے جس کی اطاعت ہندوستان نے قبول کرلی ہے۔ سنہ ۱۸۱۳ء کی تحقیقات میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ ہندوستان کے بنے ہوئے سوتی اور ریشمین کپڑے انگریزی کپڑوں سے پچاس ساٹھ فیصدی کمتر نرخ پر ولایت کے بازاروں میں نفع کے ساتھ فروخت ہوسکتے تھے۔ چنانچہ مجبور ہوکر ہندوستانی کپڑوں کی درآمد پر ستّر ۷۰ ؍ اسّی فیصدی محصول قائم کردیا نیز بعض کی قطعاً ممانعت کردی۔ اگر یہ طریق اختیار نہ کیا جاتا تو انگلستان میں کپڑے کے کارخانے بند ہوجاتے بلکہ کلوں کے زور سے ان کا بعد کو چلنا دشوار ہوجاتا۔ لیکن ہندوستان کو دبا دبا کر ولایت کے کارخانوں کو ترقی دی گئی۔ کاش اگر ہندوستان کا بس چلتا تو وہ بھی بدلا لیتا۔ انگریزی مصنوعات کی درآمد پر بھاری محصول لگاکر ان کو ملک میں آنے سے روکتا اور اپنی صنعت و حرفت کے میدان کو بچاتا لیکن اس کو اپنی حفاظت کرنے کا اختیار نہ تھا وہ غیروں کی اجازت کا محتاج تھا۔ انگریزی مال تو کوئی محصول درآمد لئے بغیر ہندوستان میں ٹھونسا گیا اور ہندوستانی مال کی درآمد ولایت میں روک دی گئی۔ اور پھر بھی چونکہ ہندوستان سے مقابلہ دشوار نظر آتا تھا رقابت کے جوش میں حکومت کے اختیارات سے اپنے مفید مطلب

اور ہندوستان کے خلاف کام لیا جاتا رہا۔

(علم المعیشہ صفحہ ۵۸۶)

مونٹگمری مارٹن جس نے ہندوستان کے متعلق ۱۸۳۵ء میں رپورٹ شائع کی تھی لکھتا ہے :-

"اس کتاب کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اضلاع زیر بحث میں کسقدر لوگ پارچہ بافی پر اپنی گذران کرتے تھے اور اس میں کیسے ماہر اور کامل تھے۔ لیکن تجارت آزاد کے بہانے سے انگلستان ہندوستانیوں کو لنکا شایر، یارک شایر اور گلاسکو کی کلوں کے بنے ہوتے کپڑے خریدنے پر مجبور کر رہا ہے اور بنگال و بہار کے دستی بنے ہوئے کپڑے کیسے مضبوط اور کیسے خوش نما بھاری بھاری محصول در آمد قایم کر کے اپنے یہاں آنے سے روکتا ہے۔ یہاں ایک نکتہ یہ بھی بتانے کے قابل ہے کہ اول اول جبکہ انگلستان کی صنعت و حرفت بمقابلہ ہندوستان کے پس ماندہ حالت میں تھی تو ہندوستانی مصنوعات کو بھاری محصول در آمد کے ذریعہ سے صرف انگلستان میں جانے سے روکا جاتا۔ یہی انگریزی تاجر ہندوستانی مصنوعات دیگر ممالک میں لے جاکر فروخت کرتے اور تجارت سے نفع اٹھاتے تھے۔ مگر اپنے ملک میں صنعت و حرفت کی ترقی کو تجارت کے نفع پر ترجیح دینے اور ہندوستانی ارزاں مال کی بجائے ملک کا گراں مال خریدنا بہتر سمجھتے تھے۔ جب اول اول اس تامین کی آڑ میں بعدہٗ کلوں کی ایجادات سائنس کی تحقیقات اور تعلیم عامّہ کی بدولت اپنے یہاں کی صنعت خوب ترقی کر چکی تو دیگر ممالک میں بھی انگریزی مصنوعات پھیلانے شروع کئے۔ علاوہ ازیں یوروپ کے دیگر ممالک اور امریکہ نے بھی اپنی اپنی صنعت و حرفت پھیلانے کی خاطر انگلستان کی دیکھا دیکھی ہندوستانی مصنوعات کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ شروع کیا۔ یعنی بھاری محصول قائم کر کے اُن کی در آمد روک دی۔ انگلستان کی طرح اُنھوں نے اپنی کلوں کی ایجادات اور سائنس

کی تحقیقات میں پوری کوشش کی۔ عوام میں تعلیم پھیلائی اور بہت جلد اُن کی معاشی حالت بھی روبہ ترقی ہوگئی۔ لیکن ہندوستان نہ صرف ایجادات اور سائنس کی تحقیقات اور تعلیم عامّہ کی برکت سے محروم رہا بلکہ اُس کے ان پڑھ مگر اپنے فن کے بڑے بڑے کامل صناع کو اپنے کاروبار میں تباہ کن مزاحمتیں پیش آئیں نہ صرف دیگر ممالک نے ہندوستانی مصنوعات کی درآمد روک دی بلکہ اس کے برعکس بلاتحاشا اپنی مصنوعات لالاکر ہندوستان میں انبار لگانے شروع کئے۔ اور اس طرح پر کچھ عرصہ میں ہندوستانی مصنوعات نہ صرف دیگر ممالک سے خارج ہوگئے بلکہ خود اپنے ملک میں بھی ان کو پناہ نہ مل سکی اور عارضی بندشوں میں نامساعد حالات میں گھر کر بے کس اور کار رفتہ ہوگئے۔ صرف زراعت اور پیداوار خام کی بہم رسانی اس کے ذمہ ڈالدی گئی۔ صنعت وحرفت کی خاص برکات میں اس کا کوئی حصہ نہیں رہا۔"

(علم المعیشہ ص۵۹۱)

خلاصہ یہ کہ اس آزاد تجارت کے ڈھونگ اور حکومت کے زور سے ہندوستان کے ہر ہر شہر اور قصبہ اور گاؤں میں انگریزی مصنوعات کے انبار لگادئے گئے اور بیرون ہند کے اموال میں ڈیوٹی... بندروں کے کسٹموں پر کم سے کم کردی گئی اور اگر کہیں محصول درآمد کچھ زاید حکومت نے مقامی ضرورتوں کی بناء پر بڑھایا تو شور مچا کر مقامی حکام کو اس قدر ڈرایا گیا کہ وہ مجبور ہوکر ڈیوٹی کے کم کرنے پر مضطر ہوگئے جس کی تفصیل ہم عنقریب پیش کریں گے۔ دوسرا یہ ڈھونگ عمل میں لایا گیا کہ ہندوستان کی مصنوعات پر بھی اتنا محصول ضرور لگانا چاہئے جتنا کہ انگلستان کے مصنوعات پر لگایا جاتا ہے تاکہ ہندوستان کی مصنوعات انگلستان کی مصنوعات سے سستی نہ ہوں۔ ورنہ تجارت آزاد نہ رہیگی بلکہ تجارت مامونہ ہوجائے گی۔ صاحب علم المعیشہ ص۵۹۵ میں لکھتا ہے :۔

"باوجود ہزار بس ماندگی کے جب سوتی کپڑا بننے والے کارخانے کلکتہ بمبئی جیسے مقامات میں اُبھرنے لگے اور تدریج کپڑے کی ملیں جاری ہوچلیں تو انگلستان کے

کارخانہ داروں کو فکر دامنگیر ہوئی کہ کہیں یہ پرانا رقیب پھر سر نہ اٹھائے اور بنا بنایا کام بگاڑ دے ۳ ½ فیصدی محصول درآمد جو انگریزی کپڑے پر ہندوستان میں ادا کیا جاتا ہے اور جس کی مجموعی تعداد اب سرکار ہند کی کل آمدنی کا (۱۵) فیصدی حصہ ہے اس سے تو بچنا آسان نہ تھا۔ پس انگریزی کارخانہ داروں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ یہ محصول درآمد یعنی ۳ ½ فیصدی محصول مال نہیں بلکہ محصول تامین ہے۔ یعنی اس سے ہندوستانی کارخانوں کو امان ملتی ہے اور اس میں نہ صرف انگریزی کارخانوں کا نقصان ہے بلکہ ایسا محصول انگلستان کے قومی طریق تجارت آزاد کے منافی ہے۔ پس اگر محصول درآمد مالی نقصان کے خوف سے ترک نہیں کیا جا سکتا تو ہندوستانی کارخانوں پر بھی بقدر ۳ ½ فیصدی محصول پیداوار قائم کر دینا چاہئے تاکہ ان کو انگریزی کارخانوں پر موجود فوقیت حاصل نہ رہے۔ سب جانتے ہیں کہ انگلستان میں لنکا شایر اور منچسٹر کے کارخانہ داروں کا حکومت میں رسوخ بہت قوی ہے۔ ان کے اثر میں اس قدر ووٹ ہیں کہ زبردست سے زبردست وزارت بھی ان سے بے اعتنائی کرنے کی جرأت کم کر سکتی ہے۔"

اس خود غرضی اور ناانصافی کی اگرچہ بعض انصاف پسند انگریزوں نے مخالفت بھی کی مگر کچھ فائدہ نہ ہوا اور اگرچہ کچھ عرصہ تک محصول درآمد ۳ ½ فیصدی انگلستانی مال سے اٹھا بھی دیا گیا مگر مقامی مصاریف کی وجہ سے بالآخر ۱۸۹۶ء میں لارڈ ایلجن کے زمانہ میں ایک ایکٹ پاس ہوا جس کی دفعہ ۶ کی رو سے ایسے کل سوتی کپڑے پر جو ہندوستانی کارخانوں میں تیار ہو ۳ ½ فیصدی محصول پیداوار اسی طرح قایم کر دیا گیا جس طرح سے انگلستان کے کارخانہ دار ہندوستان میں ۳ ½ فیصدی دیتے تھے یہ ایکٹ اخیر تک جاری رہا۔ یہ محصول ملکی صنعتوں پر انتہائی بے انصافی پر مبنی تھا مگر قوت کے سامنے کمزور کی کیا چل سکتی ہے۔ ہندوستانیوں کا شور مچانا بالکل بے کار گیا محصول درآمد بعد میں بیرونی

ممالک سے آنے والے اموال پر ضروریات جنگ وغیرہ کی وجہ سے اگرچہ بڑھایا گیا اور ۵ فیصدی سے ۷½ فیصدی تک کر دیا گیا مگر سوتی مصنوعات پر کارخانہ داران لنکاشایر و منچسٹر وغیرہ کے خوف سے زمانہ جنگ میں بھی زیادہ نہیں کیا گیا بلکہ ۳½ فیصدی ہی رکھا گیا۔ جس کا اقرار خود سر ولیم میر ممبر مال نے سنہ ۱۹۱۶ء میں اپنی تقریر میں کرتے ہیں۔

(دیکھو علم المعیشۃ صفحہ ۵۹۸)

خلاصہ یہ کہ تا مین تجارت کی غرض سے انگلستان نے پہلے ہندوستانی مصنوعات پر ۸۰ فیصدی اور اس سے بھی زیادہ محصول لگا کر پھر قطعی ممانعت کر کے مہذب ڈاکہ ڈالا تھا اور پھر جب ملوں اور کارخانوں کی پیداوار بہت زیادہ ہو گئی اور دوسرے ممالک میں ان کی کھپت نہیں ہوسکی تو آزاد تجارت کے ڈھونگ سے ہندوستان میں اپنے ممالک کی مصنوعات ٹھونسنے کی غرض سے محصول درآمد کم کر کے ہندوستان کو مجبور کر دیا جس سے وہ خام مال تیار کرنے پر بیدست و پا ہو گیا اور دستکاری سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ مسٹر مانٹ گومری مارٹن تاریخ نوآبادیات برطانیہ میں لکھتا ہے۔

"ہم نے ربع صدی کے دوران میں ہندوستانی علاقوں کو اپنے مصنوعات کے خرید نے پر مجبور کیا۔ اس طریقہ پر کہ ہمارے اونی مال پر ہندوستان میں کوئی محصول نہیں لیا جاتا تھا۔ سوتی مال پر ۲½ فیصدی محصول تھا اور اسی نسبت سے دیگر اشیاء پر محصول لگایا گیا تھا در آں حالیکہ اُسی زمانہ میں ہندوستان کے بنے ہوئے مال پر ہم انگلستان میں ایسے سخت محصول لگاتے رہے کہ ہندوستانی مال کی درآمد بند ہو جائے۔ بالفاظ دیگر اس محصول کی مختلف شرح ۱۰-۲۰-۳۰-۵۰-۱۰۰-۵۰۰ اور ۱۰۰۰ فیصدی تک اُن اشیاء پر لگائی گئی تھیں جو ہمارے ہندوستانی مقبوضات کی بنی ہوئی ہوں۔ اس لئے ہندوستان کے ساتھ آزاد تجارت کی چیخ پکار جو ہو رہی تھی وہ دراصل انگلستان کے مال کی آزاد تجارت تھی نہ کہ ہندوستان کے اُس مال کی جو انگلستان بھیجا جائے۔ سورت، ڈھاکہ، مرشد آباد، و دیگر مقامات

کی یہاں دیسی صنعتیں عروج پر تھیں بربادی کی داستان کا بیان کرنا حد درجہ دلخراش ہے۔ میری رائے میں یہ بربادی ایمانداری کے ساتھ تجارت کو ترقی دینے کی وجہ پر مبنی نہ تھی بلکہ میرا خیال یہ ہے کہ وہ ایک زبردست طاقت تھی جس کے ذریعہ سے کمزور کو دبایا جا رہا تھا۔"

(حکومت خود اختیاری صـ۲۳ ازدت جلد ۲ صـ۱۱۲)

۱۹۲۵ء کی تفصیل لکھتا ہوا صاحب معیشۃ الہند صـ۲۷۵ پر۔ (برآمد اور درآمد اموال کی تفصیل کے بعد) لکھتا ہے

"مندرجہ بالا اعداد و شمار سے واضح ہوگا کہ ہندوستان کا جس قدر مال و سامان برآمد ہوا اُس میں تقریباً اسی فیصدی سامان خام تھا جس میں تقریباً تئیس ۲۳ فیصدی سامان خوراک شامل تھا یہ بیشتر زرعی پیداوار پر مشتمل تھا۔ مثلاً روئی ۱۷ فیصدی جوٹ ۱۲ ½ فیصدی چاول ۱۱ فیصدی روغن دار تخم ۱۰ فیصدی چار ۶ فیصدی گیہوں ۶ ½ فیصدی خام چمڑا کچھ کم ۵ فیصدی رہے ہندوستان کے مصنوعات سوا ان کی برآمد کا اوسط ۲۰ فیصدی سے بھی کم نظر آتا ہے اور ان میں صرف دو قابل لحاظ ہیں اول جوٹ کا ٹاٹ اور بورے جن کا اوسط ۵ فیصدی ہے۔"

پھر لکھتا ہے :۔

حاصل کلام یہ کہ ہندوستان میں اسی فیصدی مصنوعات درآمد ہوئے اور یہاں سے اسی فیصدی سامان خام برآمد ہوا جس سے صاف ظاہر ہے کہ ہندوستان سراسر زراعتی ملک بن گیا ہے۔ اور اب بھی یہاں سرکار کی تمام تر کوشش یہی نظر آتی ہے کہ زراعت کو ترقی دی جائے۔ صنعت و حرفت یوں ہی پس ماندہ ہے۔ دوسرے اس کی طرف سرکار کا التفات بھی مقابلۃً بہت کم ہے۔ البتہ لوگ اپنی ہمت سے تھوڑا بہت کام چلا رہے ہیں۔"

غرضکہ ہندوستان جو کہ بقول ڈاکٹر فرانسس بکانن ودیگر مورخین ایک صنعتی اور تجارتی ملک تھا جس میں کروڑوں انسان ان دونوں پیشوں سے زندگی بسر کرتے اور بیرونی ممالک سے کروڑوں اشرفیاں حاصل کرتے تھے انگریزوں کی ڈپلومیسی اور خودغرضی نے محض زراعتی ملک بنادیا گیا۔

مسٹر ہنری سینٹ جارج ٹکر دایسٹ انڈیا کمپنی کا ڈائرکٹر ۱۸۲۳ء میں لکھتا ہے۔

"ہندوستان پہلے صنعت وحرفت کا ملک تھا اب زراعت پیشہ بنادیا گیا ہے"۔

یہی جارج ٹکر صاحب دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

"ہم نے ہندوستان کے ساتھ کیسے تعلقات قائم کر رکھے ہیں۔ اس کے ریشمی کپڑے اور نیز وہ کپڑے جو سوت اور ریشم سے مل کر بنے جاتے ہیں کچھ روز سے ہمارے بازاروں سے خارج کردئے گئے ہیں اور حال میں کچھ تو (۶۷) فیصدی محصول درآمد کی بدولت اور کچھ کلوں کی بدولت سوتی کپڑے جو کہ ہندوستان میں بکثرت تیار ہوتے تھے نہ صرف اس ملک میں آنے بند ہوگئے بلکہ ہم اُلٹے انگلستان سے سوتی کپڑے اپنے ایشیائی مقبوضات میں بھیجنے لگے ہیں اور اس طرح ہندوستان تجارتی۔۔ ملک سے تنزل کرکے اب محض زراعتی ملک رہ گیا"۔ (حکومت خوداختیاری صـ۶۷)

مسٹر انڈریو سیم ۱۸۴۱ء میں سیمور کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے کہتا ہے۔

"چونکہ ہندوستانیوں پر اورآمدنیوں کے دروازے بند کردئے گئے اس واسطے وہ زراعت کی طرف متوجہ ہوگئے"۔ (حکومت خوداختیاری صـ۶۷)

ہم پہلے سرجان شور کا قول ذکر کرچکے ہیں وہ ۱۸۳۳ء میں کہتا ہے۔

"برطانیہ نے جو طرز حکومت قائم کیا ہے اس کے تحت ملک اور باشندگان ملک رفتہ رفتہ محتاج ہوتے چلے جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان پرانے تاجروں پر جلد تباہی آگئی"۔

وہ ہندوستان جس کی تجارت کے متعلق کپتان الگزنڈر ہملٹن اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے۔

"اس میں شک نہیں کہ اورنگ زیب کے زمانہ میں ہندوستان کی تجارت کا مقابلہ یوروپ کے بڑے بڑے ممالک بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اسی تجارت و مال کی درآمد و برآمد کا یہ نتیجہ تھا۔ کہ صرف شہر سورت میں چنگی کی آمدنی تیرہ لاکھ روپیہ سالانہ ہوتی تھی اور احمد آباد میں ایک کروڑ تیس لاکھ روپیہ سالانہ چنگی کی آمدنی تھی"۔ (سفرنامہ ہملٹن جلد اول صہ ۱۴۸) از رسالہ ہندوستان عہد اورنگ زیب میں مصنفہ مرزا سمیع اللہ بیگ چیف جج حیدر آباد

"بنگال میں صرف دریائے ہگلی سے ۵۰ یا ۶۰ جہاز مال سے بھرے ہوئے سالانہ تجارت کے لئے بیرون ہند بھیجے جاتے تھے"۔ (سفرنامہ ہملٹن جلد ۲ صہ ۲۱)

"تمام ساحل ہند پر ہندوستانیوں کے بڑے بڑے جہاز تجارتی مال سے لدے ہوئے چلتے پھرتے نظر آرہے ہیں"۔ (سفرنامہ ہملٹن جلد اول صہ ۴۵

"احمد آباد دولت و ثروت اور عظمت میں یوروپ کے بڑے بڑے شہروں سے کچھ ہی کم ہوگا۔ صرف شہر سورت کی آمدنی ایک لاکھ باسٹھ ہزار پانچ سو پونڈ ہے اور احمد آباد کی آمدنی اس سے دس گنی ہے"۔

(سفرنامہ ہملٹن از رسالہ ہندوستان) عہد اورنگ زیب میں

دستکاری اور تجارت کی بربادی کے نتائج۔

ہندوستانی دستکاری اور تجارت کے برباد ہونے کی وجہ سے دست کار اور تاجر لوگوں کے اندر انتہائی افلاس جاگزیں ہوگیا۔ کروڑوں آدمی بھوک کی وجہ سے مر گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸۰۰ء سے ۱۹۰۰ء تک ایک صدی کے اندر ہندوستان میں ۳۱ قحط واقع ہوئے اور چار کروڑ سے زیادہ نفوس موت کی نذر ہوگئے (جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں) اور لاکھوں نفوس اخلاقی جرائم ڈاکہ اور چوری وغیرہ میں مبتلا ہوگئے اور کروڑوں نفوس زراعت پر گذران کرنے لگے۔ دستکاری روز بروز کم ہوتی گئی اور زراعت پیشہ بڑھنے لگے۔ ڈاکٹر فرانسس بکانن کے زمانہ تحقیقات میں دستکاری کرنیوالوں کی تعداد تقریباً پچاس فیصدی

تھی صناعت پیشہ کاشتکاروں سے کم نہ تھے۔ مگر ۱۹۲۸ء میں گھٹتے گھٹتے (۱۰٫۷) فیصدی رہ گئے بالعکس کاشتکاری کرنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی ۱۹۱۸ء میں ان کی تعداد (۶۱) فیصدی بڑھ گئی حالانکہ ڈاکٹر فرانسس بکانن کے زمانہ میں پچاس فیصدی سے بھی کم تھی ۱۹۰۱ء میں (۶۶ فیصدی ہوگئی ۱۹۱۱ء میں (۱۷) فیصدی ہوگئی ۱۹۲۱ء میں (۷۲) فیصدی تک پہنچ گئی۔ نقشہ ذیل ملاحظہ ہو۔

۱۹۰۱ء میں صنعت پر گذارہ کرنیوالوں کی تعداد کا اوسط (۶٫۴) ہے یعنی ہندوستان کی کل آبادی میں ۱۵٫۵ کروڑ

۱۹۱۱ء میں	"	"	(۳٫۵) یعنی	"	" ۱۱٫۱ کروڑ
۱۹۲۱ء میں	"	"	" ۳٫۳۱	"	" ۱۰٫۳ کروڑ
۱۹۳۱ء میں	"	"	" ۳٫۳۹	"	" ۹٫۷ کروڑ

(روزنامہ احسان لاہور ج ۲۶ مورخہ ۲۷ مارچ ۱۹۳۹ء)

جس کی بناء پر قابل زراعت زمینیں کمیاب ہوگئیں کیونکہ زراعت کی طرف چاروں طرف سے لوگوں نے ہجوم کر دیا۔ مویشی کے لئے چارہ دستیاب ہونا بند ہوگیا جنگل کاٹ ڈالے گئے ایندھن کی قلت اور سخت گرانی ہوگئی۔ زمینیں کمزور ہوگئیں۔ کیونکہ زمین قوت اُگانے کی متواتر زراعت کی وجہ سے کھو بیٹھی۔ جس طرح مزدور متواتر محنت کی وجہ سے کمزور ہو جاتا ہے اسی طرح زمین بھی متواتر کاشت کی وجہ سے کمزور ہو جاتی ہے پہلے زمانہ میں ہر گاؤں میں کچھ حصہ کاشت سے علیحدہ رکھا جاتا تھا جسمیں مویشی چرا کرتے تھے اور زمین میں طاقت کاشت پیدا ہو جاتی تھی دوسرے سال میں گاؤں کی دوسری زمین خالی رکھی جاتی تھی۔ پیداوار روز بروز گھٹنے لگی۔ آئین اکبری کو دیکھئے اس زمانہ میں جو پیداوار فی ایکڑ تھی آج اس کا آدھا تہائی بھی پیدا نہیں ہوتا۔ روز بروز گرانی غلہ کی بڑھتی جاتی ہے کیونکہ پیداوار بہت کم ہے۔ بڑے بڑے شہر اجڑ گئے دیہاتی آبادی بڑھ گئی۔ کیونکہ زراعت کے لئے مزارع کے قریب رہنا ضروری ہے۔ دیہاتی زندگی کی وجہ سے جہالت بڑھ گئی کیونکہ دیہات میں تعلیمی انتظام نہیں ہو سکتا۔

زراعت کو بھی انگریزوں نے نہایت پامال کر دیا

زراعت کے متعلق بھی انگریزوں کی پالیسی نہایت اندوھناک اور دلخراش ہے۔ انگریزوں سے پہلے کاشتکاروں سے مال گذاری چوتھ کی صورت میں وصول کی جاتی تھی کھیت میں غلہ تیار ہونے پر حکومت کے افسر کن کرتے تھے اور پیداوار کے تخمینہ پر چوتھائی حکومت کے لئے درج رجسٹر کیا جاتا تھا غلہ حاصل ہونے پر حسب رجسٹر کاشتکار چوتھائی غلہ یا اس کی قیمت حکومت کو دیتا تھا اس طرح اگر پیداوار اچھی ہوتی تھی تو حکومت اور کاشتکار اور زمیندار سب کو نفع ہوتا تھا اور اگر نہیں ہوتی تھی یا کم ہوتی تھی تو سب کو نقصان رہتا تھا۔ اور حکومت کاشتکار کے نفع اور نقصان میں یکساں طریقہ پر شریک رہتی تھی مگر انگریزوں نے قبضہ پاتے ہی پختہ لگان کر دیا۔ اور زمینوں پر نقد معین کر دیا خواہ زمین میں پیداوار ہو یا نہ ہو۔ غلہ خواہ عمدہ قسم کا ہو یا خراب قسم کا ہر حالت میں حکومت اپنی مقرر کردہ مقدار وصول کرنے لگی خواہ کاشتکار کے یہاں کچھ بھی پیدا نہ ہوا ہو۔ عدم وصولیابی پر کاشتکار کی قرقی کر لی جاتی تھی اُس کے گھر کا سامان، عورتوں کے زیورات اُس کی زراعت کے وسائل بیل، ہل وغیرہ نیلام کر دیئے جاتے تھے جس کی بناء پر عام زراعت پیشہ انتہائی فلاکت میں مبتلا ہو گئے۔ لگان پر زیادتی برابر جاری رہی۔ مسٹر جی کرہارڈی سوس لیبر پارٹی اپنی کتاب انڈیا میں جو کہ ۱۹۰۹ء میں انگلستان میں شائع ہوئی لکھتا ہے۔

> "عام طور پر دعویٰ کیا جاتا ہے کہ برطانوی حکومت کے ماتحت ہندوستان کے کسانوں کو اُس سے بہت کم لگان ادا کرنا پڑتا ہے جو سلطنت مغلیہ اور دوسرے بادشاہوں کے زمانہ میں ادا کرنا پڑتا تھا اس دعویٰ کی تردید و تغلیط کئی طرح کی جا سکتی ہے لیکن اس مقام پر صرف چند اعداد و شمار پیش کئے جاتے ہیں۔ تاکہ پوری طرح بطلان ہو جائے ۱۸۱۷ء میں بمبئی برطانیہ کے زیر حکومت آیا اُس وقت حالت یہ تھی کہ اُس کے حکمرانوں کی طرف سے صوبہ کے تمام کاشتکاروں سے لگان میں صرف

اسّی لاکھ روپیہ کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اسی زمانہ میں لگان وصول کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ کسان سے اُس کی پیداوار کا خواہ پیداوار اچھی ہو یا بُری ۱/۴ یعنی چہارم لیا جاتا تھا۔ اس طرح اگر فصل اچھی ہوتی تھی تو حکومت کو کاشت کاروں کے ساتھ فائدہ ہوتا تھا اور خشک سالی کے زمانہ میں جتنا کاشتکاروں کو نقصان ہوتا تھا اسی تناسب سے حکومت کو بھی نقصان اُٹھانا پڑتا تھا لیکن اب صورت برعکس ہے۔ اور کاشتکار سے سالانہ ایک مقررہ رقم وصول کرلی جاتی ہے اور اس کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا کہ فصل خراب ہوئی ہے یا اچھی اور خرابی پیداوار کے باعث کاشتکار اس قابل بھی ہے کہ وہ لگان ادا کر سکے یا نہیں۔ ۱۸۱۷ء کے بعد سے جبری لگان کا طریقہ اختیار کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۲۳ء میں لگان کی تعداد بڑھ کر ایک کروڑ پچاس لاکھ ہوگئی۔ حتیٰ کہ ۱۸۷۵ء میں لگان کی مجموعی رقم چار کروڑ اسی لاکھ ہوگئی......

ہندوستان میں ٹیکسوں کا ۸۰ فیصدی زمینوں کے لگان سے وصول کیا جاتا ہے۔ گورنمنٹ متواتر زمیندار طبقے کو نظر انداز کر رہی ہے۔ جو گورنمنٹ اور کاشتکار کے درمیان ایک واسطہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ کاشتکار سے اس کی پیداوار کا ۵۰ فیصدی سے لے کر ۶۵ فیصدی تک حکومت وصول کرلیتی ہے۔ اس کے علاوہ اسے دوسرے ٹیکس بھی ادا کرنے پڑتے ہیں اس طرح تمام ٹیکسوں میں اُسے اپنی پیداوار کا تقریباً ۷۵ فیصدی دینا پڑتا ہے۔ ہندوستان میں کاشتکاروں پر اس قدر بار پڑا ہوا ہے جس کا اندازہ دوسرے لوگ مشکل سے کرسکتے ہیں........ اگر گھر کی آمدنی پر ۵ فیصدی ٹیکس لگا دیا جاتا ہے تو ٹیکس دہندہ چیخ اُٹھتا ہے اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کی حالت کس قدر ردّی اور ناگفتہ بہ ہوگی جہاں پیداوار پر ۵ فیصدی نہیں بلکہ ۷۵ فیصدی ٹیکس لیا جاتا ہے۔ حکومت آئے دن شرح لگان پر نظر ثانی کرتی رہتی ہے تاکہ اُن کسانوں سے جو پہلے ہی بھاری بھاری ٹیکسوں کے بوجھ

کے نیچے دبے ہوئے ہیں اگر ممکن ہو سکے تو اُن کے جیب کی آخری پائی بھی حاصل کر لی جائے ۔ تیس فیصدی لگان تو عموماً بڑھا دیا جاتا ہے ۔ حالانکہ ہمارے پیش نظر ایسی مثالیں موجود ہیں جہاں ۵۰ فیصدی، ۷۰ فیصدی اور ۱۰۰ فیصدی لگان میں اضافہ کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی ہمیشہ افلاس و نکبت کی ہولناک مصیبتوں میں مبتلا رہتے ہیں ۔"

(مدینہ بجنور جلد ۱۹ ۸۵ ۲۸ دسمبر ۱۹۳۰ء)

صوبہ بنگال کا لگان نواب بنگال کے آخری عہد یعنی ۱۷۶۴ء میں ایکاسی لاکھ پچھتر ہزار پانچسو (۸۱۷۵۵۲۰) بیس روپیہ تھا مگر اضافہ کرتے کرتے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۷۹۴ء میں دو کروڑ اڑسٹھ لاکھ (۲۶۸۰۰۰۰۰) وصول کیا۔

(رسالہ مظلوم کسان صفحہ ۲۹ از آر۔ سی ۔ دت)

اسی طرح ہر صوبہ میں اضافہ ہوتا رہا چنانچہ حسب ذیل تفصیل قابل ملاحظہ ہے یہ تفصیل پورے ہندوستان کی ہے ۔

۱۸۵۶ء	سترہ کروڑ تیس لاکھ روپیہ
۱۸۷۰ء	اونیس کروڑ چھیانوے لاکھ روپیہ
۱۸۸۰ء	اکیس کروڑ اکیانوے لاکھ روپیہ
۱۸۹۰ء	چوبیس کروڑ پانچ لاکھ روپیہ
۱۹۰۰ء	چھبیس کروڑ پچیس لاکھ روپیہ
۱۹۱۴ء	اکتیس کروڑ پچیس لاکھ روپیہ

یہ اضافہ میعادی بندوبست کے حلقوں میں ہوتا رہا دوامی بندوبست کے حلقے حسب معاہدہ لارڈ کارنوالس اضافہ سے محفوظ رہے ۔

(معاشیات ہند صفحہ ۲۵۹)

انگریزوں نے دیوانی کے اختیارات شہنشاہ دہلی سے حاصل کرتے ہی نہایت ظالمانہ حیثیت سے

گرانبار اضافہ لگان ہیں جاری کر دیا تھا اور باوجودیکہ مختلف وجوہ سے لوگ قحط اور افلاس میں مبتلا ہو کر مر رہے تھے مگر سنگ دل انگریزوں کو رحم نہیں آتا تھا اور دولت و مال کی ہوس میں لگان کا اضافہ غریب کسانوں پر لگاتار جاری کر رہے تھے۔ مسٹر آر سی دت لکھتا ہے :-

"ہندوؤں اور مغلوں کی حکومت میں جس حساب سے لگان لیا جاتا تھا اُس سے بہت زیادہ باوجود افلاس بڑھ جانیکے اب وصول کیا جاتا ہے ۱۷۹۳ء سے ۱۸۲۲ء تک سرکار نے بنگال کے زمینداروں سے نوّے ۹۰ فیصدی اور شمالی ہند میں اسّی فیصدی لگان وصول کیا۔ بنگال کے آخری نواب نے اپنی حکومت کے آخری سال ۱۷۶۴ء میں (۸۱۷۵۵۲۰) لاکھ روپیہ وصول کئے تھے لیکن بنگال، بہار اڑیسہ کی سلطنت حاصل کرتے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۷۹۴ء میں لگان کی رقم (۲،۶۸،۰۰،۰۰۰) کروڑ روپیہ کر دی ۱۸۰۲ء میں ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کے بعض اضلاع انگریزی عملداری میں شامل ہوئے جن کا مالیہ نوابوں کے عہد میں (۱،۳۵،۱۳،۴۷۰) کروڑ روپیہ مقرر تھا مگر اسمیں سے کس قدر معاف کر دیا جاتا تھا اور کس قدر رقم وصول کی جاتی تھی اس کا ٹھیک پتہ نہیں مل سکتا۔ اب انگریزی عملداری ہونے پر تین ہی سال میں ان اضلاع کی (۱،۶۸،۲۳،۰۹۰) کروڑ روپیہ سالانہ آمدنی بنائی گئی۔ پہلے پہل جب مہاراشٹر کا تاج انگریزوں کے ہاتھ آیا اُس وقت وہاں کا مالیہ اسی لاکھ مقرر تھا مگر تھوڑے ہی سالوں میں انگریز اس علاقہ سے ایک کروڑ پچاس لاکھ روپیہ وصول کرنے لگے۔ اُس وقت سے لیکر برابر زمین کا مالیہ بڑھ رہا ہے۔ (رسالہ مظلوم کسان ص۲۹)

ڈائرکٹران ایسٹ انڈیا کمپنی ۱۲ فروری ۱۷۷۱ء میں ایک خط میں لکھتے ہیں :-
باوجودیکہ سابقہ قحط بہت ہولناک تھا اور اُس سے بے شمار موتیں ہوئیں مگر پھر بھی اس سال کیواسطے نئے بندوبست میں بنگال اور بہار کا لگان بڑھا دیا گیا۔

پھر ۱۲ جنوری ۱۷۷۲ء میں اُنھوں نے لکھا :-

ریونیو (مال) کے ہر ایک محکمہ میں وصولی اس طرح کامیابی کے ساتھ کی جارہی ہے جیسی کہ ہماری خواہش تھی۔

وارن ہسٹنگس لکھتا ہے :-

اس صوبہ میں ایک تہائی آبادی کے بھوکھ سے مرجانے اور کھیتی میں بہت کمی واقع ہوجانے کے باوجود بھی ۱۷۷۱ء میں لگان کی رقم ۱۷۶۸ء کے لگان کی رقم سے بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔

(رسالہ مظلوم کسان از آر سی دت ص۲۸-۲۹)

مسٹر ولیم وڈربرن نے ۱۸۹۷ء میں ہاؤس آف کامنس (دارالعوام) میں تقریر کرتے ہوئے مندرجہ ذیل الفاظ کہے۔

"ہندوستانی رعایا کی تباہ حالی اور مفلسی کے تین خاص وجوہ ہیں۔ اول مالگذاری کی زیادتی۔ اگرچہ گورنمنٹ برطانیہ کے احکام یہ تھے کہ مالگذاری ایسی نہ ہونی چاہئیے کہ اس میں زمین کا کل منافع آجائے بلکہ اس طرح مقرر کی جانی چاہئیے کہ کاشتکار کو اس کی محنت کا معاوضہ اور جو سرمایہ اس نے کاشت میں لگا رکھا ہے اس کا سود اور منافع خالص کا نصف حصہ اس کے پاس بچ سکے۔ لیکن یہ بات خود ہندوستان کے حکام تسلیم کر چکے ہیں کہ ان ہدایات پر ہندوستان میں کبھی عملدرآمد نہیں ہوا یہاں مالگذاری اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ وہ سرمایہ کے سود اور کاشتکار کی مزدوری کے حصہ کو ہضم کرلیتی ہے اور باوجود یہ امر تسلیم کرنے کے مال گذاری اس طرح بڑھائی جاتی ہے کہ بعض مواضعات میں تو سو فیصدی اور بعض خصوصی آراضیات پر ہزار فیصدی تک پہنچ جاتی ہے۔ دوسرا خاص سبب رعایا کی تباہی کا یہ ہے کہ وصول لگان و مال گذاری کا طریقہ نہایت سخت ہے جس کی رُو سے ایک مقررہ سالانہ رقم

وقت معینہ پر وصول کی جاتی ہے اور خراب فصلوں میں جو نقصان ہوتا ہے اُس کا بوجھ کاشتکار پر ڈالا جاتا ہے یہ بوجھ ایسا ہے کہ کاشتکار اس کو برداشت نہیں کر سکتا اور اس کو سودی قرضہ لینا پڑتا ہے۔ اور تیسرا سبب یہ ہے کہ یوروپ کے نمونہ پر قرضہ وصول کرنے کے لئے عدالتیں قائم کردی گئی ہیں جن کی وجہ سے قرض خواہ کی پشت پناہی پر تمام سلطنت کی قوت ہوتی ہے اور اُس کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ رعایا کو غلامی کے ادنیٰ درجہ تک پہنچا دے۔

(تقاریر و تحریرات سر ولیم وڈربرن مطبوعہ نٹیسن پریس صنہ ۱۲

از رسالہ مسلمانوں کے افلاس کا علاج صفحہ ۱۵)

یہ چند شہادتیں بطور اختصار ہم نے پیش کی ہیں جن سے صاف اور واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ سنگدل اور خود غرض برطانویوں نے کس طرح ہندوستان کے غریب طبقہ کاشتکاروں کو بے رحمی سے برباد کیا ہے اور کاشتکاری کو بھی فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ لگان کے ثقیل بوجھ اور وصولی کے انتہائی جابرانہ طریقہ کی وجہ سے کسان ہر سال زمین جوتنے پر مجبور تھا زمین کو لگاتار بوتا تھا اور اپنی گلوخلاصی کی فکر کرتا تھا جس کی وجہ سے ہندوستان کی زمین انتہائی درجہ میں کمزور ہوگئی اور پیداوار میں نہایت زیادہ کمی ہوگئی۔ پیداوار کا اوسط فی ایکڑ زمین باعتبار دیگر ممالک حسب ذیل ہے۔

چاول کی پیداوار فی ایکڑ زمین

		رقبہ کاشت
ہسپانیہ	۶۲٫۹	۶۹۶۴ ہزار ایکڑ
اطالیہ	۴۳٫۰	۱،۳۷،۵۰۰ لاکھ ایکڑ
ہندوستان	۱۴٫۹	۳،۲۶،۰۷،۰۹۱ کروڑ

گیہوں کی پیداوار فی ایکڑ زمین

بلجیم	فی ایکڑ	۲۶ من
برطانیہ	"	۲۲ "
ہندوستان	"	۸ "

ناظرین خیال فرمائیں۔ وہ ہندوستان جو کہ بقول تھارنٹن، مرید نہ ٹاڈ نشنڈ لارڈ کلایو وغیرہ اپنی پیداوار اور زراعت میں تمام دنیا میں نہایت مشہور تھا جس کی شہادت آئین اکبری کے صفحات بھی دیتے ہیں انگریزی عہد میں تمام دنیا سے کس قدر گر گیا۔

مذکورہ بالا اعداد و شمار سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان کی دولت اور تمام ذرائع دولت، دستکاری، تجارت، زراعت سبھوں پر ایسا چھاپہ مارا کہ جس کی نظیر نہ سابقہ زمانوں میں کہیں ملتی ہے اور نہ موجودہ زمانہ میں کسی دوسری قوم اور ملک میں کہیں دکھائی دیتی ہے بلکہ تعجب ہے کہ ان امور کے ہوتے ہوئے ہندوستان زندہ کیسے رہا۔ پچھلے زمانہ میں ظالم حکومتیں چھاپہ مارتیں اور لوٹتی تھیں مگر سرمایہ داروں پر ہی ان کا دست ظلم دراز ہوتا تھا بخلاف انگریزوں کے کہ انھوں نے نہ کسی امیر کو چھوڑا نہ کسی غریب کو بلکہ ان کی ملعونہ پالیسیوں سے غریب طبقہ نہایت زیادہ برباد ہوا۔ گذشتہ شہادتیں ہندوستانیوں کے افلاس اور بھوک سے مرنے کی ان امور کے ملاحظہ سے آفتاب کی طرح روشن ہو جاتی ہیں اور یقین کیا جا سکتا ہے کہ وہ مبالغہ سے بالکل خالی ہیں اور بالکل واقعی ہیں۔ انگریزوں کا اُن پر پردہ ڈالنا بالکل غلط ہے۔ والی اللہ المشتکی۔

ہندوستان کے باشندوں میں تنفر

اور دشمنی پھیلانا۔

تمام سمجھدار بلکہ بے سمجھ لوگوں کا بھی تسلیم کیا ہوا اصول ہے کہ اتفاق و اتحاد، رواداری اور میل ملاپ ہی انسانی فلاح و بہبود اور دنیوی اور دینی ترقی اور راحت و آرام کا ذریعہ ہے۔ انسان تو صاحب عقل و شرافت ہے ہی وہ اگر اس کا احساس کرے تو ایسے تعجب کی بات نہیں مگر یہ چیز تو جنگلی حیوانوں اور درندوں تک میں بھی پائی جاتی ہے۔ اور وہ سب اتفاق و اتحاد سے بسر کرتے ہیں اور اس کے پابند رہتے ہیں۔ اسی طرح سب مانتے ہیں کہ جھگڑا لڑائی تنفر اور عداوت، بدامنی اور فساد

ہر طرح سے بربادی کے قوی اسباب میں سے ہے۔ جس کی اجازت کسی طرح نہیں دی جا سکتی مگر برا ہو خود غرضی اور نفسانی خباثتوں کا کہ وہ انسانوں اور اقوام کو ایسی ایسی ملعون پالیسیوں پر مجبور کرتی ہے جن کی وجہ سے قوموں کی قومیں بربادی کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ یوروپین اقوام اور بالخصوص برطانوی قوم نے یہی پالیسی جاری کرنا تمام ایشیائی اور افریقی اقوام کے ساتھ اپنے اقتدار اور لوٹ کھسوٹ کے لئے ضروری سمجھا ہے۔ ہندوستان کو زیر و برباد کرنا اور اپنے پنجۂ آہنی کے اندر دبا کر اُس کو چوستے رہنا۔ انگلینڈ اس کو ایسے ہی ملعون ذرائع سے حاصل کرنا ضروری سمجھتا رہا ہے اور ابتدا سے اسکی یہی حکمت عملی رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے مہلک امور کے جاری ہونے سے ملکوں کی انتہائی بربادی ہو جائے گی۔ مگر درندے کو اس کی کیا پرواہ ہے اس کو تو خون چوسنے سے مطلب ہے شکار مرے یا جئے۔ دو سو سال کی برطانوی مذکورہ بالا شرمناک پالیسی نے ہندوستان کو سخت فلاکت اور بربادی کے گڑھے میں ڈالدیا ہے۔ اور ایسے گندہ اخلاق اور اعمال میں مبتلا کر دیا ہے کہ آئندہ زمانوں میں شاید صدیوں کے بعد اس کو سنبھلنے کی نوبت آسکے ہم مختصر طور سے اس شر انگیز پالیسی کا فوٹو کھینچتے ہیں جس سے برطانوی جذبات انسانیہ اور اصلاح خلایق کے دعووں کا پول کھلجائے اور حقیقت حال بے نقاب ہو جائے۔ کوتاہ فہم ناظرین کو اپنی غلطیوں پر تنبہ حاصل ہو۔

انگریزوں نے ہندوستان کے باشندوں میں نفرت پھیلائی اور ان کے امن و اتحاد کے خرمن میں آگ لگائی تاکہ اپنی حکومت مضبوط رہے

(۱) (سر جان میلکم)

"اس قدر وسیع ملک میں ہماری غیر معمولی قسم کی حکومت کی حفاظت اس امر پر منحصر ہے کہ ہماری عملداری میں جو بڑی جماعتیں ہیں ان کی عام تقسیم ہو اور پھر ہر ایک جماعت کے ٹکڑے مختلف ذاتوں اور فرقوں اور قوموں میں ہوں جب تک یہ لوگ اس طریقہ سے جدا رہیں گے اس وقت تک غالباً کوئی بغاوت اٹھ کر

ہماری قوم کے استحکام کو متزلزل نہ کرے گی "۔

اسی مقصد کے لئے ایسی تاریخیں لکھی گئیں جن میں ہندوؤں پر مسلمان بادشاہوں کے فرضی اور غیر واقعی مظالم بھیانک صورتوں میں دکھلائے گئے۔ جن میں سے مشہور تاریخ سر ہنری ایلیٹ کی ہے۔ جنھیں یہ بات سخت ناگوار تھی کہ لکھے پڑھے ہندو مسلمانوں کی گذشتہ عہد حکومت کی تعریف کیوں کیا کرتے ہیں۔ اور عہد جدید کی عیب جوئی کرتے ہیں۔ چونکہ اُس زمانہ میں جس قدر کتابیں اور تاریخیں خود ہندو مصنفین کی لکھی ہوئی تھیں اُن سب سے مسلمانوں کی عظمت و وقعت کا اظہار ہوتا تھا اور اس کو بعض انگریز برداشت نہ کرسکتے تھے اس لئے سب سے اول سر ہنری ایلیٹ نے جو کہ ہندوستان میں بڑے بڑے عہدوں پر رہے تھے اور آخر میں گورنمنٹ ہند کے صیغۂ خارجہ کے سکریٹری ہوگئے تھے ہندوستان کی ایک تاریخ لکھ کر اُس کی پہلی جلد ۱۸۴۹ء میں شائع کی۔ یہی وہ سب سے پہلی تاریخ ہے جس نے زمانۂ قدیم اور بالخصوص مسلمانوں کے عہد کے خلاف خوب زہر اُگلا ہے۔ تاریخی میدان میں یہی وہ پہلی کتاب آئی جس کے ترجمے دیسی زبان میں کراکے اُن کے ذریعہ اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے غبار اور دشمنی کا بیج بویا گیا۔ اگر کسی شخص کو اس تاریخ کے لکھے جانے کا مقصد معلوم کرنا ہو تو اس کے لئے صرف اس کا دیباچہ پڑھ لینا بالکل کافی ہوگا جسمیں مورخ نے اپنے منشار کو واضح اور صاف لفظوں میں لکھدیا ہے مثلاً صاحب موصوف تحریر فرماتے ہیں۔

" بڑا افسوس ہندو مصنفین پر آتا ہے جن سے ہمیں توقع ہوسکتی تھی کہ اس قوم کے محسوسات توقعات اور معتقدات ہمیں معلوم ہوتے مگر وہ تو احکام اور ہدایات کے مطابق لکھتے ہیں۔ ماہ محرم کو محرم شریف اور قرآن کو کلام پاک کہتے ہیں اپنی تحریرات کو بسم اللہ سے شروع کرتے ہیں "۔

ایلیٹ صاحب کو ہندو مصنفین کی اس بات پر سخت غصہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے مراسم اور مذہب کی اس قدر عظمت کیوں کرتے ہیں ایک معمر ہندو مصنف نے کہیں کہدیا تھا کہ وہ اپنی ارتھی کے قریب اور اپنی قبر کے کنارے کھڑا ہے تو ایلیٹ صاحب ناراض ہوکر فرماتے ہیں کہ اُسے علم ہوگا کہ میری لاش

جلا کر اُس کی راکھ گنگا میں بہا دی جائے گی۔ پھر اس نے قبر کے کنارے کھڑا ہونا کیوں لکھا۔ حالانکہ مصنف مذکور نے جو کچھ لکھا تھا وہ محض اس لئے لکھا تھا کہ ایک بات کو مختلف پیرایوں میں لٹریچر کی ایک خوبی سمجھا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ ایلیٹ صاحب کو اس بات پر غصہ تھا کہ :۔

"اب جبکہ ہندو اپنے ظالم (یعنی مسلمان) آقاؤں کے چنگل سے نکل کر آزاد ہو گئے اور بغیر روک ٹوک کے اپنے دل کی باتیں ظاہر کر سکتے ہیں تب بھی ان غلامانہ ذہنیت کے لوگوں میں سے ایک بھی اپنے ملک کے محسوسات کے مطابق نہیں لکھتا۔ یا طویل زمانہ کی مظلومیت کے خیالات اور جذبات کا اظہار نہیں کرتا۔"

مگر حقیقت یہ ہے کہ ہندوؤں کو اگر مسلمانوں کے زمانہ میں تکلیف پہنچی ہوتی تو وہ آزادی کے زمانہ میں ضرور اس کا اظہار کرتے۔ البتہ ایلیٹ صاحب کو اس سے سخت تکلیف پہنچی تھی کہ ہندو مسلمانوں کے عہد حکومت کی کیوں تعریفیں کرتے تھے اور انگریزوں کے عہد کی کیوں عیب جوئی کرتے تھے۔ اسی لئے انھوں نے کوشش کی کہ تاریخوں کے پرانے انباروں میں سے ایسے واقعات نکالیں جن سے یہ نتیجہ نکالا جا سکے کہ مسلمانوں کا عہد ظالمانہ اور انگریزوں کا عہد خدا کی رحمت تھا چنانچہ اس مقصد کو اُنھوں نے حسب ذیل الفاظ میں واضح کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :۔

"اگرچہ پرانی تاریخوں کی قدر و قیمت کم ہے تاہم بغور مطالعہ کرنے سے ان میں بہت سا مواد مل سکتا ہے اُن کے ذریعہ سے جہالت کا دھندلا پن دور کیا جا سکتا ہے۔ جس نے ہندوستان کی معلومات کو تاریک کر رکھا ہے اور یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے عہد کی تاریخ ابھی لکھنے کو باقی ہے۔ اُن سے رعایا کو اُن بے شمار فوائد کا احساس کرایا جائے گا جو ہماری نرم اور منصفانہ حکومت سے حاصل ہوئے ہیں۔"

ایلیٹ صاحب کو ہندوؤں کے وہ تعریفی کلمات جو کہ اسلامی عہد کے متعلق کہتے یا لکھتے تھے نہایت ناگوار ہوتے تھے حالانکہ وہ واقفیت پر مبنی تھے اور اسی طرح جو کلمات وہ انگریزی حکومت کے متعلق تنقید اور احتجاج کے کہتے تھے وہ بھی حقیقت رکھنے والے تھے۔ چنانچہ........

(الف) لارڈ ولیم بنٹنگ ۱۸۸۲ء میں کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہتے ہیں۔ (اس مد کی بابت کوئی سند سر ولیم بنٹنگ کے قول سے زیادہ وقعت دار نہیں مل سکتی جو کہ ابتدا میں مدارس کے گورنر اور اس کے بعد ہندوستان کے مشہور وائسرائے رہے ہیں) "بہت سی باتوں میں اسلامی حکومتیں انگریزی راج سے کہیں بہتر تھیں۔ مسلمان اس ملک میں آباد ہوگئے جسے انھوں نے فتح کیا تھا وہ ہندوستانی باشندوں سے گھل مل گئے۔ اُن میں شادی بیاہ کرنے لگے۔ مسلمانوں نے ہندوستانی قوموں کو ہر قسم کے حقوق دیئے فاتح اور مفتوح کے مذاق دلچسپی اور ہمدردی میں یکسانیت تھی۔ کوئی فرق نہ تھا۔ برخلاف اس کے انگریزی پالیسی اس کے برعکس ہے۔ اب سرد مہری خود غرضی بے پروائی ہے۔ جس میں ایک طرف حکومت کا آہنی پنجہ حکمران ہے اور دوسری طرف ہر چیز پر اپنا قبضہ ہے اور ہندوستانیوں کو کوئی دخل نہیں ہے۔

(الانصار دیوبند ۲۲ ص ۳ ۱۶ جون ۱۹۲۶ء از فارورڈ کلکتہ
(ہندوستان میں عیسائیوں کی حکومت از میجر باسو جلد ۴ ص ۴۴۶
روشن مستقبل ص ۲۵ و ۲۶)

(ب) سر پی سی رائے (بنگال کے مشہور عالم) ۱۹۳۶ء میں بنگال کے مسلم فیڈریشن کے جلسہ میں بحیثیت صدر جلسہ تقریر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"اورنگ زیب کے عہد میں بنگال کے ہندوؤں کو منصبداری اور بڑی بڑی جاگیریں عطا کی گئیں اور بڑے بڑے زمیندار بنا دیئے گئے۔ اورنگ زیب نے ہندوؤں کو گورنر بنایا۔ وائسرائے بنایا۔ یہاں تک کہ اس نے خالص صوبہ افغانستان پر بھی جو نائب دار السلطنت مقرر کیا تھا وہ ہندو راجپوت ہی تھا

(ماخوذ از تقریر پی سی رائے۔ روشن مستقبل ص ۲۴)

(ج) پنڈت سندر لال صاحب الہ آبادی (بھارت میں انگریزی راج) میں فرماتے ہیں۔

"اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور ان کے بعد اورنگ زیب کے تمام جانشینوں کے زمانہ میں ہندو اور مسلم یکساں حیثیت رکھتے تھے۔ دونوں مذاہب کی مساویانہ توقیر کیجاتی تھی اور مذہب کے لئے کسی کے ساتھ کسی قسم کی جانب داری نہ کی جاتی تھی۔ ہر بادشاہ کی طرف سے بیشمار ہندو مندروں کو جاگیریں اور معافیاں دی گئی تھیں۔ آج تک ہند میں متعدد ہندو مندروں کے پجاریوں کے پاس اورنگ زیب کے دستخطی فرمان موجود ہیں جن میں خیرات اور جاگیروں کے عطا کئے جانے کے تذکرے ہیں۔ اس قسم کے دو فرمان اب تک الہ آباد میں موجود ہیں جن میں سے ایک اریل میں سومیشور ناتھ کے مشہور مندر کے پجاریوں کے پاس ہے۔"

"اسی طرح شہنشاہ اورنگ زیب نے گردھر پسر جگ جیون ساکن موضع بسی ضلع بنارس اور جدو مصر ساکن ہیش پور پرگنہ حویلی کو اور پنڈت بلبھدر مصر کو جاگیریں عطا کیں"۔

(روشن مستقبل صا۲)

شہنشاہ جہانگیر مرحوم لکھتا ہے:۔ "اور راجہ بکرماجیت کو کہ ہندوستان کے معتبر راجوں سے ہے اور رصد نجوم کی ہند میں اس نے بنائی ہے خطاب دیگر میر آتش اپنا بنایا۔ یعنی افسری توپخانہ کی عنایت کی۔ اور حکم کیا کہ ہمیشہ توپخانے میں پچاس ہزار توپچی اور تین ہزار توپ عمدہ آراستہ تیار رہیں یہ بکرماجیت کھتری ہے میرے باپ کی خدمت میں فیلخانہ کے داروغہ مشرقی سے خدمت دیوانی اور مرتبہ امرائی کو پہنچا تھا فن سپہگری اور تدبیر جنگ کو خوب جانتا ہے۔

(ترجمہ تزک جہانگیری)

عالمگیر (۵)

اورنگ زیب مرحوم کے عہد حکومت میں ہندو امراء کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

ہفت ہزاری	شش ہزاری	پنج ہزاری	چار ہزاری	ساڑھے تین ہزاری	تین ہزاری
۲ نفر	۲ نفر	۵ نفر	۵ نفر	۴ نفر	۱۳ نفر

ڈھائی ہزاری	دو ہزاری	ڈیڑھ ہزاری	ایک ہزاری
۵ نفر	۱۶ نفر	۲۷ نفر	۱۵ نفر

مسٹر ظہیر الدین فاروقی بیرسٹر ایٹ لا تاریخ کیول رام مصنف تذکرۃ الامراء سے مندرجہ بالا فہرست نقل کر کے فرماتے ہیں :-

"ان مختلف فہرستوں اور پھر دوسرے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ اورنگ زیب مرحوم ہندوؤں کو اُن کی لیاقت اور قابلیت کے لحاظ سے ہمیشہ بڑھاتا رہا۔ ہندوؤں کو اپنی سرکار میں ملازم رکھنے کے سلسلہ میں اس کا خیال تھا کہ مذہب کو دنیاوی امور کے بیچ میں لانا بے معنی ہے اور اس قسم کے معاملات میں مذہبی عصبیت کو راہ نہ دینا چاہیئے۔

(کتاب اورنگ زیب اور اس کا عہد مؤلفہ ظہیر الدین فاروقی بی اے علیگ بیرسٹر ایٹ لا بھڑایچ) صـ ۲۰۲

(د) دوسری فہرست اورنگ زیب مرحوم کے زمانہ کے ہندو امراء کی حسب ذیل ہے

ہفت ہزاری	شش ہزاری	پنج ہزاری	چہار ہزاری
۳ نفر	۳ نفر	۹ نفر	۵ نفر
تین ہزاری	ڈھائی ہزاری	دو ہزاری	ڈیڑھ ہزاری
۱۳ نفر	۹ نفر	۵ نفر	۴۰ نفر
ایک ہزاری	۷ صدی	پانصدی	ایک صدی یعنی یوزباشی
۶ نفر	۱ نفر	۱ نفر	۱ نفر

ان منصبداروں کے علاوہ اکتالیس اور مختلف عہدوں پر ہندو امراء تھے۔ ہفت ہزاری منصب سب سے اونچا ہوتا تھا۔ جس کے لئے حسب ذیل اشیاء مقرر تھیں۔

گھوڑے	ہاتھی	شتر	خچر	چھکڑا	تنخواہ ماہوار
۴۹۰	۱۴۱	۱۱۰	۲۷	۲۲۰	۴۵ ہزار روپیہ

نمبر اول پنج ہزاری منصب والوں۔ کے لئے حسب ذیل اشیاء تھیں۔

گھوڑے	ہاتھی	شتر	خچر	چھکڑا	تنخواہ ماہوار
۳۴۰	۱۱۵	۱۰۰	۲۰	۱۶۰	تیس ہزار روپیہ

نمبر دوم پنج ہزاری کی تنخواہ اُنتیس ہزار روپیہ تھی اور نمبر سوم کی تنخواہ اٹھائیس ہزار ماہوار تھی۔

اسی طرح ہر امیر کی حسب درجہ بڑی تنخواہیں اور وظایف تھے، جو کہ آج وہم وخیال میں بھی نہیں آسکتے۔ ہفت ہزاری ہندو امرا میں سے ساہو پسر مہاراجہ سیتا بھی تھا اور پنج ہزاری امرا میں سے سیوا جی کا داماد راجندجی اور مالوی بھونسلہ بھی تھا۔ اورنگ زیب کے سپہ سالاروں میں راجہ جے سنگھ (جس کے نام پر شہر جے پور ہے) پنج ہزاری منصبداروں میں سے تھا۔ راجہ جسونت سنگھ کابل کا گورنر تھا۔

(ماخوذ از علماء ہند کا شاندار ماضی جلد اول)

چونکہ اورنگ زیب مرحوم کا زمانہ سلطنت دراز اور طویل ہوا ہے، اس لئے امراء کی فہرستوں میں کمی، زیادتی اور اختلاف ہونا لازمی امر ہے۔ ہر مورخ نے اپنے زمانہ کے اعداد وشمار کا ذکر کیا ہے۔

وصیت بابر۔ شہنشاہ محمد بابر ظہیر الدین مرحوم اپنے بیٹے محمد ہمایوں نصیر الدین کو خفیہ وصیت میں مندرجہ (سن) ذیل الفاظ لکھتا ہے:۔

"اے پسر سلطنتِ ہندوستان مختلف مذاہب سے پُر ہے۔ الحمد للہ کہ اس نے اس کی پادشاہت تمہیں عطا فرمائی۔ تمہیں لازم ہے کہ تمام تعصباتِ مذہبیہ کو لوحِ دل سے دھو ڈالو۔ اور عدل وانصاف کرنے میں ہر مذہب، وملت کے طریق کا لحاظ رکھو۔ جس کے بغیر تم ہندوستان کے لوگوں کے دلوں پر قبضہ نہیں کر سکتے۔ اس ملک کی رعایا مراحم خسروانہ اور الطاف شاہانہ ہی سے مرہون ہوتی ہے۔ جو قوم یا ملت حکومت کی مطیع اور فرماں بردار رہے ــ اس کے مندر اور مزار برباد نہ کئے جائیں۔ عدل وانصاف ایسا کرو کہ رعایا بادشاہ سے خوش رہے۔ ظلم وستم کی نسبت احسان اور لطف کی تلوار سے اسلام زیادہ ترقی پاتا ہے۔ شیعہ وسنی کے جھگڑوں سے چشم پوشی کرو ورنہ اسلام کمزور ہو جائے گا۔ جس طرح انسان کے جسم میں چار عناصر مل جل کر اتحاد واتفاق سے کام کرتے ہیں اسی طرح مختلف مذاہب رعایا کو ملا جلا رکھو اور ان میں اتحادِ عمل پیدا کرو تاکہ جسم سلطنت مختلف امراض سے محفوظ ومامون رہے۔ سرگذشت تیمور کو جو اتفاق

اتحاد کا مالک تھا اپنی نظر کے سامنے رکھو تاکہ نظم و نسق کے معاملات میں پورا تجربہ ہو۔"

(روزنامہ خلافت جلد ۵ نمبر ۱۶۰ مورخہ ۱۸ اگست سنہ ۱۹۲۶ء از ڈاکٹر بال کرشن پرنسپل راجہ رام کالج کولہاپور۔ مترجم از فارسی)

(ح) فرمان اورنگ زیب: شہنشاہ اورنگ زیب مرحوم اپنے ایک فرمان مورخہ ۲۵ رجمادی الاول سنہ ۱۰۶۵ھ میں (اب سے تین سو ایک برس پہلے لکھتے ہیں) "ہماری پاک شریعت اور سچے مذہب کی رو سے یہ ناجائز ہے کہ غیر مذہب کے قدیمی مندروں کو گرایا جائے۔ ہماری اطلاع میں یہ بات لائی گئی ہے کہ بعض حاکم بنارس اور اس کے گرد و نواح کے ہندوؤں پر ظلم و ستم کرتے ہیں اور ان کے مذہبی معاملات میں دخل دیتے ہیں اور ان برہمنوں کو جن کا تعلق پرانے مندروں سے ہے ان کو اُن کے حقوق سے محروم کیا جاتا ہے۔ لہذا یہ حکم دیا جاتا ہے کہ آئندہ کوئی شخص ہندوؤں و برہمنوں کو کسی وجہ سے بھی تنگ نہ کرے اور نہ ان پر کسی قسم کا ظلم کرے"۔ یہ فرمان ابوالحسن حاکم بنارس کے پاس سلطان محمد بہادر کی معرفت بھیجا گیا تھا۔

(راجہ نرنجن سین نے ایشیاٹک سوسائٹی کے جلسہ میں پیش کیا تھا۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں اخباروں میں شائع ہوا تھا۔ روزنامہ خلافت ۱۸ اگست سنہ ۱۹۲۶ء)

(ط) الگزنڈر: کپتان الگزنڈر ہملٹن اپنے سفرنامہ ہندوستان میں لکھتا ہے (جلد اول سفرنامہ صفحہ ۱۲۷ و صفحہ ۱۲۸) درباره ٹھٹہ سندھ در عہد اورنگ زیب۔

"ریاست کا مسلمہ مذہب اسلام ہے۔ لیکن تعداد میں اگر دس ہندو ہیں تو ایک مسلمان ہے۔ ہندوؤں کے ساتھ مذہبی رواداری پورے طور سے برتی جاتی ہے۔ وہ اپنے برت رکھتے ہیں اور تہواروں کو اسی طرح مناتے ہیں جیسے کہ اگلے زمانہ میں کرتے تھے جبکہ بادشاہت خود ہندوؤں کی تھی وہ اپنے مردوں کو جلاتے ہیں لیکن ان کی بیویوں کو اجازت نہیں ہے کہ شوہروں کے مردوں کے ساتھ ستی ہوں"۔

(ی) اسی سفرنامہ جلد اول صفحہ ۱۶۳ میں درباره شہر سورت مذکور ہے۔

"اس شہر میں تخمیناً سو مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں لیکن ان میں کبھی کوئی سخت جھگڑے اُن کے اعتقادات وطریقہ عبادت کے متعلق نہیں ہوتے۔ ہر ایک کو پورا اختیار ہے کہ جس طرح چاہے اپنے طریقہ سے اپنے معبود کی پرستش کرے۔ صرف اختلاف مذاہب کی بنیاد پر کسی کو تکلیف دینا اور آزار پہنچانا ان لوگوں میں بالکل مفقود ہے۔ پارسی بھی ہیں اور وہ اپنے رسوم مذہب زردشت کے بموجب ادا کرتے ہیں عیسائیوں کو پوری اجازت ہے کہ اپنے گرجے بنائیں اور اپنے مذہب کی تبلیغ کریں اور بعض مرتبہ وہ کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔"

(از ترجمہ سفرنامہ موسومہ ہندوستان عہد اورنگ زیب
میں از نواب سمیع اللہ بیگ صاحب چیف جج ہائی کورٹ حیدرآباد دکن)

(نوٹ) یہ شخص کپتان الگزنڈر ہملٹن زمانہ شہنشاہ اورنگ زیب مرحوم میں ہندوستان آیا تھا اور ۲۵ برس ہندوستان میں رہا تھا۔ مگر کمپنی کا ملازم نہ تھا۔

اورنگ زیب (ش)

صفحہ ۲۷۵
ٹی ڈبلیو آرنلڈ پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور اپنی تصنیف پریچنگ آف اسلام میں لکھتے ہیں (ترجمہ)

اورنگ زیب کے فرامین اور مراسلات کے ایک قلمی مجموعہ میں جو ابھی تک طبع نہیں ہوا ہے مذہبی آزادی کا وہ جامع اور مانع اصول درج ہے جو ہر ایک بادشاہ کو غیر مذہب کی رعایا کے ساتھ برتنا ضروری ہے جس واقعہ کے متعلق یہ اصول بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ:۔

"عالمگیر کو کسی شخص نے عرضی دی کہ دو پارسی ملازموں کو جو کہ تنخواہ تقسیم کرنے پر مقرر تھے اس علت میں برخاست کر دیا جائے کہ وہ آتش پرست ہیں اور اُن کی جگہ کسی تجربہ کار معتبر مسلمان کو مقرر کیا جائے کیونکہ قرآن شریف میں آیا ہے۔ "یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّکُمْ اَوْلِیَآءَ (الآیۃ)

عالمگیر مرحوم نے عرضی پر مندرجہ ذیل حکم لکھا:۔

"مذہب کو دنیا کے کاروبار میں دخل نہیں ہے، اور نہ ان معاملات میں تعصب کو جگہ مل سکتی ہے اور اس قول کی تائید میں یہ آیت نقل کی ہے لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ۔ بادشاہ نے لکھا کہ جو آیت عرضی نویس نے نقل کی ہے اگر یہی سلطنت کا دستور العمل ہوتا تو ہم کو چاہیے تھا کہ اس ملک کے سب راجاؤں

اور اُن کی رعیت کو غارت کر دیتے مگر یہ کس طرح ہو سکتا تھا۔ بادشاہی نوکریاں لوگوں کو انکی لیاقت اور قابلیت کے موافق ملیں گی اور کسی لحاظ سے نہیں مل سکتیں۔

(دعوتِ اسلام ترجمہ پریچنگ آف اسلام صفحہ ۲۷۸)

(ل) شہنشاہ جہانگیر مرحوم اپنی کتاب تزک جہانگیری صفحہ ۸۲ میں فرمانات شاہی کی تفصیل دیتا ہوا اپنے امراء کو مندرجہ ذیل الفاظ بھی لکھتا ہے۔ "اور بزور کسی کو مسلمان نہ کریں"۔

مندرجہ بالا شہادتیں صاف صاف روشنی ڈالتی ہیں کہ مسلمانوں کا عہدِ حکومت تعصب مذہبی اور فرقہ واریت سے پاک تھا۔ اس میں مساویانہ اور برابری کا سلوک تھا۔ ہر ہندوستانی کو خواہ کسی مذہب اور کسی برادری اور نسل سے تعلق رکھتا ہو۔ حسب قابلیت حصہ ملتا تھا۔ کسی عہدہ انتظامی، فوجی، ملکی کا دروازہ کسی کے لئے بند نہ تھا۔ سب سے لطف و احسان اور رحم و کرم اور ہمدردی کا معاملہ کیا جاتا تھا۔ تمام مذاہب کے ساتھ دریا دلی اور رواداری کا معاملہ ہوتا تھا۔ بادشاہوں کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ مختلف مذاہب رعایا کو ملا جلا رکھا جائے اور اُن میں اتحادِ عمل پیدا کیا جائے۔ سب کی ترقی اور خوشحالی فارغ البالی کا انتظام اور خیال رکھا جاتا تھا۔ ہر مذہب اور ملت کے ساتھ عدل و انصاف مراحم خسروانہ اور الطافِ شاہانہ برتا جاتا تھا۔ ظلم و ستم ستانا اور تنگ کرنا بغیر کسی جرم قانونی کے روا نہ رکھا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمان بادشاہوں نے رعیت کے دلوں میں جگہ کر لی تھی۔ بادشاہ لوہے کی سنگینوں اور تلواروں اور آگ و بارود کی بندوقوں اور توپوں سے حکومت نہیں کرتا تھا۔ تمام امورِ حکومت میں رعایا کو دخل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس زمانہ میں ہندوستان دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرتا گیا اور ضرب المثل امن عام ملک میں پھیلا ہوا تھا۔

(س) ہیجر باسو کہتا ہے۔ رعایا کی خوشحالی اور سرمایہ داری کے اعتبار سے بھی مسلمانوں کا دورِ حکومت سونے کے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ دولتمندی اور آرام و چین کا جو نقشہ شاہجہاں کے وقت میں دیکھنے میں آیا تھا بلا شبہ بے مثل و بے نظیر تھا۔ حالانکہ اُس زمانہ میں رسل و رسائل کے طریقے اس زمانہ جیسے ملک میں نہ تھے۔ ریلیں اور تار، موٹریں

اور ہوائی جہاز، دخانی جہاز، ٹیلیفون وغیرہ معدوم تھے۔ مگر انگریزی حکومت بالکل اس کے برعکس تھی اور ہے جیساکہ ہم اوپر لارڈ ولیم بنٹنک وائسرائے ہند کا قول نقل کر آئے ہیں وہ لکھتا ہے۔ برخلاف اس کے انگریزی پالیسی اس کے برعکس ہے۔ اب سرد مہری، خود غرضی، بے پروائی ہے۔ جس میں ایک طرف حکومت کا آہنی پنجہ حکمراں ہے اور دوسری طرف ہر چیز پر اپنا قبضہ ہے اور ہندوستانیوں کو کوئی دخل نہیں ہے"۔

(ع) سرجان سلیور (مدراس گورنمنٹ کا ممبر) کہتا ہے "وہ لوگ (باشندگان ہند) ٹیکسوں کے لگانے میں جن کی ادائیگی کے لئے وہ مجبور کئے جاتے ہیں کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ قوانین کو جن کی تعمیل اُن پر فرض ہوتی ہے۔ مرتب کرنے میں اُن کی کوئی آواز نہیں ہوتی۔ اپنے ملک کے انتظام میں اُن کا کوئی حقیقی حصہ نہیں ہوتا۔ اور ان حقوق کے دیئے جانے سے اس شرمناک حیلہ سے انکار کیا جاتا ہے کہ ان میں اس قسم کے فرائض کے انجام دینے کے لئے ذہنی اور اخلاقی اوصاف کی کمی ہے"۔

(رپورٹ سلیکٹ کمیٹی صـ ۴۰۲ دت جلد ۲ حکومت خود اختیاری صـ ۳۰)

خلاصہ یہ ہے کہ ہندو مصنفین انہیں وجوہ سے جو کہ واقعی اور صحیح تھیں اور جن کا مشاہدہ اور معاملہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اور اپنے باپ دادوں سے سُن کر یقینی طور پر مانتے تھے مسلمانوں کے عہد حکومت کی تعریفیں کرتے تھے اور انگریزوں کے عہد کی عیب جوئی کرتے تھے۔ ایلیٹ صاحب آنکھوں میں دھول جھونک کر اور واقعات کو چھپا کر اور مسخ کر کے بلکہ فرضی اشیاء درمیان میں لاکر چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے عہد حکومت کو ظالمانہ اور انگریزوں کے عہد حکومت کو نرم اور منصفانہ ثابت کریں۔ حالانکہ انگریزوں نے بڑے بڑے انتظامی اور فوجی عہدوں پر آخر تک کسی ہندوستانی کو فائز نہیں ہونے دیا۔ اور وہ وہ انسانیت سوز اور برباد کن کارروائیاں کرتے رہے ہیں کہ جنکی مثال متمدن دنیا میں نہیں ملتی۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ ایلیٹ صاحب کو پرانے زمانے کے ہندو مسلمان مورخوں پر ہی غصہ نہیں بلکہ جدید تعلیم یافتہ ہندوستانیوں پر بھی غصہ ہے۔ جن کے

لیئے وہ تحقیر کے طور پر بابو کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"اب ہم ان شاندار بابوؤں کی کچھ نہ سنیں گے جنہیں ہماری گورنمنٹ کے عہد میں حد درجہ کی آزادی اور بہت سے سیاسی حقوق حاصل ہیں جو کبھی کسی مفتوح قوم کو نہیں دیئے گئے۔ جو ملکی ہمدردی کا دم بھرتے ہیں اور اپنی موجودہ ذلت کا رونا روتے ہیں۔ اگر وہ تاریخ میں غوطہ لگائیں گے تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ جس زمانہ کے واپس آنے کی وہ تمنا کرتے ہیں اُس میں اگر وہ محض زبان سے ان لغویات کو ظاہر کرتے تو اُنہیں سیسہ پلا دیا جاتا یا دیوار میں چن دیا جاتا۔ اب ہم بلا لگان اراضی کے متعلق شور و غوغا سننے پر مجبور ہونگے۔ درانحالیکہ تاریخ کے ہر صفحے سے ظاہر ہے کہ پہلے زمانہ میں کوئی ملکیت ایسی نہ تھی جو قانوناً ضبط نہ ہو سکتی اور نہ ہوتی ہو۔"

مورخ کی بڑی تعریف یہ سمجھی جاتی ہے کہ وہ نفسانیت، ذاتیات اور خود غرضانہ جذبات سے بالاتر ہو کر لکھے۔ برخلاف اس کے جو کتاب محض دو قوموں میں منافرت پھیلانے کی غرض سے لکھی جائے اور لکھتے وقت صاف الفاظ میں کہا جائے کہ قدیم تاریخوں میں کچھ نہیں ملتا بلکہ واقعات سے اپنے حسب منشا نتائج نکالے جاتے ہیں۔ جو مورخ اپنوں اور غیروں سب پر اس بات سے ناراض ہو کہ فلاں زمانے یا فلاں قوم کی کیوں تعریف کیجاتی ہے، ہندوؤں پر اس لئے ناراض ہو کہ مسلمانوں کی سلطنت جانے پر مسلمان بادشاہوں کی برائی نہیں کرتے اور ہمارے زمانہ کی خوبیوں کی تعریف کرنے کی جگہ اُس کی عیب جوئی کرتے ہیں اور اپنے مقصد کو صریح الفاظ میں لکھ دے کہ اُس کی غرض بابوؤں کی تردید اور انگریزوں کی سلطنت کے فوائد ذہن نشین کرنا ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے شخص کی تصنیف کا شمار تواریخ میں کس طرح کیا جا سکتا ہے مگر ہندوستانیوں کی قسمت اُسی روز پھوٹ گئی جبکہ اس قسم کی کتابوں کی بنا پر دیسی زبانوں میں تاریخیں لکھی گئیں، اسکولوں میں جاری کی گئیں اور رفتہ رفتہ وہی جھوٹ اور افترا پردازیاں موجودہ تاریخ کا جزو بنا دی گئیں چنانچہ یہی وہ تعلیم ہے جس کا پھل چکھنے سے ہندوستان میں مذہبی افتراق پیدا

ہوا اس کی تصدیق سرجان بینارڈ ممبر اکزکٹو کونسل پنجاب کے سینیر ممبر کے حسب ذیل قول سے ہوتی ہے جس کو اُس نے لندن کے ایک جریدہ موسومہ معاملات خارجیہ میں شائع کیا تھا:-

"ہندوستان میں خانہ جنگی کی طرف رجحان موجود ہے جس کا ایک نمونہ ہندو مسلم عناد ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر یہ رجحان نہ ہوتا تو ہماری حکومت قائم نہ ہو سکتی نہ برقرار رہ سکتی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ہندو مسلمانوں میں عام مخالفت برطانیہ کے عہد میں شروع ہوئی۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی ظالم بادشاہ گذرے ہیں جن میں سے کسی نے غیر مسلموں پر جزیہ لگایا اور کسی نے ذبیحہ گاؤ پر مجنونانہ جوش میں آکر سزائیں دیں لیکن یہ واقعات گاہے گاہے پیش آتے تھے۔ شجر علم کا پھل چکھنے سے پہلے عوام میں مذہبی افتراق کا احساس نہ تھا خواہ ہندو یا مسلمان دونوں ایک ہی معبد میں مصروف بہ پرستش ہوتے تھے۔"

(ان ہیپی انڈیا مصنفہ لالہ لاجپت رائے ص۴۰۰ - روشن مستقبل ص۲۳۶)

اب سوال یہ ہے کہ وہ کون سا پھل تھا جس کے چکھنے سے مذہبی افتراق پیدا ہوا اس کا جواب صاف یہ ہے کہ نہ علوم قدیمہ میں کوئی ایسی بات تھی جس سے مختلف قوموں میں افتراق ہوتا نہ علوم جدیدہ میں کوئی ایسا مضمون تھا جس سے ہندو مسلم فسادات ہوتے اور نہ عام تاریخوں میں ایسی سمیت تھی بلکہ سمیت جو کچھ تھی وہ اس قسم کی تاریخوں میں تھی جس کی ابتدا ایلیٹ صاحب نے کی تھی۔ اُن کے بعد مسٹر کیمپسن ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم نے اسی نوعیت کی ایک تاریخ لکھی جس کی شکایت سر سید احمد خاں نے کی ہے۔ اسی قسم کی کتابیں اسکولوں کے درس میں داخل کی گئیں۔ اُن کے ترجمے اردو میں کرا کے تمام ملک میں پھیلائے گئے جنہوں نے ملک کے امن کو باہمی خلفشار اور کشاکش میں بدل دیا۔ اسی قسم کی فضا میں ملک میں فرقہ وارانہ اور نام نہاد سیاسی جماعتیں پیدا ہوئیں جو ملک کی سیاسی ترقی میں مزاحم ہو کر غیر ملکی حکومت کی بالواسطہ امداد کرتی رہتی ہیں۔ (روشن مستقبل ص۲۳۷)

ان تاریخی کتابوں اور اس قسم کے پروفیسروں اور مدرسوں نے گذشتہ بادشاہوں اور راجاؤں کو

متعصب، کٹر مذہبی، مذہبی دیوانے وغیرہ الفاظ سے ملقب کر کے تحریروں اور تقریروں میں زہر پھیلا کر ملک کی فضاء کو نہایت زیادہ گندا کیا۔ نوعمر، جوشیلے، ناتجربہ کار، ناواقف طلبہ کے سادہ اور صاف قلوب ان زہریلے مواد سے ایسے زہر زدہ ہو گئے کہ اُن کی اصلاح باوجود کھلی بربادی اور نہایت مضرت رساں نتائج دیکھنے اور اقرار کرنے کے نہیں ہوتی اور نہ دلوں کی صفائی ہوتی ہے۔ اسی کی شکایت ڈبلیو ایم ٹارانس اپنی کتاب "ایشیا میں شہنشاہیت" میں کرتا ہے۔ مندرجہ ذیل الفاظ ملاحظہ ہوں:-

"سیواجی کو متعصب اور سلطان ٹیپو کو کٹر مذہبی کہا جاتا ہے۔ لیکن جس وقت ہم نے جنوبی ہند کی ریاستوں میں دخیل ہونا شروع کیا اُس وقت اُن کے یہاں اس قسم کے مذہبی تنفر کا کہیں نام تک نہ تھا۔ جس طرح انگلستان اور یورپ کے تقریباً سب حصوں میں مخلوق کو تباہ کرنا روا رکھا جاتا تھا۔ جب آئرلینڈ میں کوئی رومن کیتھولک نہ اپنے بزرگوں کی جاگیر کا حقدار سمجھا جاتا تھا نہ فوج کا افسر ہو سکتا تھا۔ جب سویڈن میں سوائے لوتھر کے معتقدین کے اور کسی عقیدہ کا کوئی ملازم نہیں ہو سکتا تھا۔ ٹھیک اس وقت ہندوستان کے اندر ہر شہر اور شاہی دربار میں ہندو مسلمان عزت اور سرمایہ کمانے میں اور ایک دوسرے سے بازی لیجانے میں آزاد تھے۔"

گذشتہ شہادتیں جو کہ نہایت صحیح ہیں بتلاتی ہیں کہ بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اورنگزیب اور دیگر سلاطین مغلیہ اور اسی طرح سیواجی اور سلطان ٹیپو اور دوسرے نواب اور راجہ فرقہ وارانہ تعصبات نہ اپنے دلوں میں رکھتے تھے نہ اپنے احکام شاہی اور اپنے درباروں میں استعمال کرتے تھے۔ ہاں حکومت اور ملک کے لئے بیشک لڑتے جھگڑتے رہتے تھے مگر ہندو راجاؤں کے ساتھ مسلمان اور مسلمان بادشاہوں اور نوابوں کے ساتھ ہندو فوجی افیسری اور ملکی نظام میں شریک رہتے تھے اور ہر ایک کو دوسرے پر اعتماد ہوتا تھا۔ جہانگیر اپنے تمام توپخانہ کو راجہ بکرماجیت کی کمان میں رکھتا ہے۔ مرہٹے اپنی تمام توپخانہ کی قوت کو ابراہیم گردی کے زیر کمان رکھتے تھے۔ "توپخانہ ایسی اہم چیز ہے کہ اُس پر لڑائی کا تمام تر دار و مدار ہوتا ہے چنانچہ آج تک

انگریزوں نے اپنے توپ خانہ کو ہندوستانیوں کی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ بہرحال اُس لڑائی میں احمد شاہ ابدالی کے مقابلہ میں جبکہ مرہٹے ہار گئے اُس وقت احمد شاہ ابدالی نے مسلمان توپچیوں کو اُنکی مردانگی اور نمک حلالی پر بڑی داد دی اور اُن سے خواہش کی کہ وہ احمد شاہ کی فوج میں آجائیں اُس پر مسلمانوں نے جواب دیا کہ اُن کے آقا ہاریں یا جیتیں وہ اُن کا ساتھ چھوڑ کر دوسری جگہ نہیں جا سکتے"

(حکومت خود اختیاری صہ۵۲)

اورنگ زیب مرحوم جس کو انگریزوں نے بعد میں متعصب مشہور کیا اور پھر سرکار جادو نے بھی انگریزوں کی ہمنوائی کی ہم اُس کے متعلق مسٹر آرنلڈ کی تاریخی شہادت اور دوسرے مورخین کی شہادتیں پیش کر چکے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہایت فراخ حوصلہ اور دریا دل غیر متعصب بادشاہ تھا۔ ہفت ہزاری منصب پر اکبر کے یہاں صرف ایک ہندو فائز ہوتا ہے مگر عالمگیر کے یہاں اس منصب پر ایک فہرست میں دو اور دوسری میں تین ہندو امراء نظر آتے ہیں اُس کے سپہ سالاروں میں جے سنگھ جسونت سنگھ ساہو پسر جہاراجہ سیتارا جندجی داماد سیواجی، مالوی بھونسلہ وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ سیواجی کے مقابلہ کے لئے جے سنگھ سپہ سالاری کرتا ہوا پہونچتا ہے اور اُس کو قید کرتا ہے۔ سیواجی معافی طلب کرتا ہے تو عالمگیر اُس کو معاف کر دیتا ہے۔ انگریزی قانون اور عملدرآمد میں تو صرف سازش (کانس پرسی) پر سڈیشن ایکٹ کے ماتحت موت یا کالے پانی کی سزا دینی ضروری ہو جاتی ہے بغاوت کے تحقق پر تو ٹھکانا ہی نہیں۔ مگر سیواجی کھلی بغاوت کرتا ہے اور بادشاہی قلعوں کو لوٹتا اور فوجوں سے مقابلہ کرتا ہوا ہزاروں کا خون بہاتا ہوا پکڑا جاتا ہے۔ مگر معافی مانگنے پر دومرتبہ چھوڑ دیا جاتا ہے اور خلعت پاتا ہے۔ تیسری مرتبہ پھر بغاوت کرتا ہے اور گرفتار ہو کر بادشاہ کے سامنے پیش ہوتا ہے۔ اورنگزیب اُس کو قتل نہیں کرتا بلکہ قلعہ میں قید کر دیتا ہے۔ جہاں سے وہ کچھ عرصہ کے بعد فرار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح تمام نوابوں اور بادشاہوں کا حال تاریخ میں موجود ہے۔ سلطان ٹیپو کا دیوان معتمد سردار پورنیا برہمن تھا۔ سراج الدولہ (نواب بنگال) کا صدر دیوان (وزیر اعظم) موہن لال تھا، پٹنہ کا گورنر رام نرائن تھا۔ آصف الدولہ (نواب اودھ) کا وزیر اعظم بھاؤ لال تھا۔ روہیلہ نواب حافظ رحمت خاں کا وزیر اعظم راجہ مان رائے تھا اور اُس کی وفات کے بعد

اس کا بیٹا راؤ پہاڑ سنگھ ہوا نواب کو اس قدر اعتماد تھا کہ نوابوں اور گورنر جنرل کے پاس ایلچی بنا کر اُن کو بھیجا جاتا تھا۔ چنانچہ تاریخ روہیلکھنڈ معروف بہ "حیات حافظ رحمت خاں" صفحہ ۲۰۸ کی مندرجہ ذیل عبارت ملاحظہ ہو:۔

(ہندوؤں کے ساتھ برتاؤ) طرز حکمرانی اور ذاتی حالات کے ضمن میں ہم نے عام رعایا کے ساتھ حافظ الملک کے حسن سلوک اور اُن کی عطا کردہ مراعات کا تذکرہ کیا ہے وہ محض مسلمانوں کے لئے ہی مخصوص نہ تھیں بلکہ ہندو ان سے مستفیض ہوتے تھے۔ شریعت اسلامیہ کے سچے اور پکے پیرو ہونے کے باعث اور اسلام کے پاک اصولوں کو صحیح طور پر سمجھنے کی وجہ سے حافظ الملک اپنی اُس رعایا کو جو امن پسند تھی اور مسلمانوں کی مذہبی آزادی میں خلل اندازی نہ کرتی تھی ہر طرح کا آرام پہونچانا اور اُس کے لئے ترقی کی راہیں کھولنا اپنا فرض ایمانی سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کی طرح ہندوؤں کو اپنے فرائض مذہبی کی ادائیگی میں پوری پوری آزادی حاصل تھی۔ آئے دن بڑے بڑے مندروں اور دوسری عبادت گاہوں کی تعمیر ہوتی تھی اور حکومت کسی قسم کی مزاحمت نہ کرتی تھی۔ مذہبی تیوہار بدستور قدیم بڑی دُھوم دھام اور شان و شوکت سے منائے جاتے تھے اور مسلمانوں کی جانب سے کسی طرح کی روک ٹوک نہ ہوتی تھی۔ گائے، باجا اور محرم و رام لیلا کے قضیوں کا وجود نہ تھا اور روہیلوں کے ابتدائے زمانہ حکومت سے انتہا تک کسی ہندو مسلم فساد کا پتہ نہیں ملتا۔ پہلا ہندو مسلم فساد دار الحکومت بریلی ۱۸۳۷ء میں ہوا جبکہ روہیلوں کی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

مخالف و موافق مورخین کی تمام مستند تاریخوں کی ورق گردانی کر لی جائے۔ لیکن کوئی ایک ایسا واقعہ نظر سے نہ گذرے گا جس سے یہ ظاہر ہو کہ ہندوؤں نے اس سرزمین میں اپنی غالب اکثریت کے باوجود من حیث القوم مسلمان حکمرانوں کے خلاف کوئی مذہبی بغاوت کی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ طاقتور حکومت کا خوف اس امر میں مانع ہوا ہو۔ لیکن ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں تو روہیلہ سلطنت کو زوال ہوئے عرصہ گذر چکا تھا پھر جب حافظ الملک کے پوتے خان بہادر خاں نے ازسرنو روہیلہ حکومت قائم کرنا چاہی تو اُن کی تقریباً ساٹھ ہزار فوج میں بہ تعداد کثیر ہندو شامل تھے۔ اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ روہیلوں نے اپنے عروج کے زمانہ میں کس قسم کا سلوک کیا ہوگا۔ جس کی خوشگوار یاد نے انہیں ایسا کرنے پر مجبور کیا۔

علماء، صوفیہ اور مشائخ بطور خود مذہبی تبلیغ کرتے تھے لیکن تبلیغ حکومت کے فرائض میں شامل نہ تھی۔ نہ حکومت کیطرف سے اس کام کے لئے روپیہ دیا جاتا۔ مسلمانوں کی اعلیٰ معاشرت کو پسند کر کے یا اُن کے عمدہ مذہبی اصولوں کو بہتر سمجھ کر اگر کوئی ہندو اسلام قبول کرتا تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ خود ہندوؤں میں زمانہ حال کی طرح اُس زمانہ میں تبلیغ مذہب کا طریقہ رائج نہ تھا اور نہ اس کی یقیناً ممانعت نہ ہوتی، اور جس طرح عہدِ قدیم میں اسلامی حکومت سے پہلے ہندو راجاؤں نے اپنی اپنی مملکتوں میں عرب کے مبلغ مذہب تاجروں کو مسجدیں بنانے اور تبلیغِ اسلام کی اجازت دینے میں پس و پیش نہ کیا اسی طرح مسلمان حکمراں ہندوؤں کو اپنا مذہب پھیلانے کی اجازت دیدینے میں مطلق تکلف نہ کرتے۔

اگر روہیلے زبردستی ہندوؤں کو مسلمان بناتے تو آج روہیلکھنڈ میں ہندوؤں کی نہیں مسلمانوں کی اکثریت ہوتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ روہیل کھنڈ کے صدر مقام یعنی خاص ضلع بریلی اور دارالاقامت پیلی بھیت تک میں ہندوؤں کی آج تک زبردست اکثریت ہے اور تمام ضعیف العمر ہندو اپنے تجربہ سے اور اپنے اسلاف کے اقوال سے یہی بیان کرتے ہیں کہ مسلمان اپنے طرزِ عمل میں ہمیشہ غیر متعصب رہے ہیں اور انہوں نے کبھی ہندوؤں کو اپنا مذہب چھوڑنے پر مجبور نہیں کیا۔ مذہبی آزادی کے علاوہ ہندوؤں کو زراعت و تجارت میں بھی گرانقدر مراعات و حقوق حاصل تھے بلکہ مسلمان تو بالعموم فوجی ملازمت کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ زراعت و تجارت تمام و کمال ہندوؤں ہی کے ہاتھ میں تھی۔ ہندوؤں کی بعض قومیں مثلاً کھتری، ٹھاکر اور راجپوت فوج میں نوکری کرتے تھے۔ ویش خزانچی کے عہدوں کے لئے موزوں سمجھے جاتے تھے اور کایستھ اہل قلم ہونے کے باعث حکومت کے تمام دفاتر میں ملازم تھے۔ سفارت کے اہم اور نازک فرائض بھی بالعموم ہندو معتمدین کے سپرد کئے جاتے تھے۔ چنانچہ حافظ الملک نے منشی ٹیک چند اور منشی چتر بھوج کو بارہا بڑی بڑی اہم سفارتوں پر بادشاہ دہلی، مرہٹوں، جاٹوں، شجاع الدولہ اور انگریزوں کے پاس روانہ کیا۔ دیوان کا عہدہ جو مدار المہام یا وزیر اعظم کے برابر سمجھا جاتا تھا خصوصیت کے ساتھ ہمیشہ ہندوؤں کے ہاتھ میں رہا۔ پہلے راجہ مان رائے حافظ الملک کے دیوان رہے۔ اور اُن کے بعد راؤ پہاڑ سنگھ اس عہدہ جلیلہ پر فائز ہے جن کی جاگیر میں کم و بیش (۴۰۰) گاؤں تھے ان لوگوں کے حافظ الملک سے نہ صرف برادرانہ اور عزیزدارانہ تعلقات تھے بلکہ یہ لوگ اُن کے جملہ مالی اور ملکی معاملات میں سیاہ و سپید کے مالک اور غیر معمولی

اختیارات کے حامل تھے۔ حافظ الملک کی مجلس مشاورت جس میں اہم معاملات طے پاتے تھے اُس میں ہندو اعیان دولت بھی شریک ہوتے تھے جنکی موجودگی کے بغیر کوئی مجلس انعقاد پذیر نہ ہوتی تھی اور اُن کی رائے کو بڑی وقعت دیجاتی تھی۔

حافظ الملک کی نظر میں اللہ کی تمام مخلوق یکساں طور پر عزیز تھی۔ جب وہ بذل و احسان کرتے تو یہ نہیں دیکھتے تھے کہ کون ہندو اور کون مسلمان ہے۔ شہر پناہ پیلی بھیت کی تعمیر کا واقعہ لکھا جاچکا ہے۔ میواتیوں اور مارواڑیوں کے واسطے جن میں مسلمانوں سے زیادہ ہندو تھے محض وجہ معاش مہیا کرنے کے لئے انہوں نے کس طرح ایثار و قربانی سے کام لیا۔ اسی طرح ۱۱۶۷ء میں آتش زدگی اور زلزلہ سے شہر بریلی پر تباہی آئی تو انہوں نے جو سلوک مسلمانوں کے ساتھ کیا وہی ہندوؤں کے ساتھ کیا۔ ایک اور واقعہ ہے کہ حافظ الملک جب صاحبزادہ ارادت خاں کی شادی کرکے شاہجہانپور سے لوٹ رہے تھے تو پہلی منزل پر کسی رسالدار کا ایک ہندو ملازم کارپردازان رسد کے پاس آیا اور اُس نے بیس سیر آٹا اور بیس سیر گھی طلب کیا۔ کارپردازوں نے اُس سے دریافت کیا کہ تم تنہا ہو یا تمہارے ہمراہ اور لوگ بھی ہیں تم کس امیر کے ملازم ہو اور کیا کام کرتے ہو۔ اُس ہندو نے اپنے رسالدار کا نام بتایا اور کہا کہ میرے ساتھ دس اور آدمی ہیں اور یہ گھی رسالدار صاحب کے گھوڑوں کے واسطے لئے جاتا ہوں۔ میں خود رسالدار کے کہاروں میں ملازم ہوں۔ اتفاقاً جس رسالدار کا نام لیا گیا اُس کے ملازم پیشتر تمام اشیاء مطلوبہ لے جاچکے تھے۔ لہذا کارپردازوں کے دل میں شک پیدا ہوا اور انہوں نے تحقیق احوال کے لئے ایک شخص کو اُس رسالدار کے پاس بھیجا۔ تحقیق کے بعد اُس ہندو ملازم کا جھوٹ اور فریب کھُل گیا۔ چنانچہ اُس کو فوراً پکڑ کر حافظ الملک کے حضور میں لے گئے اور تمام واقعہ عرض کیا۔ حافظ الملک نے حکم دیا کہ اس شخص کو پچیس سیر آٹا اور پچیس سیر گھی دیا جائے اور فرمایا کہ اس قسم کی تحقیقات سے جو غریب لوگوں کے واسطے موجب خجالت ہوتی ہے آئندہ پرہیز کیا جائے۔ حافظ الملک کی اسی رحمدلی، بیدار مغزی، روشن خیالی، بے تعصبی اور انصاف پسندی کا نتیجہ تھا کہ اُن کی ہندو رعایا نے بھی اپنے قابلِ احترام آقا کے لئے وفاداری کی مثال قائم کردی۔ جس وقت تمام مسلمان عزیز و اقارب اور سرداروں نے حافظ الملک کی جان بچانے کے لئے روپیہ فراہم کرنے سے انکار کردیا اُس وقت دیوان پہاڑ سنگھ کا چالیس لاکھ روپیہ کا پیش کش کرنا اور جب سخت بے سروسامانی میں حافظ الملک نے وطن عزیز کی خاطر جنگ آزادی کے لئے علم جہاد بلند کیا اُس وقت

جوق درجوق راجپوتوں کا اگر شریک حال ہونا ایسے واقعات نہیں ہیں جن کو دنیا جلد فراموش کر سکے گی ۔ یہ ایسے واقعات ہیں جن کو تاریخ عالم میں ہمیشہ آبِ زر سے لکھا جائے گا ۔

نیز رنجیت سنگھ کے وزیر اور معتمد خاص پیرزادہ عزیزالدین تھے ۔ اور اس کے توپخانہ کے افسر اعلیٰ الٰہی بخش تھے ۔ اسی نام ہی سے توپخانہ موسوم تھا ۔ یہی نہیں کہ ان دنیادار پادشاہوں اور نوابوں اور راجاؤں کے یہاں آپس میں ایک دوسرے پر اس قدر اعتماد تھا بلکہ مذہبی لوگوں میں بھی یہی اعتماد اور وثوق تھا سکھوں سے لڑائی میں حضرت سید احمد صاحب شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے توپخانہ کا چارج راجہ رام راجپوت ہندو کو دے رکھا تھا جس نے اتمان زئی کی جنگ میں سکھوں پر بہت سخت گولہ باری کر کے سکھوں کو شکست دی ۔ (دیکھو شاندار ماضی ۲۵ صفحہ ۸ از سوانح احمدی ص۱۱۰)

غرضکہ زمانہ ماضی ہر دو فرقوں ہندوؤں اور مسلمانوں میں بہت زیادہ اعتماد اور وثوق اور میل جول اور رواداری کا تھا ۔ ہندوستان میں مختلف مذہبوں اور عقیدوں کے لوگ ملی جلی آبادیوں میں مثل عزیزوں اور رشتہ داروں کے امن کے ساتھ یکجا رہتے تھے ۔ انقلاب ۱۸۵۷ء تک مذہبی اور ملی اختلاف کا عوام میں وجود نہ تھا ۔ جب فوجوں میں بغاوت اور انقلابی تحریک شروع ہوئی تو ہر مقام کے سپاہی اپنی اپنی چھاؤنیوں میں آگ لگا کر اور برباد کر کے دہلی کے معزول اور معطل بادشاہ بہادر شاہ مرحوم کی طرف دوڑ پڑے سپاہی بہار تک سے آئے ۔ ان میں ہر ملت اور مذہب کے ہندوستانی تھے ۔ ہندو سپاہی بھی بہادر شاہ کی جے پکارتے تھے ۔ اگر موجودہ زمانہ کے سے تعصبات اُس وقت ہوتے تو مسلمان سپاہی مسلمان بادشاہ یا نواب کے پاس ہی جاتے اور ہندو سپاہی کسی راجہ کے پاس ہی جاتے مگر سب کے سب بلا تفریق مذہب وملت معزول اور بے جان مسلمان بادشاہ کے گرد جمع ہو گئے ۔ (۱) مہاراجہ بھور عرف ناناصاحب مرہٹہ کانپوری نے کانپور پر قبضہ کیا اور بہادر شاہ کا سبز جھنڈا لگا کر ان کے نام پر ایک سو ایک توپوں کی سلامی دی ۔ (۲) عظیم اللہ خان پیشکار ناناصاحب کی نسبت مشہور ہے کہ انقلاب ۱۸۵۷ء کی اسکیم انہیں کے دماغ کا نتیجہ تھی ۔ بڑا قابل اور انگریزی داں شخص تھا ۔ ناناصاحب کی طرف سے ان کے مقدمہ کی پیروی کے لئے انگلستان گیا تھا اور وہاں سے روس بھی گیا تھا ۔ (۳) تانتیا ٹوپی مرہٹہ نے کالپی میں جنگ آزادی میں حصہ لیا اور کانپور میں ناناصاحب کی

سپہ سالاری کی خدمات انجام دیں (۴) رانی جھانسی نے کمپنی کی فوج پر قبضہ کر کے شاہ دہلی کا پرچم لگایا اور خود گھوڑے پر چڑھ کر انگریزوں کے خلاف بہادری سے جنگ کی۔ (۵) راجہ کنور سنگھ رئیس جگدیش پور صوبہ بہار اسی سال کی عمر میں انگریزوں سے لڑے اور انگریزی فوج کو مسلسل شکستیں دیں جس سے لارڈ کیننگ وائسرائے گھبرا گئے۔ جب بنارس میں لارڈ مارک کی فوج سے مقابلہ ہوا تو راجہ صاحب بجلی کی طرح ادھر سے ادھر کوندتے پھرتے تھے۔ بلیا کے قریب گنگا پار کرتے ہوئے اُن کے داہنے ہاتھ میں گولی لگی تو بائیں ہاتھ سے اُسے تلوار سے کاٹ کر پٹی باندھ دی تاکہ زہر نہ پھیلے اور آٹھ ماہ کی جنگ کے بعد اس ضعیف العمر سپاہی نے اپنی راجدھانی پہ قبضہ حاصل کر لیا مگر زخم کی تکلیف سے انتقال کیا۔ (۶) خانبہادر خان نواب روہیلکھنڈ کے آخری وارث تھے۔ اُنھوں نے اپنے اعلان میں اس بات پر زور دیا کہ انگریز ہمیشہ وعدہ خلافی اور جائدادوں کی ضبطی کرتے رہتے ہیں اور ہندو مسلمانوں کو لڑاتے رہتے ہیں اب دونوں کو مل کر اُن کے خلاف لڑنا چاہیئے وہ روہیلکھنڈ پر قابض ہو کر خوب لڑے۔ اسی طرح بیگم حضرت محل زوجہ واجد علی شاہ بخت خان سپہ سالار نواب نجیب خاں اور مولانا احمد اللہ شاہ وغیرہ نے جنگ آزادی میں بہت کچھ کارنمایاں کئے۔

ان واقعات سے بخوبی ظاہر ہے کہ جو ظلم و ستم اور جبر و تعدی پچھلی سلطنتوں کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں وہ نہ صرف غلط ہیں بلکہ حالت اس کے برعکس ہے (جیسا کہ ہم پہلے دکھلا چکے ہیں) ورنہ بادشاہ سے رعایا کی اس قدر گرویدگی کی جبکہ اُس کی سلطنت جاتی رہی تھی کوئی وجہ نہ تھی۔ اسی طرح نیتاجی پنڈت سبھاش چندر بوس جیسے تعلیم یافتہ غیر مسلم کا بہادر شاہ کی قبر پر جا کر آنسو بہانا اور اظہارِ عقیدت کرنا ان افسانوں کے غلط ہونے کی دلیل ہے

(دیکھو روشن مستقبل صفحہ ۷۷ و ۷۸ و ۷۹ و ۸۰ و ۸۱)

باوجودیکہ انگریزوں کا نفاق ڈالنے کا اصول پہلے سے چلا آتا تھا مگر ۱۸۵۷ء میں ہندو مسلمان عوام الناس جنگِ آزادی میں یکساں شریک ہوئے۔ یہ بات انگریزوں کو بہت زیادہ کھٹکی اس لئے اُس وقت سے وہ اور زیادہ اس فکر میں رہے کہ دونوں قوموں کے درمیان میں کوئی مستقل خلیج پیدا کر دیں جس سے یہ لوگ آپس میں کبھی مل نہ سکیں۔ اس لئے مذکورہ تاریخیں بطور پروپگنڈہ ایلیٹ اور کیمبن صاحبوں کی لکھی گئیں اور ان میں ہندوؤں پر مسلمان بادشاہوں کے مظالم دکھائے گئے پھر وہ اور اُن کے ترجمے اسکولوں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے

کورس میں داخل کر کے نوجوان طلبہ کو پڑھایا گیا۔ علاوہ ازیں جداگانہ انتخاب اور مسلم لیگ اور مہاسبھا کی بنیاد نیز قربانی گاؤ اور مساجد کے سامنے باجے کی مخالفت وغیرہ بھی اُسی کے ذرائع اور وسائل قویہ ہیں۔ نیز افسوں میں ملازمتوں کا اُتار چڑھاؤ ہمیشہ سے اُس کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ اس قسم کی تاریخیں انگریزی درسگاہوں میں پڑھانے اور دوسری تدبیروں کے عمل میں لانے سے ہندو مسلمانوں میں جدائی کی کوششیں قوی کر دی گئیں۔

(۲) لارڈ الفنسٹن گورنر بمبئی ۱۴۔ مئی ۱۸۵۹ء میں ایک یادداشت میں لکھتا ہے:۔ "نفاق ڈال کر حکومت کرنا رومیوں کا اصول تھا اور یہی اصول ہمارا بھی ہونا چاہیئے"۔

(حکومت خود اختیاری ص۵۵ ازان ہیپی انڈیا)

(۳) اس سے پہلے کارنے ٹکس نے رسالہ ایشیاٹک جرنل میں ۱۸۲۱ء میں لکھا تھا:۔

"لڑاؤ اور حکومت کرو"۔ رومن کا مقولہ ہماری ہندوستانی حکومت کا اصل اصول ہونا چاہیئے عام اس سے کہ وہ سیاست یا تمدن یا فوج کشی کے متعلق ہو۔

(حکومت خود اختیاری صفحہ ۵۲)

(۴) مسٹر ایڈورڈ ٹامسن اپنی کتاب (انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ) میں لکھتا ہے:۔

"برٹش سیاست کو مدنظر رکھتے ہوئے تو ہم نے مسٹر گلیڈسٹون اور لارڈ سیلسبری جیسے مشہور زمانہ مدبرین کے خیالات کو چھوڑ دیا ہے کیونکہ وقت کی ضرورت اُن کے برخلاف حکم دیتی تھی لیکن ہندوستان کے متعلق ہم ابھی تک اُسی فرسودہ پالیسی پر عمل کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ ہندوستانیوں میں نااتفاقی اور باہمی اختلاف کو زندہ رکھنا قدیم سے ہمارے سیاستدانوں کا نہایت مرغوب مشغلہ بنا ہوا ہے۔ لیکن ہندوستان اتفاق اور اتحاد کی ضرورت کا بیش از بیش احساس نہایت تیزی سے کر رہا ہے"۔

(انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ مترجم ص۱۰۸)

(۵) مندرجہ ذیل سوال و جواب میں میجر جنرل اسمتھ کے سی بی کی عجیب و غریب شہادت ملاحظہ فرمایئے۔ سر ولیم ڈگبی از ترجمہ پراسپرس برٹش انڈیا ص۱۰۹

سوال۔ نمبر ۵۶۳۰ کیا آپ کسی طرح اس بات کی روک کر سکتے ہیں کہ دیسیوں کو اپنی طاقت کا علم نہ ہو۔

(ج) میرے خیال میں انسانی تاریخ میں کوئی ایسی نظیر نہیں ملتی کہ معدودے چند اغیار چند کرور آبادی کے ملک پر حکمرانی کر سکیں جسے آج کل راج کی بادشاہت کہتے ہیں اس لئے جونہی وہ تعلیم یافتہ ہوجائیں گے تو تعلیم کی تاثیر سے اُن کے قومی اور مذہبی تفرقے دور ہوجائیں گے جس کے ذریعے سے ہم نے اتبک اس ملک کو اپنے قبضہ میں رکھا ہوا ہے۔ یعنی مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف کرنا علیٰ ہذا القیاس تعلیم کا اثر یہ ہوگا کہ اُن کے دل بڑھ جائیں گے اور انہیں اپنی طاقت سے آگاہی ہوجائے گی۔"

(۶) مسٹر چرچل مورخہ ۲۷ جون ۱۹۳۲ء کو تقریر کرتے ہیں۔" وزیر اعظم (مسٹر میکڈانلڈ) نے طے کرلیا ہے کہ وہ فرقہ وارانہ فیصلہ دیں گے۔ میرے نزدیک اس میں سخت خطرہ ہے۔ اگر انہوں نے جملہ جماعتوں کے خوش کرنے کی کوشش کی تو وہ کسی کو خوش نہ کرسکیں گے۔ اہل روم کا اصول تھا کہ نفاق ڈال کر حکومت کرو لیکن ہم نے بالاتفاق طے کرلیا ہے کہ یہ اصول نامناسب ہے، مگر اُسی کے ساتھ اس اصول کو بھی اختیار نہ کرنا چاہیئے جو اس کے برعکس ہو اور وہ یہ ہے کہ رعایا کو متحد کردیا جائے جس کا نتیجہ سلطنت سے دست کشی ہوگا۔ دراصل یہ ایک بڑا خطرہ ہے اور اندیشہ ہے کہ ہم اس بڑے خطرہ میں نہ پڑجائیں"

(لیڈر اخبار مورخہ ۱۴ جولائی ۱۹۳۲ء)

(۷) سر جان مینارڈ۔" ہندو مسلمانوں کے مابین عام مخالفت برطانیہ کے عہد میں شروع ہوئی"

(ان ہیپی انڈیا ص۳۰ روشن مستقبل ص۲۳۱)

(۸) آنریبل امبکا چرن مزمدار کہتا ہے۔" اول اول اپنی عملداری کے ابتدائی زمانہ میں مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کو بڑھایا گیا اور اُس کے بعد ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمانوں کو اٹھایا گیا جو باہمی رنجش اور عداوت کا موجب ہوا۔"

(ہندوستان کا قومی ارتقا ص۲۴۷ روشن ص۱۵۵)

اس طریقہ پر آفسوں اور عہدہ ہائے حکومت میں سخت نفاق پھیلایا گیا۔

خلاصہ یہ کہ ہندوستان میں قدیم سے ہندو مسلمان سکھ پارسی اور دیگر اقوام ہمیشہ سے ملے جلے عزیزوں اور رشتہ داروں کی طرح بستے اور آپس میں رواداری بلکہ اتحاد و اتفاق سے چلے آتے تھے مگر انگریزوں نے

اپنے مفاد اور خود غرضی کے لئے اس کو خطرہ جانکر مختلف تدبیروں سے نفاق ڈلوایا اور آپس میں ایک دوسرے کو لڑانا اختیار کیا۔ کبھی ایک جماعت پر دستِ شفقت پھیرا اور کبھی دوسری پر اور اس ذریعہ سے مختلف ملتوں میں رقابت پیدا کر کے حسد، عناد، مذہبی کشت و خون کی صورتیں پیدا کیں۔ اگرچہ مسٹر چرچل کہتے ہیں کہ ہم نے بالاتفاق اس طریق کو نامناسب جانکر ترک کر دیا ہے۔ مگر ایڈورڈ ٹامسن اپنی کتاب میں اقرار کرتے ہیں کہ ہندوستانیوں میں نااتفاقی اور اختلاف کو زندہ رکھنا قدیم سے ہمارے سیاستدانوں کا نہایت ہی مرغوب مشغلہ بنا ہوا ہے۔ اتنی ہی صحیح ہے اور خود مسٹر چرچل بھی ہندوستانیوں کے اتحاد کو نہایت ہی مبغوض سمجھتے اور برطانوی اقتدار کے لئے موت شمار کرتے ہیں روزمرہ کے شاہدات بتلاتے ہیں کہ آج بھی ہندوستان میں یہی کھیل برٹش حکام کھیل رہے ہیں۔ اور اگرچہ پہلے کے بوئے ہوئے زہریلے بیج سالہا سال کے لئے بلکہ ایک صدی یا اس سے زائد کے لئے کافی تھے مگر اب بھی برطانوی حکام اس میں پوری جد وجہد عمل میں لا رہے ہیں۔ لارڈ ویول کے متعلق خود انگلینڈ میں اُس کے انکشافات اخباروں میں آ رہے ہیں۔ اور مسٹر آر۔ ایس رونیکار آف سی پی اپنے مشاہدات اور تاثرات ۱۹ر نومبر ۱۹۴۶ء کو الفاظ ذیل میں انگلستان سے واپسی پر ذکر کرتے ہیں:۔

"سوئٹزرلینڈ، آئرلینڈ اور برطانیہ کے دوران میں مجھے سرکردہ لیڈروں، قانون دانوں جرنلسٹوں اور تاجروں سے ملنے کا موقعہ ملا............ جب میں لندن میں تھا تو میں نے یہ افواہیں سنیں کہ کچھ کنسرویٹو ہندوستان کے فسادات میں غیر معمولی دلچسپی لے رہے ہیں۔ میں نے یہ بھی سنا کہ وہ ہندوستان میں فسادات کرانے کے لئے رجعت پسند عناصر کو مالی امداد بھی دے رہے ہیں ان دنوں وہاں یہ افواہ بھی گشت لگا رہی تھی کہ کنسرویٹو پارٹی کا ایک ایلچی فسادات کرانے کے لئے ہندوستان روانہ ہو چکا ہے۔"

(پرتاپ لاہور مورخہ ۲۱ر نومبر ۱۹۴۶ء جلد ۲، ۲۱)

مسٹر لوئی فشر (مشہور امریکن مصنف) لندن سے بذریعہ تار ایک آرٹیکل ہندوستان بھیجتا ہے جو کہ ۲ر ستمبر ۱۹۴۲ء کو اسٹنڈرڈ کلکتہ میں شائع ہوتا ہے۔ جس میں بیان کیا گیا ہے کہ چرچل اور جناح میں گذشتہ مہینوں میں ہندوستان کی قسمت کے بارے میں نامہ و پیام ہوا کیا ہے اُن دونوں نے نہایت ہی رازدارانہ طور پر آپس میں خط و کتابت اور راز و نیاز کی باتیں کی ہیں۔ یہ واقعہ چرچل کے ایک ایسے ہی نہایت خفیہ خط پانے کے

بعد ظہور میں آیا کہ مسلم لیگ نے وزارتی وفد کی تجاویز پر دوبارہ غور کیا اور دستور ساز اسمبلی کے مقاطعہ کا فیصلہ کر دیا جو آزاد ہندوستان کا دستور بنانے والی ہے۔ برطانی مشن نے ان تھک کوشش کی کہ سیاسی طاقت برطانیہ کے ہاتھوں سے ہندوستانیوں کو منتقل کرنے کا راستہ صاف کر دے مگر چرچل اور جناح دونوں ان کوششوں کو ناکام کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔ مسٹر جناح کے نئے طرز پالیسی کا پھل کلکتہ میں لوٹ، موتیں اور قتل و غارتگری کی صورت میں ظاہر ہوا ہے الخ"

الغرض آج بھی طرح طرح سے ہندوستان میں برطانوی حکام نفرت اور عداوت کی آگ بھڑکاتے ہوئے فرقہ وارانہ فسادات کے لئے کوشاں ہیں تاکہ اُن کا اقتدار جس قدر ممکن ہو زیادہ زمانہ تک باقی رہے۔ جس کی وجہ سے ہندوستان یہاں کے باشندوں کے لئے جہنم بنتا جا رہا ہے۔ ڈیڑھ سو برس کی سلگائی ہوئی روزافزوں آگ آج خرمن امن و اماں کو ہندوستان کے ہر قطعہ میں بھسم کر رہی ہے۔ ہندو اور مسلمانوں کا خون نہایت تیزی سے بہایا جا رہا ہے۔ مکانات جلائے جا رہے ہیں۔ اموال لوٹے جا رہے ہیں۔ عزتیں برباد کی جا رہی ہیں مصیبتوں کی گھٹائیں چاروں طرف چھائی ہوئی ہیں۔ والی اللہ المشتکی۔

انگریز اور غدّاری

چونکہ بعض علماء کا خیال رہا ہے، کہ ہم انگریزوں سے معاہدہ کر چکے ہیں جس کے لئے عدالتوں وغیرہ میں مقدمات لے جانا اور ہندوستان میں زیر حکومت برطانیہ سکونت پذیر ہونا وغیرہ عملی دلیل ہے اس لئے اُن کی حکومت کو توڑنے اور زائل کر کے آزاد ہونے کی جد وجہد کرنا جائز نہیں ہے۔ نہ دوسرے مسلمانوں ترکوں وغیرہ کی مدد کی غرض سے ان کی مخالفت درست ہے۔ قرآن شریف میں ہے۔ وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ الآیہ۔ بنابریں ہم ایک بحث عہد شکنیوں کی ناظرین کے سامنے پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ خود انگریزوں کے مشاہیر نے اقرار کیا ہے کہ انگریز ہمیشہ معاہدات کو توڑتے ہی رہے ہیں پس اگر کوئی معاہدہ تسلیم بھی کر لیا جائے تو انہیں کے اقرار سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد شکنی ہمیشہ سے انگریزوں اور تاج برطانیہ کا شیوہ رہا ہے اس لئے

شرعی نقطۂ نظر سے بھی آزادی کی جدوجہد اور ان کو نکالنا وغیرہ ضروری اور صحیح ہے۔
ناظرین اس آنے والی تفصیل کو بغور دیکھیں۔ اور انگریزوں اور برطانیہ کی غداریوں سے
مطلع ہوں اور ایسے فتاوی کی غلطی معلوم کریں۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور اسلاف
کرام نے جو جدوجہد آزادی کی کی تھی وہ سراسر احکام شرعیہ اور عقلیہ کے مطابق تھی، اس
میں تامل کرنا سراسر ناواقفیت اور غلطی ہے۔ ہم اس میں ایسٹ انڈیا کے سابقہ معاہدوں کے
متعلق بہت کم شہادتیں لائیں گے وہ تو بہت ہی زیادہ ہیں۔ ہم تاج برطانیہ کے متعلق
چند اعداد بطور مشتے نمونہ خروارے پیش کرتے ہیں۔

(انگریزوں اور اُن کے بہی خواہوں کا انگریزی عہد شکنیوں اور وعدہ خلافیوں کا اقرار کرنا)

انگریزوں کی عہد شکنیاں اور وعدہ خلافیاں ہندوستان میں بے شمار واقع ہوتی رہی ہیں۔ انگریزوں کا
ہمیشہ سے اصول رہا ہے کہ ضرورت کے وقت گدھے کو باپ بنالو اور ضرورت پوری ہو جانے پر باپ کو گدھا بنا دو
نہایت نرم اور خوش آئند الفاظ بول کر دھوکا دینا اور سیدھے سادھے لوگوں پر قبضہ کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل
رہا ہے ایشیائی اور افریقی اقوام ان کے اس دامِ فریب میں گرفتار ہو کر ہمیشہ نقصان اُٹھاتی رہی ہیں اس مکاری
اور دغابازی میں برطانوی قوم اتنی ماہر ہے کہ یورپ کی دوسری قومیں بھی اُن کو نہیں پہونچ سکیں۔ یہی حال ہندوستان
کی غلامی اور بربادی کا باعث ہوا۔ چنانچہ

(۱) خان بہادر خاں جو کہ نواب روہیلکھنڈ کے آخری وارث تھے انھوں نے اپنے اعلان جنگ ۱۸۵۷ء میں اسی
بات پر زور دیا تھا۔ کہ انگریز ہمیشہ وعدہ خلافی اور جائدادوں کی ضبطی کرتے رہے ہیں۔ اور ہندو مسلمانوں کو
لڑاتے رہتے ہیں۔ اب دونوں کو مل کر اُن کے خلاف لڑنا چاہیئے وہ روہیلکھنڈ پر قابض ہو کر خوب لڑے
(یہ اُس آزادی کی لڑائی کا اعلان تھا جو کہ ۱۸۵۷ء میں عمل میں لائی گئی اور جس کو انگریزوں نے غدر کے نام سے
مشہور کیا) (ہندوستان کی سیاسی ترقی صفحہ۵) (روشن مستقبل ص۷۹)

(۲) نواب اودھ واجد علی شاہ کو جبکہ ۴ر فروری ۱۸۵۶ء میں صوبہ اودھ کو الحاق کا حکم سنایا گیا جس میں اُن کی
وفاداری تسلیم کی گئی اور صرف بدنظمی کے الزام میں انہیں معزول کیا گیا (درانحالیکہ بدنظمی خود کمپنی کے

طرز عمل کا نتیجہ تھا) تو انہوں نے سر تسلیم خم کر کے وضعداری کی تکمیل کر دی اور فرمایا کہ میں تو خادم ہوں کوئی سرکشی نہ کروں گا۔ البتہ حکومت انگلستان سے چارہ جوئی کروں گا۔ اس کے بعد انھوں نے افسروں اور فوج کو اپنی ملازمت سے علیحدہ کر کے انہیں ہدایت کی کہ وہ حکومت برطانیہ کی اطاعت اور عزت کریں مگر اطاعت نتیجہ ہوتا ہے انصاف اور مراعات اور وعدوں کے ایفاء کا جنگی حکام گورنمنٹ اپنی مسلسل کامیابیوں کے زعم میں ضرورت نہ سمجھتے تھے۔ وہ وعدے یہ تھے کہ نواب صاحب کی معزولی کے وقت تعلقداران اودھ، شاہی خاندان اور دابستگان درِ دولت کو یہ امید دلائی گئی تھی کہ ان کے حقوق محفوظ رکھے جائیں گے مگر ہوا یہ کہ برخلاف سرکاری اعلانات کے مالگذاری میں اضافہ شروع کیا گیا۔ اور بجائے تعلقداروں کے براہ راست اراضی کے قابضوں سے بندوبست کی کارروائی کیجانے لگی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے تعلقداروں کی آمدنیاں آدھی کے قریب رہ گئیں۔ شاہی خاندان کے لوگوں کے ساتھ جس قسم کا برتاؤ کیا گیا تھا اس کا پتہ لارڈ اسٹینلی کے مراسلہ مورخہ ۱۳ر اکتوبر ۱۸۵۸ء سے چلتا ہے جس میں تحریر تھا:۔

"شاہی خاندان کے لوگوں اور وظیفہ خواروں کے ساتھ بے تمیزی کا برتاؤ کیا گیا اور وظائف روک دیئے جانے سے انکا حال پتلا ہو گیا۔ سابق ملازموں اور با اثر لوگوں کو خاص طور پر ملازمتوں اور عہدوں سے محروم کیا گیا جن کے وہ متوقع تھے"۔

(فوجی بغاوت از لفٹننٹ جنرل میک لوڈ امینس صفحہ ۳) (روشن مستقبل ص۲ و ۳)

(۳) مسٹر پیڑ فریمین ممبر پارلیمنٹ وصدر کامن ویلتھ آف انڈیا لیگ کہتے ہیں (از انڈین نیوز لندن) برطانیہ عہد و پیمان کے ذریعہ ہندوستان پر ہندوستان کے بھلے کے لئے حکومت کرنے کا پابند ہے۔ لیکن کیا ہم نے اس عہد کی پابندی کی ہے۔ میں نے اوپر جو واقعات وحقائق بیان کئے ہیں وہ اس سوال کا جواب دیں گے۔ بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ اگر ہندوستان کو ہوم رول مل گیا تو عوام جمہور پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا۔ ایک سو برس کے برطانی راج سے جو مصیبت ہندوستان پر نازل ہوئی ہے اس سے زیادہ مصیبت ناممکن ہے۔ جو قانون ساز مجلسیں ہم نے قائم کی ہیں ان میں عوام کی نمائندگی نہیں ہوتی اور

ہم نے محصول کا بوجھ سب سے زیادہ غریبوں ہی کے دوش بے کسی پر رکھا ہے۔

(مدینہ بجنور جلد ۱۹ نمبر ۲۲ مورخہ ۲۵ مارچ ۱۹۳۰ء)

(۴) تقریر مسٹر برک درباره فروختگی اضلاع کوڑہ والہ آباد۔ "پہلا بادشاہ جسے کمپنی نے روپیہ لے کر فروخت کیا آلِ تیمور کا مغل اعظم تھا۔ یعنی شاہ عالم بادشاہ۔ یہ بلند شخصیت ایسی بلند جو انسانی عظمت کا مطمحِ نظر ہو سکتی ہے۔ عام روایات کے مطابق اپنے عمدہ طرزِ عمل۔ پاک باطنی اور ماہرِ علوم مشرقیہ ہونے کے باعث بہت ہر دل عزیز و محترم تھی۔ اُس کی یہ خوبیاں اور نیز یہ امر کہ اُسی کے سندات کے طفیل میں ہم نے تمام ہندوستانی مقبوضات حاصل کئے۔ اُس کو سرِ بازار فروخت کرنے سے نہ روک سکے۔ اُسی کے نام کا سکہ چلتا ہے۔ اُسی کے نام سے عدل و انصاف کیا جاتا ہے۔ ملک کے طول و عرض میں اُسی کے نام کا تمام عبادت گاہوں میں خطبہ پڑھا جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی اسے بیچ ڈالا گیا۔ ایک سلطنت عطا کر دینے والے معطی اور بکثرت قوموں کے جائز حکمراں کے واسطے اُس کے شاندار عطیات میں سے صرف دو ضلعے کوڑہ اور الہ آباد بطور شاہی ملک محفوظ کر دیئے گئے تھے۔ لیکن ۲۶ لاکھ روپیہ سالانہ (خراج بنگال و بہار) کا زرِ خراج بند کر دینے کے بعد یہ اضلاع بھی اُس کے وزیر شجاع الدولہ کے ہاتھ فروخت کر دیئے گئے۔ اس معاملہ کا سب سے مذموم پہلو جو کچھ لوگوں کو نظر آئے گا وہ یہ ہے کہ ان دو ضلعوں کا سودا ابھی بمشکل محض دو سال کے لئے کیا گیا۔ افسوس کہ اب یہ تیموری شاہزادہ اپنی معمولی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے سے بھی عاجز ہے اور اس کی موجودہ لاچاری میں ہم بخشش کے طور پر بھی اُسے کچھ نہیں دے سکتے"

(ہندوستان اور عہد کمپنی کی صحیح تاریخ رائز آف دی کرسچین پاور ان انڈیا۔ مؤلفہ میجر بی۔ ڈی باسو جلد اول۔ از حیات حافظ رحمت خاں مرحوم صہ ۱۹۹)

(۵) عہد نامہ مِنٹگمری و شجاع الدولہ دربارہ الہ آباد و کوڑہ "قرار پایا کہ چونکہ بموجب عہد نامہ الہ آباد۔ مورخہ ۱۶ اگست ۱۷۶۵ء اضلاع کوڑہ و الہ آباد بادشاہ کو اُن کے اخراجات کے لئے دیدیئے گئے تھے اور ان اضلاع پر بادشاہ نے اپنا قبضہ چھوڑ کر انگریز کمپنی اور وزیر کے مفاد کے خلاف اُن کی سند مرہٹوں کو دیدی اور چونکہ یہ فعل مذکورہ عہد نامہ کی منشا کے خلاف ہے۔ اس لئے یہ مقامات کمپنی ہی کو جس سے بادشاہ نے

انہیں حاصل کیا تھا واپس ہو گئے اور اب وزیر اور کمپنی کے درمیان یہ معاہدہ ہوتا ہے کہ اضلاع مذکور کو ان شرائط کے ساتھ وزیر کے قبضہ میں دیدیا جائے گا کہ وہ سکہ رائج الوقت اودھ کے پچاس لاکھ روپیہ کمپنی کو دیں گے جس کی ادائیگی کا یہ طریقہ ہو گا کہ بیس لاکھ روپیہ فوراً نقد اور دو سال بعد پندرہ پندرہ لاکھ روپیہ سالانہ دو قسطوں میں ادا ہو گا۔"

(ہسٹنگز اینڈ دی روہیلہ وار از حیات حافظ رحمت خاں مرحوم ص۱۱۱)

ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ اس معاہدہ میں کس قدر جھوٹ اور فریب اور دیدہ دلیری سے کام لیا گیا ہے۔ جس پر پرک کی تقریر سابق روشنی ڈالتی ہے۔

(۶) ۱۸۳۳ء میں تاج برطانیہ نے ایک طرف تو ایسٹ انڈیا کمپنی کو تجارت سے روک کر بیس سال کے لئے صرف ملک گیری اور حکومت کا فرمان اور پٹہ دیا اور دوسری طرف مندرجہ ذیل اعلان کیا:-

"اور قانون بنایا جاتا ہے کہ ممالک مذکور کے کسی باشندے کے لئے یا ملک معظم کی کسی رعیت کیلئے جو ممالک مذکورہ میں سکونت پذیر ہوں کمپنی کا کوئی عہدہ، کوئی خدمت اور کوئی ملازمت، مذہب، جائے ولادت، نسل یا رنگ کی بنا پر ممنوع نہ ہو گی۔"

مگر اس عہد و پیمان شاہی اور اعلان تاج برطانی کی ہمیشہ خلاف ورزی کی گئی اور کبھی بھی اس کو شرمندۂ عمل نہیں کیا گیا۔ وائسرائے ہند لارڈ لٹن کے مندرجہ ذیل الفاظ ملاحظہ ہوں:-

۱۸۳۳ء کا مسودہ قانون جو پارلیمنٹ نے منظور کیا ہے اتنا مبہم ہے اور دیسی باشندوں کے متعلق حکومت ہند کی ذمہ داریاں محتاج تشریح رکھنا ایسی بین غلطی ہے کہ قانون منظور ہوتے ہی اس کے نتائج ظاہر ہونے لگے اور حکومت ہند اس کی پابندی سے گریز کرنے کی تدابیر کرنے لگی۔ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے روز افزوں طبقے نے (جس کی ترقی میں حکومت ساعی رہتی ہے مگر اس کی خواہشات پوری نہیں کر سکتی) اس قانون کی دفعات کا مطالعہ کیا ہے اور دل پر نقش کر لیا ہے اب اس قانون کی رو سے اگر کسی ہندوستانی کو ایک بار ایسا عہدہ مل جائے جو پہلے سول سروس والوں کے لئے مخصوص تھا تو اس کو یہ توقع اور دعوی کرنے کا

حق ہے کہ ترقیات کا زینہ بالتدریج طے کرنے کے بعد بڑے سے بڑے عہدہ پر اُس کا تقرر ہو سکتا ہے۔ ہم سب سمجھتے ہیں کہ یہ حقوق اور توقعات نہ کبھی پوری کیجائیں گی نہ کیجا سکتی ہیں۔ گویا ہمارے سامنے اس وقت دو راہیں تھیں یعنی ممنوع کر دینا یا فریب دینا۔ اور ہم نے وہ راہ اختیار کی جس میں راست روی سب سے کم تھی۔ مقابلہ کے امتحان جیسے کہ انگلستان میں رائج ہیں ہندوستانیوں کے لئے مقرر کرنا یا شرکت امتحان کے وقت امیدواروں کی قید عمر میں تخفیف کر دینا۔ وہ عریاں حیلے ہیں جو بالقصد اس لئے اختیار کئے گئے ہیں کہ اس قانون کو مفلوج اور معطل کر دیا جائے۔ چونکہ یہ تحریر خفیہ ہے اس لئے بلا تامل میں کہنے کو تیار ہوں کہ میرے نزدیک ہندی اور برطانوی دونوں حکومتیں ابھی تک اس الزام کا معقول جواب نہیں دے سکتی ہیں کہ انہوں نے ہندوستانیوں کے کان تک تو ایک وعدہ جانفزا پہونچا دیا لیکن اُن کے قلوب کو ایفاء کی مسرت سے محروم رکھنے کی کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔

(حکومت خود اختیاری صفحہ ۴۴ و ۴۵)

(۷) ڈیوک آف آرگل کہتا ہے:۔

"میں اعتراف کرتا ہوں کہ ہم ادائے فرض سے قاصر رہے اور ہم نے جو وعدے اور پیمان کئے تھے پورے نہیں کئے۔" (حکومت خود اختیاری صفحہ ۴۵)

(۸) اسی سلسلہ میں لارڈ سالسبری کہتا ہے:۔

"دوستو! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس گندم نمائی اور جو فروشی سے فائدہ کیا ہے۔"

(۹) مذکورہ بالا اعلان ۱۸۳۳ء جبکہ بنایا گیا اور پاس ہو کر مشتہر ہوا تو ممبران پارلیمنٹ (ہاؤس آف کامنس) نے نہایت زوردار الفاظ میں اس کی معقولیت اور ضرورت کو تسلیم کیا تھا بلکہ لارڈ میکالے نے مندرجہ ذیل الفاظ میں اس کی زوردار تائید کی تھی۔

"ممکن ہے کہ ہمارے نظام حکومت کے سایہ میں ہندوستان کی سیاسی ذہنیت اس قدر نشوونما پا جائے کہ خود اس نظام کے اندر نہ سما سکے۔ ممکن ہے کہ بہتر حکومت کے ذریعہ سے ہم اپنی رعایا

میں بہتر حکومت کی صلاحیت پیدا کر دیں اور مغربی علوم سے آشنا ہونے کے بعد آئندہ کسی

عہد میں وہ مغربی اداروں کا مطالبہ کرنے لگیں۔ وہ دن کبھی آئے گا یا نہ آئے گا مجھے معلوم

نہیں لیکن اُس کو روکنے یا ٹالنے کی ہرگز کوشش نہ کروں گا اور جب کبھی یہ دن آئے گا تو برطانیہ

کی زندگی میں وہ دن سب سے زیادہ فخر و مباہات کا دن ہوگا۔"

مگر حسب پیشینگوئی لارڈ میکالے جبکہ ہندوستانیوں نے تعلیم میں اس قدر کامیابی حاصل کر لی کہ امتحان مقابلہ میں وہ انگریزوں کو شکست دینے لگے تو زوردار کوشش ہونے لگی کہ انگریزوں کے لئے سول سروس کے عہدے مخصوص کر دیئے جائیں۔ ذمہ داران حکومت نے ضروری سمجھا کہ اس اعلان کو عمل میں لانے سے گریز کیا جائے اور حیلوں اور بہانوں سے اس کو مفلوج کر دیا جائے۔ چنانچہ عرصہ دراز تک جس کی مقدار تقریباً بیس سال ہوتی ہے۔ ہندوستانی عہدہائے عالیہ سے اس کے بعد بھی بالکل محروم رہے۔ آخر کار احتجاجی آوازیں اُٹھیں شکایات کے بازار گرم ہوئے، پروٹسٹوں کی بھرمار ہوئی، حق طلب اور حق کوش زبانوں اور قلموں نے فضا کو اپنی گونج سے مکدر کر دیا تو آسمان انگلینڈ سے کڑکتی ہوئی آواز آئی کہ ہندوستانی نالائق ہیں عہدہ ہائے عالیہ کی قابلیت نہیں رکھتے۔ مگر وہ ہندوستانی دماغ اور قلم، اور وہ مشرقی قلب اور گروہ، جس کے دماغی اور علمی بہترین کارناموں سے تاریخ قدیم بھری پڑی ہے اور جس کی تصدیق خود یوروپین مورخین کر چکے ہیں کب دب سکتا تھا اور کب ایسی لچر اور پوچ بات پر سکوت کر سکتا تھا چنانچہ بار بار جوابات اور سوالات کی بھرمار ہوتی رہی تو حسب عادت کمیشن بٹھایا گیا۔ تحقیقات پر معلوم ہوا کہ عدم قابلیت کا عذر بالکل غلط اور محض بہانہ ہی بہانہ اور حیلہ سازی ہے اُن کا عہدوں سے محروم ہونا صرف ہندوستانیت اور کالے رنگ ہونے کی بناء پر اور نسلی امتیاز کی وجہ سے ہے۔ سر ارسکن پیری (جس نے اس تحقیقات قابلیت میں شہادت دی تھی) کہتا ہے کہ "ہندوستانی مجوزین کی قوت فیصلہ کمپنی کے اُن ججوں سے جو اپیل سنتے تھے بدرجہا بہتر تھی"

سر جان سلیور (مدراس گورنمنٹ کا ممبر) کہتا ہے:۔

"وہ لوگ (باشندگان ہند) ٹیکسوں کے لگانے میں جن کی ادائگی کے لئے وہ مجبور کئے جاتے

ہیں کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ قوانین کو جن کی تعمیل اُن پر فرض ہوتی ہے مرتب کرنے میں ان کی کوئی آواز نہیں ہوتی اپنے ملک کے انتظام میں اُن کا کوئی حقیقی حصہ نہیں ہوتا اور اُن کے حقوق دیئے جانے سے اس شرمناک حیلہ سے انکار کیا جاتا ہے کہ ان میں اس قسم کے فرائض انجام دینے کے لئے ذہنی اور اخلاقی اوصاف کی کمی ہے“۔

(دت، صفحہ ۲۰۲ جلد ۲)

لارڈ آڈسلے ۱۸۶۷ء میں کہتا ہے:۔

”اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس فرض کو ادا کریں جو ہندوستان کی طرف سے ہم پر عائد ہے تو ہم اسی طرح سبکدوش ہو سکتے ہیں کہ ملک میں جتنے اشراف اور اکابر ہیں اُن کی امداد اور مشورہ سے فائدہ اُٹھائیں۔ یہ جواب کہ ہندوستانی دماغ میں تدبر اور قابلیت کا سرمایہ ناکافی ہے ایک بے معنی لغویت ہے“۔

(۱۰) بہر حال مذکورہ بالا اعلان ۱۸۳۳ء کے ایفاء کی مدبرین برطانیہ کی طرف سے برابر عملی مخالف ہوتی رہی اور طرح طرح کے جھوٹے حیلوں سے اُس کو ٹلایا گیا۔ ۱۸۵۷ء میں انقلابی تحریکات کی آگ کے نشو ونما پانے کے وجوہ میں سے یہ وجہ بھی تھی۔ اس لئے ۱۸۵۸ء کے اعلان وکٹوریہ میں اس امر کو اور بھی زیادہ قوت کے ساتھ سراہا گیا۔ یہ اعلان نہ صرف ملکہ وکٹوریہ (تاج برطانیہ) کی طرف سے تھا بلکہ دار العوام (ہاؤس آف کامنس) اور دار الامراء (ہاؤس آف لارڈس) اور مذہبی طبقہ (کلیسا) کی طرف سے متفقہ تھا اس کی دفعہ ۶ میں مندرجہ ذیل الفاظ تھے:۔

”اور یہ بھی ہمارا حکم ہے کہ جہاں تک ممکن ہے ہماری سب رعیت کو گو کسی قوم اور مذہب کی ہو بلا تعرض وطرفداری کے ہماری ملازمت میں اُن عہدوں پر جن کو وہ اپنی علمیت اور قابلیت اور دیانت سے انجام دے سکتے ہوں مقرر کرتے رہیں“

۱۸۵۸ء کا یہ شہنشاہی اعلان بہ نسبت ۱۸۳۳ء کے پارلیمنٹی اعلان کے نہایت زوردار اور تاکیدی الفاظ کے ساتھ وسیع اور واضح پیمانہ پر واقع ہوا تھا مگر کیا اُس کو عملی جامہ پہنایا گیا اور اُس کے ایفاء کا خیال کیا گیا۔

مسٹر ہیرلڈ کاکس کا آرٹیکل مندرجہ سنڈے ٹائمز لندن اس کو بتلائے گا۔ اُس کے اقتباس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

"مسٹر گاندھی کے طرز عمل میں برطانی حکومت کی طرف سے ایک بین انقلاب رونما ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ موجودہ برطانی مدبرین کی ناکامی ہے کہ وہ اُس مساویانہ عدل و انصاف کی عزت نہیں کرتے جس کا ملکہ معظمہ کے عہد حکومت میں اعلان کیا گیا تھا۔ آج اُس اعلان کا حوالہ دینا ضروری ہے کہ اُس کی مسلسل خلاف ورزی نے ہی یہ دن دکھایا کہ سلطنت کو نازک ترین مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے"۔ اعلان کے الفاظ یہ تھے۔

"باعتبار رنگ، نسل، مذہب، یا زبان قانون کسی میں فرق و امتیاز نہیں کرے گا بلکہ اس کے تحفظ کا پورا پورا خیال رکھا جائے گا کہ ہر ایک سے غیر جانبدارانہ سلوک ہو"

(اخبار فتح دہلی مورخہ ۱۵۔ اپریل ۱۹۲۱ء)

لالہ لاجپت رائے آنجہانی ۱۹۲۰ء میں تحریر کرتے ہیں کہ "اس قسم کے اعلان کو بچانوے سال گذر چکے ہیں مگر آج تک کبھی اُس پر عملدرآمد نہیں ہوتا (نو سو) روپیہ سے (ہزار) روپیہ تک عہدوں پر کل چار فیصدی ہندوستانی مقرر ہیں باقیماندہ چھیانوے فیصدی عہدوں پر انگریز اور انگلو انڈین قائز ہیں حالانکہ وہی ہندوستانی جو انگریزی عملداری میں نالائق قرار دیئے گئے ہیں ہندوستانی ریاستوں میں وزارت اور مدارالمہامی کے کام خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں۔ الخ" (حکومت خود اختیاری صفحہ ۹۱)

ایک ہزار یا اس سے زائد تنخواہ والے عہدوں پر تو ہندوستانیوں کا پہونچنا تقریباً محال ہی رہا۔ ہر قسم کے احتجاجات ہوتے رہے۔ مگر فوجی اعلیٰ عہدے اور سول سروس وغیرہ کے بڑے بڑے عہدے انگریزوں کے لئے ہی مخصوص رکھے گئے۔ یہ صرف عملی کوتاہی نہیں تھی بلکہ ہمیشہ ذمہ داران برطانیہ نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ ایسے ایسے قوی اعلانات شاہی اور پارلیمنٹی پاس شدہ تجاویز کو پائے استحقار سے ٹھکراتے ہی رہے۔

اسی بناء پر پھر اہل ہندوستان کو مطمئن کرنے کے لئے ۱۸۔ اگست ۱۹۱۷ء کو ملک معظم کا مشہور اعلان حکومت خود اختیاری کی بابت شائع کیا گیا جس میں ہندوستانیوں کو ذمہ دار حکومت دینے کا وعدہ تھا۔

اور اس سے اگلے دن اعلان کیا گیا تھا کہ ہندوستانیوں کو فوجی کمیشن کے اعلےٰ عہدے دیئے جایا کریں گے۔ مگر یہ اعلانات بھی باد در ہوا ثابت ہوئے اور چار مہینہ ہی کے بعد رولٹ کمیٹی مقرر کی گئی جو کہ صلح اور آشتی کے بالکل منافی تھی۔ جس کے نتیجہ میں ستیہ گرہ، قتل، غارت گری ظہور پذیر ہوئے۔ بے گناہوں پر ہوائی جہازوں سے بم گرائے گئے۔ مگر جبکہ ترک موالات (نان کوآپریشن) کے موثر حربہ نے گورنمنٹ کے دانت کھٹے کر دیئے تو ڈیوک آف کیناٹ کو بھیجکر ہندوستانیوں کو دلاسا دیا گیا۔ ڈیوک موصوف نے اپنی تقریر میں جو کہ ۹ر فروری ۱۹۲۱ء کو جدید اسمبلی کے افتتاح کے وقت ملک معظم کی طرف سے کی گئی تھی فرمایا:۔

"سالہا سال سے بلکہ چند نسلوں سے ہمدردانِ ملک اور وفادار ہندوستانی اپنی بھارت ماتا کے لئے سوراج کا خواب دیکھ رہے تھے۔ آج میری سلطنت میں آپ کے لئے سوراج کی ابتدا ہو رہی ہے، اور آپ کو ترقی کے وسیع ترین اور اعلےٰ درجہ کے مواقع مل رہے ہیں جن سے میری نوآبادیات کے مانند آزادی حاصل ہو۔"

نیز دوسری تقریروں میں ڈیوک موصوف اور وائسرائے نے صاف الفاظ میں فرمایا کہ:۔

"اب مطلق العنان حکومت کا اصول قطعی طور پر ترک کر دیا گیا۔ پس اس وقت سے ہندوستان معتد بہ درجہ میں اپنا بوجھ خود اٹھائے گا۔"

(روشن مستقبل ص۳۶۹)

(۱۱) مگر افسوس کہ ان جملہ اعلانات بعیدہ اور قریبہ موکدہ اور غیر موکدہ کو جس طرح پہلے سے توڑنے کا سلسلہ جاری تھا۔ اب بھی جاری رہا۔ اگر کبھی کچھ مشکلات پیش آئیں تو زوردار الفاظ میں مواعید اور عہود کو دُہرایا گیا اور جب اطمینان کی سانس آنے لگی تو سب کو توڑ تاڑ کے رکھ دیا گیا چنانچہ مسٹر لائیڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ ہاؤس آف کامنس (دار العوام) میں ۲۔ اگست ۱۹۲۲ء کو تقریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"اگر پہلے سے یہ بات صاف نہیں ہے تو میں صاف طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ ہماری غرض اصلاحات دینے سے یہ نہیں ہے کہ انجام کار ہم اپنی امانت سے بالکل دست بردار ہو جائیں۔۔۔۔۔۔ جو

بات خاص طور پر میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہندوستانی بحیثیت جماعت مقننہ کے یا بہ
حیثیت مدبران ملک کے خواہ کیسے ہی کامیاب کیوں نہ ہوں مگر میرے نزدیک کوئی زمانہ ایسا نہ ہوگا کہ ان کا کام
انگریزی عہدہ داروں کی ایک تھوڑی سی تعداد کے بغیر چل سکے گا جو ساڑھے اکتیس کروڑ
کی آبادی میں کل بارہ سو ہیں"۔

نیز وزیر اعظم موصوف نے اسی تقریر میں یہ بھی فرمایا:۔

"انگریزی افسران ملازمت کی تمام عمارت کے لئے بمنزلہ فولادی قالب کے ہیں اگر اُس
قالب کو ہٹا لیا جائے تو تمام عمارت منہدم ہو جائے گی"۔

مسٹر لائیڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ اور ممبران پارلیمنٹ کی بدعہدی اور دیدہ دلیری کو ملاحظہ فرمائیے کہ مندرجہ
بالا تقریر کس قدر غداریوں اور عہد شکنیوں سے بھری ہوئی علانیہ عمل میں لائی گئی ہے جس نے گذشتہ تمام شاہی
اور پارلیمنٹری اعلانات کو جو کہ دربارہ حقوق اہل ہند متعلقہ ملازمتوں اور آزادئ ہند وغیرہ تھے سب کو یک قلم
پاش پاش کر دیا اور پھر کوئی مخالف آواز ہاؤس سے نہیں نکلی۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب مرحوم اس زمانہ میں وزیر ہند کی کونسل کے ممبر لندن میں موجود تھے
اس عہد شکن تقریر سے نہایت زیادہ متاثر ہوئے اور ۳۔ اگست ۱۹۲۲ء کو اور پھر ۶۔ اگست کو دو زبردست
چٹھیاں وزیر ہند کو بطور احتجاج لکھیں اور درخواست کی کہ وزیر اعظم کے پاس بھیجدی جائیں۔ اُن میں نہایت
تفصیل کے ساتھ دکھایا کہ وزیر اعظم کی یہ تقریر شاہی اعلان ۱۹۱۶ء اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء اور
شاہی اعلان ۱۹۲۱ء کے کسقدر منافی تھی۔ حکومت کو کونسی ضرورت پیش آئی کہ ۱۹۲۱ء کے اعلان کے صرف
ڈیڑھ سال بعد اس تقریر کے ذریعہ انہیں کالعدم کر دیا گیا۔ صاحبزادہ صاحب نے اپنی چٹھی میں یہ بھی دکھایا تھا کہ
"قانون گورنمنٹ ہند ۱۹۱۹ء کے الفاظ یہ تھے:۔

"پارلیمنٹ کی پالیسی جس کا اعلان کیا جا چکا ہے یہ ہے کہ ہندوستان کے ہر شعبہ میں ہندوستانیوں
کی تعداد مسلسل بڑھائی جائے تاکہ اس سے برٹش انڈیا میں بحیثیت سلطنت برطانیہ کے ایک
اہم جزکے ذمہ دار حکومت کا مسلسل احساس پیدا ہو"۔

جب مندرجہ بالا الفاظ میں کوئی قید کسی قسم کی نہ تھی تو اب بارہ سو انگریز عہدہ داروں کی کیوں قید لگائی جاتی ہے اور جبکہ وہ ہمیشہ مسلط رہیں گے تو ہندوستانیوں میں خود اپنا انتظام کرنے کی قابلیت کیسے پیدا ہو گی۔"

(روشن مستقبل باب نہم صفحہ ۳۷۲ تا ۳۷۵)

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب مرحوم نے بہت کچھ زور لگایا مگر لاٹھی کی طاقت کے سامنے حجت اور دلیل کہاں چل سکتی ہے۔ اور سرکاری برطانوی افراد کے ذاتی منافع کے سامنے ہندوستانیوں کے مفاد اور حقیقی فرائض سلطنت اور عہد کے ایفا کی کیا پرواہ کیجا سکتی ہے۔ یہاں تو خود غرضیوں اور اپنے حلوے مانڈے کی فکر ہے۔ اور بے ایمانی اور عہد شکنی وتیرہ ہے۔ جس کے ذریعہ سے ہمیشہ انسانی شرافت کا خون بہایا گیا ہے۔

(۱۲) توسیع مملکت کے متعلق اعلان شاہی ۱۸۵۸ء یوں تو لوٹ کھسوٹ اور زرکشی کی انتہائی اور روز افزوں حرص انگریزوں میں اسی وقت سے تھی جب سے کہ وہ ہندوستان میں وارد ہوئے تھے بلکہ یہی چیز ان کے انگلستان چھوڑ کر سفر کرنے کی باعث ہوئی تھی۔ مگر جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء سے اس میں چار چاند لگ گئے تھے انہوں نے ایک طرف تو تجارت کے بڑھتے ہوئے وسائل سے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا اور دوسری طرف ملک گیری اور اقتدار و غلبہ سے غارتگری اور لوٹ کھسوٹ کا بازار خوب گرم کیا۔ رؤساء اور عام پبلک کو اس دور میں جن جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا ان کو بجز علام الغیوب کوئی نہیں جانتا۔ ان دونوں حیثیتوں کے جمع ہو جانے سے کمپنی کو بے شمار فوائد اور ہندوستانیوں کو بے شمار اسباب ہلاکت و بربادی کا سامنا کرنا پڑا بالآخر ہندوستان اور یورپ میں آوازیں اٹھیں اور بالخصوص ان انگریز تاجروں کی طرف سے جو کہ ایسٹ انڈیا کمپنی میں حصہ دار نہیں تھے اور ان کو کمپنی کے اقتدار کی بنا پر من مانی کارروائی کا موقعہ نہیں ملتا تھا بالآخر ۱۸۳۲ء میں تاج برطانیہ کی طرف سے کمپنی کو حقوق تجارت سے روک دیا گیا اور صرف ملک گیری اور حکمرانی کا چارٹر دیا گیا جس کی وجہ سے تجارتی ذرائع سے جو سونے اور چاندی کے دریا کمپنی کے گھروں میں بہتے تھے ان کے دہانے خشک ہو گئے۔ منہ کو انسانی خون لگ جانے کے بعد درندے کی حرص و آز انتہائی زور پر ہو جاتی ہے۔ اس لئے یہ

سپید بھیڑیئے کہاں صبر کر سکتے تھے انہوں نے طرح طرح کے نئے نئے اطوار و ذرائع توسیع مملکت اور تحصیل دولت اور زر کشی کے قائم کئے۔ معاہدوں کو توڑنا حلیف اور تابعدار ریاستوں پر نئے نئے بہانوں اور تشددات سے قبضہ کرنا، جابرانہ قوانین خود بنا کر ملک میں نافذ کرنا کسی شرمناک اور انسانیت سوز حرکت کو برا نہ سمجھنا وغیرہ وغیرہ روزمرہ کا مشغلہ تھا۔ سندھ بغیر کسی وجہ کے قلمرو انگریزی میں ملا لیا گیا۔

افغانستان میں فوجیں رکھنے کی ناکام کوشش کی گئی۔ برہما کا بچا کھچا حصہ، پنجاب، اودھ اور دوسری چھوٹی چھوٹی ریاستیں براہ راست کمپنی کی حکومت میں لے لی گئیں۔ متبنیٰ کے قانون کو غیر قابل اعتبار قرار دے کر اُن جملہ ریاستوں کو اپنے قبضہ میں لے لیا گیا۔ جن پر والی سابق کا متبنیٰ حسب دستور ہندوستان قابض تھا۔ ایسے امور کی بناء پر عام ناراضی پھیل گئی تھی جو کہ ۱۸۵۷ء کی انقلابی تحریک کی باعث یا ممد و معاون بنی۔ اسی بناء پر کوئن وکٹوریہ کے اعلان میں دفعہ ۳ مندرجہ ذیل الفاظ میں رکھی گئی۔

"جو ملک ہمارے قبضہ میں ہے اُسے زیادہ کرنا نہیں چاہتے اور جب یہ ہم کو گوارا نہیں ہے کہ کوئی شخص ہماری مملکت یا حقوق میں دست اندازی کرے تو ہم بھی پیش قدمی کی اپنی طرف سے بہ نسبت ملکیت یا حقوق اوروں کے اجازت نہ دیں گے اور والیانِ ہند کے حقوق و منزلت اور عزت مثل اپنے حقوق و منزلت اور عزت کے عزیز سمجھیں گے۔"

مگر اس شہنشاہی اعلان کو بھی ذمہ دارانِ برطانیہ نے توڑ تاڑ کر رکھ دیا اور خلاف ورزی کرنے میں انتہائی جسارت کو عمل میں لاتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب تک اپنی کمزوری کا کچھ احساس یا مخالف طاقتوں کا خوف رہا جب تک تو اس پر قائم رہے مگر جوں ہی یہ یقین ہو گیا کہ اب ہم کو کسی مخالف طاقت کا خوف نہیں ہے اور نہ ہم میں کوئی کمزوری باقی ہے تو توسیع ملک اور قبضہ ممالک کا سودا سوار ہو گیا۔ خود انگلستان میں توسیع مملکت کی تحریک شروع ہوئی اور وائسرائے ہند کو حکم دیا گیا کہ وہ مغربی شمالی سرحد پر پیش قدمی کرے اس وقت وائسرائے ہند لارڈ نارتھ بروک تھے انہوں نے اعلان وکٹوریہ کی پابندی اور اس پالیسی کے

خطرات سے بچنے پر زور دیا ایک عرصہ تک تحریرات وغیرہ کا سلسلہ جاری رہا مگر سربارتھ فیرجو کہ اس عہد شکنی اور فارورڈ پالیسی کا سرگرم ممبر تھا اور عرصہ سے اس جد وجہد میں کامیاب ہوکر انگلستان کے با اثر اشخاص کو اپنا ہم خیال بنا چکا تھا۔ ایوانِ حکومت میں بھی کامیاب ہوگیا۔ چنانچہ لارڈ نارتھ بروک کو ۱۸۷۶ء میں استعفا دیکر قبل از وقت ہندوستان چھوڑنا پڑا اور لارڈ لٹن کو اس کی جگہ وائسرائے بنایا گیا اُس نے ہندوستان پہونچکر کابل کو مشن بھیجا اور پھر افغانستان اور سرحدی مقامات پر حملوں اور دراز دستیوں کے دروازے کھل گئے افغانستان پر بار بار چار مرتبہ حملے ہوئے جن میں لاکھوں جانوں اور کروڑوں روپیوں کا نقصان ہوا۔ اُس وقت سے لے کر آج تک کم وبیش چالیس لڑائیاں ہو چکی ہیں جن میں سے صوات، مہانہ، بنیر، چترال، کھجوری کابل وغیرہ کی لڑائیاں مشہور ہیں۔ آفریدیوں، مسعودیوں، وزیریوں، مہمندیوں وغیرہ قبائل کو تاخت وتاراج کیا گیا اُن کی زمینیں چھینی گئیں۔ ان لڑائیوں پر ہندوستان کے خزانہ سے روپیہ اور جانیں پانی کی طرح بہائی گئیں، مسٹر آصف علی کی تحقیقات کے مطابق سات ارب سے زیادہ اس عہد شکن پالیسی کی بناء پر خرچ ہوا ہے جس میں سے صرف پچاس لاکھ پونڈ انگلستان سے وصول ہوا حالانکہ صرف کابل کی لڑائیوں پر دو کروڑ پونڈ سے زائد خرچ ہوئے تھے۔ قومی جماعتیں بالخصوص کانگریس اس پالیسی کے خلاف ہمیشہ آواز بلند کرتی رہی ہیں چنانچہ کانگریس نے ۱۸۹۶ء میں مندرجہ ذیل رزولیوشن پاس کیا۔

> "سرحد کی پیش قدمی کی پالیسی سلطنتِ برطانیہ کے لئے اور بالخصوص ہندوستان کے مفاد کے لئے مضرت رساں ہے کیونکہ اُس کی وجہ سے ہندوستان کے حدود کے باہر فوجی مہمات بھیجنی پڑتی ہیں جس سے قیمتی جانیں تلف ہوتی ہیں اور رعایا کا روپیہ ضائع ہوتا ہے اس لئے کانگریس مستدعی ہے کہ اس جارحانہ کارروائی کو بند کیا جائے اور یہ امر قرار دیا جائے کہ درآنحالیکہ یہ مہماتِ شاہی اغراض کے لئے ضروری سمجھی جائیں تو اُن کے صرف کا بڑا حصہ سلطنتِ برطانیہ کے خزانہ سے ادا کیا جائے۔"

مگر قوت کے غرور نے عہد شکنی کی مستیوں میں اضافہ ہی کیا۔ اور ہوسِ ملک گیری روز افزوں ہوتی رہی

(۱۳) یہی لارڈ لٹن جو کہ لارڈ نارتھ بروک کی جگہ توسیع ملک کے اعلانِ شاہی کو توڑنے اور فارورڈ (پیش قدمی کی)

پالیسی قائم کرنے کے لئے ہندوستان بھیجے گئے تھے۔ ۲ مئی ۱۸۰۸ء میں اپنی وائسرائی کے زمانے میں وزیر ہند کو مندرجہ ذیل الفاظ لکھتے ہیں:۔

"مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ انگلستان اور ہندوستان دونوں ملکوں کی حکومتوں کے پاس اس وقت تک اس الزام کا کوئی جواب نہیں ہے کہ انہوں نے جو وعدے کئے اُن کی خلاف ورزی کرنے کے کسی ذریعہ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا"۔

(مدینہ بجنور مورخہ ۲۸ - اکتوبر ۱۹۴۱ء جلد ۳۰ - ۔۔۔)

(۱۴) "مارک سولیویں" جنگ اور بے چینیوں کے اسباب کو تشخیص کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

"اس کی تمام ذمہ داری انہیں وعدہ خلافیوں پر عائد ہوتی ہے مسٹر چرچل کو اس پر غور کرنا چاہیئے"۔ (مدینہ بجنور جلد ۳۰ مورخہ ۲۰ اکتوبر ۔۔۔)

(۱۵) ۱۸۵۸ء کے شہنشاہی اعلان کی دفعہ ۷ میں ہے" اور کا ہم کو بخوبی علم ہے کہ اہل ہند اس اراضی کو جو اُن کے بزرگوں سے انہیں وراثتہً پہونچی ہے بہت عزیز رکھتے ہیں اس لئے ہم کو بھی اُس کا بڑا لحاظ ہے بلکہ چاہتے ہیں کہ یہ حقوق اُن کے جو اراضی سے متعلق ہیں بشرط ادا کرنے مطالبہ سرکاری کے محفوظ رہیں اور ہمارا حکم ہے کہ بوقت تجویز و نفاذ قانون کے عموماً حقوق قدیمی اور ملک کے رسم ورواج پر لحاظ کامل ہوتا رہے"۔

نیز دفعہ ۹ میں ہے"...... اور ملک کا ایسا انتظام کیا جائے کہ جس سے ہماری ساری رعایا باشندہ ملک مذکور کو فائدہ ہو کیونکہ اُن کی فارغ البالی ہمارے لئے موجب اقتدار اور اُن کی فراغت ہمارے لئے باعث بے خطری اور اُن کی شکر گذاری ہمارے لئے پورا صلہ ہے"۔

مگر کیا ذمہ دارانِ برطانیہ نے اس اعلان شاہی کو عملی جامہ پہنایا اور اس عہد کو ایفا کے درجہ پر پہونچایا سرولیم ویڈر برن (جو کہ ہندوستان میں بڑے ممتاز عہدوں پر فائز رہ چکے تھے اور بعد میں پارلیمنٹ کے ممبر ہو گئے تھے) کے وہ الفاظ جو کہ انہوں نے ۱۸۹۶ء میں دارالعوام (ہاؤس آف کامنس) میں تقریر کرتے ہوئے کہے تھے اس کا جواب دیں گے:۔

ہندوستانی رعایا کی تباہ حالی اور مفلسی کے تین خاص وجوہ یہ ہیں:۔

(اول) مالگذاری کی زیادتی۔ اگرچہ گورنمنٹ برطانیہ کے احکام یہ تھے کہ مالگذاری ایسی نہ ہونی چاہیئے کہ اُس میں زمین کا کل منافعہ آجائے بلکہ اس طرح پر مقرر کیجانی چاہیئے کہ کاشتکار کو اُس کی محنت کا معاوضہ اور جو سرمایہ اُس نے کاشت میں لگا رکھا ہے اُس کا سود اور منافع خالص کا نصف حصّہ اُس کے پاس بچ سکے لیکن یہ بات خود ہندوستان کے حکام تسلیم کرچکے ہیں کہ ان ہدایات پر ہندوستان میں کبھی عملدرآمد نہیں ہوا۔ یہاں مالگذاری اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ وہ سرمایہ کے سود اور کاشتکار کی مزدوری کے حصّہ کو ہضم کرلیتی ہے اور باوجود یہ امر تسلیم کرلینے کے مالگذاری ہمیشہ اس طرح بڑھائی جاتی ہے کہ بعض مواضعات میں تو سو فیصدی اور بعض خصوصی اراضیات پر ہزار فیصدی تک پہونچ جاتی ہے۔

(دوم) دوسرا خاص سبب رعایا کی تباہی کا یہ ہے کہ وصول لگان و مالگذاری کا طریقہ نہایت سخت ہے جس کی رو سے ایک مقررہ سالانہ رقم وقت معینہ پر وصول کیجاتی ہے اور خراب فصلوں میں جو نقصان ہوتا ہے اُس کا بوجھ کاشتکار پر ڈالا جاتا ہے۔ یہ بوجھ ایسا ہے کہ کاشتکار اُس کو برداشت نہیں کرسکتا اور اُس کو سودی قرضہ لینا پڑتا ہے۔

(سوم) "اور تیسرا سبب یہ ہے کہ یورپ کے نمونہ پر قرضہ وصول کرنے کے لئے عدالتیں قائم کردی گئیں ہیں۔ جن کی وجہ سے قرضخواہ کی پشت پناہی پر تمام سلطنت کی قوت ہوتی ہے اور اُس کو اس قابل بنادیتی ہے کہ وہ رعایا کو غلامی کے ادنےٰ درجہ تک پہونچادے۔" (تقاریر و تحریرات سر ولیم ولڈربرن مطبوعہ نیٹسن پریس صفحہ ۱۲۰)

(از مسلمانوں کے افلاس کا علاج صـ۱۴)

مذکورہ بالا شہادت معمولی شہادت نہیں ہے جس سے جملہ حکام برطانیہ کی بدعہدی اور عہد شکنی آفتاب کیطرح روشن ہے۔ اور جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ عہد شکنی ایک دو دن یا ایک دو مہینہ یا سال دو سال میں عمل میں نہیں لائی گئی بلکہ ہمیشہ اسپر عملدرآمد ہوتا رہا جس کی وجہ سے عام طبقہ بالخصوص کاشتکار انتہائی بربادی کو پہونچ گئے۔

پھر اس پر مزید طرفہ ماجرا یہ ہوا کہ مالگذاری کا اس قدر بھاری اور ثقیل بوجھ اگر ایک ہی مرتبہ بطور دوامی بندوبست کے جیسا کہ لارڈ کارنوالس نے کیا تھا کردیا جاتا تو ممکن تھا کہ گرانی اجناس کے وقت میں کاشتکار کم

اپنی اور اپنے بچوں کی سسکتی ہوئی جان بچا لینے کا موقعہ ہاتھ میں آجاتا جیسا کہ لارڈ کارنوالس کے بندوبست دوامی کئے ہوئے علاقوں میں رعایا کو بعد میں حاصل ہوا (جس میں سابقہ مالگذاری پر نوے فیصدی یا اُس سے زیادہ اضافہ کیا گیا تھا اور کاشتکار کے پاس صرف دس فیصدی چھوڑا گیا تھا۔ مسٹر آرسی دت لکھتا ہے۔ کہ ۱۷۹۳ء سے ۱۸۲۲ء تک صوبہ بنگال میں زمینداروں سے ۹۰ فیصدی وصول کیا گیا ہے) مگر کارپردازان برطانیہ کی حرص و طمع اور ہندوستانیوں کے لوٹ کھسوٹ کے عزائم نے اس کا موقعہ نہیں دیا۔ ۱۸۵۸ء کے اعلان کے بعد کچھ عرصہ تک جنگ اور انقلاب ۱۸۵۷ء کی بھیانک صورت ان کے دماغوں اور آنکھوں کے سامنے پھرتی رہی اور مثل فارورڈ پالیسی کے زیادتی لگان و مالگذاری سے بھی گریزاں رہے مگر جبکہ اپنی قوت کا نشہ اور ہندوستانیوں کے ضعف کا یقین پورا ہو گیا تو سب کو بالائے طاق رکھدیا گیا۔ اور وکٹوریہ کے اعلان کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا گیا۔ تفصیل اس کی مجملاً حسب ذیل ہے۔

۱۸۶۱ء میں کرنل بیرڈ نے قانون اراضی کی بخوبی جانچ کی اور اس کی اصلاح پر زور دیتے ہوئے سفارش کی کہ اگر باقیماندہ علاقہ میں بھی (جو کہ لارڈ کارنوالس کے بندوبست سے بچ گئے تھے اور وہاں میعادی بندوبست جاری تھا جن میں ہر دس پندرہ برس کے بعد اضافہ ہوتا رہتا تھا) دوامی بندوبست جاری کر دیا جائے تو قحط کا زور بے حد کم ہو سکتا ہے۔ اس کو قبول کرتے ہوئے سکرٹری آف اسٹیٹ ہند نے ۹ جولائی ۱۸۶۲ء میں اس سفارش کی تائید کی۔ چنانچہ سلطنتِ برطانیہ کی گورنمنٹ نے اس کو منظور کر لیا اور ۲۳ - مارچ ۱۸۶۷ء کو وزیر ہند سر اسٹیفورڈ نورتھ کورٹ نے ہز مجسٹی کی گورنمنٹ کے اس فیصلہ کی کہ بندوبست استمراری جاری کر دیا جائے دوبارہ تصدیق کی۔ وہ لکھتا ہے کہ

"ہز میجسٹی کی گورنمنٹ تیار ہے کہ مالگزاری میں اضافہ ہونے کی امید کو قربان کر دے اس لئے کہ مالکانِ اراضی کی اغراض کو حکومتِ برطانیہ کی بقا سے وابستہ کر دینا زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔"

(دت جلد ۲ صفحہ ۲۸۸)

مگر وہ انگریزی دل اور دماغ جس کی گھٹی میں عہد شکنی اور بدعہدی پڑی ہوئی ہے اور جس کے ہر ہر جوڑ و بند میں طمع اور لالچ اور زرکشی کا طوفان ہمیشہ جوش کھاتا رہتا ہے۔ وہ کہاں ایسے اعلان اور قانون پر قائم رہ سکتا تھا جس میں

اُس کی حرص و آز کو نقصان اور ہندوستانیوں کو کسی قسم کے فائدہ کی صورت ہو چنانچہ یہی دوامی بندوبست کی مذکورۂ بالا تجویز جس کو ۱۸۶۲ء میں ملکہ معظمہ نے منظور کر لیا تھا اور ۱۸۶۶ء میں وہ مستحکم بھی ہو گئی تھی جس سے رعایا کے دلوں میں خوشی اور اُمید کے جذبات پیدا ہو چکے تھے اور صوبہ آگرہ (یو۔پی) کے بعض مشرقی اضلاع میں اس کا نفاذ بھی ہو چکا تھا۔ ۲۰ مارچ ۱۸۸۳ء کو اکیس سال بعد سکریٹری آف اسٹیٹ کے مندرجہ ذیل الفاظ نے اس کو ختم کر دیا۔

"جس پالیسی کی داغ بیل ۱۸۶۲ء میں رکھی گئی تھی اب وقت آگیا ہے کہ اس کو باضابطہ ترک کر دیا جائے" (دت صـ ۲۹۹)

اصلی واقعہ یہ ہے کہ گورنمنٹ کو رعایا کی مسلسل وفاداری اور اُن کے ضعف کی بنا پر کامل اطمینان ہو گیا تھا اس لئے خلاف اعلان شاہی میعادی بندوبست کو ہی جاری رکھا گیا جس میں ہندوستانیوں کا خون زیادہ سے زیادہ چوسا جا سکتا تھا۔ اس زیادتی لگان و مالگزاری کی وجہ سے ہزاروں زمیندار اور تعلقدار برباد ہو گئے اور اُن کی جائدادیں نیلام کر دی گئیں۔

مسٹر رابرٹ ناٹ کہتا ہے:۔

"تعلقہ داران سے ہمارے مطالبہ جات اُس رقم سے جو وہ پہلے ادا کرتے تھے۔ تین گنے بلکہ اس سے بھی زائد ہیں اور اس زیادتی کے معاوضہ میں کوئی فائدہ نہیں ہے جو اُن کو حاصل ہوا ہو۔ ساہوکاروں نے جن سے تعلقداروں کو تباہ کن شرح سود پر قرضے لینا پڑے ہیں اپنے مطالبہ میں اُن کی املاک اور دیہات کو قرق کرا لیا ہے۔"

دوامی بندوبست ۱۷۹۳ء سے جاری ہوا تمام مزروعہ زمین فیصدی ۵ ٪ دوامی بندوبست کے ماتحت ہے جس میں مالگزاری کا اضافہ نہیں ہوتا مگر باقیماندہ زمین میعادی ہے جس میں ہر بندوبست میں (جو کہ ہر پندرہ سال سے تیس سال کے اندر ہوتا رہتا ہے) اضافہ کیا جاتا ہے۔ مزروعہ زمین کا ۵۵ فیصدی میعادی رکھا گیا ہے اور اسی کے متعلق مذکورہ بالا ۱۸۶۲ء کی تجویز تھی اور اسی کے متعلق کوئن وکٹوریہ کے اعلان میں اطمینان دلایا گیا تھا۔ اسی میں اضافہ اور زیادتی کے لئے انگریزی قلوب ہمیشہ بے چین رہے جس کی بناء پر کاشتکار آبادی انتہائی بربادی میں مبتلا ہو گئی۔

حالانکہ انگریزی حکومت اور کمپنی کے اقتدار سے پہلے زمینوں کی مالگزاری بہت کم تھی لبطور چوتھ یعنی چوتھائی پیداوار

فیصدی وصول کیا جاتا تھا اور حالانکہ ۱۷۶۵ء میں بادشاہانِ دہلی سے دیوانی کا فرمان (ریونیو افیسری) حاصل کرنے کے بعد کمپنی نے ستر اور اسی فیصدی کا اضافہ کر دیا تھا اور یہ اضافہ بھی روز افزوں ہی ہوتا رہا تھا یعنی ۱۷۶۴ء میں جو کہ نواب بنگال کا آخری زمانہ ہے تمام صوبہ بنگال کی مالگذاری اکیاسی لاکھ پچھتر ہزار پانچ سو بیس روپیہ تھی ۸۱۷۵۵۲۰ مگر ۱۷۶۵ء سے کمپنی نے اس پر اضافہ کی دھواں دھار اسقدر زیادتی کی کہ تیس برس کے بعد ۱۷۹۳ء میں صوبہ بنگال کی مالگزاری دو کروڑ اڑسٹھ لاکھ ہو گئی - یہ اضافہ ۱۷۶۵ء میں قبضہ پاتے ہی شروع ہوا اور اس میں اس قدر مظالم اور تشددات کئے گئے کہ اُن کو ذکر کرتے ہوئے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں - اُن کی کچھ تفصیل ڈبلو ڈبلو ہنٹر نے رسالہ "ہمارے ہندوستانی مسلمان" میں اور دوسرے مورخین نے ذکر کی ہے - اسی طرح اضافہ تمام صوبہ جات میں ہوتا رہا - خلاصہ یہ کہ ۱۸۵۶ء میں تمام مقبوضہ علاقہ ہائے برطانیہ سے (۱۷٫۳۰٫۰۰٫۰۰۰) کروڑ روپیہ وصول کیا گیا - ۱۸۵۷ء کے جنگ انقلاب کے اسباب میں یہ گرانبار اضافہ لگان اور مالگذاری بھی دکھلایا گیا تھا جس کی بناء پر کوئن وکٹوریہ کے اعلان میں یہ دفعات داخل کی گئیں تھیں - جن سے زمینداروں اور کاشتکاروں کو مطمئن کرنا مقصود تھا - چاہیئے تو یہ تھا کہ جو اضافہ مالگزاری و لگان کمپنی کے قبضہ میں آنے پر ہوا تھا وہ دور کر دیا جاتا اور اُسی درجہ پر زمین کی آمدنی کر دی جاتی جس پر شاہی نظام کے زمانہ میں تھی یا اگر یہ نہ کیا جاتا تو کم از کم اُس اضافہ میں سے کچھ گھٹا دیا جاتا جو کہ اس مدت میں کمپنی نے روز افزوں زیادتی کے ساتھ کیا تھا - جس کی بناء پر صوبہ بنگال کا خراج (۸۱٫۷۵٫۵۲۰ لاکھ روپیہ) سے بڑھ کر تیس برس کے عرصہ میں (۲٫۶۸٫۰۰٫۰۰۰ کروڑ) کو پہونچ گیا تھا اور صوبہ بمبئی کا خراج (۸۰٫۰۰٫۰۰۰ لاکھ روپیہ) جو کہ ۱۸۱۷ء کا خراج ہے جبکہ وہ دیسی اور شاہی نظام پر وصول کیا جاتا تھا مگر کمپنی نے قبضہ پاتے ہی اس میں اضافہ شروع کیا یہاں تک کہ چھ برس کے بعد ۱۸۲۳ء میں (۱٫۵۰٫۰۰٫۰۰۰ کروڑ) ایک کروڑ پچاس لاکھ ہو گیا اور پھر اضافہ ہوتے ہوتے ۱۸۷۵ء میں چار کروڑ اسی لاکھ (۴٫۸۰٫۰۰٫۰۰۰ کروڑ) ہو گیا - اور یہی حال تمام صوبہ جات میں زیادتی مالگزاری اور لگان کا جاری رہا جس سے رعایا سخت پریشان ہو گئی - کمپنی کے کارکن اور حکام لگان کی وصولی میں انتہائی سختی برتتے تھے جس کا عشر عشیر بھی شاہی زمانہ میں نہ تھا - الحاصل رعایا تنگ ہو کر جنگ کے لئے کھڑی ہو گئی شہنشاہی اعلان وکٹوریہ میں اشک شوئی اور تسکین کے لئے یہ الفاظ مذکورہ بالا تو ذکر کر دیئے گئے مگر کوئی عملی کاروائی

تخفیف خراج کی نہیں کی گئی۔ ہاں ۱۸۶۲ء کی تجویز کا اعلان کیا گیا اور رعایا کو اس کے ذریعہ سے دوامی بندوبست کا لالچ دے کر مزید اضافہ لگان کی طرف سے مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ محض باتوں باتوں کی تھپک اور بناوٹی دھوکا دہی کچھ عرصہ تک جاری رہی۔ پھر ۱۸۸۳ء میں اس کو بھی منسوخ کر دیا گیا۔ اور اضافہ کی چھری تمام میعادی زمینوں پر چلتی رہی۔ مندرجہ ذیل نقشہ اضافہ کی کارروائی پر روشنی ڈالتا ہے۔

سنہ ۱۸۵۶ء	۱۷ کروڑ ۳۰ ,۰۰,۰۰۰	یعنی سترہ کروڑ تیس لاکھ
سنہ ۱۸۷۰ء	۱۹ کروڑ ۹۶ ,۰۰,۰۰۰	یعنی انیس کروڑ چھیانوے لاکھ
سنہ ۱۸۸۰ء	۲۱ کروڑ ۹۱ ,۰۰,۰۰۰	یعنی اکیس کروڑ اکیانوے لاکھ
سنہ ۱۸۹۰ء	۲۴ کروڑ ۰۵ ,۰۰,۰۰۰	یعنی چوبیس کروڑ پانچ لاکھ
سنہ ۱۹۰۰ء	۲۶ کروڑ ۲۵ ,۰۰,۰۰۰	یعنی چھبیس کروڑ پچیس لاکھ
سنہ ۱۹۱۴ء	۳۱ کروڑ ,۰۰,۰۰,۰۰۰	اکتیس کروڑ روپیہ

(معیشت الہند ص ۲۵۹)

یہ تمام اضافہ میعادی زمین پر ہوتا رہا اور کوئن وکٹوریہ کے اعلان کے بعد ہوتا رہا۔ اور اس زمانہ میں ہوتا رہا جبکہ ہندوستان میں قحط انتہائی شباب پر پہونچا ہوا تھا۔ رعایا بھوک کی بناء پر لکھیوں کی موت مر رہی تھی۔ اس تمام مالگزاری کا تقریباً ۸۴ فیصدی میعادی بندوبست کے حلقوں سے وصول ہوتا رہا اور تقریباً ۱۶ فیصدی دوامی بندوبست کے حلقوں سے وصول ہوا۔

اسی زمانہ کے متعلق سر چارلس ایلیٹ چیف کمشنر آسام ۱۸۸۰ء میں لکھتا ہے "میں بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ کاشتکاروں کی نصف تعداد ایسی ہے جو سال بھر تک یہ نہیں جانتی کہ ایک وقت پیٹ بھر کر کھانا کسے کہتے ہیں"

اگرچہ انگریزی اقتدار کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کا قحط بھی بڑھتا رہا تھا۔ حسب تصریحات سر ولیم ڈگبی انگریزی اقتدار سے پہلے چھ سو برس میں یعنی سنہ ۱۰۰۰ء سے سنہ ۱۷۰۰ء کے ابتدا تک کل ۱۸۔ قحط واقع ہوئے تھے اور وہ بھی تمام ملک میں نہیں ہوئے تھے بلکہ کسی صوبہ میں واقع ہوئے اور دوسرے صوبے محفوظ رہے۔ پھر جہاں یہ

قحط واقع بھی ہوئے وہاں موتیں زیادہ نہیں ہوئیں۔ اس لئے کہ لوگوں کے پاس روپئے زیادہ تھے غلہ کتنا بھی گراں ہوجاتا تھا خریدنے کی طاقت موجود رہتی تھی۔ موت تک کی نوبت نہیں آتی تھی۔ دیسی بادشاہوں اور نوابوں اور راجاؤں کو رعایا سے خصوصی ہمدردی ہوتی تھی اس لئے وہ اپنی طاقت کے موافق قحط کے ازالہ کا انتظام کرتے تھے۔ بخلاف ان قحطوں کے جو کہ ابتداءً سنہ ۱۸۰۰ء سے واقع ہوئے وہ نہایت ہولناک اور بہت زیادہ تھے۔ سنہ ۱۹۰۰ء کے ابتدا تک یعنی صرف ایک سو برس کے عرصہ میں اکتیس قحط واقع ہوئے اور پھر جوں جوں اقتدار برطانوی بڑھتا گیا قحطوں کی مقدار اور ہولناکی بھی بڑھتی گئی۔ جس کی تفصیل چوتھائی صدی کے طرز پر حسب تصریح سر ولیم ڈگبی مندرجہ ذیل ہے:۔

سنہ ۱۸۰۰ء	سے	سنہ ۱۸۲۵ء تک	۵ قحط	۵۰ لاکھ آدمی صرف قحط سے مرے
سنہ ۱۸۲۶ء	سے	سنہ ۱۸۵۰ء تک	۲ قحط	۱۰ لاکھ 〃 〃 〃 〃
سنہ ۱۸۵۱ء	سے	سنہ ۱۸۷۵ء تک	۶ قحط	۵۰ لاکھ 〃 〃 〃 〃
سنہ ۱۸۷۵ء	سے	سنہ ۱۹۰۰ء تک	۱۸ قحط	۲ کروڑ ۶۰ لاکھ 〃 〃 〃
				۳ کروڑ ۷۰ لاکھ

ناظرین خیال فرمائیں کہ اس صدی کی آخری چوتھائی یعنی سنہ ۱۸۷۵ء سے سنہ ۱۹۰۰ء تک کا زمانہ وہ زمانہ ہے جس کو انگریزی اقتدار کی حیثیت سے زریں اور سنہرا زمانہ کہا جاتا ہے کیونکہ انقلاب سنہ ۱۸۵۷ء اور اس کے ہولناک مظالم اور بیدردی کے قتل وغارت وغیرہ کے بعد ہندوستانی اس قدر کمزور اور ذلیل ہوگئے تھے کہ اُن میں کوئی سکت حکام برطانیہ کے مقابلہ اور مخالفت کی باقی ہی نہیں رہی تھی۔ انگریزی حکام جو چاہتے تھے کرتے تھے کسی میں دم مارنے کی طاقت نہیں تھی۔ خلاصہ یہ کہ اس صدی کی آخری چوتھائی جو کہ انگریزی اقتدار کی سب سے بلند چوٹی ہے اس میں اٹھارہ قحط واقع ہوئے اور اُس میں ڈھائی کروڑ سے زیادہ آدمی صرف قحط کی وجہ سے موت کے گھاٹ اُتر گئے۔ ان قحطوں کے اسباب خواہ کچھ بھی ہوں مگر جب اس طرح بربادی پھیلی ہوئی ہو اور لوگ بھوک اور غذا نہ پانے کی وجہ سے اس کثرت سے مر رہے ہوں اُس وقت تو ضروری تھا کہ مالگزاری اور لگان بالکل چھوڑ دیا جاتا۔ یا کم از کم تخفیف عمل میں لائی

جاتی مگر انگریزوں کی سنگدلی اور درندگیت ملاحظہ فرمائیے کہ چھوڑنا اور تخفیف کرنا تو درکنار ہمیشہ خراج میں اضافہ ہی ہوتا رہا اور وہ بھی معمولی اضافہ نہیں تھا بلکہ تقریباً سو فیصدی اضافہ اس پچاس برس کے عرصہ میں کردیا گیا۔ اور نہایت سختی سے وصول کیا گیا۔ نہ انسانیت کا پاس کیا گیا۔ نہ شہنشاہی اور پارلیمنٹی عہود ومواثیق اور اعلانات کا کوئی لحاظ کیا گیا۔ نہ غریبوں اور مفلسوں کی بربادی اور ہولناک موت کا کچھ خیال رکھا گیا۔ دنیائے تاریخ میں ایسی سنگدلی اور وحشت کی مثال نہایت کم پائی جائے گی۔ مسٹر جے کیرہارڈی (موسس لیبر پارٹی) اپنی کتاب انڈیا میں لکھتا ہے:۔ کہ "چالیس برس کے عرصہ میں سنہ ۱۸۶۰ء سے ۱۹۰۰ء تک ۳ کروڑ آدمی صرف فاقہ کشی کی وجہ سے ہندوستان میں مرگئے"۔ اسی کتاب میں دوسری جگہ لکھتا ہے کہ "سنہ ۱۸۹۱ء سے سنہ ۱۹۰۰ء تک نو برس کے عرصہ میں ہندوستان میں ایک کروڑ نوے لاکھ آدمی قحط سے مرے ہیں" اس قدر موتیں ڈیڑھ سو برس میں یعنی سنہ ۱۷۵۰ء سے سنہ ۱۹۰۰ء تک میں تمام دنیا میں جتنی لڑائیاں واقع ہوئیں نہیں ہوئی تھیں جتنی برطانوی حکومت کے زریں اقتدار کے ماتحت امن وامان کی حالت میں ہندوستان میں واقع ہوئیں"

ذرا اس بربریت کو ملاحظہ فرمائیے کہ سنہ ۱۸۹۰ء سے سنہ ۱۹۰۰ء تک میں اتنا عظیم الشان قحط ہندوستان میں پڑا ہوا ہے کہ تقریباً دو کروڑ آدمی مرگئے ہیں مگر اسی مدت میں زمین کے خراج پر دو کروڑ بیس لاکھ روپیہ اضافہ کیا گیا۔ یعنی سنہ ۱۸۹۰ء میں خراج چوبیس کروڑ پانچ لاکھ تھا اور سنہ ۱۹۰۰ء میں چھبیس کروڑ پچیس لاکھ کردیا گیا۔ کیا اسی کو انسانیت کی خدمت اور رعایا پروری کہا جاتا ہے۔ اسی لئے ڈبلو جی پیڈر سنہ ۱۸۷۳ء میں لکھتا ہے کہ "ایک ایسی رائے جس پر تقریباً ہر شخص متفق ہے اگر قابل اعتماد ہوسکتی ہے تو یہ صحیح ہے کہ اہل ہند ہماری زیر حکومت بد سے بدتر حالت کو پہونچتے جاتے ہیں" (حکومت خود اختیاری ص۳۸)

مسٹر گرانٹ ڈف (مئی سنہ ۱۸۸۰ء میں مسٹر لین سے غریب ہندوستانیوں کے متعلق دارالعوام میں) کہتا ہے۔

"آپ کا کیا ارادہ ہے کہ ایک مفلس قوم کو بالکل ہی پیس ڈالا جائے"

(حکومت خود اختیاری ص۳۷ از دادا بھائی ص۱۵)

حالانکہ اس زمانہ سے پہلے ہی کمپنی نے ہندوستانیوں کو بربادی کی نہایت بھیانک صورت میں مبتلا کردیا تھا

جس کو سر جان شور ۱۸۳۳ء میں مندرجہ ذیل الفاظ میں ظاہر کرتا ہے۔

"انگریزی حکومت کی بیں ڈالنے والی زیادہ ستانی نے ملک اور اہل ملک کو اتنا مفلس کر دیا ہے کہ اُس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ انگریزوں کا بنیادی اصول یہ رہا ہے کہ ہر صورت سے تمام ہندوستانی قوم کو اپنی اغراض کا غلام بنا لیا جائے۔ اُن پر محصولات اتنے لگا دیئے ہیں کہ اضافہ کی گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔ یکے بعد دیگرے جو صوبہ ہمارے تصرف میں آیا ہے اُس کو مزید وصولیابی کا میدان بنا لیا گیا ہے اور ہم نے اس بات پر ہمیشہ فخر کیا ہے کہ دیسی والیانِ ملک جتنا وصول کرتے تھے اُس سے ہماری آمدنی کس قدر زیادہ ہے..... مختصر یہ کہ ہندوستان میں جتنی انتہائی سخت اور جابر حکومتیں گذری ہیں اُن میں ایک برطانوی حکومت بھی ہے"۔

خلاصہ یہ ہے کہ کوئین وکٹوریہ کے اعلان ۱۸۵۸ء سے پہلے بھی اور اس کے بعد بھی آج تک زمینوں پر خراج کا بوجھ برابر بڑھتا رہا اور جو قدیمی نظام زمینوں کا تھا اُس میں برابر تبدیلی اور وصولی میں زیادتی ہوتی رہی جس کا زہریلا اثر یہ ہوا کہ کاشتکار اور زمیندار انتہائی درجہ میں مفلس اور قلاش ہو گئے اور لاکھوں مالکان اراضی کو زمینوں کو بیچ ڈالنا، گرو کر دینا، زمین سے دست بردار ہونا، اور انتہائی افلاس میں گذر بسر کرنا یا فنا ہو جانا پڑا۔ یہ ہیں وہ اعلانات و عہود برطانیہ اور اُن پر عملدرآمد۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

(۱۶) انگریز ہندوستان کے فاتح نہیں تھے بلکہ ہندوستان کو انتظام کی درستی کے لئے مغل بادشاہانِ دہلی سے بطور سند و عہد و پیمان و فرمانات شاہی انہوں نے ۱۷۶۵ء و ۱۸۰۳ء وغیرہ میں حاصل کیا تھا اسی لئے اس کے امانت ہونے کا اور اس کے غیر فاتح ہونے کا بڑے بڑے ذمہ دارانِ برطانیہ کو ہمیشہ اقرار رہا ہے۔

(الف) ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر اپنی کتاب ترجمہ ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۲۲۵ میں لکھتا ہے:۔

"بنگال کو انگریزوں نے حاصل کیا تو شہنشاہ دہلی کے دیوان ہونے کی حیثیت سے پھر یہ عہدہ کسی بہت بڑی رشوت سے نہیں بلکہ تلوار کے زور سے لیا گیا۔ قانوناً ہم صرف شہنشاہِ دہلی کے دیوان تھے یعنی چیف ریونیو افسر۔ اسی بنا پر سلطنت کا

دعویٰ ہے کہ ہم کو اُسی اسلامی طریقہ پر کار بند رہنا چاہیئے جس کے انتظام کا ہم نے اُس وقت ذمہ لیا تھا

جہاں تک میرا خیال ہے اس میں طرفین کا باہمی سمجھوتہ فی الواقع یہی تھا۔"

(نوٹ) چونکہ آخری زمانہ سلطنت مغلیہ میں کمزوری سلطنت کی وجہ سے صوبے باغی ہو گئے تھے اس لئے جب کسی بڑے عہدہ پر بادشاہ کی طرف سے تقرر ہوتا تھا تو اُس کو فرمان بادشاہ کی طرف سے مل جاتا تھا مگر بسا اوقات اُس کو اس فرمان کے منوانے میں قوت کا استعمال کرنا لازمی ہوتا تھا یہی مقصد مذکورہ بالا عبارت میں مندرجہ ذیل عبارت کا ہے "پھر یہ عہدہ کسی بہت بڑی رشوت سے نہیں بلکہ تلوار کے زور سے لیا گیا"۔

(ب) کتاب مذکور "ہمارے ہندوستانی مسلمان" کے اسی صفحہ ۲۲۵ کے حاشیہ پر ہے۔ "وہابی مقدمات کا انچارج افسر لکھتا ہے:۔ "ہم نے دیوانی اس وعدے کے ساتھ لی تھی کہ ہم اسلامی حکومت کو جیسی کہ اس وقت قائم ہے برقرار رکھیں گے۔ ہم نے ایسا ہی کیا تھا"۔

(ج) ہم اس سے پہلے مسٹر پیٹر فریمین کا مقالہ جو کہ انڈین نیوز لندن میں ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا تھا نقل کر چکے ہیں جس کے الفاظ مندرجہ ذیل ہمارے اس دعوے کے مسلم ہونے کے شاہد ہیں۔ "برطانیہ عہد و پیمان کے ذریعہ ہندوستان پر ہندوستان کے بھلے کے لئے حکومت کرنے کا پابند ہے"۔

(د) مسٹر برک کی تقریر بھی ہم مفصلاً پیچھے میں نقل کر آئے ہیں۔ اُس کے مندرجہ ذیل الفاظ بھی قابل ملاحظہ ہیں:۔

پہلا بادشاہ جسے کمپنی نے روپیہ لے کر فروخت کیا آلِ تیمور کا مغل اعظم تھا۔ یہ بلند شخصیت ایسی بلند جو انسانی عظمت کا مطمح نظر ہو سکتی ہے۔ عام روایات کے مطابق اپنے عمدہ طرز عمل، پاک باطنی اور ماہر علوم مشرقیہ ہونے کے باعث بہت ہر دلعزیز و محترم تھی اُس کی یہ خوبیاں اور نیز یہ امر کہ اُسی کی سندات کے طفیل میں ہم نے تمام ہندوستانی مقبوضات حاصل کئے اُس کو برسر بازار فروخت کرنے سے نہ روک سکے۔ اسی کے نام کا سکہ چلتا ہے۔ اُسی کے نام سے عدل و انصاف کیا جاتا ہے۔ ملک کے طول و عرض میں اُسی کے نام کا تمام عبادت گاہوں میں خطبہ پڑھا جاتا ہے، لیکن پھر بھی اُسے بیچ ڈالا گیا۔ ایک سلطنت عطا کر دینے والے معطی اور بکثرت

قوموں کے جائز حکمراں کے واسطے اُس کے شاندار عطیات میں صرف دو ضلع الخ

(از حیات حافظ رحمت خاں مرحوم صـ۱۹۹ ماخوذ از ہندوستان اور عہد کمپنی کی صحیح تاریخ رائز آف دی کرسچین پاور ان انڈیا - مؤلفہ میجر بی - ڈی - باسو)

مذکورۂ بالا الفاظ مسٹر برک کے صاف روشنی ڈالتے ہیں کہ انگریز ہندوستان کے ہرگز فاتح نہیں ہیں - بادشاہی سندات اور فرامین کے ذریعہ اور اُس کے طفیل میں ہندوستان پر انہوں نے قبضہ کیا تھا اور قبضہ و اقتدار کے زمانہ میں بھی مثل ملازموں اور خدام سلطنت کے امورِ انتظامیہ مالیات وغیرہ انجام دیتے تھے سکہ بادشاہی کا تھا - کورٹ یعنی عدل و انصاف کی تمام کارروائیاں بادشاہی نظام اور نام پر ہوتے تھے خطبہ اُسی کے نام کا پڑھا جاتا تھا -

(ہ) مسٹر لائیڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ - ۲ راگست ۱۹۲۲ء میں تقریر کرتے ہوئے ہاؤس آف کامنس میں کہتے ہیں :-

"اگر پہلے سے یہ بات صاف نہیں ہے تو اب میں صاف طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ ہماری غرض اصلاحات دینے سے یہ نہیں ہے کہ انجام کار ہم اپنی امانت سے بالکل دست بردار ہو جائیں"

مسٹر لائیڈ جارج کو اقرار ہے کہ ہندوستان انگریزوں کے پاس امانت ہے مفتوحہ چیز امانت نہیں ہوتی -

(و) پروفیسر سیلے کہتا ہے - "اگر ہندوستان میں متحدہ قومیت کا کمزور جذبہ بھی پیدا ہو جائے اور اُس میں اجنبیوں کے نکالنے کی کوئی عملی روح نہ بھی ہو بلکہ صرف اس قدر احساس عام ہو جائے کہ اجنبی حکومت سے اتحادِ عمل ہندوستانیوں کے لئے شرمناک ہے تو اُسی وقت سے ہماری شہنشاہیت کا خاتمہ ہو جائے گا کیونکہ ہم درحقیقت ہندوستان کے فاتح نہیں ہیں اور اس پر فاتحانہ حکمرانی نہیں کر سکتے - اگر ہم اس طرح حکومت کرنی بھی چاہیں گے تو اقتصادی طور پر قطعاً برباد ہو جائیں گے "-

انگریزوں کا اُن معاہدوں کو توڑنا جن کے ذریعہ ہندوستان پر دیوانی اختیارات حاصل کئے گئے

غرضکہ ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ فاتحانہ نہیں تھا بلکہ متعدد عہود اور مواثیق اور شروط کے ساتھ

بادشاہی فرمانات حاصل کئے گئے تھے جن کے سایہ میں آہستہ آہستہ تمام ہندوستان پر قبضہ ہو سکا اور جن میں برابر دھوکا دہی، غدّاری، مکّاری عمل میں لائی گئی۔

ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر لکھتا ہے:۔

"ایسٹ انڈیا کمپنی کے سابق ملازمین اپنی حیثیت کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور جب انہوں نے پہلے پہل صوبجات پر قبضہ کیا تو اسلامی نظام کو برقرار رکھا۔ انہوں نے شرع اسلامی کو ملک کا قانون بنایا اور اس کے نفاذ کے لئے مسلمان قاضی مقرر کئے۔ اس وقت جو کچھ بھی کیا جاتا دہلی کے مسلمان شہنشاہ کے نام پر کیا جاتا تھا حقیقت یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی بادشاہت کا طغرائے امتیاز حاصل کرنے سے اس قدر ڈرتی تھی کہ ایک طویل مدت تک بھی جب مسلمان ملازمین کی وساطت سے حکومت کرنے کی کوشش اسلامی نظام کے ناقابل ذکر بدعنوانیوں کے باعث قطعاً ناکامیاب ہو چکی تھی اس نے یہی ظاہر کیا کہ وہ بادشاہ کی نائب ہے۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ اس ظاہرداری نے آخر ایک قابلِ نفرت تماشے کی صورت اختیار کر لی تھی۔ ہم اس زمانے میں جب ہمارا ریزیڈنٹ شاہ دہلی کو ایک غریب قیدی کی طرح کھانے پینے کے لئے کچھ ماہوار رقم بطور وظیفہ دیا کرتا تھا جو حکم جاری کرتے اسی کے نام پر کرتے۔ چونکہ اب تک جو لوگ ہندوستان کی تاریخ پر قلم اٹھاتے رہے وہ کبھی ہندوستان نہیں آئے اس لئے ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ انگلستان میں بیٹھ کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے اس عجیب و غریب طرزِ عمل کو سمجھ سکیں گے جس کو ہم نے ابھی بیان کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم نے باقاعدہ بادشاہت قبول کرنے میں دس سال بھی جلدی کی ہوتی تو ہم مسلمانوں کی ایسی بغاوت میں گھر جاتے جو ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے بھی کہیں زیادہ خطرناک ہوتی۔ مسلمان محسوس کرتے کہ ان کی حیثیت یک قلم بدل گئی ہے۔ ہماری اپنی حالت بھی ایسی کافر طاقت کی ہو جاتی جس نے دارالاسلام پر قبضہ کر لیا ہو۔ اندریں حالت مسلمانوں کی ایک بہت بڑی اکثریت جمع ہو جاتی کہ بغاوت کو فرض عین قرار دے۔ میں اس سے پہلے بیان کر آیا ہوں کہ شریعت اسلامی کی رو سے ہر مرد عورت اور بچے کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ کافر حکمرانوں کی بیخ کنی کرے اور

انہیں ملک سے باہر نکال دے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کی قابلِ تعریف اعتدال پسندی اور اس عزم بالجزم نے کہ اسلامی سلطنت کی تدریجی اور طبعی موت میں ایک لمحہ بھر کی عجلت بھی نہیں کیجائے اس مصیبت کو ہمارے سر سے ٹال دیا۔ ہندوستان بتدریج اور غیر محسوس طور پر دارالاسلام سے دارالحرب میں تبدیل ہوتا گیا۔ شاہی ضلع وار دستاویزات کی کئی سال تک تحقیق کرنے کے بعد بھی میرے لئے یہ بتلانا ناممکن ہے کہ یہ تبدیلی کس سال یا کس مدت میں واقع ہوئی۔ مسلمان شہنشاہ کی ظاہری برتری کو مٹانے سے بہت پہلے ہم نے مسلمان حاکموں کو برطرف کرنا شروع کر دیا تھا لیکن اس برائے نام عظمت کے محض تماشہ بن جانے کے بعد بہت کافی عرصے حتیٰ کہ ۱۸۳۵ء تک ہمارے سکے اُسی کے نام جاری ہوتے تھے (۱۸۳۵ء میں کمپنی کے روپئے پر جس کا وزن ۱۸۰ گرین تھا انگریزی بادشاہ کی شکل بنائی گئی تھی اور ایسٹ انڈیا کا نام لکھا گیا تھا) پھر جب ہمیں یہ جرأت ہوئی کہ سکوں پر انگریز بادشاہ کی شکل دیجائے تب بھی ہم نے اسلامی دستور العمل اور عدالتوں میں اسلامی زبان کو برقرار رکھا گو یہ باتیں بھی بتدریج مٹ گئیں حتیٰ کہ ۱۸۶۴ء میں ہم نے ایک دلیرانہ قدم اُٹھایا۔ میرے خیال میں یہ اقدام بڑا ہی غیر دانشمندانہ تھا یعنی مجلس قانون ساز کے ایک ایکٹ کے ذریعہ ہم نے تمام مسلمان قاضیوں کو برطرف کر دیا۔ اس قانون نے ہندوستانی سلطنت کی اس عمارت کو مکمل طور پر دارالحرب میں بدل دیا۔ جس کی تعمیر پوری ایک صدی (۱۷۶۵ء تا ۱۸۶۴ء) سے ہو رہی تھی۔ اسلامی حکومت کے اس طرح بتدریج مٹنے سے ہماری مسلمان رعایا پر نئے نئے فرائض عائد ہوتے گئے۔"

(ہمارے ہندوستانی مسلمان مترجم ڈاکٹر صادق ص ۱۹۳ و ۱۹۴ و ۱۹۵)

ڈاکٹر ہنٹر کی تصریحات پوری طرح پر روشنی ڈالتی ہیں کہ انگریزوں نے ہندوستان کو شاہانِ مغلیہ سے بذریعہ فرمانات اور عہد و پیمان دھوکا دے کر اور اطمینان دلا کر حاصل کیا تھا مگر نیتیں صاف نہ تھیں اپنی ملعون اور نجس اغراض زیرِ نظر تھیں۔ وعدہ کیا گیا کہ ہر زمانہ میں اسلامی اور شہنشاہی نظام کو محفوظ رکھ کر آمدنی کو ترقی اور نظام کو برتری دیجائے گی مگر دل کے چور نے ابتدا ہی سے نظام اسلامی کو برباد

کرنا شروع کر دیا اور مسلمانوں کو آہستہ آہستہ نکال کر اور اپنا زہریلا مادہ داخل کر کے بادشاہی طاقت اور مسلمانوں کی برتری کو فنا کر دیا۔ اور تمام عہدو پیمانوں کو رفتہ رفتہ اس طرح توڑ ڈالے کہ اُن عہود کا کوئی تار بھی باقی نہ رہ گیا۔

(ب) پھر ڈبلیو ہنٹر لکھتا ہے۔" انگریزوں نے چند ایک سال تو مسلمان عہدے داروں کو بحال رکھا لیکن جب اصلاح کا وقت آیا تو اس قدر احتیاط سے قدم اُٹھائے کہ اُس پر بزدلی کا گمان ہونے لگتا ہے۔ بااین ہمہ سب سے کاری ضرب جو ہم نے پُرانے طریق پر لگائی وہ اس قدر پُر فریب تھی کہ اُس کا پیش از وقت اندازہ نہ مسلمانوں کو ہو سکا نہ انگریزوں کو۔ میرا مطلب ہے اُن تبدیلیوں سے جو لارڈ کارنوالس نے رائج کیں اور جن سے ۱۷۹۳ء کا دوامی بندوبست مترتب ہوا۔ اس بندوبست سے اُن مسلمان افسروں کا کاروبار زبردستی ہمارے ہاتھ میں آگیا جو حکومت اور ٹیکس جمع کرنے والوں کے درمیان واسطہ کا کام دیتے تھے اور جن کے سپاہیوں کو مالگزاری جمع کرنیکا جائز حق پہونچتا تھا۔" ص ۲۲۶

(ج) پھر صفحہ ۲۲۷ پر لکھتا ہے۔" ایک افسر جس نے مسلمانوں کی موجودہ بے چینی اور دوامی بندوبست سے اس کے تعلق کا مطالعہ بڑی دقیق نظر سے کیا ہے۔ لکھتا ہے:۔" اس بندوبست نے ہندو کلکٹروں کو جو اس سے پہلے معمولی عہدوں پر مامور تھے ترقی دے کر زمیندار بنا دیا ہے اُن کو زمین کی ملکیت کا حق حاصل ہو گیا ہے اور اب وہ اُس دولت کو سمیٹ رہے ہیں جو مسلمانوں کی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کا حق تھا۔" سو یہ سب سے بڑی ناانصافی ہے جس کا مسلمان امراء انگریزی حکومت کو مجرم ٹھیراتے ہیں۔ اُن کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم نے مسلمان شہنشاہ سے بنگال کی دیوانی اس شرط پر لی تھی کہ ہم اسلامی نظام کو برقرار رکھیں گے۔ لیکن جوں ہی ہم نے اپنے آپ کو طاقتور پایا اُس وعدے کو فراموش کر دیا۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ جب ہم نے بنگال میں مسلمانوں کے نظامِ دیوانی کا مطالعہ کیا تو اس کو اس قدر یکطرفہ ناکارہ اور اصول انسانیت کے خلاف پایا کہ اگر ہم اس کو برقرار رکھتے تو تہذیب کے لئے باعثِ ننگ ہوتے ہم اضلاع کے اندراج سے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ اسلامی حکومت کا مقصد محض روپیہ جمع کرنا تھا مالگزاری جمع کرنے والوں کے ذمے نظامِ حکومت کے تمام فرائض کر دیئے گئے تھے اُن کو اس بات کی اجازت

تھی کہ جو جی میں آئے کریں بشرطیکہ مالگزاری کا روپیہ باقاعدہ جمع کرتے رہیں۔ عوام کو اس لئے ستایا جاتا تھا کہ زمینداروں کو لگان وصول ہوتا رہے اُن کو اس لئے لوٹا جاتا تھا کہ زمینداروں کے ملازمین دولتمند ہو جائیں۔ اس ظلم وستم کے خلاف شکایت بے سود تھی کیونکہ یہ زمیندار اور اُس کے افسر کی مرضی پر منحصر تھا کہ وہ اُن کی شکایات کو سنے یا نہ سنے۔ اُن کی شکایات کے ازالہ کا امکان بہت کم تھا کیونکہ ظالم بالعموم زمیندار ہی کا ملازم ہوتا تھا پھر اگر ڈاکوؤں کو کوشش کر کے گرفتار کر بھی لیا جاتا تو اُن کے لئے مشکل نہ تھا کہ قید کرنے والوں سے یارانہ گانٹھ لیں۔ بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے ماتحت حکومت کی حیثیت ایسی مشین کی تھی جس سے تھوڑے آدمی دولتمند ہو جائیں یہ نہیں کہ بہتوں کی حفاظت ہو سکے معلوم ہوتا ہے اس پر نہ کبھی حاکموں کے دل میں رحم پیدا ہوا نہ اُن کے ضمیر میں الخ ص ۲۲۹

ڈاکٹر ہنٹر اقرار کرتا ہے کہ انگریزوں نے یقیناً اسی شرط پر ہندوستان کے صوبہ بنگال کی دیوانی لی تھی کہ وہ نظام اسلامی کو برقرار رکھیں گے اور اس کا بھی اقرار کرتا ہے کہ ہم نے (انگریزوں نے) اس کو توڑا اور عہد شکنی کی۔ مگر چونکہ وہ اپنے قومی جذبات میں اس قدر غرق ہے کہ اپنی قوم اور اپنی حکومت کے اعمال اور اخلاق کو اولاً صحیح نظریہ پر پرکھ ہی نہیں سکتا یا اگر پرکھ سکتا ہے تو اُس کی تاویل کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ حُبُّكَ الشَّيْءَ يُعْمِي وَيُصِمُّ اُس کو قومی محبت نے حقائق سے اندھا کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ وہی نظام ہے جو کہ شہنشاہ بابر کے زمانہ سے شہنشاہ عالمگیر کے اخیر زمانہ تک تقریباً دو سو برس سے زیادہ قائم رہا بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ زمانہ ابتدائے اسلام سے عہدِ عالمگیری کے خاتمہ تک ایک ہزار برس سے زائد قائم رہا جس میں تمام ممالک اسلامیہ بالخصوص ہندوستان رشکِ جناں بن گیا تھا تو صحیح ہوگا اگر وہ نظام اسلامی ناکارہ اور ریک طرفہ اور اصولِ انسانیت کے خلاف ہوتا تو ملک کیوں اس قدر پھولتا اور پھلتا۔

میجر باسو کہتا ہے "رعایا کی خوشحالی اور سرمایہ داری کے اعتبار سے بھی مسلمانوں کا دورِ حکومت سونے کے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ دولتمندی اور آرام وچین کا جو نقشہ شاہجہاں کے وقت میں دیکھنے میں آتا تھا بلاشبہ بے مثل وبے نظیر تھا۔" روشن مستقبل ص ۱۶

لارڈ میکالے کہتا ہے۔ "باوجود مسلمان ظالموں اور مرہٹہ لٹیروں کے مشرقی ممالک میں بنگال باغ ارم یا نہایت دولتمند ملک سمجھا جاتا تھا اُس کی آبادی بیحد وغایت بڑھتی تھی۔ غلہ کی افراط سے دُور و دراز کے صوبہ جات پرورش پاتے تھے اور لندن اور پیرس کے اعلےٰ خاندانوں کی بی بیاں یہاں کے کرگھوں کے نازک ترین کپڑوں میں ملبوس ہوتی تھیں"

(ماخوذ از سوانح لارڈ کلایو حکومت خود اختیاری ص۳)

لارڈ کلایو لکھتا ہے:۔ "یہ (ہندوستان) نامتناہی دولت والا ملک ہے"۔ سرجان شور انگریزوں سے پہلے کا زمانہ عہدِ زریں قرار دیتا ہے۔

غرضکہ یہ بالکل غلط اور جھوٹی بات ہے کہ نظامِ حکومت اسلامیہ یکطرفہ اور ناکارہ اور اصولِ انسانیت کے خلاف تھا۔ اس قسم کی بے شمار شہادتیں خود انگریزوں کی موجود ہیں کہ اُس نظام کے ماتحت ہندوستان ہر طرح ترقی پذیر رہا۔ البتہ اُس نظام سے جس کو کمپنی اور لارڈ کارنوالس وغیرہ نے بنایا تھا ملک انتہائی بربادی کو پہونچ گیا۔ سرجان شور (جو کہ صوبہ بنگال کی سول سروس سے تعلق رکھنے والا تھا) ۱۸۳۲ء میں لکھتا ہے:۔

"برطانیہ نے جو طرزِ حکومت قایم کیا ہے اُس کے تحت میں ملک اور باشندگانِ ملک رفتہ رفتہ محتاج ہوتے جاتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ ان پر جلد تباہی آگئی۔ انگریزی حکومت کی پیس ڈالنے والی زیادہ ستانی نے ملک اور اہلِ ملک کو اتنا مفلس کر دیا ہے کہ اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ انگریزوں کا بنیادی اصول یہ رہا ہے کہ ہر صورت سے تمام ہندوستانی قوم کو اپنی اغراض کا غلام بنا لیا جائے۔ اُن پر محصولات اتنے لگا دیئے ہیں کہ اضافہ کی گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔ یکے بعد دیگرے جو صوبہ ہمارے تصرف میں آیا ہے اُس کو مزید وصولیابی کا میدان بنا لیا گیا ہے اور ہم نے اس بات پر ہمیشہ فخر کیا ہے کہ دیسی والیانِ ملک جتنا وصول کرتے تھے اُس سے ہماری آمدنی کس قدر زیادہ ہے۔ ہر وہ عہدہ عزت، او منصب جس کو قبول کرنے کے لئے ادنےٰ سے ادنےٰ انگریز کو آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستانیوں کے لئے بند کر دیا گیا ہے مختصر یہ کہ ہندوستان

میں جتنی انتہائی سخت اور جابر حکومتیں گزری ہیں اُن میں ایک برطانوی حکومت ہے جس کے دَور میں حکومت اور ذی ثروت افراد (بشرطیکہ وہ بے اندازہ دولت رکھتے ہوں) دونوں انصاف کا خون کر سکتے ہیں اور کر چکے ہیں۔ جس کے عہد میں ظلم کی داد رسی تقریباً ایک ناممکن چیز ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ رعایا ہم سے نفرت کرتی ہے اور ہر طاقت کا خیر مقدم کرنے اور اس کے پرچم کے نیچے جمع ہو جانے کے لئے تیار ہے بشرطیکہ اُس میں اتنی قدرت ہو کہ ہمیں تباہ کر سکے"۔

اس عبارت سے پہلے وہ لکھتا ہے۔ "لیکن ہندوستان کا عہد زریں گزر چکا ہے۔ جو دولت کبھی اُس کے پاس تھی اُس کا جزو اعظم ملک کے باہر کھینچ کر بھیج دیا گیا ہے اور اُس کے قدرتی عمل اُس بد عملی کے ناپاک نظام نے معطل کر دیئے ہیں جس نے لاکھوں نفوس کی منفعت کو چند افراد کے فائدے کی خاطر قربان کر دیا ہے"۔ (حکومت خود اختیاری ص۲٦و۲۷)

مسٹر سول میرٹ ممبر کونسل ۱۸۳٦ء میں لکھتا ہے:۔

"برطانیہ کا دَورِ حکومت مہربان اور مقبول بتایا جاتا ہے مگر اس عہد میں ملک جس حالت کو پہونچ گیا ہے اگر اُس کا مقابلہ دیسی حکمرانوں کے عہد سے کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اُس وقت لوگ خوشحال تھے۔ یہ ملک فلاکت کی انتہائی پستی تک پہونچ گیا ہے۔ میں ایک واقعہ عرض کرنا چاہتا ہوں جو نہایت اہم نتائج سے لبریز ہے اور وہ یہ ہے کہ چند سال سے سرکاری مالگذاری کا بڑا حصہ ملک کا سرمایہ یک کر ادا ہو رہا ہے۔ اگرچہ وہ سرمایہ خود ہی نہایت مختصر ہے۔ سرمایہ سے میری مراد کسانوں کی منقولہ جائداد ہے۔ جو قیمتی دھات یا پتھر کے استعمالی زیورات پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان زیورات کو حسب ضرورت نفع آور کاموں میں لگا لیا جاتا ہے اور کاشتکاری کے لوازمات کے بہم پہونچانے کا بھی اس سے کام لیا جاتا ہے اور بالعموم اس مقصد کے حاصل کرنیکو اُس وقت تک کے لئے جب تک کہ کام پورا ہو گرو کرنے کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے مختصر یہ ہے کہ جس چیز پر نظر ڈالئے اس سے یہ عقیدہ کہ روز افزوں تنگ حالی ہم کو فلاکت مطلق کی طرف لے جا رہی ہے پختہ ہو جاتا ہے"۔

یہی مسٹر میریٹ ایک دوسرے مقام پر کہتے ہیں :۔

"ہندوستان میں ہماری حکومت سے جو مصائب ظہور میں آئے ہیں وہ یا تو اُس گرانقدر خراج سے براہ راست پیدا ہوئے ہیں جو یہ ملک انگلستان کو ادا کرتا ہے یا بالواسطہ اُسی کا نتیجہ ہیں۔ ...... یہ سچ ہے کہ کھلی ہوئی دست درازی کے استیصال سے جو برکات حاصل ہوتی ہیں ان کے ہندوستانی ابتک ممنون اور معترف ہیں۔ مگر اُسی کے ساتھ وہ کہتے ہیں کہ یہ بڑھی ہوئی ناداری ایک ایسے ناسور کا پتہ دیتی ہے جو دَر پردہ ہلاکت کے سامان کر رہا ہے اور اس کا کوئی جواب موجود نہیں ہے"۔

مندرجہ بالا نوٹوں سے جو کہ برطانیہ کے مشہور و معروف ذمہ داران اربابِ حکومت کے اقوال ہیں اور جنھوں نے ہندوستان میں رہ کر حالات کا بخوبی معائنہ کیا ہے، صاف طور پر ظاہر ہو رہا ہے کہ ڈاکٹر ہنٹر نے جو الزامات اُس اسلامی نظام پر (جس کا وعدہ اور عہد برطانیہ نے شاہانِ مغلیہ سے کیا تھا) رکھے ہیں وہ بالکل غلط اور محض اپنی قوم کی شرمناک جنبہ داری اور ناجائز پروپگنڈہ پر مبنی ہیں اور جو بھلائیاں اپنے نظام میں دِکھلائی ہیں وہ بالکل خلاف واقع ہیں بلکہ یہ نظام محض لوٹ کھسوٹ اور انتہائی بربادی اور خود غرضیوں پر مشتمل ہے۔ جس نے ہندوستان کو بالکل مفلس اور قلاچ اور ناکارہ بنا کر ہلاکت کے گڑھوں میں ڈال دیا ہے۔ ہندوستانی نظامِ قدیم کے متعلق ڈاکٹر ہنٹر کا انتقاد اور اعتراض (جو مذکورۂ بالا نوٹوں سے معلوم ہوتا ہے) بالکل برعکس ہے۔ برطانیہ اور انگریزوں کے بنائے ہوئے نظام میں وہ سب خرابیاں بلکہ اُس سے بدرجہا زائد موجود ہیں جن کو ڈاکٹر صاحب موصوف اسلامی نظام میں دکھلا رہے ہیں۔ ع برعکس نہند نام زنگی کافور

لارڈ ڈلہوسی نے ۱۸۶۷ء میں بیان کیا تھا کہ "ہمیں دیسی حکومت کے طریقہ کو جہاں تک ممکن ہو ترقی دینے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ تاکہ دیسیوں کی قدرتی استعداد اور تدبر کی نشو و نما ہو سکے اور ان میں جتنی خوبیاں اور جو ہر کبھی تھے حکومت کی امداد میں کام آسکیں۔ مغلیہ سلطنت کی عظمت کا راز وہ سیر چشم حکمت عملی تھی جو اکبر اور اُس کے جانشینوں کا شعار رہی جنہوں نے

ہندوؤں کی اعانت اور قابلیت سے فائدہ اٹھایا اور حتی المقدور خود کو اہلِ ملک کے ساتھ یک ذات کرلیا۔ ہمیں ان واقعات سے سبق لینا چاہیئے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اُس فرض کو ادا کریں جو ہندوستان کی طرف سے ہم پر عائد ہے تو ہم اُسی طرح سبکدوش ہو سکتے ہیں کہ ملک میں جتنے اشراف اور اکابر ہیں اُن کی امداد اور مشورہ سے فائدہ اُٹھائیں۔ یہ جواب کہ ہندوستانی دماغ میں تدبر اور قابلیت کا سرمایہ ناکافی ہے ایک بے معنی لغویت ہے"۔

(حکومت خود اختیاری ص۳۶)

لارڈ سیلسبری نے بھی لارڈ ڈلہوزی کی تائید کرتے ہوئے فرمایا "جو لوگ ہندوستان سے سب سے زیادہ واقف ہیں۔ اُن کی متفقہ رائے یہ ہے کہ چند چھوٹی چھوٹی دیسی ریاستیں جن کا نظم و نسق عمدہ ہو۔ ہندوستانیوں کے سیاسی اور اخلاقی ارتقاء کے لئے حد درجہ مفید ہیں"

اسی قدیم نظام اسلامی اور جدید نظام انگریزی کے متعلق ہنیبرڈ لکھتا ہے:۔

"باوجودیکہ انگریزوں کی عام رائے اُس زمانہ میں اسی طرف تھی کہ ہندوستان کا نظام اُسی پرانے طریقہ پر رکھا جائے جیسا کہ قدیم سے چلا آتا تھا تاہم ہندوستان میں وہی نظام قائم رکھا گیا جو کمپنی کے زمانہ میں قائم ہو چکا تھا اور جس کی نسبت لارڈ سیلسبری نے ۱۸۶۷ء میں فرمایا تھا کہ ضابطے اور دستور کی طرف برطانوی حکومت کا رجحان اُس کی سست گوش اور ابلہانہ لاپروائی جو اکثر اُس کی بکمل اور پیچیدہ تنظیم کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ذمہ داری کا خوف اور اختیاراتِ نظم و نسق کا ایک جگہ مرکوز ہونا یہ سب باتیں ایسے اسباب کا نتیجہ ہیں جن کی ذمہ داری کسی شخص پر نہیں ہے۔ لیکن ان کی بدولت حکومت ناکارہ ہو گئی ہے اور اس نااہلیت میں قدرتی حالات اور اسباب سے مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک خوفناک تباہی نمودار ہو گئی ہے"۔

(ہنیبرڈ جلد ۱۸۰ ص ۱۰۷۲ حکومت خود اختیاری ص۳۶)

چنانچہ اس نظام کی وجہ سے جو مصیبت اس ملک میں ہوئی اُس کا اندازہ مسٹر رابرٹ نائٹ کی مندرجہ ذیل رائے سے بخوبی ہو سکتا ہے جو کہ اُنہوں نے زوالِ گجرات کی نسبت ظاہر کی ہے"۔ ۱۸۶۰ء میں

جبکہ گجرات میں ہم نے پہلا قدم رکھا تھا بہت سے دولت والے اور فارغ البال خاندان موجود تھے مگر ان کے بدن پر آج کپڑا بھی نہیں ہے...... تعلقداران سے ہمارے مطالبہ جات اس رقم سے جو وہ پہلے ادا کرتے تھے۔ تین گنے بلکہ اس سے بھی زیادہ ہیں اور اس زیادتی کے معاوضہ میں کوئی فائدہ نہیں ہے جو اُن کو حاصل ہوا ہو۔ ساہو کاروں نے جن سے تعلقداران کو تباہ کن شرح سود پر قرضے لینا پڑے ہیں اپنے مطالبے میں اُن کی املاک اور دیہات کو قرق کرا لیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ قرضہ سر سے اونچا ہوتا جاتا ہے اور گلو خلاصی کی صورت نہیں۔ خیال تو کیجئے کہ اُن کے گھرانوں کا آئندہ کیا حال ہوگا۔"

(دادا بھائی ص۴۶ حکومت خود اختیاری ص۳۷)

الغرض نظام اسلامی قدیم کی برکتیں تو ظاہر و باہر ہیں جن کا اقرار تمام مورخین کرتے ہیں اور جنھوں نے علانیہ طور پر ہندوستان کو رشکِ جناں بنا دیا تھا اسی بناء پر شاہانِ مغلیہ نے اپنے فرمانوں میں اُن کے باقی رکھنے اور انہیں کے ترقی دینے کا عہد لیا تھا۔ مگر انگریزوں نے چونکہ اپنی حرص و آز اور جلد سے جلد زیادہ سے زیادہ دولتمند ہو جانے کی خواہش کو اُس میں نہ پایا اور اُس میں ہندوستانی پبلک کی پرورش اور ترقی اور انگریز قوم کی حریصانہ مسابقت کے آثار نہ دیکھے اس لئے اُس کو چھوڑنا ضروری سمجھا اور حسبِ عادتِ قدیم اُس میں عیوب کا پروپگنڈا اور اپنی ابلیسانہ خواہشوں کو پورا کرنے والے نظام کو اچھالنا شروع کر کے آہستہ آہستہ جاری کیا۔ (کیونکہ دفعۃً جاری کرنا خطرناک تھا) جس کے نتیجہ میں ہندوستان انتہائی فلاکت اور بربادی میں مبتلا ہو گیا۔ حالانکہ انصاف پسند اور سمجھ دار انگریز اُس کے مخالف رہے ۱۸۵۷ء کے بعد بھی اُسی کو جاری رکھا گیا اور وکٹوریہ کے اعلانات کو بھی پسِ پشت ڈال دیا۔

مسٹر فلپ فرانسس جو کہ بنگال کونسل کا ممبر تھا لکھتا ہے:-

"ایک انگریز کو یہ معلوم ہو کر تکلیف ہونی چاہیئے کہ جب سے کمپنی کو دیوانی ملی ہے اہلِ ملک کی حالت پہلے سے بدتر ہو گئی ہے اور یہ کمپنی کی تجارت وغیرہ کا نتیجہ ہے۔ میرے خیال میں یہی اسباب ہیں جن کی وجہ سے یہ ملک ایک شخصی اور مطلق العنان حکومت کے زیر سایہ تو سرسبز ہوتا

رہا مگر جب انگریزوں کے تصرف میں آیا تو تباہی کے کنارے پہونچ گیا۔

(ان ہیپی انڈیا ص۳۴۴ حکومت خوداختیاری ص۷۹)

خود لارڈ کلایو ۱۷۶۵ء میں کہتا ہے۔ "جو بدنظمی نظر آرہی ہے وہ کس چیز کا نتیجہ ہے وہ نتیجہ ہے چند لوگوں کی لوٹ مار عیش پسندی حرص اور تھوڑے عرصہ میں اس قدر دولتمند بن جانے کی ہوس کا جو صرف چند لوگ ہی بن سکتے ہیں"۔

بہر حال جو اعتراضات اور ننگ انسانیت الزامات نظام انگریزی میں ابتدا سے رکھے گئے تھے اور آج تک ظہور پذیر ہوتے رہے اُن کو نظامِ اسلامی پر تھوپنا انتہائی جسارت اور شرمناک کارروائی ہے جو کہ ہمیشہ سے انگریزی ڈپلومیسیوں کے بائیں ہاتھ کا کرشمہ رہا ہے۔ ؎

خرد کا نام جنوں رکھ لیا جنوں کا خرد　　　جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

(د) پھر ڈبلو ہنٹر موصوف ص۲۲۹ پر لکھتا ہے:-

"جب ہم نے اس نظام کو توڑنا شروع کیا جس کو برقرار رکھنے کا ہم نے وعدہ کیا تھا تو ان بیچاروں کی جان میں جان آگئی"۔

یہ اقرار بھی واضح طور پر بتلا رہا ہے کہ انگریزوں نے بادشاہانِ اسلام سے عہود اور پیمانات کئے تھے اور وہ جملہ نظام اسلامی اور شہنشاہی قوانین اور طرزِ حکومت کا برقرار رکھنا تھا مگر انہوں نے اُن سب کو توڑ ڈالا۔ باقی رہا یہ امر کہ آیا نظام سابق کے توڑنے اور انگریزی نظام کے جاری کرنے سے ہندوستانی عوام اور کاشتکاروں کی جان میں جان آئی یا تلف ہوگئی۔ اوپر کے وہ تھوڑے نوٹ جو ہم نے معتبر حوالوں سے ذکر کئے ہیں اس پر پوری روشنی ڈالتے ہیں۔ حالانکہ اس قسم کی شہادتیں طوالت کے خوف سے ہم نے بہت کم ذکر کی ہیں۔ ہندوستان کی موجودہ انتہائی برباد شدہ حالت کھلے بندوں اس کی کیفیت بتلا رہی ہے۔

(ہ) پھر ڈبلو ڈبلو ہنٹر صفحہ ۲۳۰ پر لکھتا ہے:-

"مگر یہ دلائل کتنے ہی وزنی کیوں نہ ہوں اُن پرانے نوابوں کو مطمئن نہیں کر سکتے جو

برطانوی حکومت کی بے راہ روی کی وجہ سے بڑی بڑی تکلیفیں اُٹھا رہے ہیں۔
فوج سے بے دخلی مسلمانوں کے نزدیک سب سے بڑی قومی ناانصافی ہے اور اُن کے پُرانے نظامِ مالیات سے ہمارا انحراف صریحًا وعدہ خلافی ہے۔"

ان جملوں میں ڈاکٹر ہنٹر وعدہ خلافی اور ناانصافی کو مسلمانوں کا عندیہ قرار دیتا ہے حالانکہ خود تسلیم کر چکا ہے کہ واقع میں جو ہمارے وعدے اور عہود تھے ہم اُن پر قائم نہیں رہے اور ۱۷۶۵ء ہی سے اس کے درپے رہے کہ ان کا تار تار بکھیر دیا جائے چنانچہ سو برس کے عرصہ میں یعنی ۱۸۶۴ء تک میں ہم نے اس کو رفتہ رفتہ بالکل نیست و نابود کر دیا۔ اور دانستہ یا نادانستہ طریقہ پر پردہ ڈال کر اس عہد توڑنے اور نیا نظام قائم کرنے کو ہی بہتر اور ملک کے لئے مفید بتلاتا ہوا شرمناک پردہ ڈالتا ہے۔ جس کا پول ہم کھول چکے ہیں۔

مذکورۂ بالا چند واقعات بطور نمونہ پیش کئے گئے ہیں جن سے ملکی اعلانات اور معاہدوں میں کھلی ہوئی غداری کا پتہ چلتا ہے۔ اب میں چند جدید واقعات پیش کرتا ہوں جس کا تعلق مسلمانوں اور اُن کے مذہبی مراکز، مقدس مقامات سے ہے۔ ۲۔ نومبر ۱۹۱۴ء کو وائسرائے ہند نے امکنہ مقدسہ کے متعلق مسلمانانِ ہند کے لئے اعلان کیا تھا۔

برطانیہ عظمیٰ اور ٹرکی میں جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے جو دولتِ عثمانیہ نے قصدًا بغیر کسی قسم کی دھمکی دیئے جانے کے غلط مشوروں سے شروع کی ہے۔ ملکِ معظم کی گورنمنٹ ہز ایکسلنسی ہند کو اختیار دیتی ہے کہ وہ عرب کے مقدس مقامات اور عراق کی مقدس زیارت گاہوں اور جدّہ کے ساحل کے متعلق ایک عام اعلان کر دیں تاکہ ملکِ معظم کی بہت ہی وفادار ہندوستانی مسلم رعایا کو اس جنگ کے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی نہ ہو۔ مذہبی سوال سے کسی قسم کا تعلق نہیں۔
اعلان یہ ہے کہ یہ مقدس مقامات اور جدّہ برطانیہ کے بحری اور برّی فوج کے حملے اور دستبرد سے بالکل محفوظ رہے گا تاوقتیکہ ہندوستانی حاجی اور زوار کی

آمد و رفت میں کوئی دست اندازی نہ کی گئی۔ ملکِ معظم کی گورنمنٹ کے کہنے سے فرانس اور روس کی حکومتوں نے بھی اسی قسم کا اطمینان دلایا ہے"۔

اس اعلان کو چند ہی دنوں میں توڑ ڈالا گیا اور ۱۹۱۶ء میں جدہ کے ساحل پر آٹھ دن گولہ باری کی گئی اور اس کے بعد فوجیں اتاری گئیں اور پھر انھیں فوجوں سے جدہ سے مکہ معظمہ پر چڑھائی کی گئی ترکی حکام اور افسروں اور سپاہیوں کو پہلے جدہ میں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرا کے اسیر کیا گیا اور مصر بھیجدیا گیا۔ پھر مکہ معظمہ میں قشلہ اور قلعہ پر گولہ باری کرائی گئی اور جب تنگ آکر ترکی فوجوں اور افسروں نے ہتھیار ڈالدیئے تو اُن کو بھی اسیر کر کے مصر بھیجدیا گیا۔ پھر طائف پر چڑھائی کی گئی اور تقریباً ڈھائی مہینہ کی گولہ باری کے بعد جب ترکی فوجوں نے ہتھیار ڈالدیئے تو اُن کو بھی اسیر کر کے مصر وغیرہ بھیجدیا گیا۔ چونکہ میں (کاتب الحروف) اُس زمانہ میں حجاز (طائف) میں بمعیت حضرت شیخ الہند مرحوم موجود تھا ان سب واقعات پر براہ راست مطلع ہوتا رہا۔ صورت یہ کی گئی کہ پہلے پہل جبکہ ۱۹۱۴ء کی جنگِ عمومی میں چناق قلعہ کی چھ سات مہینوں تک بحری قوت نے جس پر انگریزوں کو بہت زیادہ اعتماد اور غرور تھا کوئی کامیابی حاصل نہیں کی اور منہ کی کھانی پڑی اور بیک بینی و دو گوش اپنے ہزاروں سپاہیوں کو فنا کر کے لوٹنا پڑا۔ ترکوں کی شجاعت اور بہادری سے انتہائی شرمندگی اُٹھانی پڑی تو اپنی بہادرانہ لڑائی سے مایوس ہو کر پرانی چال عیاری اور ڈپلومیسی کو عمل میں لانا ضروری سمجھا گیا اور شریف مکہ (شریف حسین) سے نامہ و پیام اور ساز باز کیا گیا۔ مصر میں جرنیل میکموہن اور حجاز وعرب میں کرنیل لارنس اس کے مرکز تھے۔ شریف حسین کو جمہوریہ عربیہ اور اُس کی صدارت کا سبز باغ دکھایا گیا اور بے شمار اشرفیوں سے امداد کی گئی اور اپنے ولی نعمت ٹرکی کی غداری پر آمادہ کیا گیا۔ اولاً حجاز کا اقتصادی محاصرہ کر کے وہاں کے باشندوں کی آرام و زندگی کا میدان تنگ کر دیا گیا اور پھر شریف مذکور سے جو کہ بالکل ہمدم و ہمراز ہو گیا تھا۔ بغاوت کا اعلان ۵ رجب ۱۹۱۶ء میں کرا دیا گیا۔ شریف کی بدوی فوجوں سے مدینہ منورہ اور جدہ، طائف، مکہ معظمہ پر حملہ کرایا گیا۔ مگر یہ بدوی فوجیں ترکوں کی باقاعدہ مسلح فوجوں پر نہ غالب آسکیں اور نہ اُن کو ہتھیار رکھنے

اور شہروں کے تخلیہ کرنے پر مجبور کر سکیں تو شریف حسین کی طلب گولہ باری (جو کہ مابین الاقوامی معاہدات کے خلاف تھی) اور باقاعدہ فوج وہتھیار جدہ اور مکہ معظمہ میں چڑھالانے پر یہ حکم کیا گیا کہ اہلِ مکہ وجدہ سے ایک محضر دستخط کرا کر انگریزی بحری ذمہ دار کے پاس بھیجے کہ ہم کو ترکوں سے آزاد کراؤ ہم سخت مجبور ہیں۔ چنانچہ یہ عمل کیا گیا اور اُس پر جبریہ طور سے سر برآوردہ اہالی شہر کے دستخط کرائے گئے اور کمانڈار بحری قوت کے پاس محضر بھیجا گیا اُس کے پہونچنے کے بعد گولہ باری شروع ہوگئی۔

چنانچہ کرنل لکھتا ہے۔ ۱۹۱۶ء میں شاہ حجاز کو ہم نے اتحادیوں کا ساتھ دینے پر آمادہ کیا۔

(ڈیلی اکسپریس لنڈن۔ مورخہ ۲۸ مئی ۱۹۲۰ء)

لنڈن ٹائمز۔ لکھتا ہے:۔

"جدہ کے ساحل پر انگریزی جہازوں نے گولہ باری کی۔ نیز ٹائمز کا نامہ نگار لکھتا ہے:۔

"جدہ کے ساحل پر انگریزی جہازوں نے گولہ باری کی۔ نیز ٹائمز کا نامہ نگار لکھتا ہے۔ اس کارروائی نے مرتدین کی مدد کی۔ اگرچہ برطانوی فوج ۳ ہزار فٹ یا زیادہ سے زیادہ تین ہزار گز کے فاصلہ سے آگے نہیں بڑھ سکی اور بہت سی رکاوٹوں سے جن کا کوئی علاج نہ تھا گولہ باری کرنا سخت مشکل ہوگیا تھا۔"

مگر اس تمام کارروائی کو ہندوستان سے بالکل چھپایا گیا۔ جب ہندوستان میں ایک عرصہ کے بعد خبریں پہونچیں تو چاروں طرف آگ بھڑک اٹھی۔ جو کہ سب کو معلوم ہے۔ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ افسوس کہ ان کھلی کھلی عہد شکنیوں اور غداریوں کے ہوتے ہوئے بھی تحریکات آزادی کی مخالفتیں عمل میں لائی گئیں۔ فالی اللہ المشتکی۔

انگریزوں کا خاص طور پر مسلمانوں کو طرح طرح سے برباد کرنا

یوروپین عموماً اور انگریز خصوصاً تمام ایشیا اور افریقہ کے باشندوں کے ہمیشہ سے دشمن رہے ہیں اور ان کو نیم وحشی غیر متمدن خارج از انسانیت وغیرہ کہتے ہوئے ان کی عزت، مال اور ذرائع دولت وغیرہ پر نہایت

بربریت سے چھاپہ مارتے رہے ہیں مگر بالخصوص مسلمانوں پر ان کو سیاسی رقابت کا بھی ہمیشہ سے خیال قائم رہا۔ اور اُن کو سخت ترین دشمنی کی آگ میں ڈالا گیا۔ جس کی بناء پر مسلمانوں کے برباد کرنے اور فنا کے گھاٹ اُتار دینے کا سب سے زیادہ عملدرآمد جاری کیا گیا۔ بالخصوص اس وقت سے جبکہ ان کو بادشاہ دہلی سے دیوانی کا صیغہ دربارہ بنگال و آسام بہار و اڑیسہ دیدیا گیا تھا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ وہ اپنے ولی نعمت کو پہچانتے اور اُس کے ساتھ وفاداری اور نمک حلالی کو عمل میں لاتے مگر رذیلوں کے ساتھ احسان کرنا ہی غلطی تھا۔ ؎

نکوئی بابداں کردن چنان است ۔۔۔ کہ بدکردن بجائے نیک مرداں

شہنشاہ اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، عالمگیر اور اُن کے وارثوں نے انتہائی غلطی کی تھی کہ ان غیر اقوام اور رذیل لوگوں کو اپنے ملک میں اقامت اور حقوق شہریت کی معہ تجارت اجازت دی اور بار بار اُن کی نالائقی کو دیکھتے اور تجربہ کرتے ہوئے بھی بڑھاتے رہے۔ چنانچہ کپتان الگزنڈر ہملٹن اپنے سفرنامہ میں ایسٹ انڈیا کے کارکنوں کی بغاوت اور شاہی فوج کا اُن پر مسلط ہونا اور بارگاہِ سلطانی میں ڈیپوٹیشن کا جس کا ایک ممبر وہ بھی تھا دہلی آنا اور شہنشاہ سے معافی مانگ کر انگریز مجرمین کا رہائی دلانا وضاحت سے ذکر کرتا ہے۔ اس کے باوجود شاہان مغلیہ ان یورپین لوگوں پر اعتماد کر کے بڑے عہدے بھی عطا کرتے رہے، بہر حال جو کچھ ہونا تھا وہ پیش آیا۔

الغرض انگریزوں نے دیوانی پر اقتدار پاتے ہی مسلمانوں کے ساتھ سوت کا معاملہ برتنا شروع کیا اور ہر صیغہ سے مسلمانوں کو چھانٹنا اور اپنوں سے یا مسلمانوں کے دشمنوں سے بھرنے کا معاملہ تدریجی طور پر جاری کیا۔ اُس زمانہ میں تمام ملکی اور فوجی صیغوں پر مسلمان ہی چھائے ہوئے تھے اور انہیں میں اعلےٰ قابلیت سیاسی اور فوجی تھی۔ چنانچہ ڈبلو ڈبلو ہنٹر صفحہ ۲۳۰ پر لکھتا ہے:۔

> حقیقت یہ ہے کہ جب یہ ملک ہمارے قبضہ میں آیا تو مسلمان ہی سب سے اعلےٰ قوم تھی۔ وہ دل کی مضبوطی اور بازوؤں کی توانائی ہی میں برتر نہ تھے بلکہ سیاسیات اور حکمت عملی کے علم میں بھی سب سے افضل تھے۔ لیکن اس کے باوجود مسلمانوں پر حکومت کی ملازمتوں کا دروازہ بند ہے۔ غیر سرکاری ذرائع زندگی میں بھی انہیں کوئی نمایاں جگہ حاصل نہیں۔"

صفحہ ۲۳۶ پر لکھتا ہے:۔

"ایک صدی قبل حکومت کے تمام ذمہ دار عہدوں پر مسلمانوں کا مکمل قبضہ تھا۔ ہندو محض شکریہ کے ساتھ اُن چند ٹکڑوں کو قبول کر لیتے تھے جو اُن کو سابق فاتح اپنے دستر خوان سے اُن کی طرف پھینک دیتے تھے اور انگریزوں کی حیثیت چند ایک گماشتوں اور کلرکوں کی تھی"۔

صفحہ ۲۲۲ پر لکھتا ہے:۔

"مختصراً یہ کہ مسلمان نواب فاتح تھے اور اس حیثیت سے حکومت پر چھائے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی کوئی ہندو ماہر اقتصادیات یا کوئی ہندو جرنیل بھی نمایاں حیثیت اختیار کر لیتا تھا۔ ان مثالوں کی موجودگی ہی اس امر کا بہترین ثبوت ہے کہ ایسا شاذ و نادر ہوتا تھا"۔

ڈاکٹر ہنٹر صفحہ ۲۳۱ پر لکھتا ہے:۔

"لیکن پھر بھی سوچنا چاہئے کہ جتنے ہندوستانی سول سروس میں داخل ہوتے یا ہائی کورٹ کے جج بنتے ہیں اُن میں ایک بھی مسلمان نہیں حالانکہ جب یہ ملک ہمارے قبضہ میں آیا تو اُس سے کچھ عرصہ بعد تک بھی حکومت کے تمام کام مسلمانوں ہی کے ہاتھوں سرانجام پاتے تھے جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں"

صفحہ ۲۳۲ پر لکھتا ہے:۔

"کارنوالس کے مجموعہ قوانین نے اس اجارہ داری کو محکمہ قانون میں اُس قوت کے ساتھ نہیں توڑا جس قوت کے ساتھ اُس نے دیوانی محکمہ میں توڑا تھا لیکن پھر بھی کمپنی کے پہلے پچاس سالہ دورِ حکومت میں حکومت کی ملازمتوں میں سب سے بڑا حصہ مسلمانوں ہی کا تھا لیکن دوسری نصف صدی میں ہوا کا رخ بدل گیا"۔

صفحہ ۲۴۶ پر لکھتا ہے:۔

"انگریزوں کے ہندوستان پر قابض ہونے سے پہلے وہ (مسلمان) ملک کی سیاسی ہی نہیں بلکہ دماغی قوت بھی تسلیم کئے جاتے تھے"۔

اور صفحہ ۲۶۵ پر دربارہ اسلامی تعطیلات لکھتا ہے:۔

"گویا وہ قوم جو کبھی ہندوستان کے تمام عدالتی عہدوں پر فائز تھی اب اس حد تک ذلیل ہو چکی ہے۔

بہر حال یہ جاننا تسلی بخش ہے کہ اور نہیں تو اس بے انصافی پر عملدر آمد ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔ حکومتِ اعلےٰ نے مداخلت کی اور حاکمانہ طور پر اسلامی تعطیلات کے چند دن مقرر کر دیئے یقیناً وہ اتنے نہ تھے جتنے مسلمان چاہتے تھے"

مسٹر ہنری ہیرنگٹن طامس (بنگال سروس کا پنشنر) اپنے رسالہ بغاوت ہند اور ہماری آئندہ پالیسی کے صفحہ ۱۳ تا ۱۷ میں ۱۸۵۸ء میں لکھتا ہے:۔

"عزم، تعلیم، اور ذہنی صلاحیت کے اعتبار سے مسلمان ہندوؤں سے کہیں زیادہ فائق ہیں اور نسبتاً ہندو اُن کے سامنے طفل مکتب معلوم ہوتے ہیں۔ علاوہ اس کے مسلمانوں میں کارگزاری کی اہلیت زیادہ ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے سرکاری ملازمتیں زیادہ تر انہیں کو ملتی ہیں۔ اس طرح اُن کو سرکاری کاموں اور ملکی مصالح سے واقفیت کا موقعہ ملا اور اُن کی رائے کو وقعت حاصل ہو گئی"۔

اگرچہ مسلمانوں کا گرانا انگریزوں نے ۱۷۶۵ء سے شروع کیا تھا۔ اور اس طرح گرتے گرتے سو سال کا عرصہ گذر گیا تھا مگر پھر بھی ۱۸۵۸ء میں اُن کی دماغی اور عملی قابلیت کی دوسروں پر فوقیت اس درجہ باقی تھی جس کو ہیرنگٹن طامس بتاتا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُن کی قابلیت سیاسیات اور حکومت وغیرہ میں پہلے کس درجہ پر فائق ہو گی جس کی صریح دلیل ہندوستان کا انگریزوں سے پہلے زندگی کے ہر شعبہ میں بالاتر ہونا اور روز افزوں ترقی کرنا ہے جس کو ہم واضح کر آئے ہیں۔ مگر انگریزوں نے اپنی خود غرضیوں اور سیاسی رقابت اور آئندہ کے تحفظات کی بناء پر کیا کیا اس کی شہادت مندرجہ ذیل اقتباسات دیں گے۔

ڈاکٹر ہنٹر صفحہ ۱۹۵ پر لکھتا ہے:۔

"مسلمان شہنشاہ کی ظاہری برتری کو مٹانے سے بہت پہلے ہم نے مسلمان حاکموں کو برطرف کرنا شروع کر دیا تھا"۔

صاحب حکومت خود اختیاری صفحہ ۱۴۱ پر لکھتا ہے:۔

"ہندوستان میں انگریزی عملداری کی ایک خصوصیت یہ رہی ہے کہ ہندوستانی ابتدا سے بڑے

عہدوں سے (جن پر عموماً مسلمان فائز تھے) قطعاً خارج کر دیئے گئے۔ قوانین بنانے میں اور ملک کے لوگوں کے درمیان انصاف کرنے میں اُن کا کوئی اختیار باقی نہیں ہے، عملداری کی اس خصوصیت کے مضر اثرات کا اندازہ منجملہ دیگر انگریزوں کے سر طامس منرو کو بخوبی ہوا جس کا اظہار انہوں نے اپنی رپورٹ میں حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے وضع قوانین میں اُن کا کوئی حصہ نہیں ہے اور قوانین کے عملدرآمد میں اُن کو بہت کم دخل ہے۔ بہ استثناء چند نہایت چھوٹے عہدوں کے وہ کسی بڑے عہدہ تک خواہ وہ فوجی ہو یا سول نہیں پہونچتے۔ وہ ایک ادنےٰ قوم کے فرد سمجھے جاتے ہیں۔۔۔۔ تمام فوجی اور دیوانی عہدے جو کچھ بھی اہمیت رکھ سکتے ہیں اب یوروپینوں کے قبضہ میں ہیں جن کا پس انداز روپیہ خود اُن کے ملک کو چلا جاتا ہے۔"

ان بڑے عہدوں اور ملازمتوں سے ان کا خارج کرنا نا قابلیت کی وجہ سے نہ تھا بلکہ صرف اُن کے ہندوستانی رقیب اور مسلمان ہونے کی وجہ سے تھا۔ ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ خود ذمہ دار انگریزوں کا اقرار ہے کہ ہندوستانی مسلمان قوتِ فیصلہ اور دماغی قوتوں میں انگریزوں سے فائق تر تھے۔

سر ارسکن بیری کہتا ہے:۔

"ہندوستانی مجوزین کی قوتِ فیصلہ کمپنی کے اُن ججوں سے جو اپیل سنتے تھے بدرجہا بہتر تھی"۔

(حکومت خوداختیاری صفحہ ۲۰)

جان سلیور (مدراس گورنمنٹ کا ممبر) کہتا ہے:۔

"وہ لوگ (باشندگان ہند) ٹیکسوں کے لگانے میں جن کی ادائگی کے لئے وہ مجبور کئے جاتے ہیں کوئی اختیار نہیں رکھتے قوانین کو جن کی تعمیل اُن پر فرض ہوتی ہے مرتب کرنے میں اُن کی کوئی آواز نہیں ہوتی اپنے ملک کے انتظام میں اُن کا کوئی حقیقی حصہ نہیں ہوتا اور ان حقوق کے دیئے جانے سے اس شرمناک حیلہ سے انکار کیا جاتا ہے کہ ان میں اس قسم کے فرائض انجام دینے کے لئے ذہنی اور اخلاقی اوصاف کی کمی ہے۔

(رپورٹ سلیکٹ کمیٹی صفحہ ۲۰۷ دت جلد ۲)

اور پھر اس پر مزید یہ طرہ تھا کہ ہندوستانی ججوں کو باوجود اس اعلےٰ اصلاحیت کے یوروپین ججوں کی تنخواہ کا

صرف پچیسواں حصّہ ملتا تھا۔ سر ارسکن پیری لکھتا ہے:۔

"یوروپین جج کو تقریباً تین ہزار پونڈ سالانہ تنخواہ ملتی ہے لیکن ہندوستانی منصف صرف ایک سو بیس پونڈ سالانہ پاتا ہے"۔

مسلمانوں کے ساتھ دلسوز بے انصافیاں کرنا اور اُن کو برباد کرنا

صفحہ ۲۱۲:۔

"لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ بڑے افسروں سے لے کر چھوٹے افسروں تک (موجودہ وائسرائے سے زیادہ کسی نے بھی مسلمانوں کے ساتھ ناانصافیوں پر زیادہ غور نہیں کیا) ہر شخص کو یقین ہوگیا ہے کہ ہم نے ملکہ کی مسلمان رعایا کے حقوق پورے نہیں کئے اور ہندوستان کی آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ جس کی تعداد تین کروڑ کے لگ بھگ ہے اپنے آپ کو برطانوی حکومت کے ماتحت تباہ و برباد ہوتا دیکھ رہا ہے۔ اُس کو شکایت ہے کہ جو لوگ کل تک اس ملک کے فاتح اور حکمراں تھے آج نانِ جویں کے روکھے سوکھے ٹکڑوں کو بھی ترس رہے ہیں سکے جواب ہیں یہ کہنا کہ یہ سب کچھ نتیجہ ہے اُن کے اپنے انحطاط کا عذرِ گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہوگا کیونکہ ان کا انحطاط بھی تو ہماری ہی سیاسی غفلت اور لاپرواہی سے مترتب ہوا۔ جب تک اس ملک کی عنانِ حکومت ہمارے ہاتھ نہیں آئی تھی تب بھی مسلمانوں کا یہی مذہب تھا وہ ایسا ہی کھانا کھاتے اور جملہ ضروریاتِ زندگی میں ویسا ہی طرز بود و ماند رکھتے تھے جیسا کہ اس زمانہ میں وہ اب بھی وقتاً فوقتاً اپنے احساس خودی اور جنگی اور اولوالعزمیوں کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ بایں ہمہ یہ وہ قوم ہے جسے برطانوی حکومت کے ماتحت تباہ و برباد کردیا گیا ہے"۔ (صفحہ ۲۱۳ ہمارے ہندوستانی

صفحہ ۲۰۷:۔

مگر یہ جب ہی ممکن ہے کہ ہم ان متواتر اور مسلسل ناانصافیوں کے احساس کو دور کردیں جو انگریزی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کے اندر پیدا ہوگیا ہے۔

صفحہ ۲۰۷ و ۲۰۸ :-

"اس حقیقت سے چشم پوشی بے سود ہے کہ مسلمان ہم پر کیسے کیسے شدید الزامات عائد کرتے ہیں۔ ایسے الزام جو شاید ہی کسی حکومت پر عائد کئے گئے ہوں۔ (۱) وہ ہمیں اس بات کا ملزم ٹھہراتے ہیں کہ ہم نے اُن پر ہر قسم کی باعزت زندگی کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ (۲) وہ ہمیں اس بات کا ملزم ٹھہراتے ہیں کہ ہم نے ایک ایسا طریقہ تعلیم رائج کر دیا ہے جس سے اُن کی قوم بہرہ ور نہیں ہو سکتی اور جو اُن کی ذلت و خواری کا سبب بن گیا ہے۔ (۳) وہ ہمیں یہ بھی الزام دیتے ہیں کہ ہم نے مسلمان قاضیوں کی برطرفی سے ہزارہا خاندانوں کو مبتلائے آفات کر دیا ہے۔ یہ قاضی نکاح کے لئے مذہبی اجازت دیتے تھے اور اُن کا کام زمانہ قدیم ہی سے اسلام کے متبرک قوانین کی نگہداشت اور نفاذ عمل میں لانا تھا۔ (۴) اُن کو شکایت ہے کہ ہم نے مسلمانوں سے مذہبی فرائض کو پورا کرنے کے ذرائع چھین لئے اور اس طرح روحانی اعتبار سے اُن کے ایمان کو خطرے میں ڈال دیا۔ (۵) ہمارا بڑا جرم اُن کے نزدیک یہ ہے کہ ہم نے مسلمانوں کے مذہبی اوقاف میں بد دیانتی سے کام لیتے ہوئے اُن کے سب سے بڑے تعلیمی سرمائے کا غلط استعمال کیا۔ ان مخصوص الزامات کے علاوہ جن کے متعلق ان کو یقین ہے کہ باسانی ثابت کئے جا سکتے ہیں اور بھی بہت سی شکایات ہیں جو محض جذبات پر مبنی ہیں۔ اور شاید انگریزوں کے تصور سے قاصر دماغ پر کوئی اثر نہ ڈال سکیں۔ مگر آئرلینڈ کی طرح ہندوستان میں بھی یہ شکایتیں مسلمانوں کو حاکموں سے بدظن رکھتی ہیں۔ وہ علی الاعلان کہتے ہیں کہ ہم نے بنگال میں قدم رکھا تو مسلمانوں کے ملازمین کی حیثیت سے لیکن اپنی فتح و نصرت کے وقت اُن کی مطلق پرواہ نہیں کی اور نو دولت طبقہ کی گستاخانہ ذہنیت کے ساتھ اپنے سابق آقاؤں کو پاؤں تلے روند ڈالا۔ مختصر یہ کہ ہندوستانی مسلمان برطانوی حکومت کو غفلت اور بے اعتنائی کا مجرم، جذبات شجاعت سے معرا، اور سرمایہ میں کمپنیوں کی طرح بد دیانتی سے کام لینے والے اور دیگر بڑی بڑی ناانصافیوں کا جن کا سلسلہ سو سال تک پھیلا ہوا ہے مرتکب ٹھہراتے ہیں۔"

صہ ۲۱۱

"یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ اُس طریقہ تعلیم سے پرہیز کرتے ہیں جو فی نفسہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو۔ لیکن اُن کے ملی رجحانات کو قطعاً خاطر میں نہیں لاتا۔ حقیقت میں اس طرح اُن کی ضروری سے ضروری احتیاجات بھی پوری نہیں ہوتیں۔ یہ طرز تعلیم اُن کے مفاد کے خلاف اور اُن کی مدنی روایات کے منافی ہے۔" (ڈبلیو ہنٹر از مسٹر بیلے سکریٹری محکمۂ داخلیہ حکومت ہند)

تعلیم یافتہ مسلمان جن کو پرانے طریقہ تعلیم پر ناز ہے حکومت کے اُن عہدوں اور ملازمتوں میں جگہ نہیں پاتے جن پر اس سے پیشتر اُن کی اجارہ داری قائم تھی۔ وہ حیران ہیں کہ یہ سب کچھ اور دیگر ذرائع زندگی قابل نفرت ہندوؤں کے ہاتھ میں چلے گئے یا جا رہے ہیں۔ جن مسلمانوں کی تعلیم ذرا بہتر ہوتی ہے۔ وہ بھی نالاں ہیں۔ گو اُن کا یہ احساس مذہبی ایذا رسانی کی حد تک نہیں پہونچا۔ اگرچہ اُن کے مذہبی خیالات کے مطابق لاپروائی کی حد تک پہونچ جاتا ہے۔ ان کے تعصب کو جس کا جواز قرآن مجید سے ہر وقت ثابت کیا جاسکتا ہے یہاں تک برانگیختہ کر دیا گیا ہے کہ ڈر ہے کہ کہیں ساری مسلمان قوم بے وفا، جاہل اور متعصب گروہ کی شکل اختیار نہ کرلے۔

صفحہ ۲۱۴ :-

"انہیں یہ رنج نہیں کہ حکومت کی نوازشوں سے حسب دستور سابق انہیں کوئی حصہ نہیں ملتا انہیں رنج یہ ہے کہ وہ اس سے بتدریج خارج کئے جا رہے ہیں۔ وہ اس بات کا گلہ نہیں کرتے کہ اب زندگی کی دوڑ میں اُنہیں ہندوؤں کا مقابلہ درپیش ہے۔ اُنہیں گلہ ہے تو یہ کہ اور کہیں نہیں تو کم از کم بنگال میں اُن کے لئے عرصہ حیات تنگ ہو چکا ہے"۔

صفحہ ۲۱۴ :-

مختصراً یوں کہئے کہ یہ وہ قوم ہے جس کی روایات بہت شاندار ہیں مگر جس کا اس کے باوجود کوئی مستقبل نہیں۔ اگر اس قوم کی تعداد تین کروڑ ہے تو یہ محض اس قوم کے لئے ہی نہیں بلکہ اُس کے حاکموں کے لئے بھی ایک بہت ہی اہم سوال ہے۔ مشرقی بنگال میں کاشتکاروں کی بہت زیادہ

تعداد مسلمان ہے"۔

صفحہ ۲۱۶:-

"حقیقت میں سارا صوبہ مسلمان امراء سے جو کبھی طاقتور اور بر سر اقتدار تھے بھرا پڑا ہے۔ وہ گذشتہ عظمت کی نشانیاں ہیں۔ اس وقت بھی مرشد آباد میں ایک اسلامی عدالت ایک نقلی سلطنت کا کھیل کھیل رہی ہے۔ ہر ضلع میں کسی نہ کسی شہزادہ کی اولاد بے بام محلات اور پر از خار نالابوں کے درمیان نہایت تکبر اور ترش روئی سے خون جگر پیتی نظر آتی ہے۔ اس قسم کے بہت سے خاندانوں کو میں بذات خود جانتا ہوں۔ ان کے گھروں میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی کمی نہیں۔ ان کے پوتے پوتیاں بھی ہیں اور ان کے نواسے نواسیاں بھی۔ لیکن اس فاقہ مست گروہ میں ایک ایسا بھی نہیں ہے جسے اپنے ہی لئے زندگی میں کام کرنے کا کوئی موقعہ حاصل ہو۔ وہ غلیظ برآمدوں اور ساتھ کے ٹپکتے ہوئے مکانوں میں اداس زندگیاں بسر کر رہے ہیں۔ اور دن بدن قرض کے تباہ کن گڑھوں میں گرتے چلے جاتے ہیں۔ تا آنکہ پاس ہی کا ہندو مہاجن ایک دن ان سے جھگڑا مول لے لے گا اور چند لمحوں میں قرضخواہوں کا ایک جم غفیر عدالت کے حکم سے بیع قطعی کا حق حاصل کر کے قدیم مسلمانوں کے اس خاندان کو دیکھتے دیکھتے ہڑپ کر لے گا۔ یہاں تک کہ صفحہ ہستی سے اس کا نشان تک مٹ جائے"۔

صفحہ ۲۱۷:-

"اگر کسی خاص مثال کی ضرورت ہو تو میں ناگر کے راجاؤں کی مثال پیش کر سکتا ہوں۔ پہلے پہل جب انگریزوں کو ان سے واسطہ پڑا تو ان کی سالانہ آمدنی دو صدیوں کی غلطیوں اور فضول خرچیوں کے باوجود پچاس ہزار پونڈ تھی۔ یہ راجہ اپنے لئے ستونی شامیانے میں بیٹھ کر اپنی اس ریاست کا نظارہ کیا کرتے تھے جو آج کل دو انگریزی اضلاع پر منقسم ہے۔ ان کی مسجدیں اور لاتعداد بارہ دریاں ایک مصنوعی جھیل کے کنارے چاروں طرف چلی گئی تھیں اور صاف و شفاف پانی میں جس کے اندر ایک بھی خود رو پودا نظر نہیں آتا تھا منعکس ہوتی تھیں۔ راجہ کی خانگی سیڑھیوں سے

ہر روز ایک سنہری بجرا مستانہ وار اُس جزیرہ کا رخ کرتا ہے جو اس جھیل کے عین وسط میں واقع ہے اور رنگا رنگ کے پھولوں سے پٹا پڑا ہے۔ محل کے دروازہ پر سپاہی پہرہ بدلتے رہتے ہیں اور جب آفتاب غروب ہونے کے قریب ہوتا ہے تو شہزادیوں کے باغات سے بچّوں کے کھلکھلانے اور خواتین کی شیریں آوازیں سننے میں آتی ہیں۔

مگر اب سوائے فلک نما ڈیوڑھی کے اس محل کا کوئی نشان باقی نہیں۔ مسجد کی بے بام و در دیواروں سے استرکاری کی تمام زیبائشیں مٹ چکی ہیں۔ وسیع و عریض باغ اور ان کی صاف ستھری نہریں ویرانہ ہیں۔ اب اُن میں جاوٗلوں کی کاشت ہوتی ہے۔ اور اُن کے رنگا رنگ مچھلیوں والے تالاب گندے اور سڑے ہوئے گڑھوں کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ بارہ دریوں کی جگہ اب صرف اینٹوں کا ملبہ ہے۔ کہیں کہیں اگر کسی دیوار کا کوئی حصہ نظر آجاتا ہے تو عربی وضع کی کسی محراب دار کھڑکی سے اس نظارہ پر اور بھی حسرت برسنے لگ جاتی ہے۔

مگر ان میں سب سے زیادہ حسرتناک منظر شاہی جھیل کا ہے جس کے کنارے محل اب بھی استادہ ہے جو پرانے زمانہ کا خوبصورت اور ستونوں والا محل نہیں بلکہ ایک ویران کھنڈر ہے اس کی خراب خستہ دیواروں کو سطح آب پر جمی ہوئی کائی سے بڑی ہی مناسبت معلوم ہوتی ہے (نوٹ از مصنف! میں عمارت اور تالاب کا وہ نقشہ بیان کر رہا ہوں جو میں نے ۱۸۶۷ء میں دیکھا تھا میں نے سُنا ہے کہ تالاب کو صاف کیا گیا ہے اور محل اور بھی خستہ ہو گیا ہے) وہ بدنصیب خواتین جو کبھی رانی کہلاتی تھیں اب کبھی شام کی سیر کو پردہ دار بجروں میں نہیں نکلتیں ان کے زنانخانوں کے چھت تک باقی نہیں۔ اُن کے مکین اب اُن معمولی مکانوں میں چلے گئے ہیں جو تباہ شدہ اصطبل کے پاس واقع ہیں۔ ناگر خاندان کی گذشتہ عظمتوں کی یاد صرف ایک نہر سی باقی ہے جو اب بھی دلدلوں کے بیچ میں اُسی راستہ سے بہتی ہے جس سے کبھی محلوں کے درمیان سے گذرتی تھی اور جسے دیکھ کر قدیم الایام روما کی خاموش یادگاروں کی ایک ہلکی سی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ دریائے ٹائبر کے سوا روما کا کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ دُنیا کی بے ثباتی بھی کیا چیز ہے کہ جو شئے مضبوطی سے قائم کیجائے وہی

تباہ و برباد ہو جاتی ہے - اور جو نقل مکانی کرتی رہے اُس کو ثبات و دوام حاصل ہو جاتا ہے"
اس خاندان کے نمائندے، خستہ محل کے ایک کونے میں دبکے ہوئے اپنی عسرت زدہ زندگیاں بسر
کر رہے ہیں - وہ نشہ آمیز مٹھائیوں کو چوستے اور خود رَو پودوں سے اٹی ہوئی جھیل پر حسرت بھری
نگاہوں سے تکتے رہتے ہیں - اگر کوئی سیاست داں ایوانِ عام میں سنسنی پیدا کرنا چاہتا ہو تو اُس کے
لئے یہ کافی ہے کہ بنگال کے کسی ایسے مسلمان گھرانے کی سچی داستان بیان کر دے -

وہ اپنی کہانی کو اس طرح شروع کرے گا - ایک قابل عزت شہزادہ بہت بڑے علاقہ پر حکمرانی کر رہا ہے
وہ اپنی فوج کا سپہ سالار ہے اس کے بے شمار خدمتگار ہیں وہ مشرقی شاہانہ دربار کی تمام روایات کو
برقرار رکھتا ہے اور بستر مرگ پر مسجدوں کی تعمیر اور مذہبی اوقاف کا حکم دے کر اپنی روح کو تسکین
دیتا ہے - اُس کے بعد وہ اس کے موجودہ بے عقل جانشین کی تصویر کھینچے گا - وہ اُن
جنگلوں میں جب انگریز شکاریوں کی آمد کی خبر سنتا ہے تو اپنے آپ کو چھپا لیتا ہے اور اگر اُس کے
خادم مجبور بھی کریں کہ اجنبیوں کی عزت افزائی کرنا ضروری ہے تو وہ ان سے ملاقات پر ہمیشہ
ایک ہی بات دُہراتا ہے اور وہ یہ کہ فلاں تاجر نے ابھی ابھی اس کے محل کو چند سو روپیوں کے
بدلے قرق کر لیا ہے ——

میں نے بنگال کے مسلمان نوابوں اور کاشتکاروں کے حالات ذرا وضاحت سے بیان کئے ہیں
تا کہ انگریزوں کے سامنے ان لوگوں کا نقشہ کھینچ دوں جن کی شکایات کا بیان اس باب میں کیا جائیگا
میں یہ بھی بتلا دوں کہ میرے بیانات کا تعلق جنوبی بنگال سے ہے کیونکہ یہ وہ صوبہ ہے جسے میں اچھی
طرح جانتا ہوں - اور جہاں تک مجھے علم ہے مسلمانوں نے برطانوی حکومت کے ماتحت سب سے
زیادہ یہیں نقصان اُٹھایا ہے - پھر اگر میں دوسروں کو یہ یقین دلاؤں اور خود میرا بھی خیال ہو کہ یہ
بیانات تمام مسلمانانِ ہند پر راست آتے ہیں تو مجھے اس پر معاف فرمایا جائے —— میری رائے
میں اگر کسی قوم کی حالت کو درست کرنے کی ضرورت کبھی محسوس ہو گی تو وہ جنوبی بنگال کے مسلمان
نواب ہیں - ان کے دولت و ثروت کے پرانے ذرائع ختم ہو چکے ہیں الخ صفحہ ۲۲۱ -

مسلمانوں کی آمدنی کے ذرائع

(۱) بنگال میں آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ دیوانی کا محکمہ ہے۔ جس پر مسلمانوں کی اجارہ داری قائم تھی۔

(۲) محکمہ پولیس بھی آمدنی کا اچھا خاصہ بڑا ذریعہ ہے اور اس کے تمام افسر بھی مسلمان تھے۔

(۳) آمدنی کا تیسرا بڑا ذریعہ قانونی عدالتیں ہیں اور یہاں بھی مسلمان چھائے ہوئے تھے۔

(۴) اور ان سب سے بڑھ کر فوج۔ اس کے عہدہ داروں میں وہ لوگ نہیں آسکتے تھے جو اپنے فرائض کو معمولی منافع پر بجا لاتے بلکہ فاتحوں کی ایک جماعت ہوتی تھی جو اپنے کاشتکاروں کے نام فوج میں درج کراتے اور اُن کی تنخواہیں شاہی خزانہ سے خود اپنے لئے وصول کرتے۔ گویا آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے بنگال کے

خاندانی مسلمانوں کے لئے ناممکن تھا کہ وہ غریب ہوں لیکن آج کل یہ ناممکن ہے کہ وہ بدستور امیر رہیں مختصراً یہ کہ مسلمان نواب فاتح تھے اور اسی حیثیت سے حکومت پر چھائے ہوئے تھے۔ صفحہ ۲۲۲۔

ایک نواب کے خزانہ میں ہر سال تین ذرائع سے دولت جمع ہوا کرتی تھی۔ فوج کی افسری، مالگزاری جمع کرنے کی خدمت، اور سیاسی و قانونی خدمات کی سرانجام دہی۔ یہ اس کی عظمت کے جائز ذرائع تھے۔ لیکن اس کے علاوہ عدالتی خدمات اور سینکڑوں اور ذرائع بھی تھے جو فراہمی دولت میں کام آتے صفحہ ۲۲۲

مسلمانوں کے ذرائع آمدنی میں سے برطانوی حکومت کے ماتحت کیا باقی رہ گیا

(۱) سب سے پہلے جنگی خدمات کو لیجئے جن کا دروازہ اُن پر تمام و کمال بند ہے۔ اچھے گھرانے کا کوئی مسلمان فرد ہماری فوج میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اور اگر وہ ہو بھی جائے تو وہ اُس کے لئے دولت پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ صفحہ ۲۲۳۔

(نوٹ) بہت ہی کم مسلمانوں کے پاس گورنر جنرل کی کمیشن ہے اور جہاں تک مجھے علم ہے ملکہ کی کمیشن کسی کے پاس بھی نہیں۔ ہندوستانی صرف سپاہی کی حیثیت سے فوج میں بھرتی ہو سکتے ہیں اور شاذ و نادر اگر کوئی افسری تک پہونچ بھی گیا ہے تو اس نے بھی درجہ بدرجہ ہی ترقی کی ہے اور اس قاعدہ سے کوئی بھی

مستثنے انہیں۔ صرف ایک مسلمان آنریری کپتان کے درجہ تک پہنچا ہے اور وہ کپتان حیات علی ہے جس کی سفارش کرنل آوٹری نے غدر کے زمانہ میں کی تھی۔ یہ مسلمان ملکہ کے کمیشن لینے کا ہر طرح حقدار ہے۔ کیونکہ میں ذاتی طور پر اس سے اور اس کے کارناموں سے واقف ہوں۔ حاشیہ صفحہ ۲۲۳

مسلمانوں کی سفارش برائے فوجی خدمات

ذاتی طور پر میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستانی امراء کو جلد یا بدیر بعض شرائط کے ماتحت انگریزی فوج میں کمیشن افیسر کی حیثیت سے داخل کر لینا چاہیے۔ آج کل کوئی کمیشن افسر ملکہ کی فوج میں ملازمت سے مال و دولت حاصل نہیں کر سکتا اور اس بات کو مسلمان بھی اچھی طرح جانتے ہیں مگر وہ ابھی تک فوجی زندگی کے اعزازات اور معقول تنخواہ کے خواہشمند ہیں اور اس بات کو سختی سے محسوس کر رہے ہیں کہ ان کا آبائی پیشہ ہمیشہ کے لئے اُن سے چھن گیا۔ صفحہ ۲۲۲

مسلمانوں کا دوسرا ذریعہ آمدنی

مسلمان امراء کا دوسرا ذریعہ آمدنی تھا مالگذاری کا جمع کرنا۔ اس اجارہ داری کی بنیاد اسلامی قوانین پر قائم کی گئی تھی۔ ٹیکس کی ادائیگی مغلوبیت کی نشانی ہے۔ فاتح صرف ٹیکس ہی وصول نہیں کرتا تھا بلکہ ٹیکس وصول کرنے کا پر نفع کام بھی انہیں کے سپرد ہوتا تھا۔ اس بات کے بار بار دُہرانے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ہندوستان میں فاتح اور مفتوح کے تعلقات اسلامی قوانین کے اس قدر ماتحت نہ تھے۔ جتنے سیاسی اغراض کے۔ اس لئے پرجوش اور غیر ملکی فاتحوں کو دیوانی کی تفصیلات میں الجھنا ناپسند تھا۔ وہ کاشتکاروں سے براہ راست معاملہ کرنے کی ذمہ داری اپنے ہندو پیادوں پر چھوڑ دیتے۔ یہ طریقہ اس قدر عام تھا کہ اکبر نے جب ایک ہندو کو وزیر مالیات کے عہدہ پر فائز کیا۔ اور اسی عہدے کے ماتحت ٹوڈرمل نے مالیات کا قلمدان ہاتھ میں سنبھالا تو مسلمان شہزادوں نے احتجاج کے طور پر ایک وفد دربار شاہی میں بھیجا۔ لیکن شہنشاہ نے جواب دیا "تمہاری جائدادوں اور معافی کی زمینوں کا انتظام کن کے ذمہ ہے"۔ انہوں نے جواب دیا "ہمارے ہندو دلالوں کے" "بہت اچھا تو مجھے بھی اپنی ریاست کے انتظام پر ایک ہندو کو مقرر کرنے کی اجازت دیجئے"۔

مالیات کے بڑے بڑے عہدے تو مسلمانوں ہی کے پاس رہے لیکن کاشتکاروں کے ساتھ براہ راست معاملہ کرنے کا دستور ہندو پیادوں کے ہاتھ میں رہا۔ حقیقت میں یہ ہندو ملازمین محکمہ مالیات کے ماتحت تھے جو مالگزاری کو مسلمان افسروں تک پہونچاتے مگر اس سے پہلے منافع کی رقم سے خود اپنا حصہ وضع کرلیتے۔ محکمہ مالیات شہنشاہ اکبر کے سامنے جوابدہ تھا اور اسلامی نظام مالیات کی ایک بہت ہی اہم کڑی۔ وہ مالگزاری کے قوانین نافذ کرتا۔ لیکن یہ نفاذ عدالتوں کے ذریعہ نہیں بلکہ تلوار کے زور سے ہوتا۔ اگر مالیہ وصول نہ ہوتا تو سپاہیوں کو حکم دیا جاتا کہ وہ اپنی غارت گری سے دیہاتیوں کی زندگی کو اس وقت تک اجیرن بنائے رکھیں جب تک کہ ان سے آخری پائی تک وصول نہ ہوجائے۔ کاشتکار اور ہندو پیادے دونوں کا وتیرہ ہمیشہ یہی رہا ہے کہ کسی نہ کسی طرح مقررہ رقم پر چھٹکارا حاصل کرلیا جائے اس کے برعکس اعلےٰ مسلمان عہدیداروں کی کوشش یہ تھی کہ جہاں تک ممکن ہو مقررہ رقم سے زیادہ وصول ہو۔

بنگال کو انگریزوں نے حاصل کیا تو شہنشاہ دہلی کے دیوان ہونے کی حیثیت سے۔ پھر یہ عہدہ کسی بہت بڑی رشوت سے نہیں بلکہ تلوار کے زور سے لیا گیا۔ قانوناً ہم صرف شہنشاہ دہلی کے دیوان تھے یعنی چیف ریونیو افسر[ملہ] اسی بناء پر مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ ہم کو اسی اسلامی طریقہ پر کاربند رہنا چاہئے جس کے انتظام کا ہم نے اس وقت ذمہ لیا تھا۔ جہانتک میرا خیال ہے اس میں طرفین کا باہمی سمجھوتہ فی الواقعہ یہی تھا۔

(نوٹ) ملہ مسٹر انجی سن کی دستاویزات ہیں ۱۲۔ اگست ۱۷۶۵ء کا فرمان یا ایسٹ انڈیا کمپنی کی سہ ماہی رپورٹ ۱۸۷۱ء کو دیکھئے ۱۹۱ سے لے کر ۲۰۲ تک۔

ملہ وہابی مقدمات کا انچارج افسر لکھتا ہے۔ "ہم نے دیوانی اس وعدے کے ساتھ لی تھی کہ ہم اسلامی حکومت کو جیسی کہ اس وقت قائم ہے برقرار رکھیں گے۔ ہم نے ایسا ہی کیا تھا"۔

انگریزوں کا طاقتور ہوتے ہی مسلمانوں کو برباد کرنا اور معاہدوں کو توڑ ڈالنا

انگریزوں نے چند ایک سال تو مسلمان عہدہ داروں کو بحال رکھا لیکن جب اصلاح کا وقت آیا تو اس قدر احتیاط سے قدم اٹھائے کہ اس پر بزدلی کا گمان ہونے لگتا ہے۔ بایں ہمہ سب سے کاری ضرب جو ہم نے پرانے طریق پر لگائی وہ اس قدر پُرفریب تھی کہ اس کا پیش از وقت اندازہ نہ مسلمانوں کو ہوسکا نہ انگریزوں کو

میرا مطلب ہے اُن تبدیلیوں سے جو لارڈ کارنوالس نے رائج کیں اور جن سے ۱۷۹۳ء کا دوامی بندوبست مترتب ہوا۔ اس بندوبست سے اُن مسلمان افسروں کا کاروبار ہمارے ہاتھ میں آگیا جو حکومت اور ٹیکس جمع کرنیوالوں کے درمیان واسطہ کا کام دیتے تھے اور جن کے سپاہیوں کو مالگذاری جمع کرنے کا جائز حق پہونچتا تھا۔ مسلمان تعلقداروں اور اُن کے سپاہیوں اور شمشیر زنوں کی بجائے اب ہم نے ہر ایک ضلع میں ایک انگریز کلکٹر مقرر کر دیا ہے اور اس کے ساتھ غیر مسلح خالصہ دار بھی جیسا کہ اس سے پہلے عام طور پر عدالتوں کے پیادے کام کرتے تھے۔ مسلمان امراء کا یا تو مالگذاری سے کوئی تعلق نہیں رہا یا وہ محض زمیندار ہیں جن کو زمین کی آمدنی سے ایک مقررہ حصہ ملجاتا ہے۔ بہرحال ان تبدیلیوں کو دوامی بندوبست نے رائج نہیں کیا اس نے صرف اُن کی تکمیل کی تھی البتہ اُس نے مسلمان گھرانوں کو سخت نقصان پہونچایا۔ مگر ایک دوسرے رنگ میں۔ اس بندوبست کا عام رجحان اس طرف تھا کہ اُن ماتحت ہندو افسروں ہی کو زمین کا مالک قرار دیا جائے جو براہ راست کاشتکاروں سے مالگذاری وصول کرتے تھے۔

زمینداری میں مسلمانوں کی تباہی کی دوسری وجہ

میں نے سنہ ۹۰-۱۷۸۸ء کے بندوبست کے مسودات کا مطالعہ بڑی احتیاط سے کیا ہے، اور میں بخوبی سمجھتا ہوں کہ ان دفعات کے باوجود جو سنہ ۱۷۹۳ء کے قانون میں دلالوں کے بارے میں درج ہیں اُس وقت کے افسران مال کی نظروں میں پچھلے نظام مالگذاری کی صرف تین ہی کڑیاں تھیں یعنی حکومت[۱]، مقامی ایجنٹ[۲] یا زمیندار جو کاشتکاروں سے براہ راست مالگذاری جمع کرتے تھے۔ اور کاشتکار[۳] جو زمین میں ہل چلاتے تھے۔ اور انہیں تین کڑیوں کو ہم نے نظام میں داخل کیا۔ مسلمانوں کے نظام دیوانی کی دوسری کڑیوں کو ہم نے بالکل نظر انداز کر دیا یا وہ خود بخود مفقود ہو گئیں۔ مثلاً خود مختار تعلقداروں کی علیحدگی ہی سے بہت سے مسلمان خاندانوں کی عظمت خاک میں مل گئی۔ یہ خاندان اپنی ریاست کے کچھ حصہ کی کاشت کا دوامی پٹہ دوسروں کے نام لکھ دینے کے باوجود اپنے ماتحت زمینداروں پر ایک قسم کا قانونی حق رکھتے تھے اور پھر جب موقعہ ہوتا اُن سے نذرانہ کے طور پر نقدی یا جنس ہتھیا لیتے تھے۔ ایک افسر جس نے مسلمانوں کی موجودہ بے چینی اور دوامی بندوبست سے اس کے تعلق کا مطالعہ

بڑی دقیق نظر سے کیا ہے۔ لکھتا ہے۔" اس بندوبست نے ہندو کلکٹروں کو جو اس سے پہلے معمولی عہدوں پر مامور تھے، ترقی دے کر زمیندار بنا دیا ہے۔ اُن کو زمین کی ملکیت کا حق حاصل ہو گیا ہے اور اب وہ اس دولت کو سمیٹ رہے ہیں جو مسلمانوں کی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کا حق تھا" صفحہ ۲۲

مسلمانوں اور بادشاہان اسلام سے غداری

سو یہ سب سے بڑی ناانصافی ہے جس کا مسلمان امراء انگریزی حکومت کو مجرم ٹھیراتے ہیں۔ اُن کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم نے مسلمان شہنشاہ سے بنگال کی دیوانی اس شرط پر لی تھی کہ ہم اسلامی نظام کو برقرار رکھیں گے لیکن جونہی ہم نے اپنے آپ کو طاقتور پایا اس وعدے کو فراموش کر دیا۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ جب ہم نے بنگال میں مسلمانوں کے نظام دیوانی کا مطالعہ کیا تو اُس کو اس قدر یک طرفہ اس قدر ناکارہ اور اصولِ انسانیت کے خلاف پایا کہ اگر ہم اُس کو برقرار رکھتے تو تہذیب کے لئے باعثِ ننگ ہوتے۔

(نوٹ) اُس نظام کے ماتحت تو ہندوستان دن دونے رات چوگنے ترقیات کے مدارج طے کر کے دولت کا مرکز بن گیا جیسا کہ لارڈ کلائیو صوبہ بنگال کے متعلق باغِ ارم اور لازوال دولت کا مرکز لکھتا ہے اور برطانی نظامِ حکومت کے متعلق سر جان شور لکھتا ہے۔ برطانیہ نے جو طرزِ حکومت قائم کیا ہے اُس کے تحت ملک اور باشندگانِ ملک رفتہ رفتہ محتاج ہوتے جاتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ ان پرانے تاجروں پر جلدی تباہی آگئی۔

ہم اضلاع کے اندراج سے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ اسلامی حکومت کا مقصد محض روپیہ جمع کرنا تھا۔

(نوٹ) مگر انگریزوں کا مقصد روپیہ لندن کو بھیجنا تھا جس سے ملک بالکل تباہ کر دیا گیا۔ مسٹر ہیری ورلسٹ گورنر بنگال لکھتا ہے:-

"کاشتکار اور کاریگر اگرچہ گراں شرح کا سود ادا کرتے تھے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ سرمایہ جہاں سے کہ وہ قرض لیتے تھے بڑھتا جاتا تھا مگر انگریزی عملداری میں معاملہ برعکس ہو گیا ہے تاتاریوں کا حملہ ضرور شر انگیز عداوت تھی مگر اس کے مقابلہ میں ہماری حفاظت کو دیکھا جائے کہ اس سے ہندوستان

تباہ ہو رہا ہے وہ ان کی عداوت تھی اور یہ ہماری دوستی۔ ہر ہر روپیہ جو ایک انگریز ہندوستان سے کماتا ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہندوستان کے ہاتھ سے جدا ہو جاتا ہے۔"

(حکومت خود اختیاری صفحہ ۱۲)

مالگذاری جمع کرنے والوں کے ذمہ نظام حکومت کے تمام فرائض کر دیئے گئے تھے۔ اُن کو اس بات کی اجازت تھی کہ جو جی میں آئے کریں۔ بشرطیکہ مالگذاری کا روپیہ باقاعدہ جمع کرتے رہیں۔ عوام کو اس لئے ستایا جاتا تھا کہ زمینداروں کو لگان وصول ہوتا رہے۔ اُن کو اس لئے لوٹا جاتا تھا کہ زمینداروں کے ملازمین دولتمند ہو جائیں اس ظلم و ستم کے خلاف شکایت بے سود تھی۔ کیونکہ یہ زمیندار اور اُس کے افسر کی مرضی پر منحصر تھا کہ وہ اُن کی شکایات کو سُنے یا نہ سُنے۔ اُن کی شکایات کے ازالہ کا امکان بہت کم تھا۔ کیونکہ ظالم بالعموم زمیندار ہی کا ملازم ہوتا تھا پھر اگر ڈاکوؤں کو کوشش کر کے گرفتار بھی کر لیا جاتا تھا تو ان کے لئے مشکل نہ تھا کہ قید کرنے والوں سے یارانہ گانٹھ لیں۔ صفحہ ۲۲۸۔

اس نظام قدیم کے توڑنے میں صریح وعدہ خلافی کا اقرار

جب ہم نے اس نظام کو توڑنا شروع کیا جس کو برقرار رکھنے کا ہم نے وعدہ کیا تھا تو ان بے چاروں کی جان میں جان آگئی سب سے بڑی ناانصافی جو ہم نے مسلمان امراء سے کی وہ یہ تھی کہ ہم نے اُن کے حقوق معین کر دیئے۔ اس سے پہلے نہ اُن کے حقوق کوئی مستقل حیثیت رکھتے تھے اور نہ متعین تھے۔ حکومتِ وقت کے بہت سے تسلیم شدہ حقوق کی بیش بہا قربانی کے بعد ہم نے ملکیت زمین کو موروثی کر دیا اب مستقلاً اُس کے مالک تھے۔ مگر جو قوم صدیوں سے قابلِ نفرت لوٹ مار کی عادی ہو محض گورنر جنرل کے لکھ دینے سے اپنی جاگیروں کے انتظام کا پُرامن مشغلہ اختیار نہیں کر سکتی۔ دیہاتوں پر مسلمانوں کے ظلم ختم ہو گئے اور تیس سال بعد مالگذاری کے قانون نے ان کی قسمت پر یہ آخری مہر لگا دی۔ گذشتہ پچھتر سال سے بنگال کے مسلمانوں کے گھرانے یا تو صفحہ ہستی سے بالکل نابود ہو گئے ہیں یا اُن لوگوں کے مقابلہ میں حقیر اور پست ہیں جن کو ہماری حکومت نے سربلند کیا ہے۔ لیکن پھر بھی اُن کی سرکشی گستاخی اور کاہلی میں کوئی فرق نہیں آیا اور ایسا کیوں نہ ہو آخر وہ نوابوں اور فاتحوں کی اولاد ہیں۔

مسلمانوں کی دولت کے دو بڑے ذرائع یعنی فوج اور محکمہ دیوانی کے متعلق ہم نے جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے اُس کے جواز میں بہت دلائل موجود ہیں گو اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طرزِ عمل سے بنگال کے مسلمان گھرانے بالکل تباہ و برباد ہو گئے۔ ہم نے مسلمان امراء کو فوج میں داخل نہیں کیا کیونکہ ہم کو یقین تھا کہ ہماری عافیت اُن کو بے دخل کر دینے ہی میں ہے۔ ہم نے ان کو دیوانی کے منفعت بخش محکمہ سے اس لئے خارج کر دیا کیونکہ ایسا کرنا حکومت اور عوام کی بہتری کے لئے از حد ضروری تھا[1]۔ مگر یہ دلائل کتنے ہی وزنی کیوں نہ ہوں اُن پرانے نوابوں کو مطمئن نہیں کر سکتے جو برطانوی حکومت کے بے راہ روی کی وجہ سے بڑی بڑی تکلیفیں اٹھا رہے ہیں۔ فوج سے بے دخلی مسلمانوں کے نزدیک سب سے بڑی قومی ناانصافی ہے اور اُن کے پرانے نظامِ مالیات سے ہمارا انحراف صریحاً وعدہ خلافی۔ صفحہ ۲۳۱۔

قانونی اداروں سے مسلمانوں کا اخراج

"اُنکی عظمت کا تیسرا بڑا ذریعہ قانونی اور سیاسی یعنی دیوانی ملازمتوں کی اجارہ داری تھی۔ حالات اور واقعات پر زیادہ زور دینا ناواجب ہے لیکن پھر بھی سوچنا چاہیئے کہ جتنے ہندوستانی سول سروس میں داخل ہوتے یا ہائی کورٹ کے جج بنتے ہیں اُن میں ایک بھی مسلمان نہیں ہے۔ حالانکہ جب یہ ملک ہمارے قبضہ میں آیا تو اس سے کچھ عرصہ بعد تک بھی حکومت کے تمام کام مسلمانوں ہی کے ہاتھوں سرانجام پاتے تھے جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ مسلمان کلکٹر ہی مالگزاری جمع کرتے تھے۔ مسلمان فوجدار اور کوتوال ہی پولیس کے افسر تھے۔ مسلمانوں کا ایک بہت بڑا محکمہ جس کا صدر مقام نظام کے محل واقع مرشد آباد میں تھا اور صوبے کے تمام اضلاع میں اُس کے افسروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ فوجداری قوانین نافذ کرتا تھا۔ مسلمان جیلر بنگال کے تمام قیدیوں سے رشوت لیتے

---

[1] یہ مقالہ برعکس نہند نام زنگی کافور ہے۔ سیول ہیرٹ ممبر کونسل ۱۸۲۶ء میں لکھتا ہے۔ برطانیہ کا دورِ حکومت مہربان اور مقبول بتایا جاتا ہے مگر اس عہد میں ملک جس حالت کو پہونچ گیا ہے۔ اگر اس کا مقابلہ دیسی حکمرانوں کے عہد سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت لوگ خوشحال تھے .... یہ ملک فلاکت کی انتہائی پستی تک پہونچ گیا ہے۔"

تھے یا اپنی مرضی سے بھوکوں مرتے تھے قاضی یعنی اسلامی قوانین کے ماہر دیوانی اور خانگی عدالتیں قائم کرتے تھے۔

یہانتک کہ جب ہم نے تربیت یافتہ انگریز افسروں کے ذریعہ انصاف کرانا چاہا تو بھی قاضی قانونی نکات پر مشورہ دینے کیلئے اُن کے ساتھ بیٹھتے اسلامی شریعت ہی ملک کا قانون تھا اور حکومت کے تمام کارپرداز اور ماتحت افسر بدستور مسلمان ہی تھے۔ وہی سرکاری زبان بول سکتے تھے وہی سرکاری دستاویزات پڑھ سکتے تھے جو فارسی کے شکستہ خط میں لکھی ہوئی ہوتی تھیں کارنوالس کے مجموعہ قوانین نے اس اجارہ داری کو محکمہ قانون میں اُس قوت کے ساتھ نہیں توڑا جس قوت کے ساتھ اس نے دیوانی محکمہ میں توڑا تھا لیکن پھر بھی کمپنی کے پہلے پچاس سالہ دورِ حکومت میں حکومت کی ملازمتوں میں سب سے بڑا حصّہ مسلمانوں ہی کا تھا لیکن دوسری نصف صدی میں ہوا کا رخ بدل گیا۔ پہلے تو اس کی رفتار کمزور تھی لیکن جوں جوں کاروبار سلطنت کو دیسی زبان میں نہ کہ "ہتوس" میں جو مسلمان فاتحوں کی غیر ملکی زبان تھی چلانے کی ضرورت کا احساس بڑھتا گیا یہ رفتار بھی بتدریج تیز ہوتی گئی۔ اب ہندوؤں نے ملازمتوں میں داخل ہونا شروع کیا اور رفتہ رفتہ سرکاری زندگی کے تمام شعبوں پر چھا گئے۔ یہاں تک کہ ڈسٹرکٹ کلکٹری میں جہاں اب بھی پرانے طریقہ کے مطابق دوستی کی بناء پر ملازمت ملنے کا امکان ہے بہت کم مسلمان افسر ہیں۔ جو مسلمان ابھی اس محکمہ میں باقی ہیں وہ بہت بوڑھے ہیں۔ ان کا کوئی جانشین نہیں ہے۔ ابھی دس سال ہوئے ناظر یا مالگذاری کے افسر کی آسامیاں مسلمانوں کے بعد مسلمانوں ہی کو ملا کرتی تھیں مگر اب جیل کی ایک دو غیر مشہور آسامیوں کے سوائے ہندوستان کے یہ سابق فاتح اور کسی ملازمت کی امید نہیں رکھ سکتے۔ مختلف دفاتر میں کلرکوں کا عملہ عدالت کی ذمہ دار آسامیاں اور تو اور پولیس کی اعلیٰ ملازمتیں بھی سرکاری اسکول کے چالاک ہندو لڑکوں سے پُر کیجاتی ہیں[1]۔

اگر غیر مشہور نان گزیٹیڈ افسروں کے جم غفیر سے لے کر اعلیٰ عہدوں تک کا مطالعہ کیا جائے تو یہ سوال شخصی آراء سے نکل کر یقینی طور پر اعداد و شمار میں پہونچ جاتا ہے۔ دو سال کا عرصہ ہوا میں نے ایک سلسلہ مضامین میں ثابت کیا تھا کہ بنگال کے قانونی اور مالگذاری کے محکمے میں جس کی ملازمت کی بڑی خواہش کی جاتی ہے اور جس میں تناسب کا بہت خیال رکھا جاتا ہے مسلمانوں سے بالکل خالی ہو رہے ہیں۔ ان مضامین کا ترجمہ بہت جلد فارسی میں ہو گیا اور

---

[1] یہ تمام بیانات سارے صوبہ پر عموماً...... لیکن بھاگلپور اور پٹنہ کے ڈویژن کو چھوڑ کر باقی تمام اضلاع پر خصوصاً صادق آتے ہیں۔

بہت سے دیسی اور اینگلو انڈین اخبارات نے ان کو نقل کیا تھا یا اُن پر بحث کی۔[1]

حکومتِ بنگال نے مسلمانانِ کلکتہ کی اعلیٰ تعلیم کے متعلق تحقیقات کرنے کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا تھا اس کے باوجود حکومت کی ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب بدستور کم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس بیان کے ساتھ ذیل کے اعداد و شمار زیر نظر رکھیئے سب سے اعلےٰ عہدوں کی جو آسامیاں پچھلی نسل سے پُر کی گئی تھیں اُن میں مسلمانوں کو زیادہ شکایت کی گنجائش نہیں کیونکہ اپریل ۱۸۶۹ء میں ہر دو ہندوؤں کے مقابلہ میں ایک مسلمان تھا اور اب ہر تین ہندوؤں کے مقابلہ میں ایک مسلمان ہے۔ دوسرے درجہ میں اُس وقت تناسب دو مسلمان اور نو ہندوؤں کا تھا اور اب ایک مسلمان اور دس ہندوؤں کا ہے۔ تیسرے درجہ میں اُس وقت چار مسلمان اور باقی ستائیس ہندو اور انگریز تھے اور اب تین مسلمان اور باقی چوبیس ہندو اور انگریز ہیں۔ جب ہم چھوٹے درجوں میں جاتے ہیں تو ۱۸۶۹ء میں تمام اقوام کے لوگوں کی کل تعداد تیس تھی جن میں چار مسلمان تھے اور اب اُنتالیس کی کل تعداد میں صرف چار ہیں۔ امیدواروں میں جن سے اسامیاں پُر کی جاتی ہیں کل دو مسلمان تھے اور اُن کی کل تعداد اٹھائیس تھی لیکن اب اُن میں ایک بھی مسلمان نہیں۔

بہرحال غیر مشہور محکموں میں جہاں بنگال کی سیاسی جماعتیں تناسب کا بہت زیادہ خیال نہیں کرتیں مسلمانوں کی حالت اور بھی بدتر ہے۔ ۱۸۶۹ء میں ان محکموں میں تناسب یہ تھا۔

اسسٹنٹ گورنمنٹ انجینیرز کے تین درجوں میں۔ ہندو (۱۴ نفر) ۔ مسلمان (۰)

اکونٹنٹ آفس میں ۔ ہندو ۔ (۵۰) مسلمان صرف (۳)

محکمہ پبلک ورکس کے سب انجینیر ——— ہندو (۲۴) مسلمان (۱) اوورسیر ہندو (۶۳)

اوورسیر مسلمان (۲)

نو آموز طبقہ ۔ ہندو (۴ نفر) انگریز (۲ نفر) مسلمان (۰)

برساڈ ڈیپنیٹ محکمہ ۔ ہندو (۲۲) مسلمان (۰) صفحہ ۲۳۴

---

[1] شمال مغربی صوبے کے بہترین اخبار پانیر میں اسباب میں میں نے ان مضامین سے مدد لی ہے

ان گزیٹیڈ ملازمتوں کی فہرست جن پر ہندو، مسلمان، انگریز سب فائز ہو سکتے ہیں۔

نام عہدہ	یوروپین	ہندو	مسلم	کل تعداد
بنگال میں سرکاری ملازمتوں کی تقسیم اپریل ۱۸۷۱ء میں				
اکونٹنٹ سول سروس جن کا تقرر انگلستان میں بادشاہ کی طرف سے ہوتا ہے۔	۲۶۰	×	×	۲۶۰
عدالتہائے دیوانی کے افسر (غیر منظور شدہ) اضلاع میں	۴۷	×	×	۴۷
اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر	۲۶	۷	×	۳۳
ڈپٹی مجسٹریٹ و ڈپٹی کلکٹر	۵۳	۱۱۳	۳۰	۱۹۶
انکم ٹیکس اسیسر	۱۱	۴۳	۶	۶۰
رجسٹریشن ڈیپارٹمنٹ	۳۳	۲۵	۲	۶۰
عدالت خفیفہ کے جج اور سب جج	۱۴	۲۵	۸	۴۷
منصف	۱	۱۷۸	۳۷	۲۱۹
محکمہ پولیس تمام گزیٹیڈ افیسر	۱۰۶	۳	×	۱۰۹
پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ انجنیر	۱۵۴	۱۹	×	۱۲۳
پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کا ماتحتی عملہ	۷۲	۱۲۵	۴	۲۰۱
پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ اکونٹنٹ	۲۲	۵۴	×	۷۶
میڈیکل ڈیپارٹمنٹ، میڈیکل کالج، جیل، خیراتی ڈسپنسری، حفظانِ صحت	۸۹	۶۵	۴	۱۵۸
چیچک کا ٹیکہ اور اضلاع کے میڈیکل افسر	۳۸	۱۴	۱	۵۳
محکمہ تعلیم و دیگر محکمہ جات مثلاً چنگی، بحری افسر، سروے، افیون	۴۱۲	۱۰	×	۴۲۲
کل تعداد (صفحہ ۲۳۵)	۱۳۳۸	۶۸۱	۹۲	۲۱۱۱

غور فرمائیے کہ گزیٹیڈ ملازمتوں میں جن کی کل تعداد دو ہزار ایک سو گیارہ ہے اُس میں یوروپین ملازم ایک ہزار تین سو اڑتیس ہیں اور ہندوستانی صرف سات سو تہتر اور ان سات سو تہتر میں بھی مسلمان کل بانوے ہیں

یعنی کل ملازموں کا بیسویں حصّہ سے بھی کم ۔ حالانکہ ایک صدی پہلے تمام عہدے انہیں کے پاس تھے اس اسلام دشمنی اور انگریز نوازی کو انگریزہی کی زبانی معلوم فرمائیے ۔ اور مسلمانوں کے برباد کرنے کا فوٹو ذہن میں کھینچئے ۔

ایک صدی قبل حکومت کے تمام ذمہ دار عہدوں پر مسلمانوں کا مکمل قبضہ تھا۔ ہندو محض شکریہ کے ساتھ اُن چند ٹکڑوں کو قبول کر لیتے تھے جو اُن کے سابق فاتح اپنے دسترخوان سے اُن کی طرف پھینک دیتے تھے اور انگریزوں کی حیثیت چند ایک گماشتوں اور کلرکوں کی تھی ۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کا تناسب جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے ۔ اب ایک اور سات کا ہے ۔ ہندوؤں اور یوریپینوں کا تناسب ایک اور دو کا ۔ مسلمانوں اور یوریپینوں کا تناسب ایک اور چودہ کا تمام نظام حکومت میں اس قوم کا تناسب جو آج سے ایک صدی پہلے ساری حکومت کی اجارہ دار تھی ۔ کم ہوتے ہوتے ایک اور تیئیس رہ گیا ہے ۔ اور وہ بھی اُن گزٹڈ ملازمتوں میں ہے جہاں تناسب کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے ۔ پریزیڈنسی شہر کے دفتر کی معمولی ملازمتوں میں مسلمانوں کا حصہ تقریباً معدوم ہو چکا ہے ۔ ابھی پچھلے ہی دنوں ایک بہت بڑے محکمہ کے متعلق معلوم ہوا کہ وہاں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو مسلمانوں کی زبان پڑھ سکے در اصل کلکتہ کے سرکاری دفتر میں مسلمان اب اس سے بڑھ کر اور کوئی امید بھی نہیں رکھ سکتے کہ قلی اور چپراسی دواتوں میں سیاہی ڈالنے والا ، قلموں کو ٹھیک کرنے والا کے سوائے کوئی اور ملازمت حاصل کر سکیں ۔

مسلمانوں کو فنا کرنے کے بعد ابھارنا اور ہندوؤں کے خلاف اُن کو بھڑکانا

کیا ہندو ہمیشہ مسلمانوں سے بہتر ثابت ہوتے ہیں ، کیا اُن کو صرف ایک ایسے غیر جانبدار ماحول کی تلاش تھی جس میں رہ کر مسلمانوں کو اس دوڑ میں پیچھے چھوڑ جائیں ۔ کیا مسلمانوں کے پاس سرکاری ملازمتوں کے علاوہ اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے دوسرے ذرائع بکثرت موجود ہیں اس لئے وہ سرکاری ملازمتوں سے بے اعتنائی برتتے اور ہندوؤں کیلئے اس میدان کو کھلا چھوڑ دیتے ہیں ۔

مسلمانوں کی برتری کا اقرار اور اُن کو عہدوں سے نکالنے کی مذمت

بیشک ہندو مسلمانوں سے زیادہ ذہین ہیں مگر ابھی تک انہوں نے اُس عام اور نمایاں فوقیت کا کوئی ثبوت

نہیں دیا جو گورنمنٹ کی ملازمتوں میں اجارہ داری کے لئے ضروری ہے۔ اور ایسا کرنا اُن کی گذشتہ تاریخ کے بالکل خلاف بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب یہ ملک ہمارے قبضہ میں آیا تو مسلمان ہی سب سے اعلےٰ قوم تھی۔ وہ دل کی مضبوطی اور بازوؤں کی توانائی ہی میں برتر نہ تھے۔ بلکہ سیاسیات اور حکومت عملی کے علم میں بھی سب سے افضل تھے۔ لیکن اس کے باوجود مسلمانوں پر حکومت کی ملازمتوں کا دروازہ بالکل بند ہے۔ غیر سرکاری ذرائع زندگی میں بھی اُنہیں کوئی نمایاں جگہ حاصل نہیں۔

قانون اور وکالت سے مسلمانوں کا اخراج

اعلیٰ خاندان کے مسلمانوں کے لئے صرف ایک ہی پیشہ باقی رہ گیا ہے اور وہ پیشہ وکالت کا ہے۔ طبابت کا پیشہ جیسا کہ میں ابھی بیان کروں گا بالکل الگ حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اب یہ حال ہے کہ سرکاری ملازمتوں سے کہیں زیادہ سختی کے ساتھ مسلمانوں پر قانون کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔ بنگال میں ہز میجسٹی کے ہائی کورٹ آف جوڈیکیچر میں دو ہندو جج ہیں اور مسلمان ایک بھی نہیں ہے۔ اس زمانہ میں اینگلو انڈین اور ہندو اس بات کا گمان بھی نہیں کر سکتے کہ ہائی کورٹ کے جج کبھی اُس قوم میں سے مقرر کئے جائیں گے جو تمام عدالتی محکموں پر قابض تھی۔ پچھلی دفعہ جب میں نے ۱۸۶۹ء میں اعداد و شمار جمع کئے تھے تو ان کا تناسب حسب ذیل تھا۔

سرکاری قانونی افسر۔ انگریز (۴ نفر) ہندو (۲ نفر) مسلمان (×)

ہائی کورٹ کے وہ ملازم جن کا عہدہ اتنا بلند تھا کہ ان کا نام شائع کیا جائے۔ انگریز (۱۴) ہندو (۷) مسلمان (×)

بیرسٹر۔ انگریز (معلوم نہیں) ہندو (۲) مسلمان (×)

اگر ہائی کورٹ کے اُن وکلاء کی فہرست دیکھی جائے جن کا درجہ بیرسٹروں سے ذرا کم ہے تو یہ داستان اور بھی زیادہ عبرتناک ہو جائے گی۔ یہ اس پیشہ کا ایک شعبہ ہے جو تمام کا تمام مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا اور اُس زمانہ کے کئی ایک آدمی ابھی تک بقید حیات موجود ہیں۔ ذیل کی فہرست ۱۸۴۵ء سے شروع ہوتی ہے۔ ۱۸۴۶ء کے وکلاء میں سے ایک انگریز ایک ہندو اور دو مسلمان ابھی تک زندہ ہیں۔

۱۸۳۶ء تک مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں اور انگریزوں کی مجموعی تعداد کے برابر تھی۔ اور تناسب

حسب ذیل تھا:-

مسلمان وکلاء (۶ نفر) ہندو (۷ نفر) انگریز (۱-نفر)

جتنے وکلاء ۱۸۴۵ء اور ۱۸۵۷ء کے درمیان (ان دونوں سالوں کو شامل کرتے ہوئے) داخل فہرست کئے گئے ہیں ان میں سے ۱۸۶۹ء کے زندہ وکلاء میں سے سب کے سب مسلمان ہیں۔ ۱۸۵۱ء تک بھی مسلمان اپنی جگہ سے نہیں ہٹے تھے اور حقیقت میں وہ ہندوؤں اور انگریزوں کی مجموعی تعداد کے برابر تھے لیکن ۱۸۵۱ء سے یہ صورت حالات بدلنا شروع ہوتی ہے۔ اب نئے نئے آدمیوں نے میدان میں آنا شروع کیا۔ قابلیت کے مختلف معیار قائم ہوئے چنانچہ اب فہرست کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ۱۸۵۳ء سے ۱۸۶۹ء تک کل دو سو چالیس [۲۴۰] ہندوستانی داخل کئے گئے۔ جن میں دو سو انتالیس ہندو اور صرف ایک مسلمان۔

اب ہم اس قانونی پیشہ کے دوسرے شعبوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ۱۸۶۹ء میں ہائی کورٹ کے اٹورنی پروکر اور سالسٹرز میں سے ستائیس ہندو تھے۔ اور مسلمان ایک بھی نہ تھا۔ آئندہ قانون داں بننے والوں میں سے چھبیس ہندو ہیں مسلمان کوئی نہیں۔ غرضیکہ اس پیشے کے کسی شعبہ کا ذکر کیا جائے نتیجہ ہر حال میں یکساں ہوگا۔ ۱۸۶۹ء میں رجسٹرار ہائی کورٹ کے دفتر میں (۱۷) ملازمین کی یہ حیثیت تھی کہ اگر ان کے نام شائع کر دیئے جائیں تو ان میں چھ انگریز اینگلو انڈین ہوں گے۔ گیارہ ہندو اور مسلمان صفر۔ رسیور کے دفتر سے چار نام ملے ہیں جن میں دو انگریز دو ہندو اور مسلمان کوئی نہیں۔ کلرک آف دی کراؤن اور ٹیکس افسر کے دفتر میں انگریزوں کی تعداد چار تھی۔ ہندوؤں کی پانچ لیکن مسلمان مفقود۔ محکمہ قانون کے کونے کونے سے اکونٹس افسر، کورونر اور مترجمین کے دفاتر سے بیس نام بھیجے گئے۔ اُن میں سے آٹھ انگریز گیارہ ہندو اور صرف ایک مسلمان اس فہرست میں اپنی قوم کی نمائندگی کر رہا تھا لیکن یہ بیچارہ ایک مُلا تھا جسے ہفتہ میں صرف چھ شلنگ تنخواہ ملتی تھی (تقریباً چھ روپیہ ماہانہ)

صفحہ ۲۴۹

مسلمانوں کی طبابت

اب طبابت کی باری آتی ہے۔ بدقسمتی سے یہ پیشہ جیسا کہ ہندوستانی اطبا میں رائج ہے اعلیٰ خاندان کے مسلمانوں کے

نزدیک پیشہ کی حیثیت نہیں رکھتا ایک معزز مسلمان کے ہمیشہ دو طبی مشیر ہوں گے۔ ایک تو وہ جسے انگریزی میں عام طور پر معالج کہتے ہیں اور جسے اپنے آقا کی نظر میں بڑی عزت اور وقعت حاصل ہوتی ہے، دوسرا جراح جس کو عرفِ عام میں حجام کہتے ہیں۔ داڑھی مونڈنے سے لے کر عضو کاٹنے تک تمام اعمال جراحی یہی کرتا ہے۔ پھر طب وجراحت کے درمیان اس قدر تفاوت ہے کہ جس طبیب کی حالت ذرا بھی اچھی ہے وہ زخموں کی مرہم پٹی کرنے سے صاف انکار کر دیتا ہے۔ البتہ حجام جراح اس قسم کی حدود کا پابند نہیں۔ عملی طور پر ہر قسم کی طب اس کی حدود میں داخل ہے۔ حقیقی مسلمان اطباء بہت ہی کم ہیں اور روز بروز کم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ شمالی ہندوستان میں گو ابھی تک اُن کا چرچا ہے مگر بنگال کے اضلاع میں وہ بالکل معدوم ہیں۔ طبابت کا پیشہ اب ان پڑھ حجاموں کے ہاتھ میں ہے یا ہندو ڈاکٹروں کے۔ الخ صفحہ ۱۷۱۔

مسلمانوں کی شکایات

مسلمانان بنگال کے پرائیوٹ خطوط اور اخباری مضامین سے زیادہ کوئی شئے قابلِ رحم میری نظر سے نہیں گذری۔ کچھ مدت ہوئی کلکتہ کے ایک فارسی اخبار نے لکھا تھا (اخبار دوربین جولائی ۱۴ ۱۸۶۹ء) آہستہ آہستہ مسلمانوں سے ہر قسم کی ملازمت خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی چھینی جا رہی ہے اور دوسری قوموں کو دی جا رہی ہے خصوصاً ہندوؤں کو۔ حکومت اپنی تمام رعایا کو برابر سمجھنے پر مجبور ہے۔ لیکن وقت ایسا آگیا ہے کہ وہ اپنے گزٹ میں اس بات کا خاص طور پر اعلان کرتی ہے کہ مسلمانوں کو سرکاری نوکری نہیں دی جائے گی ابھی ابھی سندربن کے کمشنر کے دفتر میں چند اسامیاں خالی ہوئی تھیں اُس افسر نے سرکاری گزٹ میں اشتہار دیتے ہوئے صاف صاف لکھ دیا تھا کہ یہ ملازمتیں سوائے ہندوؤں کے اور کسی کو نہیں ملیں گی۔[1]

الغرض مسلمان اب یہاں تک قعرِ مذلت میں گر چکے ہیں کہ وہ سرکاری ملازمتوں کے قابل ہوں تب بھی اُن کو سرکاری اعلانات کے ذریعہ ملازمت سے باز رکھا جاتا ہے۔ اُن کی قابلِ رحم حالت پر کوئی توجہ نہیں کرتا۔ اعلیٰ حکام

---

[1] فارسی اخبار کے اس بیان کی تصدیق کرنے کے لئے میرے پاس اس وقت سرکاری ذرائع موجود نہیں۔ اس بیان پر اُس وقت ضروری کچھ نہ کچھ توجہ کی گئی تھی اور اب تک اُس کی تردید نہیں کی گئی۔

تو اُن کی ہستی تسلیم کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ۔

مسلمانانِ اُڑیسہ کی شکایات

ذیل کے فقرات اُس درخواست سے لئے گئے ہیں جو کچھ عرصہ ہوا مسلمانانِ اُڑیسہ نے کمشنر کے سامنے پیش کی ان پُر تکلف فقروں پر ممکن ہے بعض لوگوں کو ہنسی آجائے مگر اس صوبہ کے سابق فاتحین کی حالتِ زار جس سے مجبور ہو کر انہوں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں محض روٹی کے لئے التجا کی ہے بڑی ہی افسوسناک ہے اور ہمیشہ انسان کو متاثر کرتی رہے گی ۔

"ہر مجسٹی ملکہ معظمہ کی وفادار رعایا ہونے کی حیثیت سے ہم یقین رکھتے ہیں کہ ملک کی سرکاری ملازمتوں میں ہمارا بھی مساویانہ حق ہے اگر سچ پوچھئے تو اُڑیسہ کے مسلمانوں کو روز بروز تباہ کیا جا رہا ہے اور اُن کے سربلند ہونے کی کوئی امید نہیں مسلمان اعلیٰ خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اب بالکل نادار ہیں اور ہمارا کوئی بھی پرسانِ حال نہیں ۔ اب ہماری حالت ماہیِ بے آب کی طرح ہو رہی ہے ۔ مسلمانوں کی اس ابتر حالت کو ہم جنابِ عالی کے حضور میں پیش کرنے کی جرأت کر رہے ہیں ۔ اس یقین کے ساتھ کہ جنابِ عالی ہی اُڑیسہ کے ڈویژن میں ہر مجسٹی ملکہ معظمہ کے واحد نمائندہ ہیں ۔ ہمیں امید ہے کہ نسل و رنگ کے امتیاز سے بالا ہو کر ہر قوم کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے گا ۔ اپنی سابقہ ملازمتوں کے چھن جانے سے ہم اس قدر مایوس ہو چکے ہیں کہ صمیمِ قلب سے دنیا کے دُور دراز گوشوں کا رخ کرنے کے لئے تیار ہیں ۔ ہم ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں پر چڑھنے کے لئے مستعد ہیں ۔ ہم سائبیریا کے بے آب و گیاہ حصوں میں مارے مارے پھرنے کے لئے آمادہ ہیں بشرطیکہ ہمیں یقین دلا دیا جائے کہ ایسا کرنے سے ہمیں دس شلنگ (۷ روپیہ) ہفتہ کی ملازمت سے سرفراز کیا جائے گا ۔" صفحہ ۲۴۴

(ڈاکٹر ہنٹر، صفحہ ۲۴۴) :-

"آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ مسلمانوں پر اس طرح سرکاری ملازمتوں اور تسلیم شدہ پیشوں کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے ۔ بنگال کے مسلمانوں میں ذہانت کی کمی نہیں اور غربت کی خلش ہر وقت اُن کو

اس بات پر اکساتی رہتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کریں"۔ (جواب ظاہر ہے کہ وہ ہندوستانی قوم کے فرد اور سیاسی رقیبوں میں سے دماغی قابلیت والے ہیں جن سے ہر وقت خطرہ ہے کہ اگر وہ کچھ بھی خوشحال اور قوی ہوں گے تو برطانوی غلامی کا جُوا گردن سے پھینک کر دعویدار حکومت بن جائیں گے" مؤلف غفرلہ۔

ایک نہایت دلسوز اور انتہائی شرمناک معاملہ صوبہ بنگال و بہار و اڑیسہ کے اوقاف کا ہے۔ ان صوبوں کے مسلمان امراء نے بڑی بڑی جائدادیں رفاہ عام تعلیم وغیرہ کے لئے وقف کر رکھی تھیں جن سے تمام مصارف اس قسم کے انجام پاتے تھے۔ دیہات اور قصبات اور شہروں میں بے شمار مدارس اور اسکول جاری تھے جن سے پبلک بغیر کسی قسم کے مصارف اور فیس ادا کرنے کے تعلیم پاتی تھی۔ بقول پروفیسر میکس مولر اسی ہزار مدرسے صوبہ بنگال میں جاری تھے۔ کوئی گاؤں یا قصبہ اُن مدارس سے خالی نہ تھا جس کا بیان ہم پہلے کر چکے ہیں ان وقف شدہ زمینوں سے حکومت ایک پائی بھی وصول نہیں کرتی تھی اور تمام آمدنی تعلیم وغیرہ کی انہیں مدارس میں خرچ ہوتی تھی۔ حکومت تعلیمی اداروں پر اپنا خزانہ خرچ کرنے سے سبکدوش تھی اور تعلیمی چرچا ملک کے کونہ کونہ میں جاری تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی للچائی ہوئی آنکھیں اور زرطلبی کی انتہائی ہوس کب اُس کو برداشت کر سکتی تھی قبضہ پاتے ہی یہ حرص سوار ہوئی کہ جس طرح ممکن ہو ان زمینوں پر قبضہ کیا جائے۔ اگرچہ نتیجہ میں یہ علمی اور ضروری فریضہ انسانیہ (جس کو ہر متمدن قوم اور حکومت اپنے منصبی فرائض میں سے شمار کرتی اور کروڑوں اشرفیاں خرچ کر کے اپنی رعایا اور قوم کو علم سے آراستہ کرتی ہے) موت کے گھاٹ اُتر جائے۔ طرح طرح سے اس کی کوششیں شروع ہوئیں جس کی تفصیل مجملاً حسب ذیل ہے۔

"مسلمانانِ بنگال کا ہر اعلےٰ خاندان ایسے سکول کا خرچ بھی برداشت کرتا تھا جس میں خود اُس کے اور غریب ہمسایوں کے بچے مفت تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔ جوں جوں صوبہ کے مسلمان خاندانوں پر ادبار چھاتا گیا یہ خاندانی اسکول کم ہوتے اور اُن کے اثرات بھی بتدریج مٹتے گئے۔ یہ ہمارے عہدِ حکومت کی دوسری نصف صدی تھی جب ہم نے انگریزی قانون کی ناقابلِ مدافعت قوت کو ان کے مقابلے پر لا کھڑا کیا۔ زمانہ قدیم سے ہندوستانی شہزادوں کا دستور چلا آتا تھا کہ وہ نوجوانوں کی تعلیم اور رضا کی

رضاجوئی کے لئے زمین کے قطعات وقف کرتے تھے۔ .... مالگزاری جمع کرنیوالا زمیندار یامقامی مالک زمین کو اجازت تھی کہ ماتحت زمینوں میں جو چاہے کرے۔ بشرطیکہ مالگذاری کی مقررہ مقدار ادا کرتا رہے۔ وہ اپنے مذہب کے مطابق مندر یا مسجد کے ساتھ کچھ علاقہ معافی کا وقف کردیتا اور کوشش کرتا کہ ساری عمر کے ظلم و تعدی کا کفارہ بستر مرگ پر مختلف قسم کے نیک کاموں سے ہوجائے۔ جب ہم نے صوبہ بنگال پر قبضہ کیا تو اُس وقت کے قابل ترین افسر مال (مسٹر جیمز گرانٹ) کا تخمینہ تھا کہ صوبہ کا تقریباً ایک چوتھائی حصہ حکومت کے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ ۱۷۷۲ء میں وارن ہسٹنگس کو اس انتہائی بے ایمانی (یہ الفاظ قابل غور ہیں) کا حال معلوم ہوا تو ان علاقوں کی واپسی کے خلاف عوام کا جذبہ اس قدر سخت تھا کہ کوئی کارروائی نہ ہوسکی۔ ۱۷۹۳ء میں لارڈ کارنوالس نے پھر اس معاملہ کو بڑی شدومد سے اُٹھایا کہ جس معافی کے علاقہ کے متعلق حکومت وقت سے منظوری نہ لی گئی ہو اُس پر حکومت کا قبضہ ہونا چاہیئے مگر اُس وقت کی طاقتور حکومت بھی اس اصول پر کاربند ہونے کا حوصلہ نہ کرسکی۔ پھر یہ معاملہ چھبیس سال تک یوں ہی کھٹائی میں پڑا رہا اور ۱۸۱۹ء میں حکومت نے ایک بار پھر اپنے اس حق پر اصرار کیا۔ لیکن اس کے باوجود عمل کرنے کی جرأت نہ ہوئی لیکن آخر کار ۱۸۲۸ء میں مجلس قانون ساز اور محکمہ منتظمہ نے مل کر ایک بہت بڑی کوشش کا آغاز کیا جس کے ماتحت عدالتیں مقرر کی گئیں اور آئندہ اٹھارہ سال تک تمام صوبہ میں مخبر جھوٹے گواہ اور خاموش مگر مستقل مزاج افسران واگذاری گشت کرتے رہے۔ واگذاری کے مقدمات پر ۸ لاکھ پونڈ خرچ کرنیکے بعد حکومت کی مالگذاری میں تین لاکھ پونڈ سالانہ کا اضافہ مستقل ہوگیا یعنی ساٹھ لاکھ پونڈ کا سوا پانچ فیصدی سالانہ کے حساب سے۔ اس رقم کا بہت بڑا حصہ اُن زمینوں سے حاصل ہوتا ہے جو مسلمانوں یا اسلامی اوقاف کے پاس معافی کی حیثیت سے ہیں۔ اس سے جو ابتری اور نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہوئے وہ ہمیشہ کے لئے دیہاتی دستاویزات میں ثبت ہوچکے ہیں۔ سیکڑوں پُرانے خاندان تباہ ہوگئے اور مسلمانوں کا تعلیمی نظام جس کا دارومدار انہی معافیات پر تھا بالکل تہ و بالا ہوگیا۔ مسلمانوں کے تعلیمی ادارے اٹھارہ سال کی اس مسلسل لوٹ کھسوٹ کے بعد یک قلم مٹ گئے۔ جو شخص غیر جانبداری سے اُس کی

تحقیق کرے گا وہ اس نتیجہ پر پہونچے گا کہ جب واگذاری کے قوانین کا مقصد محض ایسے حق کے نافذ کرنے کا تھا جس کو ہم نے بار بار پرزور طریقہ پر اپنے لئے محفوظ رکھا تھا تو پھر واگذاری کے مقدمات میں انتہائی سختی کیوں برتی گئی درآنحالے کہ وہ ہندوستانیوں کی عام رائے کے بالکل خلاف تھی اس میں کوئی شک نہیں کہ حکومت کے صاف اور صریح قوانین کی موجودگی میں مروجہ رسم ورواج کا حق ایک غلط سی بات ہے لیکن پچھتر سال کا مسلسل قبضہ اس امر کا حق ضرور پیدا کر دیتا ہے کہ حکومت نرمی کا برتاؤ کرے۔ ہمارے واگذاری کے افسر جنہوں نے قانون کو نافذ کیا تھا رحم کرنا جانتے ہی نہیں تھے۔ اُن دنوں کا خوف وہراس ابتک بہت سے لوگوں کو یاد ہے۔ اس سے ہمارے خلاف نفرت وحقارت کی ایک شدید وجہ پیدا ہوگئی۔ اُس وقت سے کسی شخص کا عالم دین ہونا جو ہندوستانی نوابوں کی نظر میں بڑا قابل عزت اور منفعت بخش پیشہ تھا۔ بنگال میں ہمیشہ کے لئے بند ہے۔ سب سے زیادہ نقصان اسلامی اوقاف کو پہونچا ...... لیکن اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ مسلمانوں کے تعلیمی نظام کی تباہی واگذاری ہی سے شروع ہوتی ہے۔ وہابی مقدمات کے ذمہ دار افسر کی رائے میں یہ مسلمانوں کی تباہی کا دوسرا سبب تھا۔ بہرحال ان مقدمات کو حق بجانب ٹھیرایا جاسکتا ہے۔ لیکن مسلمانوں کے اس الزام کا جواب نہیں دیا جاسکتا کہ ہم نے اُن کے تعلیمی اوقاف کا ناجائز استعمال کیا۔ اس حقیقت کو چھپانے سے کیا فائدہ کہ مسلمانوں کے نزدیک اگر ہم اس جائداد کو جو اس مصرف کے لئے ہمارے قبضہ میں دی گئی تھی ٹھیک ٹھیک استعمال کرتے تو بنگال میں اُن کے پاس آج بھی نہایت اعلےٰ اور شاندار تعلیمی ادارے موجود ہوتے"۔

ڈاکٹر ہنٹر صفحہ ۲۶۲ میں لکھتا ہے:۔

"لیکن ان بے انصافیوں کی فہرست ابھی مکمل نہیں ہوئی جن کا مسلمان اپنے انگریز حاکموں کو ملزم ٹھہراتے ہیں۔ وہ ہمیں صرف اس بات کا ملزم قرار نہیں دیتے کہ ہم نے کامیاب زندگی کی تمام راہیں اُن پر مسدود کردی ہیں بلکہ یہ بھی کہ ہم نے اُن کی عاقبت کو خطرہ میں ڈال دیا ہے۔ دنیا کے ہر اچھے مذہب نے روحانی وظائف کی انجام دہی کے خاص دن مقرر کر رکھے ہیں۔ ہم اُس غم وغصہ کا اچھی طرح اندازہ

کرسکتے ہیں جو انگریزوں کو اس وقت ہو گا جبکہ کوئی غیر ملکی فاتح خود بخود اپنی مرضی سے اس بات کا اعلان کردے، کہ آئندہ اتوار کو چھٹی نہیں ہوا کرے گی۔ ہندو اور مسلمان یکساں طور پر اپنے مذہبی تہواروں کی تنظیم کرتے ہیں اور ان کے متعلق بڑے نازک جذبات رکھتے ہیں۔ ہندوستان کے بہت سے حصوں میں ان جذبات کا احترام کیا گیا ہے لیکن معلوم نہیں جنوبی بنگال کے مسلمانوں کو کچھ عرصہ سے کیوں نظرانداز کردیا ہے۔ ہم نے اول تو اُن کی مذہبی ضروریات سے تدریجاً اغماض کیا پھر ان کو بالکل بھلا دیا اور آخر کار اُن سے قطعی منکر ہو گئے۔ پچھلے سال کلکتہ ہائی کورٹ کے مسلمان وکلاء نے اس بارہ میں دو عرضداشتیں بھیجی تھیں۔ اُنہوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ جب عیسائیوں کو سال میں باسٹھ چھٹیاں دیجاتی ہیں اور ہندوؤں کو باون تو پھر مسلمانوں کو بارہ کیوں ملتی ہیں۔ اس سے پہلے مسلمانوں کے لئے منظور شدہ چھٹیاں اکیس تھیں۔ اس کے باوجود عرضی گذاروں کی التجا صرف یہ تھی کہ ان تعطیلوں کی کم سے کم تعداد جواب گیارہ تک پہونچ چکی ہے اور کم نہ کی جائے"۔ . . . . مختصراً یہ کہ اس حکم سے اُن کے مذہبی تہواروں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہ ممانعت اُس حکومت کی بہتر سالہ روایات کے خلاف ہے اگر ہندوؤں اور عیسائیوں کو ان کے مذہب کے مطابق چھٹیاں دیجا سکتی ہیں تو آپ کے سائل عرض پرداز ہیں کہ مسلمانوں کو بھی مذہبی فرائض کی بجا آوری اور تہواروں کو منانے کی چھٹی کیوں نہیں مل سکتی"۔ گویا وہ قوم جو کبھی ہندوستان کے تمام عدالتی عہدوں پر فائز تھی اب اس حد تک ذلیل ہو چکی ہے۔ . . . . حکومت اعلیٰ نے مداخلت کی اور حاکمانہ طور پر اسلامی تعطیلات کے چند دن مقرر کردیئے یقیناً وہ اتنے نہ تھے جتنے مسلمان چاہتے تھے"۔

ڈاکٹر ہنٹر مذکور صفحہ ۲۶۵ میں لکھتا ہے:۔

مسلمانوں کو شکایت ہے کہ ہم نے اُن کو قانونی پیشہ ہی سے خارج نہیں کردیا بلکہ مجلس قانون ساز کے ایک ایکٹ کی رو سے اُن کے مذہبی اور شخصی قوانین کو پورا کرنے والے ضروری منصبداروں سے بھی محروم کردیا ہے۔ اسلامی حکومت میں قاضی کے فرائض منصبی میں فوجداری دیوانی اور شرعی عدالت کے فرائض داخل تھے۔ پہلے پہل جب ہم نے ملک پر قبضہ کیا تو عدالتی نظام کو جاری رکھنے کے لئے بڑی حد تک

انھیں پر بھروسہ کیا تھا۔ ہمارے سب سے پرانے قوانین میں اُن کی اہمیت کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ہم نے قاضی کے عہدے کو برقرار رکھا۔ اُس کے فرائض کے متعلق پچیس دفعات کی طویل فہرست ہندوستان کی قانونی کتابوں میں اب بھی مل سکتی ہے۔ (بنگال کوڈ آر نمبر ۳ ۱۷۹۳ء و آر XII ۱۷۹۳ء وغیرہ)

حقیقۃً قاضی کی حیثیت مسلمانوں کے شخصی اور مذہبی قوانین میں اس قدر ضروری ہے کہ اس بات کا فیصلہ ہو گیا تھا کہ جب تک قاضی برقرار رہیں گے ہندوستان دارالاسلام کہلاتا رہے گا لیکن جب ان کو علیحدہ کر دیا گیا تو یہ ملک دارالحرب بن جائے گا۔ مسلمانوں کی بے اطمینانی سے ہم اس بات پر مجبور ہو گئے ہیں کہ عام مسلمان کے جذبات کی تحقیقات کریں۔ بدقسمتی سے ان تحقیقات کی ابتدا بہت تھوڑے دنوں سے ہوئی۔ ۱۸۶۳ء میں صوبجات کے گورنروں میں سے ایک نے اعتراض کیا تھا کہ قاضیوں کا تقرر گویا اس بات کا اقرار ہے کہ حکومت ان کی مقدس حیثیت کو تسلیم کرتی ہے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم مسلمانوں کو اس امر کا حق دیتے ہیں کہ وہ ان کا تقرر بطور خود کر سکتے ہیں۔ چنانچہ بہت کچھ بحث و تمحیص اور حکومت بمبئی کی طرف سے پُرزور احتجاج کے بعد اس مضمون پر تمام سابقہ قوانین منسوخ کر دیئے گئے اور حکومت نے قاضیوں کا باقاعدہ تقرر بند کر دیا (ایکٹ XI ۱۸۶۴ء جو بعد میں ۱۸۶۸ء کے ایکٹ iii کے ضمیمہ کی رو سے منسوخ کر دیا گیا تھا مگر اُس نے اُن قوانین کو زندہ نہ کیا جس کی رو سے پہلے تقرر کیا جاتا تھا) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پچھلے سات سال سے مسلمانوں کا بہت بڑا اور ہمیشہ بڑھتا ہوا حصہ ایک ایسے عہدہ دار سے محروم ہو گیا جس کا وجود شادی بیاہ اور دوسری خاندانی رسم و رواج کے منانے کے لئے از حد ضروری ہے۔ شروع شروع میں اس مصیبت کا احساس زیادہ نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ پُرانے قاضی ابھی موجود تھے اور قانون مذکور کا اطلاق صرف اُس وقت ہوتا تھا جب کوئی قاضی مر جاتا یا پنشن پا لیتا اور پھر اس کی جگہ از روئے قانون پُر نہیں کیجا سکتی تھی۔ اوّل اوّل موجودہ وائسرائے نے اس معاملہ پر غور و خوض کرنا شروع کیا تھا مگر کوئی قطعی فیصلہ کئے بغیر پھر ۱۸۷۰ء میں مدراس ہائی کورٹ نے اس مسئلہ پر بحث کی اور اس کا فیصلہ کر دیا۔ مسٹر جسٹس کوبٹ کے فیصلہ کے بعد شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ صرف حکومت

ہی قاضیوں کو مقرر کر سکتی ہے۔ اگر قاضی کا تقرر نہ ہو تو مسلمان اس بات کے مجاز نہیں کہ از خود کسی کو قاضی منتخب کرلیں۔ (اصل مقدمہ نمبر ۴۵۳ محمد ابوبکر مخالف میر غلام حسن اور انور)

گویا ۱۸۶۴ء کے ایکٹ نے اس قوم سے اُن کے قوانین کا ایک اہم عہدیدار چھین لیا جس کے فرائض تھے انتقال ناموں کی تسوید و تعریف، عقد نکاح اور دوسرے مذہبی فرائض و مراسم کی بجاآوری۔ اب صورت حالات یہ ہے کہ جنوبی بنگال میں سب سے بڑی مصیبت جو ایک مجسٹریٹ پر آسکتی ہے اور جس سے چھٹکارا پانے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا مسلمانوں کے ازدواجی مقدمات ہیں۔ بعض نامعلوم وجوہ کی بناء پر مسلمانوں کے ازدواجی تعلقات کچھ عرصہ سے بہت ہی نازک ہوگئے ہیں۔ زناکاری اور اغوا کے مقدمات (یہ دو تو تعزیرات ہند کے ماتحت آجاتے ہیں) اضلاع دہانہ کی عدالتوں میں دھڑا دھڑ آرہے ہیں۔ ان دس مقدمات میں سے نو ایسے ہوتے ہیں جن میں نکاح کو قانونی طور پر ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ مشرقی بنگال کے دو حلقوں میں ۱۸۶۱-۶۲ء کے اندر یعنی جب حکومت نے قاضیوں کا تقرر بند کردیا ہے اس سے دو سال پہلے کل مقدمات کی تعداد (۵۶۱) تھی ۱۸۶۶ء میں یعنی قاضیوں کا تقرر بند ہو جانے کے دو سال بعد یہ تعداد بڑھتے بڑھتے (۱۹۸۴) تک پہونچ گئی۔ لیکن اس وقت سے فوجداری اعداد و شمار میں ان کی تعداد کم ہوتی گئی ہے۔ واقعتہً نہیں بلکہ اس لئے کہ اب یہ دستور ہے کہ ایسے مقدمات کو دیوانی عدالت میں منتقل کردیا جاتا ہے۔ ....

دوسرا پہلو اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ باقاعدہ قاضیوں کی غیر موجودگی میں مسلمانوں کے لئے ناممکن ہے کہ وہ اپنی زندگی مذہبی قواعد کے مطابق بسر کرسکیں انکی اجازت بعض مذہبی مراسم کے لیے ہی ضروری نہیں بلکہ مسلمانوں کی روزمرہ زندگی میں بھی کئی ایک چھوٹے چھوٹے شرعی مسئلے ایسے پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کا صحیح حل صرف قاضی ہی کرسکتا ہے۔ اس قسم کے منصب کی غیر موجودگی میں ہر اُس شخص کو جو حکومت کا وفادار نہیں مسلمانوں پر یہ واضح کرنے کا بہت کافی موقع مل جاتا ہے کہ موجودہ حکومت اس قابل ہی نہیں کہ ہم اس کے ماتحت اچھی زندگی بسر کرسکیں۔ برعکس اس کے حکومت کے مقرر کردہ قاضیوں کو ماننا اور اُن سے کام لینا فی الحقیقت اس حکومت کے بااختیار اور جائز ہونے کا

اعتراف کرنا ہے"۔

ہم نے اس جگہ زیادہ تر شہادتیں ڈبلو ڈبلو ہنٹر کے مصنفہ رسالہ (ہمارے ہندوستانی مسلمان) سے نقل کی ہیں۔ اس لئے کہ وہ ۱۸۵۷ء سے پہلے واقعات پر زیادہ وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالتی ہیں چونکہ وہ جنوبی بنگال میں عرصہ دراز تک ملازم رہا تھا۔ اس لئے اُس کو اعداد و شمار پیش کرنے اور احوال کے مفصل معلوم کرنے کے ذرائع بہت سے حاصل تھے۔ مگر یہ احوال صرف بنگال یا اس کے جنوبی حصہ کے نہیں تھے بلکہ تمام ہندوستان کے یہی احوال تھے چنانچہ اُس کا یہ قول ہم پہلے نقل کر آئے ہیں۔

"میرے بیانات کا تعلق جنوبی بنگال سے ہے کیونکہ یہ وہ صوبہ ہے جسے میں اچھی طرح جانتا ہوں اور جہاں تک مجھے علم ہے مسلمانوں نے برطانوی حکومت کے ماتحت سب سے زیادہ یہیں نقصان اُٹھایا ہے۔ پھر اگر میں دوسروں کو یہ یقین دلاؤں اور خود میرا بھی یہی خیال ہو کہ یہ بیانات تمام مسلمانانِ ہند پر راست آتے ہیں تو مجھے اس پر معاف فرمایا جائے"۔

واقعہ یہی ہے کہ انگریزوں نے جو طرزِ عمل بنگال میں اختیار کیا تھا وہی طریقہ ہر ہر صوبہ میں جاری کیا گیا۔

لفٹننٹ جنرل میک لیوڈ انیس نے اپنی کتاب (بغاوت فوج) میں مندرجہ ذیل الفاظ لکھے ہیں۔
"ملک کے لوگوں کی کثیر تعداد ہمارے تحت میں فتوحات سے یا جبریہ الحاق سے آئی تھی حکمران خاندان تخت سے اُتارے گئے یا کچل دیئے گئے۔ بڑے خاندان ذلیل کئے گئے۔ لوگوں کے اختیارات اور مناصب اور جائدادیں چھن جانے سے مصیبتیں نازل ہوئیں۔ ان حالات میں اس بارہ میں شک کرنا خلافِ عقل تھا کہ ہمارے دشمنوں کی ایک جماعت تیار اور مرتب ہوگئی تھی"[1]

---

[1] یہ کہنا کہ فتوحات سے انگریزوں نے ہندوستان کو حاصل کیا ہے بالکل غلط ہے بلکہ ڈپلومیسیوں، عہد شکنیوں، رشوتوں، آپس میں پھوٹ ڈالنے وغیرہ چالبازیوں سے ملک حاصل کیا گیا تھا۔ پروفیسر سیلے اکسپنشن آف انگلینڈ میں لکھتا ہے:۔
"اگر ہندوستان میں متحدہ قومیت کا کمزور جذبہ بھی پیدا ہو جائے اور اُس میں اجنبیوں کے نکالنے کی کوئی (بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰۲ پر ملاحظہ ہو)

بادشاہ دہلی سے ۱۸۰۵ء کے معاہدہ کے مطابق دفتروں اور عدالتوں کی زبان فارسی تھی جس میں مسلمانوں کو پوری مہارت تھی مگر ۱۸۳۷ء میں خلاف معاہدہ تمام دفاتر کی زبان انگریزی کردی گئی۔ مسز میو مدر انڈیا میں لکھتی ہے :-

"ایک چھوٹا سا بیج بویا گیا اور اُس کے پھل سے ہم اب متمتع ہو رہے ہیں۔ یہ عدالتوں کی زبان کی تبدیلی تھی جو فارسی سے انگریزی کردی گئی۔ ہندوستان کی تعلیم کو مغربیت کا رنگ دینے کا یہ لازمی نتیجہ تھا۔ یہ تبدیلی معمولی معلوم ہوتی تھی اور اُس کے نتائج بھی معمولی تھے۔ اُس کی مثال ایسی تھی جیسی کہ کلہاڑی سے ایک ضرب لگائی جاتی ہے۔ ...... مسلمانوں نے اس تبدیلی پر سخت احتجاجات کئے اور فی الواقع یہ ان کے لئے سخت بربادکن تھی"۔

(مدر انڈیا صفحہ ۲۰۹ از حکومت خود اختیاری صفحہ ۹۰)

انگریزوں نے ملک مسلمانوں سے لیا تھا اس لئے اُن کو ہر وقت خطرہ رہتا تھا کہ کہیں مسلمان ہم سے اس ملک کو واپس نہ لے لیں اور ہم کو یہاں سے بے دخل نہ کردیں۔ خصوصاً اس بناء پر کہ اُن کی دماغی قابلیت اور جسمانی طاقت، عزم واستقلال، سیاسی مہارت وغیرہ ایسے اوصاف ہیں جن کے ہوتے ہوئے ایسے خطرات کا ہمیشہ انتظام کرنا ضروری سمجھتے رہے کہ مسلمانوں کو اس قدر کچل دیا جائے کہ اُن میں اُٹھنے کی طاقت نہ رہے اور ہندوؤں کو اتنا اُبھار دیا جائے کہ اگر کسی وقت میں مسلمان سر اُٹھائیں بھی تو یہ اُن کے دبانے کے لئے کافی ہوسکیں۔ مگر ہندوؤں کو بھی اتنا نہ اُبھارا جائے کہ وہ ہمارے مقابلے پر آسکیں۔ اسی بناء پر اگرچہ ہندوؤں نے تعلیم میں بہت کچھ ترقی حاصل کرلی تھی اُن کو ذمہ دار عہدوں سے ہمیشہ محروم رکھا گیا بالخصوص فوج کے بالائی عہدوں کے پاس اخیر تک کسی ہندوستانی کو پھٹکنے نہیں دیا گیا۔ حالانکہ یہی ہندوستانی ہندو اور مسلمان شاہان

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰۱) عملی روح نہ بھی ہو بلکہ صرف اس قدر احساس عام ہو جائے کہ اجنبی حکومت سے اتحاد عمل ہم ہندوستانیوں کے لئے شرمناک ہے تو اُسی وقت سے ہماری شہنشاہیت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ کیونکہ ہم درحقیقت ہندوستان کے فاتح نہیں ہیں اور نہ اُس پر فاتحانہ حکمرانی کرسکتے ہیں۔ اگر ہم اس طرح کی حکومت کرنی بھی چاہیں گے تو اقتصادی طور پر قطعاً برباد ہو جائیں گے۔

مغلیہ وغیرہ کے تمام عہدوں پر سپہ سالاری (جرنیلی) سے لے کر ادنیٰ فوجی عہدہ تک اور وزارت سے لے کر ادنیٰ سویلین تک تمام ملکی اور فوجی خدمتیں باحسن الوجوہ انجام دیتے تھے۔

(دیکھو آئین اکبری، تزک جہانگیری، تذکرۃ الامراء عالمگیری وغیرہ)

بہر حال مسلمان انگریزوں کی آنکھوں میں ہمیشہ کانٹے کی طرح کھٹکتے رہے اور اُن کو طرح طرح کی تدبیروں سے برباد کیا گیا۔

ڈاکٹر ہنٹر صفحہ ۱۹۳ میں لکھتا ہے:۔

"ایسٹ انڈیا کمپنی کے سابق ملازمین اپنی حیثیت کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور جب اُنہوں نے پہلے پہل صوبہ جات پر قبضہ کیا تو اسلامی نظام کو برقرار رکھا۔ اُنہوں نے شرع اسلامی کو ملک کا قانون بنایا اور اُس کے نفاذ کے لئے مسلمان قاضی مقرر کئے اُس وقت جو بھی کیا جاتا دہلی کے مسلمان شہنشاہ کے نام پر کیا جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی بادشاہت کا طغرائے امتیاز حاصل کرنے سے اسقدر ڈرتی تھی کہ ایک طویل مدت تک بھی جب مسلمان ملازمین کی وساطت سے حکومت کرنے کی کوشش اسلامی نظام کی ناقابل ذکر بدعنوانیوں کے باعث قطعاً ناکامیاب ہو چکی تھی اُس نے یہی ظاہر کیا کہ وہ بادشاہ کی نائب ہے۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ اس ظاہر داری نے آخر ایک قابلِ نفرت تماشے کی صورت اختیار کر لی تھی۔ ہم اُس زمانے میں بھی جب ہمارا رزیڈنٹ شاہِ دہلی کو ایک غریب قیدی کی طرح کھانے پینے کے لئے کچھ ماہوار رقم بطور وظیفہ دیا کرتا تھا جو حکم جاری کرتے اُسی کے نام پر کرتے (۱۸۳۵ء تک سکوں پر یہ عبارت کندہ ہوتی تھی جو ناموں کے تغیر کے ساتھ متواتر جاری رہی۔ بادشاہ شاہِ عالم پاسبان دینِ محمد سایہ رحمت الٰہی نے یہ سکہ ہفت اقلیم میں جاری کرنے کے لئے ڈھالا۔ اور دوسری طرف کندہ ہوتا تھا مرشد آباد میں تخت نشینی کے اُنیسویں سال ہمایوں میں ڈھالا گیا)

چونکہ ابتک جو لوگ ہندوستان کی تاریخ پر قلم اُٹھاتے رہے وہ کبھی ہندوستان نہیں آئے اس لئے اُن سے توقع نہیں کیجاسکتی کہ انگلستان میں بیٹھ کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے اس عجیب و غریب طرزِ عمل کو سمجھ سکیں گے جس کو ہم نے ابھی بیان کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم نے بادشاہت قبول کرنے میں دس سال بھی جلدی کی ہوتی تو ہم مسلمانوں کی ایسی بغاوت میں گھر جاتے جو ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے بھی کہیں زیادہ خطرناک ہوتی۔ مسلمان محسوس

کرتے کہ اُن کی حیثیت یک قلم بدل گئی ہے۔ ہماری اپنی حالت بھی ایک ایسی کافر طاقت کی ہوجاتی جس نے دارالاسلام پر قبضہ کرلیا ہو اندریں حالات مسلمانوں کی ایک بہت بڑی اکثریت جمع ہوجاتی کہ بغاوت کو فرض عین قرار دے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کی قابل تعریف اعتدال پسندی اور اس عزم بالجزم نے کہ "اسلامی سلطنت کی تدریجی اور طبعی موت میں ایک لمحہ بھر کی عجلت نہیں کیجائے" اس مصیبت کو ہمارے سر سے ٹال دیا۔ ہندوستان بتدریج اور غیر محسوس طور پر دارالاسلام سے دارالحرب میں تبدیل ہوتا گیا۔

شاہی ضلع وار دستاویزات کی کئی سال تک تحقیق کرنے کے بعد بھی میرے لئے یہ بتلانا ناممکن ہے کہ یہ تبدیلی کس سال یا کس مدت میں واقع ہوئی۔ مسلمان بادشاہ کی ظاہری برتری کو مٹانے سے بہت پہلے ہم نے مسلمان حاکموں کو برطرف کرنا شروع کردیا تھا لیکن اس برائے نام عظمت کے محض تماشہ بنجانے کے بعد بہت کافی عرصہ حتیٰ کہ ۱۸۳۵ء تک ہمارے سکے اُسی کے نام سے جاری ہوتے تھے۔ (۱۸۳۵ء میں کمپنی کے روپیہ جس کا وزن ۱۸۰ گرین تھا۔ انگریزی بادشاہ کی شکل بنائی گئی تھی اور ایسٹ انڈیا کا نام لکھا گیا تھا) پھر جب ہمیں یہ جرأت ہوئی کہ سکوں پر انگریز بادشاہ کی شکل دیدی جائے تب بھی ہم نے اسلامی دستور العمل اور عدالتوں میں اسلامی زبان کو برقرار رکھا گو یہ باتیں بھی اپنی اپنی باری پر بتدریج مٹ گئیں۔ حتیٰ کہ ۱۸۶۴ء میں ہم نے ایک دلیرانہ قدم اُٹھایا۔ میرے خیال میں یہ اقدام بڑا ہی غیر دانشمندانہ تھا۔ یعنی مجلس قوانین ساز کے ایک ایکٹ کے ذریعہ ہم نے تمام مسلمان قاضیوں کو برطرف کردیا۔ اس قانون نے نئی ہندوستانی سلطنت کی اس عمارت کو مکمل طور پر دارالحرب میں بدل دیا جس کی تعمیر پوری ایک صدی ۱۷۶۵ء سے ۱۸۶۴ء تک ہو رہی تھی۔ اسلامی حکومت کے اس طرح بتدریج مٹنے سے ہماری مسلمان رعایا پر نئے نئے فرائض عائد ہوتے گئے"۔ صفحہ ۱۹۵

مسلمانوں سے انہیں خطروں کے ماتحت ہندوستان میں سود در سود کا قانون بھی رائج کیا گیا۔ گیا۔ دوسری مصلحت یہ تھی کہ ہندوستان پر قومی قرضہ (انڈین نیشنل ڈیٹس) اس قدر بڑھ جائے کہ وہ کبھی سبکدوش نہ ہوسکے اور روپیوں کے دریا سود کی وجہ سے انگلستان کی طرف ہمیشہ بہتے رہیں۔ ہندوستان میں قدیمی زمانہ سے دام دوپٹ کا قانون جاری تھا یعنی اصل قرض کی مقدار ہی میں سود کی ڈگری دیجاتی تھی۔ پھر اس ڈگری کے بعد حکومت قرضخواہ کی پشت پناہ نہ ہوتی تھی۔ قرضخواہ (مہاجن) اور قرضدار آپس میں کسی مقدار پر صلح کرکے سبکدوش

ہو جاتے تھے۔ مگر انگریزی قانون حکومت کو مہاجن کا پشت پناہ بنانے لگا۔ حکومت قرضدار کو صرف قید و بند ہی نہیں بلکہ اس کی قرقی وغیرہ سے بھی مجبور کر کے مہاجن کو کامیاب بنانے لگی۔ اول تو سود اور سود در سود ہی ایسی عظیم الشان مصیبت بن گیا کہ سو دو سو قرضہ چند ہی سالوں میں لاکھوں کی مقدار پر پہونچ جاتا تھا۔ ثانیاً حکومت اپنی ذمہ داری کی بناء پر جائدادیں اور گھر کے زیورات اور دیگر سامان وغیرہ قرق کر کے بیچنے لگی۔ اس قانون نے ہزاروں مسلم امراء اور نوابوں کے خاندانوں اور لاکھوں زمینداروں کو لنگوٹیا، نان جویں کا محتاج، فاقہ مست بنا دیا۔ ان امراء اور نوابوں اور زمینداروں کی زمانہ ہائے سابقہ میں بڑی بڑی آمدنیاں تھیں ان کی عادتیں تمام ضروریاتِ زندگی اور رسومات بیاہ و شادی اور رسومات موت و غمی اور امور مذہبی وغیرہ میں نہایت کشادہ بلکہ فضول خرچیوں اور اسراف تک کی پڑی ہوئی تھیں۔ وقت پر اگر سرمایہ موجودہ کافی نہ ہوتا تھا تو قرض لے کر پوری کرتے اور اپنی جائدادوں وغیرہ کی آمدنیوں سے قرض ادا کرتے تھے۔ مسلم رعایا کے لوگ بھی لگان اور ٹیکس اسی طرح قرض سے ادا کیا کرتے تھے مگر اس قانون سود در سود نے بہت ہی تھوڑے عرصہ میں سب کا دیوالہ نکال دیا۔

پُرانے رؤسا اور اُمراء اگرچہ حکومت اور عہدہ ہائے بالا سے محروم کر دیئے گئے تھے مگر اُن کی عادتیں اور نام و نمود کی خواہشیں برابر باقی تھیں اس لئے اُن کی کشادہ دلی اور رسوم کی ادائیگی میں فرق نہ آیا اور نہ آنا تھا رسّی جل جاتی ہے مگر اس کی اینٹھن نہیں جاتی۔ چنانچہ یہی ہوا۔ مہاجن جائدادوں کے مالک بن گئے اور لاکھوں مسلمان خاندان بربادی کے گھاٹ اُتر کر نیست و نابود ہو گئے۔ علاوہ ان رسوم کے تعلیمی مصارف کی روز افزوں زیادتی اور کورٹوں کے اندھا دھند مصارف نے (جو کہ زمانہ ہائے قدیمہ میں پائے نجاتے تھے کیونکہ انگریزی قانون نے انصاف اور تعلیمات کو انتہائی گرانبار اور گراں کر دیا ہے۔ بالخصوص عدالت دیوانی میں تو انصاف حاصل کرنا بغیر مصارف ثقیلہ کے ناممکن ہو گیا ہے) بھی ہزاروں غیر مسرف خانوادوں کو خاک میں ملا دیا۔ یہ سب مٹنے والے خاندان عموماً مسلمان تھے اور مہاجن عموماً غیر مسلم تھے۔

ادھر صنعت و تجارت کے پیشے بھی عام طور پر مسلمانوں میں پائے جاتے تھے۔ خشکی اور سمندروں میں سفر کرنے کے مسلمان ہی عادی تھے۔ دُور دراز ملکوں سے اُن کے تعلقات تھے۔ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ کس طرح دونوں کو انگریزوں نے مٹایا ہے۔ جس سے خصوصی طور پر لاکھوں تجارت پیشہ اور دستکار خاندانوں کا خاتمہ ہو گیا

بہرحال انگریزی حکومت اور اُس کے ذمہ داروں نے عام ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں اور بالاخص بڑے بڑے مسلمان رؤساء اور اُمراء کو انتہائی درجہ میں نیست و نابود کر دیا۔

مذکورہ بالا امور جن کو ہم نے کافی شرح و بسط کے بیان کیا ہے۔ یہی وہ امور تھے جنھوں نے مسلمانوں میں ایک تڑپ پیدا کر دی۔ یہ تڑپ کیا تھی۔ ایک درد تھا۔ پوری ملت کا ایک درد تھا۔ جو اس کو گلو خلاصی پر مجبور کر رہا تھا۔ یہ ایک نیم بسمل قوم کی اضطرابی حرکت تھی۔ جس کا منشا یہ تھا کہ ملک اور ملت اُن مصائب سے نجات پائے جن کے نشتر شب و روز جسدِ ملت کے ہر رگ و پے میں پیوست ہو رہے تھے۔ اس مذبوحانہ اضطراب نے مسلمانوں کو کس طرح آمادہ انقلاب کیا۔ اور اُن کے رہنماؤں بالخصوص حضرات علماء نے اپنی ایمانی فراست اور دانشمندانہ بصیرت سے کس طرح انقلاب کا لائحہ عمل پیش کیا اور حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز اور آپ کے متوسلین نے کس طرح جانبازانہ اور سرفروشانہ کوششوں میں اپنی زندگی صرف کی۔ اس کی تفصیل دوسری جلد میں پیش کی جائے گی۔ واللہ الموفق وھو المعین

(ننگ اسلاف) حسین احمد غفرلہٗ

فہرست مضامین

....

حیات شیخ الاسلام

یعنی

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی صدر جمعیۃ علماء ہند شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند

کے

حالات زندگی کا بہترین مجموعہ

جس میں

علمی، مذہبی، تبلیغی، اصلاحی اور سیاسی خدمات، اسارت مالٹا، اسارت کراچی، اور اسارت مراد آباد و نینی وغیرہ کے حالات، اور آپ کے سیاسی نظریات پر سیر حاصل مفید اور دلچسپ بحث کی گئی ہے، خطبات صدارت کے اہم اقتباسات اور آخر میں چند مکاتیب بھی جمع کر دیے گئے ہیں جو علمی، اخلاقی اور روحانی افادات کا بہترین مجموعہ ہیں۔

قیمت مجلد صرف تین روپیہ چار آنے۔ (دیگر)

مکاتیب شیخ الاسلام مدظلہ العالی

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند

و صدر جمعیۃ علماء ہند

سے تعلق رکھنے والے حضرات کا جذبۂ استفادہ یقیناً ان ارشادات کا متلاشی ہوگا جو اس شیخ طریقت اور رہنمائے سیاست کے قلم خاص کے رہین منت ہیں مگر آپ مختصر اور جامع الفاظ میں فیوض و برکات کے جواہر سے دامن بھرنا چاہتے ہیں تو آپ مکاتیب شیخ الاسلام کا ضرور مطالعہ کیجئے، جس کا ہر ایک مکتوب بصیرت افروز اور حقائق سے بھرا ہے۔

(قیمت ایک روپیہ بارہ آنے)

ملنے کا پتہ

منیجر الجمعیۃ بک ایجنسی دفتر جمعیۃ علماء ہند گلی قاسم جان دہلی